

ماچ 2015

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین کا مجموعہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

WWW.PAKSOCIETY.COM



- عجب الست
نسل
کھڑی
- 196 تنزیلہ ریاض
144 نسر احمد
106 وجیہ احمد



- فسانے کا فسانہ
الزبتھ اور شارلٹ
خراں کے چاند تیلے
ایک پینج پالیسی
چھوچھک
- 92 ثمنہ عظمت
140 نگار احمد
80 صبا سحر
266 کینز نور علی
255 صدقہ آصف



- غزل
غزل
نظم
غزل
- 269 شفیق احمد شفیق
270 شہباز نور
269 عطا تراب
270 اسرار الحق مجاز

قسط سالانہ پک سوسائٹی
پاکستان (سالانہ) --- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ --- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 6000 روپے

- مہینہ سنتی
کرن کرن روشنی
ہمارے نام
- 14 مسیر
15 ادارہ
26 نادر خاتون



- ایک پنجابی نظم
- 20 انشاء جی



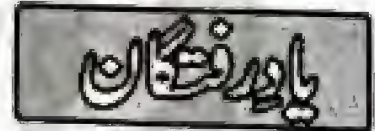
- میری ڈائری سے
- 274 امت الصبور



- باتیں زینب جمیل سے
- 32 شاہین رشید



- عینی زیدی
- 21 شاہین رشید



- میکر استاد
- 282 آسیہ راتی



- آب حیات
بن مانگی دعا
- 36 عمیرہ احمد
228 عفت سحر طاہر

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے مہینہ شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈراما ڈرامائی تفصیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشرس تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔



286 خالہ جیلانی پیکل ٹھہ بنائیں 271 شگفتہ جاہ رنگارنگ سلسلہ
284 فرح ضوی آپ کا باورچی خانہ 278 واصفہ آیل خبریں و خبریں



288 عدنان نفسیاتی ازدواجی الجھڑیں 276 خالہ جیلانی آپ کی بیاض سے



290 نیوٹی بکس کے مشورے امت الصبور



مَیّاح 2015

جلد 42 نمبر 11

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آذر ریاض نے من حسن پر تنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ٹاؤن آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

خواتین ڈائجسٹ کا مارچ کا شمار آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
عہد حاضر کی سماجی دولتی زندگی اور تیز گامی میں اُلجھ کر لطافت کا عنصر کم ہوتا جا رہا ہے۔ مسائل اور
معاشی زندگی کو مشکل بنا رہا ہے۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہم ایسی تحریروں کا انتخاب کریں جو ہماری
قارئین خیراس اور ناامیدی کے اندھیروں سے نکال کر خوشی کے کچھل مہیا کر سکیں۔ تفریح کے ساتھ ساتھ انہیں
ناموافق حالات سے خبردار کرنا ہونے کا حوصلہ دیں۔

ہمارا انتخاب، ہماری ترجیح ایسی کہانیاں ہوتی ہیں جو زندگی کو بامعنی، آسان اور خوبصورت بنائیں۔
اپنی ہی نہیں دوسروں کی بھی۔

ہم اپنی مصنفین سے بھی استدعا کرتے ہیں کہ وہ اپنی کہانیوں میں خوش امید کی پیغام دیں۔ ایسی
کہانیاں جو کہ دیر کے لیے قارئین کو زندگی کی تلخیوں سے فکدے ہائیں۔ زندگی میں جہاں تلخ حقائق ہیں وہاں
خوش رنگ، خوبصورت خواب بھی ہیں۔ امید اور خوابوں کو زندہ رہنا چاہیے۔
ہر شب تاریک کے اختتام پر روشن سحر ہوتی ہے اور ہر مشکل کے بعد آسانی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس شمارے کے ساتھ خواتین ڈائجسٹ نے ایک اور سال کی مسافت طے کر لی ہے۔
اپریل کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا۔ سالگرہ نمبر میں آپ کی پسندیدہ مصنفین کی تحریروں کے ساتھ مصنفین سے
خصوصی سروے بھی شامل ہوگا۔
مصنفین سے درخواست ہے کہ اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوا دیں تاکہ شامل اشاعت ہو سکیں۔

سالگرہ نمبر سروے،

سالگرہ نمبر میں حسب روایت قارئین کی شمولیت کے لیے سروے بھی شامل ہوگا۔ سروے کے سوالات
یہ ہیں۔

- 1- خواتین ڈائجسٹ کی وہ کون سی خوبی ہے جو اسے دیگر پریچوں کے مقابلے میں آپ کو زیادہ پسند ہے۔
- 2- خواتین ڈائجسٹ کی کسی تحریر نے آپ کی زندگی میں کون سی مثبت تبدیلی پیدا کی؟ مصنف اور تحریر کا
نام بھی لکھیں۔
- 3- اگر خواتین ڈائجسٹ کی مصنفین سے آپ کی ملاقات ہو اودان سے ایک ہی سوال کرنا، ہوتا تو آپ کس
مصنف سے کیا سوال کریں گی؟

اس شمارے میں،

- ، حمیرہ احمد کا ناول۔ آبِ حیات،
- ، نغزہ احمد کا ناول۔ نمل،
- ، تنزیلہ ریاض کا ناول۔ حیدر الیت،
- ، وحیدہ احمد کا مکمل ناول۔ کٹھ پتلی،
- ، محنت سحر طاہر کا ناول۔ بین ماگی دُعا اختتامی مراحل میں،
- ، شمیمہ عظمت علی، صدف اکسف، کینز نوڈ علی، اور نگارا احمد کے افسانے،
- ، غمناک کی میسز زبان زینب جیل سے باہیں،
- ، ماضی کی فنکارہ۔ مہتی زیدی سے ملاقات،
- ، کرن کرن دھنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- ، ہمارے نام، نفسانی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے اس لیے ان دونوں کو دین میں جمت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم ان سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سنی آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کزن کر روشنی

ادارہ

نماز سے گناہوں کی معافی

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔

”میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث سنتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے جو فائدہ دینا ہوتا دے دیتا اور جب مجھے کوئی اور آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سناتا تو میں اس سے قسم لیتا۔ اگر وہ قسم کھاتا تو میں اس پر اعتبار کر لیتا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھے حدیث سنائی اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سچ فرمایا۔ انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”جو بھی شخص کوئی گناہ کر لیتا ہے پھر اچھی طرح وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھتا ہے اور اللہ سے بخشش مانگتا ہے تو اللہ اسے ضرور بخش دیتا ہے۔“ (ابوداؤد)

فوائد و مسائل : 1 حدیث نبوی قبول کرنے میں احتیاط اور سچ غلط میں امتیاز کا عمل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے شروع ہوا ہے۔

2 حضرت علی رضی اللہ عنہ اس لیے قسم نہیں لیتے تھے کہ انہیں صحابہ کی روایت پر یقین نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ دوسرے لوگ حدیث کی اہمیت کو محسوس کریں اور وہی حدیث بیان کریں جو انہیں خوب اچھی طرح یاد ہو اس کے علاوہ یہ فائدہ بھی پیش نظر تھا کہ اگر وہ حدیث کسی کو سنائیں تو پورے اعتماد سے سنائیں کہ حدیث صحیح ہے۔

3 حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صداقت پر اتنا یقین تھا کہ ان کی سنائی ہوئی حدیث بے چون و چرا تسلیم کر لیتے تھے۔

4 وضو اور نماز گناہوں کی معافی کا ذریعہ ہیں۔

5 نماز کے باوجود دل میں ناام ہوتے ہوئے اللہ سے مغفرت کی دعا کرنا ضروری ہے البتہ بعض چھوٹے گناہ صرف وضو سے یا صرف نماز سے بھی معاف ہو جاتے ہیں۔

نماز پڑھنا

رحمتہ اللہ کا پیچھے رہ جانا شاید ان کی کسی کوتاہی کی وجہ سے پیش آیا ہو گا کہ وہ ارادہ رکھنے کے باوجود شریک نہ ہو سکے ہوں گے اس لیے انہوں نے اپنا ایک گناہ شمار کیا۔

4 چار مساجد سے مراد مسجد حرام، مسجد نبوی، مسجد اقصیٰ اور مسجد قبا ہیں جن کی زیارت کے لیے جانے کی ترغیب احادیث میں مروی ہے۔

5 حکم کے مطابق وضو اور نماز سے مراد اچھی طرح آداب و سنن کو ملحوظ رکھتے ہوئے وضو کرنا اور نماز پڑھنا اور نماز میں توجہ اور خشوع و خضوع کا اہتمام کرنا ہے، یعنی بہترین انداز سے وضو کر کے بہترین انداز سے نماز ادا کی جائے۔

6 سنت کے مطابق وضو اور نماز اتنا بڑا عمل ہے کہ اس سے بعض بڑے گناہ بھی معاف ہو جاتے ہیں۔

لناہوں سے معافی

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”بھلا بتاؤ! اگر کسی کے گھر کے سامنے (صاف پانی کا) ایک دریا بہتا ہوا، وہ اس میں روزانہ پانچ بار غسل کرے تو اس (کے جسم) پر کتنی میل بانی رہ جائے گی؟“

حاضرین نے کہا ”بالکل نہیں رہے گی۔“

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”نماز گناہوں کو اسی طرح ختم کر دیتی ہے جس طرح پانی سے میل کچیل ختم ہو جاتی ہے۔“

فوائد و مسائل : 1 مسنون وضو اور نماز سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

2 شرعی مسئلہ مثالیں دے کر بیان کرنے سے زیادہ سمجھ میں آتا ہے اور زیادہ یاد رہتا ہے۔ دوسرے علمی مسائل کی بھی یہی کیفیت ہے۔

نماز قائم کرنا

حضرت عاصم بن سفیان ثقفی رحمۃ اللہ سے روایت ہے کہ مسلمانوں نے ذات سلاسل کی جنگ کی، لیکن یہ لوگ (عاصم اور ان کے کچھ ساتھی) جنگ میں شریک نہ ہو سکے۔ (بعد میں پہنچے، چنانچہ) وہ لوگ (کچھ عرصہ) محاذ پر مورچہ زن رہے (لیکن دوبارہ جنگ کی نوبت نہ آئی تو) پھر وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس واپس آ گئے۔ اس وقت معاویہ رضی اللہ عنہ کی مجلس میں حضرت ابو ایوب اور حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ عاصم رحمۃ اللہ نے کہا۔

”ابو ایوب! ہم تو اس سال جہاد سے محروم رہ گئے۔ ہمیں بتایا گیا کہ جو شخص چار مسجدوں میں نماز پڑھے، اس کا گناہ بخش دیا جاتا ہے۔“

حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ”بھتیجے! میں تجھے اس سے آسان عمل بتاتا ہوں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرما رہے تھے، جو شخص وضو کرے جس طرح حکم دیا گیا ہے اور نماز اس طرح پڑھے جس طرح حکم دیا گیا ہے تو اس کے گزشتہ عمل معاف ہو جائیں گے۔“ عقبہ! کیا یہ حدیث اسی طرح ہے؟ انہوں نے کہا ہاں (اسی طرح ہے۔) (مسند احمد)

فوائد و مسائل : 1 ایک غزوہ ذات سلاسل ۸ھ میں فتح مکہ سے پہلے ہوا تھا۔ یہ اور جنگ ہے جو ذات سلاسل کے نام سے مشہور ہے۔ یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں واقع ہوئی۔

2 ”سلاسل“ کا مطلب ریت کے ٹیلوں کا سلسلہ ہے۔ یہ دونوں جنگیں صحرائی علاقے میں واقع ہونے کی وجہ سے ذات سلاسل کے نام سے معروف ہوئیں۔

3 حضرت عاصم رحمۃ اللہ کا جنگ میں شریک نہ ہونا گناہ نہیں تھا کیونکہ ہر جہاد میں کچھ مجاہد شریک ہوتے ہیں، کچھ ہنگامی حالات کے لیے یا کسی اور جنگ میں شریک ہونے کے لیے یا دوسرے فرائض انجام دینے کے لیے پیچھے رہتے ہیں۔ اس جنگ میں حضرت عاصم

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے کسی عورت سے زنا سے کم تر ناجائز حرکت کی۔ یہ تو معلوم نہیں کہ اس نے کس حد تک غلطی کی، تاہم زنا نہیں کیا، پھر وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ بات عرض کی۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کر دی۔
”دن کے کناروں میں بھی نماز قائم کیجئے اور رات کی گھڑیوں میں بھی یقیناً نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔ یہ نصیحت ہے نصیحت قبول کرنے والوں کے کیے۔“ (سورۃ ہود 114)

صحابی نے کہا ”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا یہ (رعایت) صرف میرے لیے ہے؟“
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جو بھی اس پر عمل کرے اس کے لیے ہے۔“

فوائد و مسائل : 1 مرد کا کسی عورت کو اور عورت کا کسی مرد کو گناہ آلود نظر سے دیکھنا، چھونا اور بوس و کنار وغیرہ کرنا یہ سب گناہ کے کام ہیں اور حدیث میں انہیں بھی ”زنا“ قرار دیا گیا ہے، تاہم یہ بد فعلی سے کم تر درجے کے گناہ ہیں، اس لیے جب کوئی شخص ایسی حرکت کا ارتکاب کر کے دل میں تادم ہو، توبہ کرے اور وضو کر کے نماز پڑھ لے تو اس کا گناہ معاف ہو جائے گا، البتہ ناجائز جنسی عمل کے ارتکاب پر حد کا نفاذ ضروری ہے، حد لگ جانے سے وہ بھی معاف ہو جاتا ہے۔

2 مومن کے دل میں اللہ کا خوف ہونا چاہیے۔ اگر نفس امارہ اور شیطان کے غلبے سے غلطی ہو جائے تو فوراً اس کے ازالہ اور معافی کی فکر ہونی چاہیے۔

3 دن کے کناروں کی نمازیں فجر اور عصر کی ہیں جن کے درمیان ظہر کی نماز آجاتی ہے اور رات کی نمازیں مغرب اور عشاء ہیں، یعنی نماز پنجگانہ کی ادائیگی گناہوں کی معافی کا باعث ہے۔

پانچ نمازوں کی فرضیت اور محافظ کا بیان

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت

ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”اللہ تعالیٰ نے میری امت پر پچاس نمازیں فرض کیں۔ میں یہ حکم لے کر واپس آیا حتیٰ کہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچا۔“

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا : 1 آپ کے رب نے آپ کی امت پر کیا فرض کیا ہے؟
میں نے کہا : ”اس نے مجھ پر پچاس نمازیں فرض کی ہیں۔“

انہوں نے فرمایا : ”اپنے رب کے پاس واپس جائیں کیونکہ آپ کی امت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔“

میں دوبارہ اپنے رب کی طرف گیا تو اس نے نصف نمازیں معاف فرمادیں۔
میں پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور انہیں بتایا۔

انہوں نے فرمایا ”اپنے رب کے پاس واپس جائیے کیونکہ آپ کی امت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔“
میں پھر اپنے رب کی طرف گیا تو اس نے فرمایا ”یہ (ادا کرنے میں) پانچ ہیں اور یہی (ثواب میں) پچاس ہیں۔ میرا فرمان تبدیل نہیں ہوتا۔“

میں پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا۔
انہوں نے فرمایا ”اپنے رب کے پاس واپس جائیے۔“

میں نے کہا ”مجھے اپنے رب سے شرم محسوس ہوتی ہے۔“ (بخاری)

فوائد و مسائل : 1 یہ حدیث واقعہ معراج کا ایک حصہ بیان کرتی ہے۔

2 حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو فرمایا کہ آپ کی امت زیادہ نمازیں پڑھنے کی طاقت نہیں رکھتی، اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں بنی اسرائیل سے اس قسم کا تجربہ ہوا تھا کہ بنی اسرائیل نے اللہ کے حکم کے مطابق نمازیں ادا کرنے میں کوتاہی کی تھی۔ (صحیح مسلم، حدیث : 13)

3 پچاس نمازوں کا حکم تبدیل کر کے پانچ کر دینا اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت ہے اور مسلمانوں پر اللہ کا احسان عظیم ہے۔ اس احسان کا شکر صرف اسی طرح ادا کیا جاسکتا ہے کہ پانچوں نمازیں پابندی سے اور پورے آداب کا لحاظ رکھ کر بروقت ادا کی جائیں۔

4 پانچ نمازوں کو پچاس قرار دے کر فرمایا کہ میرا فرمان تبدیل نہیں ہوتا اس کی وجہ یہ ہے کہ خود اسی کا قانون ہے کہ صحیح انداز سے خلوص کے ساتھ ادا کی ہوئی نیکی کا ثواب کم از کم دس گنا لکھا جاتا ہے۔ ارشاد ہے۔ من جاء بالحسنة فله عشر امثالها (الانعام : ۱۲۰) ”جو نیکی لے کر حاضر ہوا اس کا دس گنا (بدلہ) ملے گا۔“

5 آخری بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید تخفیف کی درخواست کرنے سے اجتناب فرمایا، کیونکہ پانچ پر پچاس کے ثواب کی خوشخبری میں یہ ارشاد تھا کہ اب مزید تخفیف نہیں کی جائے گی۔

عہد

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ”انہوں نے فرمایا : میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا“ آپ نے فرمایا۔

”پانچ نمازیں ہیں جو اللہ نے اپنے بندوں پر فرض کی ہیں تو جو شخص انہیں اس طرح لے کر حاضر ہوا کہ ان کے حق کو غیر اہم سمجھ کر ان میں کمی نہ کی ہو تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس سے وعدہ فرمائے گا کہ اسے جنت میں داخل کر دے گا اور جو انہیں اس طرح لے کر آیا کہ ان کے حق کو اہمیت نہ دیتے ہوئے ان میں کمی کی (پوری نمازیں ادا نہ کیں) تو اسے اللہ کے ہاں کوئی عہد حاصل نہیں ہو گا“ (اللہ کی مرضی ہے) چاہے اسے عذاب دے، چاہے بخش دے۔“ (ابوداؤد)

فوائد و مسائل : 1 صرف پانچ نمازیں فرض ہیں۔ باقی سب نفل ہیں لیکن بعض نمازوں کی تاکید زیادہ ہے بعض کی کم، تاہم ان کی ادائیگی میں بھی کوتاہی کرنا جائز نہیں کیونکہ فرضوں کی کمی نوافل سے پوری ہوگی۔

2 کی کرنے سے مراد بعض نمازیں ترک کر دینا نماز کی ادائیگی کے دوران میں خشوع و خضوع وغیرہ کا خیال نہ رکھنا ہے۔

3 دین کے فرائض کو کما حقہ اہمیت نہ دینا اللہ کی رضا سے محرومی کا باعث ہے۔

4 نماز صحیح طریقے اور پابندی سے ادا کرنے والا یقیناً ”جنت میں جائے گا اگرچہ بعض گناہوں کی وجہ سے کچھ وقت کے لیے جہنم میں بھی بھیج دیا جائے گا۔“

5 نماز کو اہمیت نہ دینا مغفرت سے محرومی کا باعث بن سکتا ہے اس لیے ترک نماز کو کفر قرار دیا گیا ہے کہ جس طرح کافر جنت میں نہیں جاسکتا اسی طرح بے نمازی بھی عذاب کا مستحق ہوگا۔

اسلام

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہم مسجد میں بیٹھے تھے کہ اسی اثنا میں ایک آدمی اونٹ پر سوار ہو کر مسجد میں داخل ہوا۔ اس نے مسجد میں اونٹ بٹھایا، اس کا گھٹنا باندھا، پھر کہا۔ ”آپ لوگوں میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کون ہیں؟“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی مجلس میں ٹیک لگائے تشریف فرما تھے۔ انہوں نے کہا۔ ”یہ سفید فام جو ٹیک لگا کر تشریف فرما ہیں۔“ اس آدمی نے کہا ”عبد المطلب کے بیٹے!“ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”(بات کرو) جواب دے رہا ہوں۔“

اس آدمی نے کہا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) میں آپ سے کچھ دریافت کروں گا اور سوال میں سختی ہوگی، آپ دل میں (ناراضی) محسوس نہ کیجئے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”جو چاہو پوچھ لو۔“

آدمی نے کہا ”آپ کو آپ کے رب کی اور آپ سے پہلے لوگوں کے رب کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا آپ کو اللہ نے سب لوگوں کی طرف بھیجا ہے؟“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اللہ گواہ ہے ہاں (کی بات ہے)۔“

اس نے کہا ”میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا اللہ نے آپ کو رات دن میں پانچ نمازیں پڑھنے کا حکم دیا ہے؟“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اللہ گواہ ہے ہاں (ایسا ہی ہے)۔“

اس نے کہا ”میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا آپ کو اللہ نے سال میں اس مہینے (رمضان) کے روزے رکھنے کا حکم دیا ہے؟“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”اللہ گواہ ہے ہاں۔“

اس نے کہا ”میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ ہمارے دولت مندوں سے یہ صدقہ (زکوٰۃ) لے کر ہمارے غریبوں میں تقسیم فرمائیں؟“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اللہ گواہ ہے ہاں۔“

اس شخص نے کہا :

”میں آپ کی لائی ہوئی (شریعت) پر ایمان لے آیا ہوں اور میں اپنے پیچھے اپنی قوم کے افراد کی طرف سے پیغام رسل بن کر آیا ہوں۔ میں بنو سعد بن بکر (قبیلہ) کا ایک فروض نام بن ثعلبہ ہوں۔“ (صحیح بخاری)

فوائد و مسائل : 1 نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسجد سادہ اور کچی تھی اس لیے اونٹ وغیرہ کے آنے سے منع نہیں کیا گیا۔ ممکن ہے اونٹوں کے بٹھانے کے لیے جگہ مخصوص ہو۔ اس بنا پر آج کل مسجد کے ساتھ سائیکلوں، اسکوٹروں اور گاڑیوں وغیرہ کے لیے جگہ خاص کی جاسکتی ہے۔

2 مجلس میں معزز شخصیت کے لیے نمایاں نشست مخصوص کی جاسکتی ہے تاکہ آنے والے اجنبیوں کو پہچاننے میں مشکل نہ ہو۔

3 اگر مسائل سوال کرتے ہوئے ادب و احترام کا مناسب خیال نہ رکھ سکے تو عالم کو چاہیے کہ ناراضی

محسوس نہ کرے۔

4 ایک راوی کی روایت (خبر واحد) قابل قبول ہے جب کہ وہ راوی قابل اعتماد (ثقة) ہو۔

5 عالم کے پاس سفر کر کے جانا اور اس سے مسائل کی تحقیق کرنا مستحسن ہے۔

6 نازل سند کے ساتھ حدیث معلوم ہو تو عالی سند حاصل کرنے کی کوشش کرنا اچھی بات ہے۔

7 قرات علی الشیخ بھی حصول علم کا ایک درست طریقہ ہے۔

8 جب قوم کسی فرد کو اپنا نمائندہ منتخب کر لے تو پھر اس کی کارروائی پر اعتماد کرنا چاہیے ”الایہ کہ اس سے واضح غلطی سرزد ہو جائے۔“

افضل

”میری اس مسجد میں ایک نماز مسجد حرام کے سوا“ دو سری مسجدوں میں پڑھی جانے والی ہزاروں نمازوں سے افضل ہے۔“ (مسلم)

فائدہ : 1 ”میری اس مسجد“ سے مراد مسجد نبوی کا صرف وہ حصہ نہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں مسجد میں شامل تھا بلکہ اس میں ہونے والے بعد کے تمام اضافے بھی شامل ہیں کیونکہ ان اضافوں کی حیثیت الگ مسجد کی نہیں اس لیے مسجد نبوی کے پرانے یا نئے جس حصے میں بھی نماز ادا کی جائے یہ ثواب حاصل ہو جائے گا البتہ اگلی صفوں کی افضلیت جس طرح دو سری مساجد میں ہے وہاں بھی ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

2 مسجد نبوی کی ایک نماز ہزار نمازوں کے برابر نہیں بلکہ ہزار نمازوں سے بہتر ہے اسی طرح مسجد حرام کی ایک نماز ایک لاکھ نمازوں کے برابر نہیں بلکہ ان سے بھی افضل ہے تاہم خشوع و خضوع، آداب و ارکان کے لحاظ اور توجہ و انابت وغیرہ کی کمی بیشی کی بنا پر اس ثواب میں بھی کمی بیشی ہو سکتی ہے۔





انشائی کی ایک پنجابی نظم

تینوں دسیاتے توں ہتا اے اسیں کہندے کہندے مر جانا
 اسیں تینوں کچھ نیئیں دسنا اے توں ہسدے ہسدے مر جانا
 بس اک اپنی وچ جلتا اے اسیں اُجڑے اُجڑے رہ جانا
 اور آپے پکھا جلتا اے توں وسدے وسدے مر جانا
 اسیں پتے آں تو خام کڑے ہاں سوچ لیا انجام کڑے
 کچھ ہو یا نٹیں کی ہونا سی اک گھر وچ دیوا بلدا ای
 اک دن دا ہسنا رونا سی کی دیکھ سندیے گھلدا ای
 اوہ ساگر چھلاں ایویں سی کیوں پورب پچھم جانی ایں
 اوہ ساریاں گلاں ایویں سی کیوں من اپنا بھٹکانی ایں
 پر چرچا کرنا تمام کڑے گھر آ جا پے گئی شام کڑے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

عکسی زندگی سے ملاقات

شاہین رشید



شاید 1983-1987ء کی بات ہے کہ ڈرامہ سیریل چھاؤں کوئٹہ ٹی وی سینٹر سے آن ایر ہوا تھا اور اس کے ڈائریکٹر پروڈیو سر کاظم پاشا صاحب تھے۔ سپر ہٹ سیریل کے تمام فنکاروں نے ہی راتوں رات شہرت حاصل کی تھی۔ آمنہ خان، لیلیٰ زبیری اور عینی زیدی۔ ان تینوں کی پرکار منس بہترین تھی۔ ان تینوں فنکاروں میں ”لیلیٰ زبیری“ تو فیلڈ سے وابستہ رہیں، لیکن آمنہ خان اور عینی زیدی غائب ہو گئیں۔ کچھ عرصہ قبل آمنہ خان نے بھی شاید ایک آدھ سیریل کیا مگر پھر غائب ہو گئیں (البتہ آپ ان کی بیٹی ”عاصمہ جہانگیر“ کو ڈراموں میں دیکھتے رہتے ہوں گے) اب رہ گئیں عینی زیدی۔ تو جب تقریباً ایک سال قبل ”میری سچ کا ستارہ“ میں انہیں ”ضمنی جنگ“ کی ساس کے روپ میں دیکھا تو احساس ہوا کہ دنیا واقعی گول ہے اگر زندگی ہو تو کہیں نہ کہیں دکھائی بھی دے جاتے ہیں۔ سنائی بھی دے جاتے ہیں اور ملاقات بھی ہو جاتی ہے۔

تو اس بار پھر ماضی کی حسین اور باصلاحیت فنکارہ عینی زیدی سے آپ کی ملاقات کروائیں گے۔ گزشتہ ماہ ہم نے ”ہمانو اب“ سے آپ کی ملاقات کرائی تھی۔ ”یعنی! آپ کو ڈراموں میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، کیسی ہیں آپ؟ اور اگر میں آپ کے حسن کی۔ اور آپ کی بارعب شخصیت ہونے کی تعریف نہ کروں تو یہ آپ کے ساتھ زیادتی ہوگی۔“

”بہت شکریہ۔ تعریف اور محبت کا۔ بہت خوشی ہوئی اپنے بارے میں سن کے۔“

”تعریفی ریمارکس تو آپ کو ملتے ہی رہتے ہوں گے۔ خیر آپ بتائیے کہ ”چھاؤں“ کے بعد کاسفر کہاں اور کیسا گزرا۔“

”ڈرامہ سیریل ”چھاؤں“ میں تو آنا اس طرح ہوا کہ میرے میاں صاحب ”آرمی“ میں تھے تو ان کی پوسٹنگ ”کوئٹہ“ میں ہوئی۔ اور لیلیٰ زبیری بھی آرمی آفیسر کی بیوی تھیں تو ان کے شوہر کی پوسٹنگ بھی وہیں ہوئی تھی تو ان دنوں کاظم پاشا ”چھاؤں“ سیریل پہ کام کر رہے تھے اور انہیں اس کے لیے لیڈنگ رول کے

لیے نئے چہرے کی تلاش تھی۔ اس زمانے میں چاروں ٹی ٹی وی سینٹرز میں بہترین سیریلز کا مقابلہ شروع ہوا تھا۔ اور میرا تو اس فیلڈ میں آنے کا کبھی ارادہ ہی نہیں تھا نہ ہی کوئی سوچ تھی۔ کیونکہ اس زمانے میں میری بیٹی کی پیدائش ہوئی تھی اور وہ صرف نو ماہ کی تھی۔ تو خیر لیلیٰ زبیری نے مجھ سے ذکر کیا اور مجھے اسکرپٹ دکھایا۔

”کاغذ“ اور ”تاوان“ اب مجھے پتا نہیں ہے کہ وہ آن اریہ ہوئے تھے کہ نہیں۔ ”تاوان“ نصرت ٹھاکر صاحب کا تھا۔ پھر جب امریکہ گئی تو وہاں کے ایک چینل سے میں نے کمپیئرنگ اور ڈسکشن کے لائیو شو کیے تھے۔ وہ بڑے کامیاب گئے۔ پھر جب یہاں سے گئی تو پاکستان آنے کا اتفاق بھی نہیں ہوا۔ پھر 2006ء میں میرے شوہر کا انتقال ہو گیا پھر میں واپس آئی تو سوچا کہ چلو ٹرائی کرتے ہیں کچھ۔“

”امریکہ اتنے سال رہیں۔ وہاں میڈیا میں کام بھی کیا تو کیسا رہا کام کا تجربہ؟“

”وہاں جس چینل سے میں نے کام کیا وہ نیا نیا کھلا تھا۔ اچھا تھا مگر اتنا آرگنائزڈ نہیں تھا اس لیے زیادہ عرصہ چل نہ سکا۔ وہاں دو سال میں نے کام کیا۔“

”پاکستان آپ بیس پچیس سال کے بعد آئیں تو کس طرح دوبارہ میڈیا تک رسائی ہوئی؟“

”میں 2013ء میں اپنی بیٹی کی شادی کرنے پاکستان آئی تھی۔ اور یہاں میں اپنی بہن کے یہاں ٹھہرتی ہوں۔ تو میرا بھائی جو یہاں ”اردوون“ کا ڈائریکٹر ہے۔ اس نے کہیں میرا ذکر کیا ہوگا ”جامی“ اس کا نام ہے۔ تو پھر ”ہم ملی وی“ والوں نے مجھ سے رابطہ کیا اور ”میری صبح کا ستارہ“ کرنے کے لیے کہا۔“

”آپ لوگوں کو یاد تھیں؟“

”جی۔ میں بہت حیران ہوئی۔ جب بہت بنگ لڑکوں نے مجھے ویلکم بیک یعنی زیدی کہا۔ تو میں نے بڑی حیرانی سے کہا کہ آپ مجھے جانتے ہیں تو کہنے لگے کہ آپ کو کون نہیں جانتا۔ کہنے لگے کہ آپ کے ڈراموں کو دیکھ کر تو ہم بڑے ہوئے ہیں۔“

”امریکہ میں پاکستانی ڈرامے دیکھتی تھیں؟ اگر دیکھتی تھیں تو کیسے لگتے تھے۔“

”جب میں یہاں سے گئی ہوں تو میٹل ڈاون ہونا تھا۔ پھر جاب بھی شروع کر دی تو کافی عرصہ نہیں دیکھ پائی تو اب کچھ ہی عرصہ قبل میں نے دیکھنا شروع کیا ہے۔ اگر کبھی دیکھے بھی تو جلتے پھرتے۔“

اور میرا تعارف کاظم پاشا صاحب سے کروایا۔ تو بس انہوں نے تو ٹھکان لی کہ آپ کو تو ہم نے سیریل میں لینا ہی لینا ہے۔ پھر میں نے اپنے شوہر سے ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ کیسے کروگی پچی پھولی ہے اور دیگر مصروفیات بھی۔ تو میں نے کہا کہ صرف چار اقساط ہیں اور چار اقساط کے بعد میرا کردار ختم ہو جائے گا یعنی کہانی میں مجھے مار دیا جائے گا۔ تو کوئی مسئلہ نہیں بہت فورس کر رہے ہیں تو آپ اجازت دے دیں۔

تو انہوں نے اجازت دے دی۔ اور پھر میرا خیال ہے کہ دوسری قسط آن اری گئی ہی تھی تو ایک آدھ دن کے بعد میری دوست نے کہا کہ تم بازار گئی ہو میں نے کہا کہ نہیں۔ تو کہنے لگی کہ تم ہر میگزین کے کور کے اوپر بیٹھی ہوئی ہو میں تو بے ساختہ رونے لگی کہ ”میں تو کبھی بھی کہ میں تو چار اقساط میں کام کر کے چلی جاؤں گی اور کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا“ مگر جناب اتنی زیادہ پسندیدگی ہوئی کہ ہیڈ کوارٹر سے بھی فون آگیا کہ اس کردار کو سیریل کے آخر تک لے کر جائیں۔ اور اسی وجہ سے پھر کہانی میں بھی تبدیلی لائی گئی اور میرے کردار کو بڑھا دیا گیا۔ اور پھر میں نے کیا آخر تک۔ اور مجھے بالکل بھی آئیڈیا نہیں تھا کہ مجھے اور میری رفارمنس کو اتنا زیادہ پسند کیا جائے گا۔ اور راتوں رات مجھے اتنی شہرت اور اتنی عزت مل جائے گی کہ میں ”اسٹار“ بن جاؤں گی۔ یہ سب اللہ کا مجھ پر خاص کرم تھا۔“

”اور میرا خیال ہے کہ اس سیریلز کی سب ہی خواتین کو بہت شہرت ملی۔ چاہے وہ آمنہ خان ہوں یا لیلیٰ زبیری۔“

”جی جی۔ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اگرچہ لیلیٰ

زبیری پہلے سے کام کر رہی تھیں مگر انہیں بھی شہرت اس ڈرامے سے ملی۔ خیر۔ پھر اس کے بعد ہم لوگ امریکہ چلے گئے۔ اور امریکہ جانے سے پہلے میرے شوہر نے آرمی چھوڑ دی اور وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ لے لی۔ چھاؤں کے بعد میں نے دو مزید ڈرامے کیے۔

مارچ 2015

کے شمارے ایک جگہ

شعاع

اپنا ماہنامہ

مارچ 2015

کاشمارہ ضلع

ہو گیا



سیراجید کا مکمل ناول "یارم" کی آخری قسط،

سونداختار کا مکمل ناول "قید"،

رخسانہ ٹارعدنان کا سلسلے دار ناول "ایک تھی مثال"،

نبیلہ عزیز کا سلسلے دار ناول "رقصِ بیل"،

سحر ساجد کا ناول "غریب رحمت"،

نازیہ جمال کا ناول "یہ تو دل کی بات ہے"،

نور عین، ملیحہ صدیقی اور جویریہ شاہ کے افسانے،

ٹی وی فنکار "آغا علی عباس" سے ملاقات،

"بیٹھ کر میر دو جہاں کرنا" آمند زریں کا تبصرہ،

معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ "دستک"،

"پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں" احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم،

خط آپ کے، آئینہ خانے میں، تاریخ کے جھروکوں سے، موسم کے پکوان اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

شعاع کا مارچ 2015 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

"تو اب کیسا محسوس کرتی ہیں؟"

"سچ پوچھیں تو میں تو بہت متاثر ہوئی ہوں۔ کیونکہ

اتنے زبردست موضوعات پہ ڈرامے بن رہے ہیں کہ

میں سمجھتی ہوں کہ آج کل کے ڈراموں میں وہی کچھ

دکھایا جا رہا ہے جو ہمارے معاشرے میں ہو رہا ہے۔

جیسے "نہر" کے "طلاق" کے اور "نکاح" کے

موضوعات پر قلم اٹھائے گئے ہیں۔ اور نہ صرف

موضوعات نئے ہیں بلکہ رنگ بچے اداکاری بھی کمال کی

کرتے ہیں اور میں نے دیکھا ہے کہ پاکستانی ڈراموں کی

ڈبنگ بھی ہو رہی ہے دو سری زبانوں پر۔ تو میں تو واقعی

بہت متاثر ہوئی ہوں۔ اور اب تو فلموں میں بھی تھوڑا

بہت اٹھان آرہا ہے اور اچھی بن رہی ہیں مگر پھر بھی ان

کو ٹائم لگے گا۔"

"اتنی تعریف نہ کریں۔ موضوعات بولڈ ہیں تو گھسے

پٹے بھی ہیں کچھ؟"

"ہاں بات تو آپ کی ٹھیک ہے۔ بہت گہری نظر

سے اور تنقیدی نظر سے دیکھیں تو بعض کہانیاں بہت

گھسی پٹی ہوتی ہیں۔ ایک لڑکی دو لڑکے، مظلوم

عورت وغیرہ وغیرہ۔ اور مجھے جب "میری صبح کا ستارہ"

ملا تو میں نے کہا کہ بہت رونے دھونے والا ٹریجک

ڈرامہ ہے عین تو اس میں کام نہیں کروں گی۔ اور

نگینو رول تو بالکل نہیں کروں گی۔ تو کہا کہ پھر وہ رول

کر لیں جس میں ماں ہر وقت روتی رہتی ہے۔ تو خیر

ایک بری ساس کا کردار میں نے کر لیا۔"

"لوگوں نے پسند کیا اس رول میں؟ اور حقیقت

میں بھی ایسی بارعب اور صبح کے ستارے والی ساس

ہیں۔"

"یقیناً۔" جو لوگ مجھے جانتے ہیں انہوں نے کہا

کہ تم بالکل ویسی نہیں ہو جیسا تم نے رول کیا ہے۔ تو

بارعب تو ہوں کہ میری شخصیت ہی ایسی ہے مگر سخت

نہیں ہوں۔ اس رول میں تو لوگوں نے مجھے برا کہا۔

گالیاں بھی دیں اور بددعائیں بھی دیں کہ کیسی ساس

ہیں آپ۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ یہی میری کامیابی

ہے۔ میری اپنی فرینڈز جو مجھے کافی عرصے سے جانتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا دل چاہتا ہے کہ تمہیں اٹھا کر پھینک دیں۔“

”سائیں تو اکثر ایسی ہی ہوتی ہیں۔ اور اس لیے وہ بدنام بھی ہیں۔ مگر سو بھی اتنی معصوم اور سب دھی نہیں ہوتیں جتنی اس سیریل میں دکھائی گئی تھی۔“

”میں بھی آپ کی بات سے اتفاق کرتی ہوں کہ جس نے لی اے کیا ہوا ہو اور جو جاب کرتی ہو۔ وہ ایسی سیدھی نہیں ہو سکتی۔ کچھ تو اپنے حق کے لیے بولے۔ اس زمانے میں اتنی مظلوم لڑکیاں ہوتی نہیں ہیں۔ خصوصاً“ پڑھی لکھی لڑکیاں تو بالکل بھی نہیں۔ اور سب نے اس بات پر اعتراض کیا کہ یہ کون سے زمانے کا ڈرامہ ہے۔ آج کل تو ایسا نہیں ہوتا۔ البتہ ڈائریکشن اچھی تھی۔ سکیمنہ سموں کے ساتھ بہت اچھا ٹائم گزرا۔“

”آپ کہہ رہی ہیں کہ ڈرامے بہت اچھے ہو گئے ہیں۔ تو کیا معاشرے میں چھینچ لایا جاسکتا ہے؟“

”بالکل لایا جاسکتا ہے۔ اور عورتوں کے لیے تو میرے خیال میں بہت چھینچ آیا ہے۔ خواتین کو اپنے حقوق پتا چلے وہ گھر سے باہر نکلیں۔ کام کر رہی ہیں اپنے حق کے لیے لڑ رہی ہیں۔ میڈیا نے خواتین کے لیے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ کیونکہ ٹی وی پر چھوٹے بڑے گھر میں اور گاؤں دیہات میں موجود ہوتا ہے۔“

”آپ کی شخصیت میں بڑا رعب ہے تو اگر آپ کو لوہے کی خاتون کا رول دیں تو کیا آپ کر سکیں گی اور کیا لوگ قبول کریں گے آپ کو اس کردار میں؟“

”میرے ساتھ ٹریجڈی یہی ہے کہ مجھ پر ایک ماڈرن خاتون کا لیبل لگا دیا گیا ہے۔ ابھی بھی دو تین رولز ایسے تھے جو مجھے پسند آئے، مگر نہیں دیے گئے۔ کہ جی آپ کر نہیں سکیں گی۔ تو میں نے کہا کہ جب تک آپ دیں گے نہیں، آزماؤں گے نہیں تو کیسے پتا چلے گا کہ میں کر سکتی ہوں یا نہیں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ پھر میں آرٹسٹ تو نہ ہوئی نا۔“

”آپ نے بیس پچیس سال پہلے ”چھاؤں“ کیا اور اب ”صبح کا ستارہ“ گزرے زمانے میں رہ کر ”سیریل“ میٹنگز ایک ایک سین پہ ڈسکشن۔ اب ایسا نہیں ہے تو کیا اب لوگ زیادہ ٹیلنٹڈ ہو گئے ہیں؟“

”یہ غلط بھی ہے اور کوئی ٹیلنٹ نہیں ہے لوگوں کا۔ مسئلہ یہ ہے کہ اب ہر ایک کو پیسہ چاہیے۔ سب کو اپنا معیار زندگی بلند کرنا ہے تو اس لیے وہ بیک وقت تین چار ڈراموں میں کام کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ڈرامے کی خوب صورتی کی بات ہے تو اس کے لیے بہت ضروری ہے کہ رہ کر ”سیریل“ بھی ہو اور ڈسکشن بھی ہو، آپ کی آواز کا اتار چڑھاؤ اور آپ کے ایکسپریشن اس چیز کی تو اصلاح کرنا ہے ڈائریکٹر۔ اور جب ہم پوری تیاری کے ساتھ جاتے تھے تو ہمارا سین بھی تو جلدی اوکے ہو جاتا تھا۔ اب تو آرٹسٹوں کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اسٹوری کیا ہے۔ تو خود سوچیں کہ جب مجھے کہانی کا بیک گراؤنڈ نہیں معلوم ہو گا تو میں ایکسپریشن کیسے دے سکوں گی۔ مجھے بھی میرا کردار دے دیا گیا تھا تو میں بالکل مجھے مطمئن نہیں ہوئی اور پھر میں نے پورا سیریل منگوایا اور اسے پڑھا۔ پورا تو نہیں پڑھ سکی مگر آؤٹ لائن پڑھ لی۔“

”آج کل کیا مصروفیات ہیں آپ کی، انڈر پروڈکشن کتنا کام ہے آپ کا؟“

”آن ایر کوئی نہیں ہے اور نہ ہی کوئی انڈر پروڈکشن ہے۔ کیونکہ میں بہت کم عرصے کے لیے آئی تھی اور اب عنقریب میری واپسی ہے، کیونکہ ڈراموں کے لیے دو دو تین تین ماہ رکنا پڑتا ہے۔ تو ان شاء اللہ تین چار ماہ کے بعد واپس آؤں گی تو پھر کام کروں گی۔“

”واپس کیوں جا رہی ہیں، بچے آپ کے وہیں امریکہ میں ہی ہیں؟“

”جی بچے بھی ہیں پھر میری اپنی جاب بھی ہے۔ کچھ اور کاممنٹس بھی ہیں میں وہاں کالج میں پڑھاتی ہوں تو چھٹی کا ڈراما مسئلہ ہوتا ہے۔“

”اتنے عرصے کے بعد پاکستان واپس آئیں تو۔ کیا

چہنچ دیکھا آپ نے؟

”فارغ اوقات میں کوئی نہ کوئی کلاس جوائن کر لیتی ہوں۔ آج کل کچھ نہیں کر رہی۔ لیکن کچھ نہ کچھ مشغل میلہ لگا ہی رہتا ہے۔ گارڈننگ کر لی، کوکنگ کر لی۔ فننگ کر لی۔ بس تو زندگی ایسے ہی چلتی رہتی ہے۔“

”اور کچھ کسنا چاہیں گی؟“

”بس یہی کہ واپس آ کے اور یہاں کے لوگوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اس فیلڈ میں واپس آ کر اور اب انتظار کر رہی ہوں کہ کوئی بہت ہی اچھا اور چیلنجنگ رول ملے اور میں سب کو دکھا سکوں کہ میں مشکل رول بھی کر سکتی ہوں۔ اور مجھ پر سے یہ ٹیک ہٹ جائے کہ میں صرف امیر اور ماڈرن خواتین کے رول ہی کر سکتی ہوں۔ میڈیا کی ترقی دیکھ کر خوشی ہوئی بہت سارے چیلنجز دیکھ کر اچھا لگا۔ اور چھپا ہوا ٹیلنٹ اب ابھر کر سامنے آ رہا ہے۔“

”پرانے لوگوں سے ملاقات ہوئی، جیسے کاظم پاشا، لیلیٰ زہیری، آصف رضا میر صاحب؟“

”کاظم پاشا سے گزشتہ سال ملاقات ہوئی تھی، آصف رضا میر کی طرف گئی مگر ملاقات نہیں ہوئی۔ لیلیٰ زہیری سے میری بہت اچھی دوستی ہے۔ سب مل کر اچھا لگا، پرانے دن یاد آئے۔“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے خوب صورت فنکارہ عینی زیدی سے اجازت چاہی۔ اس شکریہ کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔



سرورق کی شخصیت

ماڈل ----- حمیرہ
میک اپ ----- روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر ----- موسیٰ رضا

”درمیان میں ایک بار آئی تھی مگر صرف لاہور قیام ہوا تھا۔ کراچی نہیں آ سکی تھی، اور پاکستان کو دیکھ کر بہت تکلیف سے گزرتی ہوں۔ ہمارا کراچی روشنیوں کا شہر تھا اور دور دور سے لوگ دیکھنے آتے تھے اب تو شہر اجڑا اجڑا سا لگتا ہے۔ سڑکیں خراب ہو گئی ہیں۔ ٹریفک بہت گندا ہو گیا ہے۔ بے یار و مددگار والا حساب ہو گیا ہے اس شہر کے ساتھ۔ بہت افسوس ہوا کراچی کو دیکھ کر۔“

”کچھ اپنی نجی لائف کے بارے میں بتائیں۔“

”میرے تینوں بچوں کی شادیاں ہو گئی ہیں ماشاء اللہ۔ تین بچے ہیں میرے۔ ایک بیٹا اور دو بیٹیاں۔ چھوٹی بیٹی کی شادی کو ایک ہی سال ہوا ہے۔ میری بڑی بیٹی ماہین زیدی کمپیوٹر انجینئر ہے۔ علی زیدی بھی کمپیوٹر انجینئر ہے اور چھوٹی بیٹی کامیاں چونکہ بزنس میں ہے تو وہ لاہور میں رہتی ہے۔“

”داماد کے لیے کیسی ساس ہیں اور سو کے لیے کیسی ساس ہیں؟“

”میں داماد کے لیے اور سو کے لیے بہت پسندیدہ اور چیتتی ساس ہوں۔ میرے بچے میرا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ سو بھی ماشاء اللہ بہت اچھی ہے۔ اور چونکہ میرے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے تو بیٹے کے ساتھ ہی رہتی ہوں تو ہم فرینڈ کی طرح رہتے ہیں۔ ساس سو والا ریلیشن تو ہے ہی نہیں۔ اور میرے بیٹے کو شکوہ رہتا ہے کہ میں اسے ٹائم نہیں دیتی۔ میں صبح اپنی سو کے ساتھ واک پر نکل جاتی ہوں۔ کھانا بھی اکثر باہر ہی کھاتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ جی یہ سو ہے تو اسے کھانا بھی پکاتا ہے اور ہر کام کرتا ہے۔ چونکہ وہاں تو سارا کام خود کرنا پڑتا ہے تو کبھی وہ پکالتی ہے تو کبھی میں پکالتی ہوں۔ ابھی تک تو سب کچھ بہت اچھا ہے۔ آگے فیوچر کا کچھ پتا نہیں۔ بیٹے کی شادی کو چھ سال ہو گئے ہیں اور ماشاء اللہ ایک بیٹا ہے اس کا۔“

”فارغ اوقات میں کیا کرتی ہیں؟“

اس کی وہ کیفیت 'زر تاشہ کی قبر پہ پھولوں کے ساتھ حاضری اور' اظہارِ ندامت 'نمرہ آپی نے یکسر مختلف انداز میں 'نمل' لکھا ہے۔ ہم تو اب حیران بھی نہیں ہوتے (عادی ہو گئے ہیں) 'بن مانگی دعا' بہت دلچسپ ہو گیا ہے۔ سائرہ رضا لکھتا ہے 'کچھ طویل لکھ رہی ہیں ہمارے لیے۔ پلیز آپی ماہا ملک کو واپس بلا لائیں کسی طرح بھی' آپی جان میرے پیپر زہور ہے ہیں دعاؤں کی ریکویسٹ ہے۔

ج : پیاری نمرہ! آپ کی اداسی کو محسوس کرتے ہوئے ہم نے عہد الست کی اقساط میں اضافہ کر دیا ہے۔ تنزیلہ ریاض کا ناول پڑھتے ہوئے ہمارے بھی وہی محسوسات ہوتے ہیں جو آپ کے ہیں۔ بلاشبہ ان کی تحریر میں بلا کی روانی اور توازن ہے۔ ایک لفظ بھی زائد نہیں غیر ضروری تفصیل نہیں سادہ اور دل نشین انداز سے بڑی بڑی گتھیاں سلجھاتی چلی جاتی ہیں۔

نمرہ احمد نے 'مصحف' اور 'بنت کے تے' جیسی بے مثال تحریریں لکھی ہیں اور نمل ہی نہیں ان کا ہر ناول ہی مختلف ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو ہر امتحان میں کامیابی دے۔ آمین

بشری صدیق۔ چیچہ وطنی

عہد الست کے لاسٹ پیرے نے الجھا دیا جہاں حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کا ذکر ہے 'وہاں پرندے کا نام بدبد ہے جبکہ یوسف کھوہ والا پرندہ بدبد نہیں فاختہ ہے۔ بدبد

کو تو کبھی بولتے ہوئے سنا ہی نہیں ہے 'وہ تو صرف زمین' دیوار اور درختوں میں سوراخ کرتا ہی دکھائی دیتا ہے اگر میں غلطی پر ہوں تو پلیز صحیح کر دیں۔

ج : پیاری بشری! صحیح کا شکریہ۔ ممکن ہے وہ پرندہ فاختہ ہی ہو ڈر اقصیٰ دیہاتوں میں اس طرح کی حکایتیں مشہور ہو جاتی ہیں جن کی کوئی تاریخی حقیقت نہیں ہوتی 'پرندہ خواہ فاختہ ہو یا بدبد' یہ صرف حکایت ہے محض سنی سنائی بات اس میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ بات اماں اصغری نے کہی ہے جو گاؤں میں رہنے والی ایک سادہ لوح خاتون ہیں، یہ محض گاؤں کے لوگوں کا خیال ہے اس بات کی وضاحت آگے چل کر ٹیپو کے الفاظ سے بھی ہو گئی ہے۔ جب وہ کہتا ہے۔

"سبحان اللہ اس سارے واقعہ سے ایک اور بات بھی



نادیہ خاتون



خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔

Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

نمرہ کشور۔ میلسی

ہمیں یکسر بھلا دینے والی انیسہ سلیم نے ایک بار کہا تھا۔ "تنزیلہ ریاض بہت محنت سے لکھتی ہیں۔" اور واقعی تنزیلہ آپی نے بہت جانفشانی اور لگن سے عہد الست لکھا ہے۔ اس کہانی کے پورے پورے پیرا گراف میری ڈائری کی زینت بنتے ہیں، لیکن اگلے ماہ آخری قسط.... نہیں ابھی جدائی بھی گوارا نہیں اور زارا کی مٹی کی اچانک ڈیٹھ نے حقیقت میں اداس کر دیا.... یقین نہیں آتا۔ کیونکہ یہ ایسی تحریروں کا ہی اعجاز ہوتا ہے کہ وہ کہانیاں لگتی ہی نہیں ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم خود وہ زندگی جی رہے ہوں اور تنزیلہ آپی کا انداز.... ٹیپو کی لن ترانیوں نے مسکرائے پر بری طرح مجبور کر دیا۔ نمرہ احمد ہوں اور انفرادیت نہ ہو ریڈر چونکے بنا رہ نہیں پاتا۔ اب یہی ہاشم کے انداز و اطوار.... ہم کیسے ہضم کریں آخر! ہاشم کا جواہرات سے ایکسکیوز کرنا،

واضح ہو جاتی ہے کہ پنجابی اتنی پرانی زبان ہے کہ مصر کے وہ بازار جہاں صرف عبرانی بولی اور کبھی جانی تھی وہاں پر پرندوں کو پنجابی پر پورا عبور حاصل تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ بدہد پرندہ کا حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصہ میں ذکر ہے حضرت سلیمان علیہ السلام پرندوں کی بولیاں سمجھتے تھے اور بدہد نے انہیں ملکہ سبا بلقیس کے بارے میں آکرتایا تھا۔

شبانہ عند لب۔ گوجرانوالہ

سورق کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ سب سے پہلے ”آب حیات“ پڑھا۔ عمیرہ جی آپ نے پچھلی دو اقساط بہت جاندار لیکن کچھ کچھ فلمی لکھی ہیں۔ جاندار اس طرح کہ سالار کی شادی کے بعد جس طرح آپ نے اس کے ایک ایک دن رات کا احوال لکھا اس نے ناول کی خوب صورتی کو اور بڑھا دیا۔ ان کے جھگڑے اور رومانس کو ہم نے بہت انجوائے کیا۔ امامہ کا چھوٹی چھوٹی شکایتوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا اس پر سالار کا بہت پیار اور تفصیل سے جواب دینا بہت اچھا لگا مگر سالار کا امامہ پر التفات کچھ خاص اچھا نہیں لگا بلکہ فلمی لگا کیونکہ اگر سالار اسے اتنی محبت دے رہا ہے تو اسے بھی جواب میں کچھ تو کرنا چاہیے تھا۔ مگر حجاب وہ تو بالکل محسوس ہی رہی۔ عمیرہ جی سالار کی کچھ سمجھ نہیں آتی کیا ایک طرف تو امامہ کے ڈاکٹرز کو پسند کرنے پر اتنا روڈ ہو جاتا ہے اسے ڈانٹ دیتا ہے تو دوسری طرف اسے سات خون بھی معاف کر دیتا ہے ایسا کیوں؟

ہے۔ اگر امامہ نے اسے بتایا کہ وہ ان ناولوں کے کرداروں میں خود کو اور جلال کو محسوس کرتی تھی تو اسے فوراً ”ٹوک دیتا کہ اسے اچھا نہیں لگتا جلال کا ذکر۔ مگر وہ تو منہ پھلا کر بیٹھے گیا اور پچاری کو جھڑک دیا اگر وہ اتنا ہی صاف گو ہے تو کھل کے بات کرنا۔ اس قسط میں امامہ کا سوال ”میں کیوں اچھی لگی نہیں؟“ میں سالار کا جواب کچھ خاص سمجھ میں نہیں آیا۔ ویسے آپ سالار کیوں نو سال امامہ کے پیچھے خوار ہوا جبکہ وہ اس کی بتائی گئی خوبیوں پر پوری بھی نہیں اترتی ہے۔ یہ صرف محبت کی وجہ سے تو نہیں ہوا پلینز جواب ضرور دیجئے گا۔

آل ٹائم مائی فیورٹ پیر کامل آج کل دن رات میرے سر ہانے رکھا رہتا ہے اب ”آب حیات“ کو پڑھنا بھی اچھا لگ رہا ہے۔

میں بھی آپ کی سائہ رضا کی طرح عمیرہ احمد کی تمام کہانیاں بالکل چوکنی بلی کی طرح پڑھتی ہوں کہ نہ جانے آگے کیا ہو جائے وہ کس کردار کو کہاں مار دیں۔ عمیرہ جی پلینز پلینز اب امامہ کو بھی سالار کی محبت میں گرفتار کر دیں۔ آخر وہ بیچارہ اس کی ہر بات مانتا ہے۔

اس کے بعد نمبر احمد کا ”نمل“ پڑھا۔ زمر کے حالات جان کر دل بہت دکھا اور اس کے ساتھ ہم روئے۔ اس بیچاری کو ناکردہ گناہ کی سزا ملی۔ آخر اس نے کسی کا کیا لگاڑا تھا۔ فارس بھی مفت میں پھنسا۔ خدا غارت کرے ہاشم کو جس نے اپنا گناہ چھپانے کے لیے ان دونوں کو پھنسا دیا۔ زمر کو عمر بھر کا روگی بنا دیا۔ خدا پوچھے گا بیگم جواہرات کو۔ آخر عہد الست بھی اپنے اختتام کو پہنچ رہا ہے۔ تنزیلہ جی یقیناً آپ بہت زیادہ تعریف کی مستحق ہیں۔

باقی ناول اور ناولٹ بھی اچھے تھے۔ شہریار منور سے ملاقات اور حنا الطاف سے باتیں اچھی رہیں۔ مستقل سلسلوں میں مجھے رنگارنگ سلسلہ خبریں و بریں اور نفسیاتی الجھنیں بہت پسند ہیں۔ باقی ہمارے نام کی تو کیا ہی بات ہے۔

ج : پیاری شبانہ! بہت دلچسپ خط لکھا ہے آپ نے، لیکن سلسلہ وار کہانیوں کے علاوہ اور کسی تحریر پر کوئی تبصرہ نہیں، صرف ایک سطر میں نمشا دیا۔ ”آب حیات“ کے بارے میں آپ کے تمام سوالات کے جوابات اگلی اقساط میں مل جائیں گے۔

ربیعہ مظہر، غزالہ غفور۔ گجرات، گاؤں جوڑا

خواتین ڈائجسٹ سے رشتہ بہت ہی پرانا ہے اگر بتانے لگوں۔ تو بس ”عہد الست“، ”نمل“، ”آب حیات“، ”بن مانگی دعا“ یہ سب ناول میرے اوپر سحر ساطاری ہو جاتا ہے ان کو پڑھنے کے بعد جو سکون ملتا ہے۔ وہ بیان نہیں۔ باقی بھی تمام سلسلے اے دن ہیں پلینز کوئی قاری بہن بتائے گی کہ ایک کہانی تھی۔ جس کے کرداروں کے نام موسیٰ خیل اور عیسیٰ خیل تھے۔ اس کا نام اور یہ کب شائع ہوئی تھی اگر کسی کو پتا ہے تو پلینز بتا دیں۔

ج : پیاری غزالہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ اگر کسی قاری بہن کو کہانی کے بارے میں معلوم ہو تو ہمیں لکھ دیں۔ ہم ان کا خط شائع کر دیں گے۔

رخسانہ عبدالستار۔ گوجرانوالہ مغل چک کلاں

سب سے پہلے تو عمیرہ احمد زندہ یاد۔ کیا بات ہے ان کی تحریر کی۔ عمیرہ احمد سے میری گزارش ہے کہ وہ سالار سکندر اور امامہ ہاشم کو علیحدہ نہ کریں بڑی مشکل سے نو سال بعد ملے ہیں۔ نمرہ احمد بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ نمل بہت اچھا جا رہا ہے۔ نمرہ احمد کا جنت کے پتے اور قراقرم کا تاج نمل بہت زبردست تحریریں ہیں آپ نے کہا تھا کہ نمرہ احمد اور عمیرہ احمد دونوں جہنیں نہیں ہیں۔ لیکن میں تو پیشن گوئی کرتی ہوں کہ یہ دونوں اشفاق احمد کی بیٹیاں ہیں کیونکہ ایسی تحریریں لکھنا ورثے میں ملتا ہے۔

ج : پیاری رخسانہ! نمرہ احمد اور عمیرہ احمد میں کوئی رشتہ نہیں ہے اور نہ ہی ان کا اشفاق احمد سے کوئی رشتہ ہے۔ اشفاق احمد صاحب کی تو کوئی بیٹی ہی نہیں ہے ان کے چار بیٹے ہیں۔

ثانیہ یعقوب۔ کبیر والہ

میں سات سال سے خواتین ڈائجسٹ کی خاموش قاری ہوں۔ یہ ڈائجسٹ مجھے دیوانگی کی حد تک اچھا لگتا ہے۔ اس کے تمام سلسلے بہت اچھے ہیں۔ سائرہ رضا، سمیرا حمید اور نمرہ احمد کی تحریریں مجھے بہت متاثر کرتی ہیں۔ نمرہ احمد کا ناول نمل بہت اچھا ہے۔ سعدی اور زمر نے تو ہمیں اپنے حصار میں قید کر لیا ہے۔ عفت سحر جی کا بن مانگی دعا بھی بہت اچھا چل رہا ہے۔

ج : پیاری ثانیہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تمہارے دل سے شکریہ۔

صبا منظور۔ وہ پال پور

مجھے امید ہے اگلی قسط میں زمر پھوپھو اور فارس ماموں کی شادی ہو جائے گی۔ شہر محبت کا موضوع برانا تھا۔ عہد الست میں جو مسلم کنٹرول کے بارے میں کہا، وہ اسلام فوبیا کے نام سے ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے۔

ج : جی صبا! پورا یورپ اس وقت اسلام فوبیا میں مبتلا ہے۔ کیونکہ ان کا میڈیا ایک مقصد کے تحت اس کو پھیلا رہا ہے اور ساری دنیا جانتی ہے کہ میڈیا پر یہودیوں کا کنٹرول ہے۔

ماروی مہوش۔ گوجرانوالہ

نایاب جیلانی کہاں غائب ہیں۔ آپ ان سے کوئی فنڈاٹک ناول لکھوائیں۔ آپ حیات بہت ہی اچھا جا رہا ہے۔ نمل کی یہ قسط بھی جان دار تھی۔

ج : پیاری ماروی! نایاب جیلانی جلد ہی لکھیں گی۔

روشنی۔ عارف والا

خواتین ڈائجسٹ کی جان آب حیات ناول ہے۔ اور میری موسٹ فیورٹ سائرہ رضا کیوں غیر حاضر ہیں۔

ج : پیاری روشنی! سائرہ رضا ناول لکھ رہی ہیں۔ ان شاء اللہ آئندہ ماہ شامل ہو گا۔

نگہت نورین۔ سیالکوٹ

آج چھ فردری ہے۔ خواتین نہیں آیا کچھ کریں۔ شعاع، خواتین دونوں جلدی اور اکٹھے شائع کیا کریں۔ آج ڈائجسٹ نہیں آیا۔ سوچا خط کی ایک نئی روایت لکھوں۔ آخر کیا ہو گا سفینہ بیگم کا رویہ۔ دیکھئے محض اگلے دن کیا ہو گا نور محمد کے لیے؟ کیا امامہ کو اس کا بھائی ملے گا؟ زمر دل لینے پر اتر آئی ہے۔ کیا وہ خود کو گناہ گار کر لے گی۔ کسی کا خون کسی کے سر۔ کیا ہو گا اب آدم و حوا کے امانت اور سالار کے ساتھ۔ دیکھئے کل صبح تین بجے صرف خواتین ڈائجسٹ میں۔ خواتین، خواتین، خواتین جیسا کوئی نہیں (نقل کرنے پر ہم نمبروں ہیں)

7 فردری۔ اگلادان۔

خواتین آگیا۔ کالج سے آئی کال کی اور کانوں کو کچھ دیر سکون آیا۔ بھاگم بھاگم سائیکل پر گئی۔ جی ہاں میں سائیکل چلاتی ہوں۔ خواتین پکڑا اور گھر آکر جلدی جلدی ابیہا۔

مگر یہ کیا اچھیلی قسط میں اتنا ڈرایا اور اب ایک دم سب کچھ کافور ہو گیا ایک طرف معینز کچھ سمجھتا ہے دوسری طرف کچھ۔ یہ آخر ہو کیا رہا ہے۔ مصنفہ شاید خود ہی کردار کی نفسیات کو سمجھ نہیں سکیں۔ خیر جو بھی ہے۔ ٹھیک ہی تھی قسط۔ عہد الست اتنی تھوڑی قسط۔ اس قسط نے کچھ گڑبڑ دیا۔ ویسے یہ خضر الہی کا کیا چکر ہے اور اتنی جلدی آخری قسط۔ سلمان حیدر ہی میپو ہے۔ یہ کیا؟ خیر آخری قسط میں پتا چلے گا۔ ”آب حیات“ میں بیت العنکبوت شروع ہو چکا ہے۔ دیکھئے آگے کیا جو نکانے والی خبر ہے؟ نمل

بیسٹ رہی یہ قسط! ویل ڈن مگر اس دفعہ کوئی نام ہی نہیں ہے قسط کا۔۔۔ اور شروع میں کوئی نظم بھی نہیں۔۔۔؟ افسوس سب ہی ٹھیک تھے۔ ایمل رضا اچھا اضافہ تھا۔ ویل ڈن۔۔۔؟ حیا بخاری کچھ خاص پسند نہ آئیں۔ عتیقہ ملک بھی بس نارمل ہی تھیں۔ ویسے ایک بہن نے پوچھا سیالکوٹ کی ہی تھی یہ ”تیسرا دروازہ“ اور اک کھڑکی کھلی ہے ابھی مگر کھول کون رہا ہے ”بن مانگی“ کو کتنی مانگ رہ گئی ہے؟ آپ سب کچھ چھپا جاتی ہیں۔ ہمارا انداز کیسا لگا ضرور بتائیے گا۔

ج : پیاری نگہت! ہمیں بخوبی اندازہ ہے کہ ہماری قارئین خواتین ڈائجسٹ سے کتنی محبت کرتی ہیں، کتنی بے چینی سے اس کا انتظار کرتی ہیں اور پرچالٹ ہو جائے تو انہیں کتنی کوفت ہوتی ہے۔ ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ ہم اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔

نمرہ کی قسط میں اس بار کوئی نام نہیں تھا اور نہ ہی نظم تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ پچھلے عنوان ”قریب کار“ کا ہی تسلسل تھا۔ ”بن مانگی دعا“ کی چند ہی اقساط باقی ہیں، صحیح اس لیے نہیں بتا سکتے آخری اقساط میں کہانی سمیٹتے ہوئے اقساط میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

تزیلہ کا ناول ابھی ختم نہیں ہو رہا، وجہ وہی ہے کہ بہت سے واقعات کی وضاحت ابھی باقی ہے۔

ہم اپنی قارئین سے کچھ نہیں چھپاتے لیکن جب تک کوئی بات حتمی نہ ہو۔ اسے قارئین کو بتانا بھی مناسب نہیں سمجھتے۔ بس اتنی سی بات ہے۔ خط آپ نے بہت اچھے انداز سے لکھا ہے۔ پڑھ کر مزا آیا۔

سعدیہ، سائرہ، حنا اور عظمیٰ۔۔۔ سرگودھا

باجی ہم آپ کے نئے نئے قاری ہیں۔ بالکل نئے نمور

خواتین چار ماہ سے لے رہے ہیں اور وجہ باجی نمرہ احمد کا نمل ہے۔ فری پریڈ میں جو کہ فرسٹ ایئر میں ہر وقت ہوتا ہے۔ عظمیٰ نے کسی لڑکی سے لے کر نمل پڑھا اور ہمیں سنایا۔ اتنا اچھا گھریلو سسپنس۔ ہائے اتنا مزہ آیا۔ آج تک ہم نے کوئی رسالہ نہیں پڑھا تھا۔ اب ہم ہر ماہ لیتے ہیں۔ ہم بس سلسلے وار کہانیاں پڑھتے ہیں۔ اس میں ذرا رائٹر کھل کر کہانی کی انوائمنٹ

بناتا ہے۔ عہد الست کے کئی پیرا گراف تو ہم دو دو دفعہ پڑھتے ہیں۔ بہت پسند ہے۔ نیا ناول آب حیات سمجھ میں نہیں آیا۔ شاید وہ پرانی کسی اسٹوری کا سلسلہ ہے۔ پلیز عدنان ملک اور ”چپ رہو“ کے عمیر کا انٹرویو دیں اور پلیز پلیز ہم سب کی فرمائش پر باجی نمرہ احمد کا بھی انٹرویو دیں۔ بے شک تصور کے بغیر ہو اور اس میں دیں جس میں چھوٹے چھوٹے 95 - 96 سوال ہوتے ہیں۔ ایک کنفیوژن امامہ یا امامہ عہد الست اور آب حیات کے کردار دونوں بہت ملتے ہیں۔ یعنی کہ رونا اور رونا۔

ج : سعدیہ، سائرہ، حنا اور عظمیٰ، خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔

”آب حیات“ یہ نومبر میں شروع کیا گیا تھا۔ تب ہی ہم نے پیر کامل کا خلاصہ بھی لکھا تھا آپ چار ماہ سے پڑھ رہی ہیں۔ آپ کے پاس نومبر کا پرچہ ہو گا اس میں سے پڑھ لیں، عمیرہ احمد کے ناول، پیر کامل کا تسلسل ہے۔ امامہ اور سالار پیر کامل کے بنیادی کردار ہیں۔ امامہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق ہے، وہ ختم رسالت پر کامل یقین رکھتی ہے جبکہ اس کے گھروالے اس پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ عشق رسول اور ایمان کامل کے لیے امامہ نے اپنا گھر چھوڑ دیا، اس کے لیے اس نے سالار کی مدد حاصل کی سالار اس وقت ایک بے راہ رو نوجوان تھا۔ اس نے محض ایک تھل کے لیے امامہ کی مدد کی۔ امامہ اور سالار نو سال تک ایک دوسرے سے نہ مل سکے۔ اس دوران سالار پر اللہ تعالیٰ کا کرم ہوا اور اسے ہدایت کی روشنی نصیب ہوئی تو اسے امامہ کی قدر و قیمت کا احساس ہوا، وہ امامہ کو تلاش کرتا رہا اور معجزاتی طور پر ایسے اتفاق رونما ہوئے کہ امامہ دوبارہ اس کی زندگی میں آگئی۔ اب ان دونوں نے باقاعدہ ازدواجی زندگی کا آغاز کیا ہے جو ”آب حیات“ میں آپ پڑھ رہی ہیں۔

امامہ اور امامہ دوبالکل مختلف کردار ہیں۔ صرف رونے

کی وجہ سے دونوں کو ملنا نادرست نہیں۔

احمد یار پھانک۔۔۔ آرائیاں والا تحصیل وزیر آباد

ادارے کو خط لکھنے کا مقصد، ناولٹ ”مرگ وفا“ مصنفہ نبیلہ رمضان شمارہ جنوری 2015ء میں دی گئی غلط معلومات کی تصحیح کرنا ہے۔

ناولٹ متذکرہ بالا میں ایک افریقی سانپ ”مبا“ کا ذکر اس انداز سے کیا گیا ہے جیسا کہ ”مبا“ اور ”کورا“ دونوں نام ایک ہی سانپ کے ہیں۔ حالانکہ حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے۔

”مبا“ اور ”کورا“ دونوں الگ الگ اقسام کے سانپ ہیں۔ ”مبا“ جسے ”بلیک مامبا“ کہا جاتا ہے ایک انتہائی خطرناک افریقی سانپ ہے جو کہ براعظم افریقہ میں پایا جاتا ہے اور کورا سے زیادہ خطرناک ثابت ہوا ہے۔

جبکہ کورا جسے ”کنگ کورا“ بھی کہا جاتا ہے ایک ایشیائی سانپ ہے اور اس کا مسکن بطور خاص ہندوستان (بشمول پاکستان) کا علاقہ ہے۔ ناولٹ متذکرہ میں ”مبا“ اور ”کورا“ کا جس انداز سے تذکرہ کیا گیا ہے اس سے قارئین کی معلومات میں اضافہ ہونے کے بجائے غلط سمت میں راہنمائی ہوئی ہے۔

ج : سانپوں کی اقسام کہانی کا موضوع نہیں تھیں۔ اور نہ ہی یہ سانپوں کے بارے میں کوئی مضمون تھا۔ بہر حال آپ نے اتنے غور سے ناولٹ پڑھا اور خط لکھ کر تصحیح فرمائی اس کے لیے بہت شکریہ۔

فاطمہ علی ساگر۔ گوجرانوالہ

میرا خواتین ڈائجسٹ سے رشتہ اتنا پرانا نہیں (بس پچھلے آٹھ سال سے میں اس کی قاری ہوں) بابا ہاشادی کے آٹھ سال بعد میں نے اپنی دوست سے خواتین ڈائجسٹ لے کر پڑھا پھر تو مت پوچھیں میں اس کی دیوانی ہو گئی۔ سب سے پہلے کرن کرن روشنی مجھے بہت پسند ہے کیا غزلیں، نظمیں، شعرو شاعری نفسیاتی مسائل سب بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ آپ کی ساری رائےز تو کمال کی ہیں مگر جو بات رخسانہ نگار۔ نمرہ احمد، عفت سحر طاہر، تنزیلہ ریاض، عمیرہ احمد میں ہے۔ وہ دوسروں میں کہاں۔ بیوٹی بکس میں بچوں کے مسائل کے بارے میں بھی بتائیں۔

ج : پیاری فاطمہ! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ نے متعدد خطوط لکھے جو شائع نہیں ہوئے تو آپ نے مایوس ہو

کر خط لکھنا ہی چھوڑ دیا۔ اور تین سال تک ہم پرچے کے بارے میں آپ کی رائے سے محروم رہے۔ ہم پہلے بھی کئی بار بتا چکے ہیں کہ خط شائع ہوں یا نہ ہوں ہم تمام خط پوری توجہ اور دلچسپی سے پڑھتے ہیں کیونکہ ہمارے لیے ہماری

قارئین کی رائے بہت اہم ہے۔ آپ کی فرمائش ضرور پوری کریں گے۔ تھوڑا انتظار کر لیں۔

ام دعا۔ میرپور آزاد کشمیر

”آب حیات“ میں اس دفعہ اصلی سالار سکندر دیکھنے کو ملا وہی زچ کر دینے والا، شرارتی اور نہ دینے والا! اور امامہ سے اس کی محبت بے حد اچھی لگی ”امامہ“ اس امامہ سے بے حد مختلف جو ”پیر کامل“ کا حصہ تھی! وہ امامہ جس نے حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنا گھر والدین، آرام، آسائشیں سب چھوڑ دیں۔۔۔ اتنی بڑی بڑی آزمائشوں سے گزر کر چھوٹی چھوٹی الجھنیں کیونکر پال لیں؟ (خیر ایسے بھی ہوتا ہے کہ جو لوگ بڑی آزمائشوں سے گزر جاتے ہیں ہمت سے وہ چھوٹی مشکلوں میں بعض اوقات زیادہ الجھتے اور ہنستے ہیں) ”کمل“ کی قسط کافی جان دار رہی۔۔۔ مجھے شروع میں ہاشم کاردار کا کردار سب سے مضبوط اور اچھا لگا مگر پھر ہر گزرتی قسط کے ساتھ ہاشم کچھ اچھا نہیں لگا مگر چونکہ ہاشم کاردار نمرہ کافیورٹ کردار ہے سو دوبارہ ہاشم کو جج کر رہے ہیں کہ کیا ہو گا؟ اور یہ کیونکر نمرہ کافیورٹ کردار ہے اور عہد الست انتہائی میچور تحریر! سمجھانے کا انداز بہترین۔۔۔ لیکن یہ قسط ذرا سی کنفیوزنگ لگی کہ ہر کردار، ایک دوسرے سے جڑا ہوا لگ رہا تھا۔۔۔ اور کچھ سمجھ نہ آیا کہ کون کیا ہے۔۔۔ (بابا) خیر آخری قسط میں واضح ہو جائے گا۔ یہ تین ستارے ”عمیرہ“ نمرہ“ اور ”تنزیلہ“ ذہانت کی روشنی سے جگمگ کرتے ہیں۔ ”قلم“ کا صحیح استعمال ہر کسی کے بس میں نہیں۔۔۔ یہ تو خاص لوگ ہوتے ہیں جن کو اللہ چننا ہے ان پر بہت ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ان کے الفاظ میں اثر ہوتا ہے جو رب تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اور ”اثر“ ہر کسی کے قلم میں نہیں ہو سکتا!

ج : ام دعا! آپ نے بالکل صحیح لکھا، قلم کار پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے الفاظ میں تاثیر اللہ کے کرم سے ہوتی ہے اور صحیح سمت کی جانب راہنمائی کرنے کی توفیق اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہے۔

عظمیٰ شفیق۔ جڑانوالہ

یہ ثریا باجی ہیں ”ہماری لنگوٹی“ بے ساختہ ہنسی کا فوارہ چھوٹ گیا جی ہاں حیا بخاری کا ناولٹ پڑھتے ہوئے۔

کزن بھی نہیں، تایا زاد تھیں۔ تینوں کی شادی ہوئی تو ایک کزن لندن، دوسری دہلی اور خود ہیروئن ملتان چلی گئی۔ ہیروئن کو یہ غلط فہمی تھی کہ وہ اپنے جس کزن سے محبت کرتی ہے۔ وہ اس کی دوسری کزن کو پسند کرتا ہے جبکہ ایسا نہیں تھا ہیرو ہما یعنی ہیروئن کو ہی پسند کرتا تھا پلینز اس ناول کا نام بتادیں۔

سبرینہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ ہمیں کہانی کا نام یاد نہیں۔ ممکن ہے کسی قاری بہن کو یاد ہو، اگر کسی نے ہمیں خط لکھا تو ہم شائع کر دیں گے۔

قارئین متوجہ ہوں!

1- خواتین ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔

3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، تا قائل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7- خواتین ڈائجسٹ کے لیے افسانے، ناول یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر جبری کروائیں۔

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

بہت ہی منفرد سناولت تھا۔ عبور کا مطلب کیا ہے؟ مسکرائی ہے زندگی کچھ متاثر نہ کر سکا۔ البتہ ناول میں جو اشعار تھے اچھے لگے۔ راؤ سمیرا ایاز کا ناول قدرے بورنگ تھا پڑھ کے لگا ٹائم ضائع کیا۔ مکمل فاطمہ کا افسانہ عمدہ تھا بس تمکاش مجھے بھی مریم جیسی ہی ہو ملے آج سے بیس سال بعد۔ ابھی بیٹے پانچ سال کے ہیں مجھے نمبر احمد سے کہتا ہے وہ ایک قسط کا مکمل ناول بھی لکھیں پلینز پلینز۔

ج : پیاری عظمیٰ! آپ نے خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ حیات بخاری تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ عتیقہ ملک اور راؤ سمیرا ایاز کے ناول آپ کو متاثر نہ کر سکے۔

اچھی ہونے کی دعا کچھ قبل از وقت ہے لیکن ہم آپ کی دعا پر آمین کہتے ہیں۔

عبور کے معنی ہیں غور و فکر، توجہ نصیحت۔

فریدہ لاکھو، سائرہ لاکھو۔ نواب شاہ

سب سے پہلے بن مانگی دعا کی قسط پڑھی۔ پھر نمل پڑھا، واہ نمرو جی! نمل کی خاص بات یہ ہے کہ ہر کرکٹر جان دار ہے۔ تنزیلہ ریاض کا عہد الست کا یہ جملہ دنیا کے ساتھ وہ مت کیجئے گا جو ابلیس نے آپ کے ساتھ کیا۔ آج تک نہیں بھولی۔

ج : بہت شکریہ فریدہ اور سائرہ۔

آصفہ عائشہ۔ کمالیہ

اس ماہ کے شمارے میں کوئی خاص اسٹوری نہیں تھی۔ نایاب جیلانی کیوں نہیں لکھ رہی ہیں۔ پلینز آشان خان کا انٹرویو شائع کریں۔

ج : نایاب جیلانی جلد لکھیں گی۔ آشان کے انٹرویو کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچائی جا رہی ہے۔

سبرینہ اعجاز۔ کراچی

خواتین بہت شان دار تھا افسانے، ناول سب بیسٹ تھے۔ مجھے ایک ناول کا نام جانتا ہے بہت پہلے پڑھا تھا۔ اس میں ہیروئن کا نام ہما تھا اس کی دود ستیں تھیں جو

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادا خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رجول ماہنامہ شعل اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق اداں محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نوعیت میں ڈراما، ڈرامائی، تھیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشرس تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت دیگر اداں قائل ہمارے حق رکھتا ہے۔

زینب جیل کی سہ باتیں

شاہین رشید

- 1 "اصلی نام؟" میرے لیے لازمی ہوتا ہے۔
- 2 "زینب جیل۔" 14 "مادری زبان؟" "پنجابی۔"
- 3 "تاریخ پیدائش / شہر؟" 15 "بات جو بری لگتی ہے؟" "اگر کوئی مس میجنٹ کرے۔"
- 4 "اشار / قد؟" 16 "پاکستان کا کون سا قانون برا لگتا ہے؟" "30 مارچ 1990ء / گوجرانوالہ۔"
- 5 "Pices / 5 فٹ 7 انچ۔" 17 "تہوار جو شوق سے مناتی ہیں؟" "ہماں تو جی جس کی لائٹھی اس کی بھینس والی بات ہے۔"
- 6 "بسن بھائی / آپ کا نمبر؟" 18 "کیا آپ جسمانی طور پر مکمل انسان ہیں؟" "چار بسن بھائی ایک بھائی دو بھینس اور میں گھر میں بڑی ہوں۔"
- 7 "شوہر میں آمد؟" 19 "تعلیمی قابلیت؟" "بیچلر۔"
- 8 "شوہر کی تھی" "جیو" میں تو خبرناک کے لیے آفر آگئی۔
- 9 "شوہر / پسند؟" 20 "کس دن کاشدیت سے انتظار رہتا ہے؟" "جب میرا کوئی پروجیکٹ آن ایر ہو یا نیا پروجیکٹ شروع ہوتا ہے۔"
- 10 "ابھی تو کوئی ارادہ نہیں اور پسندتا پسند کی بات نہیں ہو" 21 "تھکن میں کیفیت؟" "بہت ست ہو جاتی ہوں اور کہیں نہیں جاتی۔"
- 11 "پہلا پروگرام / وجہ شہرت؟" 22 "کب معذرت کر لیتی ہوں؟" "پہلا پروگرام / وجہ شہرت؟" "خبرناک تھا۔ یہی پروگرام وجہ شہرت بنا اور" آپ کی کینز۔"
- 12 "شوہر کی لائف؟" 23 "طبیعت میں ضد ہے؟" "جب کہیں جانے کا موڈ نہ ہو اور بہت تھکن ہو تب۔"
- 13 "بہت اچھی ہے۔ ہر شعبے کی طرح اچھائیاں برائیاں ہیں۔" 24 "نہیں ضد نہیں ہے۔ لیکن اگر کسی کام سے انکار کر دوں تو بس وہ انکار ہی ہوتا ہے۔"
- 14 "صبح کب اٹھتی ہیں؟" 25 "غصے میں رد عمل؟" "جینتی ہوں۔"
- 15 "کام۔ جانا ہو تو چھ سے سات کے درمیان اٹھ جاتی ہوں۔" 26 "مردوں کی کوئی اچھی اور بری بات؟" "ایمان داری اچھی لگتی ہے اور جھوٹ بولنا برا لگتا۔"
- 16 "صبح ناشتہ کرنے کا دل چاہتا ہے یا پانی پینے کا؟" "میرا تو دل ناشتہ کرنے کو چاہتا ہے چائے اور ناشتہ۔"



27 "کوئی لڑکا مسلسل گھورے تو؟"

"میں کنفیوز ہو جاتی ہوں۔"

28 "انعامی بانڈ لینے کا شوق ہے؟"

"نہیں بالکل بھی نہیں۔"

29 "گھر میں کس سے ڈرتی ہیں؟"

"کسی سے نہیں۔ گھر کی بڑی ہوں اور والدین تو میری جان ہیں۔"

30 "کیا وقت سے پہلے ملا؟"

"نہیں جی.... سب کچھ وقت پر ہی مل رہا ہے۔"

31 "محبت کے معاملے میں کیسی ہیں؟"

"بہت کھل کر کرتی ہوں۔ پہلے نہیں کر پاتی تھی۔"

32 "کس ملک کا پاسپورٹ لینا چاہتی ہیں؟"

"امریکہ اور سویٹزرلینڈ۔"

33 "ونڈو شاپنگ کا شوق ہے؟"

"نہیں میں ونڈو شاپنگ نہیں کرتی۔ سچ شاپنگ کرتی ہوں۔"

34 "شاپنگ میں پہلی ترجیح؟"

"پرفیوم پھر کچھ اور۔"

35 "فراخ دل ہیں؟"

"جی بالکل کنجوس بالکل بھی نہیں ہوں۔ اگر دوستوں کے ساتھ کہیں کھانا کھانے جاؤں تو کوشش ہوتی ہے کہ بل میں ہی دوں۔"

36 "تحفے میں آپ کی ترجیح؟"

"پرفیوم.... مجھے اس سے بہتر کوئی تحفہ نہیں لگتا۔"

37 "ایک پسندیدہ شخصیت جس کے ساتھ ایک شام گزارنا چاہتی ہیں؟"

"سلیمان خان۔"

38 "کب موڈ پر خوش گوار اثر ہوتا ہے؟"

"جب میرا کوئی رکابو اکام شروع ہو جائے۔"

39 "پسندیدہ پروفیشن؟"

"ایکٹنگ.... اداکاری سے بہتر کچھ نہیں۔"

40 "بستر کب چھوڑتی ہیں؟"

"اگر لیٹ ہو جاؤں تو چھلانگ مار کر اٹھ جاتی ہوں۔ ورنہ آرام کرتی رہتی ہوں کہ ابھی اٹھ جاتی ہوں۔"

41 "چاہت کس میں ہوتی ہے۔ اپنے لوگوں میں یا؟"

"صرف اور صرف اپنے لوگ۔"

42 "چھٹی کہاں گزارتی ہیں؟"

"صرف اپنے گھر میں.... گھر سے بڑھ کر کوئی جگہ ہو ہی نہیں سکتی۔"

43 "لباس میں کیا پسند ہے؟"

"جو آرام دہ ہو گھر میں تو ٹراؤزر اور شرٹ میں ہوتی ہوں۔"

44 "ایک لفظ میں اپنی شخصیت کی وضاحت کریں؟"

"ڈریمر (Dreamer) (خوابوں میں رہنے والی)۔"

45 "مرد حسین ہونا چاہیے یا ذہین؟"

"ذہین۔"

46 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"

"اپنے کمرے میں۔"

47 ”کس کے ایس ایم ایس کے جواب جلدی دیتی ہیں؟“

”سب کے۔۔۔ میں کسی کو ناراض نہیں کرنا چاہتی۔“

48 ”فارغ اوقات میں کیا کرتی ہیں؟“

”ایکسر سائز۔“

49 ”کسی کو فون نمبر دے کر پچھتاؤں؟“

”نہیں۔۔۔ لیکن کوئی تنگ کرے تو اسے ہلاک کر دیتی ہوں۔“

50 ”مہمانوں کی آمد؟“

”مجھے اچھی نہیں لگتی۔“

51 ”چیزیں جو جمع کرتی ہیں؟“

”پرفیومز۔“

52 ”اگر اس ملک کی وزیراعظم ہو جائیں تو؟“

”اچھی بات ہے۔۔۔ خوش ہو جاؤں گی۔“

53 ”صحیحہ خوبروی لگتی ہے؟“

”جس کے پیچھے کوئی ایسا مقصد ہو جو میرے لیے برا ہو۔

ورنہ صحیحہ تو مجھے پسند ہیں۔“

54 ”انسان کی زندگی کا سب سے اچھا دور؟“

”میرا خیال ہے کہ جب انسان اپنے پروفیشن میں پیک

(بلندی) پر ہو۔“

55 ”کن پر بہت خرچ کرتی ہیں؟“

”اپنے گھر والوں پر۔“

56 ”اپنی کمائی سے منگی چیز کیا خریدی؟“

”کچھ عرصہ پہلے اپنے لیے گاڑی خریدی ہے۔“

57 ”کھانا کہاں کھانا پسند کرتی ہیں۔ اپنا بیڈ ڈائننگ

ٹیمبل یا چٹائی؟“

”ڈائننگ ٹیمبل۔۔۔ نہ چٹائی نہ بیڈ۔“

58 ”ہاتھ سے کھانا کھاتی ہیں یا چھری کانٹے سے؟“

”یہ تو کھانے پر منحصر ہے کہ ہاتھ سے کھانے والا ہے یا

چھری کانٹے سے۔“

60 ”انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی؟“

”کافی ہے اور سب کو ہی ہوتی ہے میرا خیال ہے۔“

61 ”کھانے دلی پسند ہیں یا بدلی؟“

”دلی۔“

62 ”کوکنگ سے لگاؤ؟“

”کوئی خاص نہیں مگر سب کچھ بنالیتی ہوں۔“

63 ”کوکنگ چینل شوق سے دیکھتی ہیں؟“

”بالکل بھی نہیں۔“

64 ”کس شخصیت کو اغوا کرنا چاہتی ہیں اور تاوان

میں کیا لینا چاہیں گی؟“

”جس کو بھی اغوا کروں گی۔ پیسے ہی مانگوں گی۔“

65 ”آپ کو فوہیا ہے؟“

”ہر جانور سے ڈر لگتا ہے ہر پرندے سے مجھے فوہیا ہے

اور میں چاہتے ہوئے بھی کنٹرول نہیں کر سکتی۔“

66 ”کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟“

”اگر سچی ہو تو اندھی ہوتی ہے۔“

67 ”دکھ کب ہوتا ہے؟“

”جب کوئی انکسور کرے تب۔“

68 ”مطالعہ کرنے کا شوق ہے؟“

”بالکل شوق ہے اور انگریزی رائٹرز کو شوق سے پڑھتی

ہوں۔“

69 ”شادی میں پسندیدہ رسم؟“

”مہندی۔ اگر مہندی نہ ہو تو پھر میں جاتی بھی نہیں۔ اگر

بہت مجبوری نہ ہو تو۔“

70 ”شادی میں کیا دننا بہتر ہے تحفہ یا کیش؟“

”میرے خیال میں کیش۔“

71 ”کس تاریخی شخصیت سے ملنے کی خواہش ہے؟“

”کسی سے نہیں۔“

72 ”اپنا فون نمبر کتنی بار تبدیل کیا؟“

”ایک ہی نمبر ہے اور بار بار نمبر تبدیل کرنا مجھے پسند بھی

نہیں۔“

73 ”کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟“

”موبائل اور پیسے۔“

74 ”آپ دوسروں سے مختلف ہیں یا؟“

بقیہ صفحہ نمبر 281



عمیرہ احمد

کچھ

آب حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کر دیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایرنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری ٹیم کی تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص سمیت اس کی ٹیم کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس ٹیم کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سرائل جاتا ہے۔

1۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون اور ادویات کے بغیر سو نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال



کرنے آئی بھی کہ اس نے اس کی ٹیلی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ ہنسی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک صرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتا دی۔ ایک اضافی لفظ کے درست بچے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد، مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی، جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔

8۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کر دی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کر دیا اور سگریٹ بنے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی اس نے اس بھی انکار کر دیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

5۔ وہ جیسے ہی گھر آیا۔ معمول کے مطابق اس کے دونوں بچے اپنا کھیل چھوڑ کر اس کے گلے آگے۔ حسب معمول اس کی بیوی نے بھی جو تیسری بار امید سے بھی اس کا پرتپاک استقبال کیا۔ وہ لان میں اپنی بیوی بچوں کو مطمئن و مسرور دیکھ کر سوچ رہا ہے کہ اگر وہ چند پیر پھاڑ کر پھینک دے تو اس کی زندگی آئندہ بھی اسی طرح خوب صورت رہ سکتی ہے۔ مگر وہ ضروری فون آجاتا ہے۔ جس کا وہ انتظار کر رہا ہے۔ اب اسے اپنی ٹیلی اور اسٹیفنی میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا تھا۔

8۔ ریڈیڈنٹ ایک انتہائی مشکل صورت حال سے دوچار تھا۔ اس کا فیصلہ کانگریس کے الیکشنز پر بری طرح اثر انداز ہو سکتا تھا۔ کیمپٹ کے چھ ممبرز کے ساتھ پانچ گھنٹے کی طویل نشست کے بعد اسے پندرہ منٹ کا وقفہ لینا پڑا تھا۔ فیصلے کی ذمہ داری اس کے سر تھی۔ آخر کار وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

10۔ الزائمر کے مریض باپ کو وہ اپنے ہاتھوں سے بخنی پلا رہا تھا۔ اس کے انداز میں اپنے باپ کے لیے نہایت پیار، احترام اور تحمل ہے۔ اس کے باپ کو معلوم نہیں کہ وہ اس کے ہاتھ سے آخری بار کھانا کھا رہا ہے۔ اس کا سامان ایر پورٹ پر جا چکا ہے اور وہ گاڑی کا انتظار کر رہا ہے۔

Q۔ وہ نیلے رنگ کی شفاف جھیل پر اس کے ہمراہ ہے۔ خوب صورت حسین مناظر میں گہری جھیل میں وہ صندل کی لکڑی کی کشتی میں سوار ہے۔

K۔ وہ تیسری منزل پر بنے اپارٹمنٹ کے بیڈ روم کی کھڑکی سے ٹیلی اسکوپ کی مدد سے ساٹھ فٹ کے فاصلے پر اس بینک کوٹ ہال پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ ٹائم نونج کروڑ منٹ ہو رہے ہیں۔ پندرہ منٹ بعد وہ مہمان بینک کوٹ ہال میں داخل ہو گا۔ وہ ایک

بروفیشنل شوٹر ہے۔ اسے مہمان کو نشانہ بنانے کے لیے ہار کیا گیا ہے۔

3۔ وہ اس سے اصرار کر رہی ہے کہ نجوی کو ہاتھ دکھایا جائے۔ وہ مسلسل انکار کرتا ہے مگر اس کی خوشی کی خاطر مان لیتا ہے۔ نجوی لڑکی کا ہاتھ دیکھ کر بتاتا ہے کہ اس کے ہاتھ پر شادی کی دو لکیریں ہیں۔ دو سری لکیر مضبوط اور خوشگوار شادی کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ دونوں ساکت رہ جاتے ہیں۔

آدمو حوا

ایک خوب صورت اتفاق نے سالار اور امامہ کو یکجا کر دیا۔ اس نے امامہ کو نو سال بعد دیکھا تھا۔ ان کی ابتدائی زندگی کا پہلا اختلاف لائٹ پر ہوا۔ سالار کو لائٹ آن کر کے سونے کی عادت تھی جبکہ امامہ کو روشنی میں نیند نہیں آتی تھی۔ لیکن سالار نے امامہ کی بات مان لی۔ صبح وہ امامہ کو جگائے بغیر سحری کر کے نماز پڑھنے چلا جاتا ہے امامہ سحری کے لیے اٹھتی ہے تو فرقان کے گھر سے کھانا آیا رکھا ہوتا ہے۔ امامہ اسے سالار کی بے اعتنائی سمجھتی ہے۔ سعیدہ اماں سے فون پر بات کرتے ہوئے وہ رو پڑتی ہے اور وجہ پوچھنے پر اس کے منہ سے نکل جاتا ہے کہ سالار کا رویہ اس کے ساتھ ٹھیک نہیں ہے۔ سعیدہ اماں کو سالار پر سخت غصہ آتا ہے۔ وہ ڈاکٹر سبط علی کو بھی بتا دیتی ہیں کہ سالار نے امامہ کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ سالار ڈاکٹر سبط علی کے گھر امامہ کا رو کھا رویہ محسوس کرتا ہے سعیدہ اماں بھی سالار کے ساتھ ناراضی سے پیش آتی ہیں۔ پھر امامہ اس رات سعیدہ اماں کے ہی گھر رہ جاتی ہے۔ سالار کو اچھا نہیں لگتا مگر وہ منع نہیں کرتا۔ امامہ کو یہ بھی برا لگتا ہے کہ اس نے ساتھ چلنے پر اصرار نہیں کیا۔ اس کو سالار سے یہ بھی شکوہ ہوتا ہے کہ اس نے اسے منہ دکھائی نہیں دی۔ سالار اپنے باپ سکندر عثمان کو بتا رہا ہے کہ اس کی شادی آمنہ نامی جس لڑکی سے ہوئی ہے وہ دراصل امامہ ہے۔ سکندر عثمان اور طیبہ سخت پریشان ہو جاتے ہیں۔ امامہ کو فرقان کے گھر روزانہ کھانا کھانے پر بھی اعتراض ہوتا ہے اور سالار کے سی نوڈ کھانے پر بھی۔ سکندر عثمان طیبہ اور انیتا ان دونوں سے ملنے آتے ہیں اور امامہ سے بہت پیار سے ملتے ہیں۔ وہ سالار کا ولیمہ اسلام آباد میں کرنے کے بجائے اب لاہور میں کرنے کا منصوبہ بناتے ہیں۔ ڈاکٹر سبط امامہ سے سالار کے ناروا سلوک کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو وہ شرمندہ سی ہو جاتی ہے کیونکہ وہ بات اتنی بڑی نہیں تھی جتنی اس نے بنا ڈالی تھی۔ سالار امامہ سے اسلام آباد چلنے کو کہتا ہے۔ تو امامہ خوف زدہ ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر سبط سالار کو سمجھاتے ہیں۔ وہ خاموشی سے سنتا ہے۔ وضاحت اور صفائی میں کچھ نہیں بولتا مگر ان کے گھر سے واپسی پر وہ امامہ سے ان شکایتوں کی وجہ پوچھتا ہے۔ وہ جواباً کہتے ہوئے وہی بتاتی ہے جو سعیدہ اماں کو بتا چکی ہے۔ سالار کو اس کے آنسو تکلیف دیتے ہیں پھر وہ اس سے معذرت کرتا ہے اور سمجھاتا ہے کہ آئندہ جو بھی شکایت ہو کسی اور سے نہ کرنا ڈائریکٹ مجھے ہی بتانا وہ اس کے ساتھ سعیدہ اماں کے گھر سے جینز کا سامان لے کر آتا ہے جو کچھ امامہ نے خود جمع کیا ہوتا ہے اور کچھ ڈاکٹر سبط نے اس کے لیے رکھا ہوتا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں کھانا روٹا ہوا ناول دیکھ کر سالار کو کوفت

ہوتی ہے اور وہ انہیں تلف کرنے کا سوچتا ہے۔ مگر امامہ کی وجہ سے رک جاتا ہے۔ سالار اپنے بینک میں امامہ کا اکاؤنٹ کھلو کر تیس لاکھ روپے اس کا حق مزاج کروا تا ہے۔ وہ امامہ کو لے کر اسلام آباد جاتا ہے اور ایرپورٹ پر اسے بتاتا ہے کہ سکندر عثمان نے منع کیا تھا۔ امامہ کو شدید غصہ آتا ہے۔ گھر پہنچنے پر سکندر عثمان اس سے شدید غصہ کرتے ہیں۔

پانچویں قسط

وہ جس شیشے سے اسے دیکھ رہی تھی وہ پھروہندا گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ سالار سے اگلا جملہ کیا کہے۔ وہ دوبارہ اپنی ای میل کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ کتاب میں امامہ کی دلچسپی مکمل طور پر ختم ہو چکی تھی۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔

ڈیپریشن کے دورے کا آغاز نئے سرے سے ہوا تھا۔ دوسرے بڈ روم کے ہاتھ روم میں آکر وہ بے مقصد اپنا دایاں ہاتھ رگڑ رگڑ کر دھوتی رہی۔ یہ احتمالہ حرکت تھی اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا، لیکن وہ اس وقت اپنی ذہنی پریشانی لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ واقعی بہت اپ سیٹ تھی۔ وہ شراب کا ایک گلاس نہیں تھا، بلکہ اس کی ازدواجی زندگی میں آنے والی پہلی کھائی تھی، پہلی اور سب سے بڑی۔ اس کے لیے یہ یقین کرنا ناممکن ہو رہا تھا کہ وہ ایسی کمپنی کے ہوتے ہوئے شراب سے مکمل اجتناب کرتا ہو گا اور شراب پینے کا کیا مطلب تھا۔؟ یہ کسی کو سمجھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بے مقصد گھر کے ہر کمرے میں پھرتی رہی۔ نیند مکمل طور پر اس کی آنکھوں سے غائب ہو گئی تھی۔

”اللہ سکون کے آسمان کو اندیشوں کی زمین کے بغیر کیوں نہیں کھڑا کرتا؟“ اس نے ٹیرس سے بے مقصد نیچے جھانکتے ہوئے سوچا تھا۔

وہ اس تاریکی اور سردی میں کتنی ہی دیر ٹیرس کی ریٹنگ کے پاس کھڑی نیچے دیکھتی رہی، اسے وقت کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔

”تم کیا کر رہی ہو یہاں؟“ اپنے عقب میں سالار کی آواز نے اس کی سوچوں کے تسلسل کو توڑا۔ وہ کمرے سے اس کی طویل عدم موجودگی کی وجہ سے اسے ڈھونڈتا ہوا وہاں آیا تھا۔

”میں۔۔۔؟“ امامہ نے چونک کر پلٹ کر اسے دیکھا۔ ”میں نیچے دیکھ رہی تھی۔“

”نیچے کیا ہے؟“ سالار نے اس کے قریب آکر نیچے جھانکا۔

”نیچے۔۔۔؟“ امامہ کو خود بھی پتا نہیں چلا کہ اس نے نیچے کیا دیکھا تھا۔

”نیچے۔۔۔؟“ کچھ بھی نہیں۔“ سالار نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ اسے غائب دماغ

کلی تھی غائب دماغ یا پھر پریشان۔

”اندر چلیں؟“ وہ کوئی جواب دینے کے بجائے اپنی شال ٹھیک کرتی ہوئی اس کے ساتھ اندر آگئی۔

”تم سو جاؤ، میں تھوڑی دیر بعد آؤں گی۔“ اس نے اندر آتے ہوئے سالار سے کہا۔

”میں کچھ درنیوی دیکھوں گی۔“ سالار ٹھٹک گیا۔

امامہ ریموٹ کنٹرول ہاتھ میں لیے اب بیوی آن کر رہی تھی۔ شادی کے بعد پہلی مرتبہ بیوی میں اتنی دلچسپی

ظاہر کر رہی تھی۔

”بیوی پر کوئی خاص پروگرام آ رہا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں ویسے ہی دیکھو کی۔“ امامہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ چلا جائے۔ وہ جانے کے بجائے ’صوفے پر اس کے برابر آکر بیٹھ گیا۔ اس نے امامہ کے ہاتھ سے ریموٹ کنٹرول لے کر لی آف کیا اور ریموٹ کنٹرول سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا۔ امامہ نے کچھ جبر ہو کر اسے دیکھا۔

”میں شراب نہیں پیتا امامہ! میں یہ پھل چکھ چکا ہوں، اس کا ذائقہ کیسا ہے، اس کا اثر کیا ہے۔ میں دونوں سے واقف ہوں، مجھے شراب میں کوئی غم ڈھونڈنا ہے، نہ کسی سرور کی تلاش ہے۔ میرے لیے یہ ان گناہوں میں سے ایک ہے جن کو میں چھوڑ چکا ہوں۔ تم ہر روز اللہ تعالیٰ سے بس یہ دعا کیا کرو کہ وہ مجھے سیدھے راستے سے نہ

بھٹکائے۔“ وہ اس سے سوال کی توقع کر رہی تھی، جواب کی نہیں۔ وہ جیسے کسی سائیکالوجسٹ کی طرح اس کا ذہن پڑھ رہا تھا۔

”اب تمہیں نیوی دیکھنا ہے تو دیکھو، ورنہ آکر سو جاؤ! گڈ نائٹ۔“

اس نے نیوی آن کرتے ہوئے امامہ کے ہاتھ میں ریموٹ کنٹرول دیا اور بیڈ روم میں چلا گیا۔ وہ اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

”انسان کو کون سی چیز بدل دیتی ہے؟ وقت؟ حالات؟ زندگی؟ تجربہ؟ تکلیف؟ تلاش؟ محبت؟۔۔۔ یا پھر اللہ؟“ اس نے نیوی آف کرتے ہوئے سوچا۔



سالار کے ساتھ اس گفتگو نے اس کے لیے بہت آسانی پیدا کر دی تھی۔ دوبارہ ڈنر پر جاتے ہوئے امامہ نے وہاں آنے والے لوگوں کو اس طرح نہیں جانچا تھا جس طرح پچھلی بار جانچا تھا۔ اس بار وہ اسے اتنے برے نہیں لگے تھے جتنے پہلی بار لگے تھے، پہلے کی طرح اسے احساس کمتری کا دورہ پڑا تھا، نہ ہی احساس برتری کا اور نہ ہی نیم عریاں لباس میں عورتوں کو دیکھ کر اس نے کسی احساس برتری کی ٹوپی پہنی تھی اور ان تعصبات کے بغیر اس کے لیے وہاں جانا قدرے آسان ہو گیا تھا۔

”تم کسی سے کوئی بات کیوں نہیں کرتیں؟“

وہ شاید چوتھا ڈنر تھا، جب واپسی پر رات کو سونے سے پہلے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد سالار نے اس سے پوچھا۔ وہ ناول پڑھتے ہوئے چونکی تھی۔

”کیسی بات؟“

”کوئی بھی بات۔۔۔؟“ وہ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”جب کوئی مجھ سے کچھ پوچھتا ہے تو میں جواب دیتی ہوں۔“

”لیکن تم بھی تو کسی سے کچھ پوچھا کرو۔“ وہ ان پارٹیز میں اس کی مسلسل خاموشی کو نوٹس کر رہا تھا۔

”کیا پوچھا کروں؟“

سالار اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔ وہ واقعی سنجیدہ تھی۔

”تم حال چال پوچھو، پھر تم قبیلے کے بارے میں پوچھ سکتی ہو، بچوں کے بارے میں بات کر سکتی ہو۔ فار گاڈ سیک

امامہ! عورتوں کو تو یہ نہیں بتانا پڑتا کہ انہیں آپس میں کیا باتیں کرنی ہے۔“ وہ اسے بتاتے بتاتے کچھ سٹپٹا گیا۔

”اچھا، میں کو شش کروں گی۔“ اس نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

”میرا یہی سوشل سرکل ہے، یہی لوگ بار بار ملیں گے تمہیں، میں ہی میں سے تمہارے دوست بنائے ہیں۔“
 ”لیکن میں نے دوست بنا کر کیا کرتا ہے؟“ اس نے دوبارہ ناول کھولتے ہوئے کہا۔ سالار نے ہاتھ بڑھا کر ناول
 اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

”کتابیں اچھی ہوتی ہیں، لیکن ایک دنیا ان کے باہر ہے، وہ بھی اچھی ہے۔“ وہ سنجیدہ تھا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتی
 رہی۔

”لوگوں سے چھپ چھپ کر بھاگ بھاگ کر اب بہت مشکل ہو گیا ہے دوبارہ ان کے ساتھ چلنا۔“ وہ خود
 بھی سمجھ نہیں پاتی کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔

”اسی لیے چاہتا ہوں کہ تم لوگوں کے ساتھ انٹرایکٹ کرو۔ اب ضرورت نہیں رہی چھپنے کی، جہاں میں تمہیں

لے کر جاتا ہوں، وہاں تم میری فیملی ہو۔ وہاں کوئی تم سے تمہاری فیملی کے بارے میں انویسٹی گیٹ نہیں کرے
 گا۔“ وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

”اچھا، میں کوشش کروں گی۔“

اس نے غیر محسوس انداز میں سالار کے ہاتھ سے کتاب لیتے ہوئے کہا۔
 ”بھابھی کے ہاں بھی جایا کرو۔“ وہ اسے نوٹین کے بارے میں کہہ رہا تھا۔

”جاتی ہوں۔“ اس نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

وہ اسے چپ چاپ کچھ دیر دیکھتا رہا۔

”اب اس طرح مت دیکھو مجھے۔“ امامہ نے اس کی نظریں اپنے چہرے پر محسوس کرتے ہوئے گردن موڑ کر

کہا۔ ”میں نے کہا ہے نامیں کوشش کروں گی۔“

وہ کچھ کہنے کے بجائے کبل کھینچتا ہوا چپ لیٹ گیا تھا۔ وہ دوبارہ کتاب پڑھنے لگی، لیکن کچھ دیر بعد اسے سالار
 کی نظریں پھر خود پر محسوس ہوئی تھیں۔

”اب کیا ہے؟“ اس نے کچھ جھنجھلا کر سالار کو دیکھا تھا۔

”کچھ نہیں۔“ امامہ نے اس کی نظروں میں کوئی بے حد عجیب سا تاثر محسوس کیا تھا۔ وہ بہت سنجیدگی سے کچھ

سوچ رہا تھا۔



عید کے دو ہفتے کے بعد اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں ان کے ولیمہ کی تقریب منعقد ہوئی تھی۔ اگر سالار کی
 ضد نہ ہوتی تو سکندر کبھی اس تقریب کے لیے اسلام آباد کا انتخاب نہ کرتے، لیکن سالار کی ضد کے سامنے سکندر
 نے بالآخر گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ سکندر کے دوسرے بچوں کے برعکس ولیمہ کی یہ تقریب خاصی سادگی سے ہوئی
 تھی۔ میوزک کا وہ اہتمام جو سکندر کے گھر کی تقریبات کا حصہ سمجھا جاتا تھا، وہ اس تقریب سے غائب تھا۔ مینواتا
 لیوش نہیں تھا، جتنا پہلے ہوتا تھا، لیکن مہمانوں کی تعداد تقریباً ”اتنی ہی تھی، جتنی عام طور پر سکندر کی تقریبات میں
 ہوا کرتی تھی۔“

دو ہزار کے قریب افراد کی موجودگی میں امامہ ”اتنی ہی غیر آرامدہ۔“ محسوس کر رہی تھی، جتنا اسے کرنا چاہیے
 تھا۔ مہمانوں کی ایک بڑی تعداد سے وہ پہلے ہی سالار کی عید ملن پارٹی اور دوسرے ڈنر میں چند دن پہلے واقف ہو
 چکی تھی۔ اب تعارف کچھ نئے طریقے سے اور دوبارہ ہو رہا تھا۔ ان کھنڈ ٹیبل ہونے کے باوجود وہ خوش تھی اور

طمانیت کا احساس لیے ہوئے تھی۔ وہ باقاعدہ طور پر سالار کی فیملی کا حصہ بن کر جیسے کسی چھت کے نیچے آگئی تھی۔ وہ ولیمہ کے بعد دو ہفتے کے لیے ہمسایہ گئے تھے پاکستان سے باہر سالار کے ساتھ امامہ کا یہ پہلا سفر تھا۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ زندگی میں دوبارہ کبھی ان پندرہ دنوں جیسے پرسکون اور بے فکری کے دن ان کی زندگی میں دوبارہ کبھی نہیں آنے والے تھے۔ وہ زندگی میں اس سے زیادہ خوب صورت جگہوں پر اس سے زیادہ سہولت کے ساتھ جاتے تب بھی زندگی کے ان دنوں کو واپس نہیں لاسکتے تھے۔ جب ان دونوں کے درمیان رشتہ نیا تھا لیکن تعلق پرانا، جب ایک دوسرے پر اعتماد زیادہ نہیں تھا، لیکن توقعات اور امیدیں بہت تھیں اور جب ان دونوں کے درمیان ابھی شکایتوں اور تلخیوں کی دیواریں کھڑی نہیں ہوئی تھیں، زندگی ایک دوسرے سے شروع ہو کر ایک دوسرے پر ہی ختم ہو رہی تھی۔

سالار کا فون انٹرنیشنل رو منگ پر تھا، لیکن دن کا زیادہ وقت وہ آف رہتا تھا۔ بینک اور اس سے متعلقہ کاموں کو

پندرہ دنوں کے لیے اس نے اپنی زندگی سے نکال دیا تھا اور ایک سیل کے آف رہنے سے ان کی زندگی میں حیران کن تبدیلی آئی تھی۔ ان کے پاس ایک دوسرے سے بات کرنے کے لیے بہت زیادہ وقت تھا اور اس وقت میں سیل فون مداخلت نہیں کر رہا تھا۔

ایک دوسرے سے کئی جانے والی ساری باتیں بے معنی تھیں، ساری باتیں بے مقصد تھیں اور ساری باتیں ”ضروری“ تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو اپنے بچپن، اپنے ماضی کے سارے قصے، ساری خوشگوار باتیں بتاتے رہے تھے جو ایسے ہی ٹریس اور resorts سے جڑی ہوئی تھیں۔

سمندر کے پانی کے اس جھیل نما حصے پر بنے بہت سے رانچز میں سے ایک پر بیٹھے، شفاف پانی میں نظر آتی مختلف قسم کی آبی مخلوق کو دیکھتے اور ایک دوسرے کو دکھاتے انہیں پتا نہیں کیا کیا یاد آتا رہتا، پھر انہیں ہنسی کے دورے پڑتے۔ بے وجہ ہنسی جس کا تعلق کسی چیز سے نہیں، صرف اس ذہنی کیفیت سے تھا جس میں وہ ان دنوں تھے۔

سالار ہمسایہ پہلے بھی دوبارہ آچکا تھا اور اس کے لیے وہ جگہ نئی نہیں تھی۔ وہ اسے لے کر ان تمام جگہوں پر جا رہا تھا، جو سی فوڈز کے لیے مشہور تھیں اور امامہ کو پہلی بار اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے کس حد تک سی فوڈ پسند ہے۔ خود اس نے سالار کے اصرار اور دباؤ کے باوجود مچھلی کے علاوہ کسی دوسری چیز کو چکھنے تک کی ہمت نہیں کی تھی۔

”ہم اپنے گھر میں اس طرح کا ایک رانچ بھی بنوائیں گے۔“

وہ اس صبح پھر لکڑی کے تختے پر آکر پانی میں ٹانگیں ڈبوئے بیٹھے تھے، جب امامہ نے کہا۔

سالار نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ ایک لمحہ کے لیے وہ اس مذاق سمجھا تھا لیکن وہ بے حد سنجیدہ، جھکی ہوئی پانی کو مٹھی میں لیے اچھال رہی تھی۔

”کس پر بنا میں گے؟“ سالار نے جیسے اسے کچھ یاد دلانے کی کوشش کی۔

”جھیل پر۔“ وہاں بلا کی سنجیدگی تھی۔

”اور جھیل کہاں سے آئے گی؟“ وہ ہکا بکا تھا۔

”وہ تم بناؤ گے نا۔“ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”اور اس جھیل میں پانی کہاں سے آئے گا؟“

امامہ نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔

”نہر کے ذریعے۔“ وہ ہنس پڑا لیکن امامہ نہیں ہنسی۔

”پانی کی نہر نکالنا دودھ کی نہر سے زیادہ مشکل ہے، سوٹ ہارٹ!“
اس نے امامہ کے کندھوں پر بازو پھیلایا۔ امامہ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

”تم نہیں بنا کر دو گے؟“ وہ سوال نہیں تھا، دھمکی تھی۔
”ہم یہاں آجایا کریں گے، بلکہ اگلے سال میں تمہیں مارشلس لے کر جاؤں گا، پھر اس سے اگلے سال“

امامہ نے اس کی بات کاٹی۔

”تم نہیں بنا کر دو گے جھیل؟“

”امامہ! جھیل کیسے بنا کر دوں میں تمہیں۔؟ ہاں، یہ ہو سکتا ہے کہ ہم کسی ایسی جگہ پر گھر بنائیں جہاں قدرتی طور پر آس پاس اس طرح جانی ہو۔“ سالار نے اسے ٹالنے کی کوشش کی تھی۔

فی الحال وہ اسے صاف لفظوں میں اس رانچ پر بیٹھ کر اپنے ہنی مون ٹرپ کے دوران اور غیر دردمانوی باتوں

کے درمیان یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ عقل سے پیدل ہے اور جاگتے میں خواب دیکھ رہی ہے اور وہ بھی احتمالہ۔

”ہاں، یہ ٹھیک ہے۔“ اس پر بروقت اثر ہوا تھا اور سالار نے جیسے اطمینان کا سانس لیا۔

”سالار، تم بہت اچھے ہو۔“ امامہ نے اب اس کا ہاتھ پیار سے پکڑتے ہوئے کہا۔

”امامہ! یہ بلیک میلنگ ہے۔“ سالار نے ہاتھ چھڑائے بغیر گہرا سانس لے کر احتجاج کیا۔ وہ اس کے جھوٹ کو اس کے گلے کی ہڈی بتا رہی تھی۔

”ہاں! ہے تو۔“ اس نے بڑے آرام سے کندھے اچکا کر ہنستے ہوئے کہا۔

وہاں باقی دن امامہ نے اس رانچ کا دوبارہ ذکر نہیں کیا تھا اور سالار نے اس پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ اسے امید تھی وہ اس رانچ کے بارے میں بھول گئی ہوگی لیکن ایسا نہیں تھا۔

واپس آنے کے چوتھے دن بعد اس نے فخریہ انداز میں سالار کو اس گھر کے نئے ڈیزائنز دکھائے تھے۔ وہ جھیل اور رانچ بھی اس کا حصہ بن چکے تھے۔ وہ اب اس پر کیا کہہ سکتا تھا۔ وہ ہنی مون اسے بہت مہنگا پڑا تھا۔ وہ دنیا کی پہلی بیوی تھی جس نے اپنے ہنی مون ٹرپ پر ایک جھیل اور رانچ کی شاپنگ کی تھی۔ اور وہ دنیا کا پہلا شوہر تھا جس نے اس شاپنگ پر اعتراض نہیں کیا تھا۔

ان کے اپارٹمنٹ کی دیوار پر اب کچھ اور تصویروں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ کچھ اور یادوں اور خوشگوار لمحوں کا۔ ان کے ولیمہ کا فوٹو شوٹ۔ بیچ کلر کے شرارے میں بلیک ڈنر سوٹ میں ملبوس سالار کے ساتھ وہ پہلی بار دلہن کے روپ میں تھی۔ وہ سالار کی فیورٹ تصویر تھی۔ اور ان کے ہنی مون کی تصویریں جس میں تقریباً ”ایک جیسی سفید ٹی شرٹس میں“ وہ ایک بیچ پر کھڑے نظر آ رہے تھے۔ ان ساری تصویروں میں صرف ایک چیز کامن تھی، ان کے چہرے اور آنکھوں میں نظر آنے والی خوشی اور جھک، ان کے ہونٹوں پر موجود مسکراہٹ جو ان تصویروں پر نظر ڈالنے والی کسی بھی پہلی نظر کو ایک لمحہ کے لیے مسکرانے پر مجبور کر دیتی تھی۔

They were made for each other

(وہ ایک دوسرے کے لیے بنے تھے)

کم از کم وہ تصویریں ہر لحاظ سے یہ ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔

زندگی آہستہ آہستہ اپنے معمول پر آرہی تھی۔ سالار واپس آنے کے بعد مصروف ہو گیا۔ وہ بینک سے تقریباً دس بجے گھر آ رہا تھا اور پہلے کی طرح گھر سے کافی کے لیے باہر نکلنے کا سلسلہ کچھ عرصے کے لیے منقطع ہو گیا تھا۔ ان کے درمیان بات چیت صبح ناشتے کی میز پر ہو رہی تھی یا رات کے کھانے کی میز پر۔ سالار کے اصرار کے باوجود وہ کھانے پر اس کا انتظار کیا کرتی تھی۔ اسے کھانے سے زیادہ اس کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے ان باتوں میں دلچسپی تھی جو وہ اس کے ساتھ کیا کرتی تھی اور سالار کو بہت جلد اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس نے بالآخر اسے اکیلے کھانا کھالینے پر مجبور کرنا چھوڑ دیا تھا۔

وہ نوشین کے ساتھ اب وقتاً فوقتاً گھر سے نکلنے لگی تھی۔ اس کی زندگی کا دائرہ اب گھر سے باہر تک بڑھنے لگا تھا اور سالار اس چیز کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ وہ واقعی چاہتا تھا کہ وہ اس کی انگلی پکڑ کر چلنا چھوڑے اور یہ تب ہی ممکن تھا اگر اسے اس کے علاوہ پکڑنے کے لیے کچھ اور ہاتھ نظر آتے۔



وہ اس دن چینل سرفنگ کر رہی تھی جب اس کی نظریں ایک چینل پر ٹھہری گئیں۔ چند لمحوں کے لیے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ اشاک مارکیٹ کے حوالے سے کوئی پروگرام تھا اور اس میں شامل دو شرکا میں سے ایک سالار بھی تھا۔ ایک لمحہ کے لیے امامہ کو یقین نہیں آیا تھا کہ وہ اسکرین پر سالار کو دیکھ رہی ہے لیکن چند لمحوں کے بعد سالار کا نام اور اس کا عمدہ اسکرین پر چند لمحوں کے لیے فلیش ہوا۔

”تو وہ مجھ سے جھوٹ بول رہا تھا۔؟“ امامہ نے اس کا عمدہ دیکھ کر سوچا۔ وہ پی آر سے منسلک نہیں تھا، لیکن اس وقت اسے اسکرین پر دیکھتے ہوئے وہ اتنی ایکسائٹڈ تھی کہ اس نے سالار کے جھوٹ اور اس کی وجوہات پر غور ہی نہیں کیا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے فنانس سے متعلق کوئی پروگرام اتنے شوق اور لگن سے دیکھا تھا۔ وہ سالار کو اکثر اسی طرح کی گفتگو فون پر کرتے سن چکی تھی اور اس نے کبھی اس پر غور بھی نہیں کیا تھا، لیکن اسکرین پر آدھا گھنٹہ اس پروگرام میں اسے سنتے اور دیکھتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہ بہت امپریشنو تھا۔ کمپوزڈ۔ کانفیڈنٹ۔ بے حد شارپ ایک مکمل پروفیشنل۔ وہ زندگی میں پہلی بار اس کی شکل و صورت اور پرسنالٹی پر غور کر رہی تھی اور پہلی بار ہی اسے احساس ہوا کہ اس کی آواز بہت اچھی ہے۔ شادی کے تقریباً دو مہینے کے بعد پہلی بار بیوی پر اپنے شوہر کو دیکھتے ہوئے وہ اس سے بری طرح متاثر ہو رہی تھی۔

سالار کسی پوسٹ لنچ میٹنگ میں تھا جب امامہ نے اسے فون کیا۔ میٹنگ تقریباً ختم ہو رہی تھی اس لیے وہ کال لیتے ہوئے بورڈ روم سے نکل گیا۔

”سالار! تم بیوی پر آئے ہو؟“ امامہ نے چھوٹے ہی اس سے کہا۔

ایک لمحے کے لیے سالار سمجھ نہیں سکا۔

”کیا؟“

”تم بیوی چینل پر آئے تھے ایک پروگرام میں اور تم نے مجھے بتایا نہیں؟“

”وہ دو ماہ پہلے ریکارڈ کیا تھا انہوں نے ریویو کیا ہو گا۔“ سالار کو یاد آ گیا۔

”تم کیا کر رہی ہو؟“ اس نے موضوع بدلا، لیکن امامہ کس حد تک اس پروگرام سے متاثر تھی اس کا اندازہ

اسے رات کو گھر آکر ہوا تھا۔

”میں نے اسے ریکارڈ کر لیا ہے۔“ وہ کھانا کھا رہے تھے جب امامہ نے اچانک اسے بتایا۔

”کے؟“ وہ چونکا کیونکہ وہ کوئی اور بات کر رہے تھے۔

”تمہارے اس پروگرام کو۔“

”اس میں ریکارڈ کرنے والی کیا بات تھی؟“ وہ حیران ہوا۔

”تمہاری بیوی پر بہت اچھے لگ رہے تھے۔“ امامہ نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے کہا۔

”اور تم انویسٹمنٹ بینکنگ میں ہو۔ لی آر میں نہیں؟“ امامہ نے اسے حتمی کیا۔

وہ مسکرایا لیکن اس نے جواباً ”اے کچھ نہیں کہا۔“

”تم نے وہ کھا ہے اپنا پروگرام؟“

سالار نے کانٹا ہاتھ سے رکھتے ہوئے اس سے کہا۔

”سوٹ ہارٹ! ایسے بہت سارے پروگرامز ہوتے ہیں جن میں ہر روز بہت سارے ایکسپرس بلائے جاتے

ہیں۔ اس میں کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے کہ اسے ریکارڈ کر کے بیوی کے ساتھ بیٹھ کر دیکھا جائے۔ اس سے

پہلے بھی میں ایسے کئی پروگرامز میں آچکا ہوں اور آئندہ بھی کہیں نہ کہیں نظر آتا رہوں گا۔ میرے بینک کی اس

سیٹ پر جو بھی بیٹھا ہو نا وہ تمہیں بزنس چھینلز یا ایسے پروگرامز میں کہیں نہ کہیں ضرور نظر آئے گا۔ یہ بھی میری

جواب کا ایک حصہ ہے۔“

وہ اس کا ہاتھ تھپک کر اب دوبارہ کانٹا اٹھا رہا تھا۔ امامہ چند لمحے کچھ نہیں بول سکی۔ اس نے جیسے ٹھنڈے پانی کا

بھرا ہوا گلاس اس پر آٹھ ملا تھا۔ اس نے اسے کچھ ایسے ہی شرمندہ کیا تھا۔

”سالار! سود حرام ہے نا؟“

وہ خود سمجھ نہیں پائی کہ اس نے سالار کی بات کے جواب میں یہ کیوں کہا۔ شاید یہ اس شرمندگی کا رد عمل تھا جو

اس نے کچھ دیر پہلے اٹھائی تھی۔

”ہاں۔“ وہ کانٹے سے کباب کا ایک ٹکڑا اٹھاتے ہوئے ”صرف ایک لمحہ کے لیے ٹھنکا تھا۔“

”بالکل اسی طرح جس طرح جھوٹ حرام ہے۔ غصہ حرام ہے۔ غیبت حرام ہے۔ بددیانتی حرام ہے۔“

منافقت حرام ہے۔ تہمت لگانا حرام ہے۔ ملاوٹ حرام ہے۔“ وہ اطمینان سے کہہ رہا تھا۔

”میں ان چیزوں کی بات نہیں کر رہی۔“ امامہ نے اس کی بات کاٹی ”اس نے جواباً امامہ کی بات کاٹی۔“

”کیوں۔ کیا ان ساری چیزوں سے انسان اور معاشرے کو کم نقصان پہنچتا ہے؟“

امامہ کو جواب نہیں سوجھا۔

وہ صرف ٹی وی کے پروگرام میں بیٹھا ایسی گفتگو کرتا امپریو لگ رہا تھا ”حقیقی زندگی میں اس طرح کا جواب ہوتا“

کچھ زیادہ خوش گوار تجربہ نہیں تھا امامہ کے لیے۔

”تم جسٹشی فائی کر رہے ہو سود کو۔؟“ اس نے بالآخر کہا۔

”نہیں میں جسٹشی فائی نہیں کر رہا۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ ہم ”جز“ کو ”کل“ سے الگ نہیں کر سکتے۔“

اسلامی معاشرے کو سود اتنا نقصان نہیں پہنچا رہا جتنا دوسری خرابیاں۔ ”وہ اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔“

”میں اگر پاکستانی معاشرے میں پائی جانے والی پانچ خرابیاں بتاؤں اور کہوں کہ ان میں سے کوئی ایک ختم کرو،

جس سے معاشرہ بہتر ہو جائے۔ کرپشن کو۔؟ غربت کو۔؟ نا انصافی کو۔؟ بددیانتی کو۔؟ یا سود کو۔؟ میں شرط

لگاتا ہوں امامہ! کہ یہ پانچوں آپشن کبھی کسی کی پہلی ترجیح نہیں ہو گا۔“

وہ چیلنج کر رہا تھا اور یہ چیلنج جیت بھی سکتا تھا کیونکہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ بھی پہلی چار میں سے ہی کسی ایک

خرابی کو حتم کرنا چاہے گی امامہ نے دل ہی دل میں اعتراف کیا۔

”اور سود صرف بینکنگ میں تو نہیں ہے۔ کوئی یونیٹی بل لیٹ ہوتا ہے تو اس پر سرچارج لگ جاتا ہے اسکول کالج کی فیس لیٹ ہو جاتی ہے تو فائن لگ جاتا ہے۔ یہ بھی تو سود کی قسمیں ہیں۔“

اس کے پاس اس کی توجیہات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

”تو تم بینکنگ میں اس لیے ہو کیونکہ تم سود کو دوسری برائیوں جیسی ایک عام برائی سمجھتے ہو؟“ امامہ نے بحث سمیٹنے کی کوشش کی۔

”نہیں“ میں اسے بہت بڑی لعنت سمجھتا ہوں تو پھر میری سوچ سے کیا تبدیلی آئے گی؟ یہ سوچ لے کر ساری دنیا کے مسلمان بینک میں کام کرنا بند کر دیں۔؟ اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کے لیے راستے کھلے چھوڑ دیں کہ وہ آئیں اور ٹیک اور کریس۔ ہماری اکائیوں کو اپنی مٹھی میں لے لیں۔ جب چاہیں جیسے چاہیں ہمارا گلا دبا دیں۔ پاور اس کی جس کے پاس کیپٹل۔ یہ جو فنانشل سسٹم پوری دنیا میں چل رہا ہے ڈسٹ کا قائم کردہ ہے دوسرے مذاہب کے لوگوں کا ہے انہوں نے اسے بنایا، پاپو لرائز کیا اور پوری دنیا میں پھیلا دیا۔ ہم کہاں سو رہے تھے اس وقت ہمیں اتنی گھن گھانی تھی تو پھر دو تین سو سال پہلے کھاتے۔ سود سے پاک ایک متوازی سسٹم بناتے اور چلاتے اس کو نہ کرتے ڈسٹ کی تقلید یا پھر اب کوشش کریں اس سب کو تبدیل کرنے کی، لیکن اس کے لیے بینکوں میں کام کرنا پڑے گا۔ دنیا میں آج تک جو بھی جنگ جیتی گئی ہے وہ اس نے جیتی ہے جو میدان میں تلوار لے کر اترتا ہے۔

میدان سے باہر کھڑے لوگوں نے بڑی سے بڑی گالیاں بھی دی ہوں تو بھی جنگ ملا متوں اور مذمتوں سے کبھی نہیں جیتی جاتی تو میں اپنی مہارت سے تلوار کا کام لیتا چاہوں گا، میری زبان شاید اتنی موثر نہ ہو۔“

امامہ ابھی نظروں سے اسے دیکھتی رہی سود کے بارے میں یہ ان کی پہلی بحث تھی۔



رمضان میں اور اس کے فوراً بعد امامہ کو کھانا پکانے کا کوئی خاص اتفاق نہیں ہوا تھا، لیکن اب وہ اس کے لیے باقاعدہ طور پر گھر کا کھانا بنانے لگی تھی۔ وہ سی فوڈ کے علاوہ کسی خاص کھانے کا شوقین نہیں تھا۔ سی فوڈ کو شدید ناپسند کرنے کے باوجود وہ بادل خواستہ اس کے لیے ہفتے میں ایک دو بار ڈبوں میں بند سی فوڈ کے بجائے بازار سے تازہ سی فوڈ لا کر پکانے لگی تھی۔

صرف پہلی بار ان تازہ پرائز کریس اور لوہسٹوز کو پکانے کے لیے صاف کرتے ہوئے اسے اتنی شدید کراہت محسوس ہوئی تھی کہ اسے رونا آگیا تھا۔ اتوار کا دن تھا اور وہ صبح کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ سنک ایریا میں ٹی وی دیکھتے اور کسی دوست سے فون پر بات کرتے ہوئے سالار کو وہم سا ہوا تھا کہ وہ سنک کے سامنے کھڑی رو رہی ہے اور یہ وہم اس لیے ہوا کیونکہ اس کال کے آنے سے پہلے وہ دونوں آپس میں بے حد خوشگوار انداز میں باتیں کر رہے تھے وہاں رونے والی کوئی بات نہیں ہوئی تو پھر؟

ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی آف کرتے اور دوست کو خدا حافظ کہتے ہوئے وہ صوفے سے اٹھ کر کچن میں آگیا تھا۔ سنک کے سامنے کھڑی وہ صرف رو نہیں رہی تھی بلکہ زار و قطار رو رہی تھی۔ سالار کے چہرہ طبق روشن ہو گئے۔

”کیا ہوا؟“

سنک میں رکھے برتن سے لوہسٹوز دھو کر شیٹ پر رکھے ایک دوسرے برتن میں رکھتے ہوئے اس نے

سالار کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ نفی میں سر ہلا کر وہ اسی طرح اپنے دونوں کاموں میں مصروف رہی۔ سالار نے ہاتھ بڑھا کر سنک کاٹل بند کر دیا۔

”کیوں رو رہی ہو تم؟“ وہ واقعی سمجھنے سے قاصر تھا۔ ”امامہ۔“

”اپنے ماں باپ کے گھر میں نے ان چیزوں کو کبھی ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا مجھیں اب مجھے دھونا پڑ رہا ہے۔“ پانی دوبارہ کھولتے ہوئے اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس کے گھر میں بھی سی فوڈ اتنے ہی شوق سے کھائے جاتے تھے، لیکن وہ ان سے شدید قسم کی کراہت رکھتی تھی اور ان چیزوں کے پاس بھی نہیں پہنچتی تھی نہ ہی کوئی اس سے کہتا تھا۔ معلوم نہیں انسان کو ماں باپ کا گھر کیوں ہر بات پر یاد آتا ہے۔

سالار کو کچھ دیر سمجھ نہیں آئی کہ وہ کیا کہے۔

”میں نے تمہیں کب کہا ہے کہ تم مجھے یہ بتا کر دو۔“

”تم نے خود کہا تھا کہ میں تمہیں سی فوڈ لا کروں گا اور تم آج یہ بتانا۔“

سالار نے پھر کچھ خفگی سے پانی بند کیا۔

”چھوڑ دو مت بناؤ۔“ اس نے سختی سے کہتے ہوئے وہ برتن سنک سے اٹھا کر شیف پر رکھ دیا۔

”یہ بات نہیں ہے۔ میں سوچ رہی تھی جب شوہر کو بتا کر کھلا سکتی۔ تو ماں باپ کو بھی بتا کر کھلا دیتی۔“ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

کیا رنج تھا کیا پچھتاوا تھا وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

اس کے منع کرنے کے باوجود اس نے اس دن سی فوڈ ہی تیار کیا تھا۔ لیکن اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر سالار کو اس قدر احساس جرم ہوا تھا کہ وہ ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھا سکا۔

”میں آہستہ آہستہ یہ سی فوڈ کھانا چھوڑ دوں گا، تمہیں دوبارہ یہ گھر پر نہیں بنانا پڑے گا۔“

اس نے کھانے کے دوران اسی احساس جرم کے ساتھ کہا تھا۔

”نہیں، تمہیں پسند ہے تو کیوں چھوڑو گے؟ پتا نہیں مجھے ایسے ہی خیال آگیا تو۔ آہستہ آہستہ میری ناپسندیدگی کم ہو جائے گی۔“ وہ اب اس ساری ہوش حال پر کچھ شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔

”میں۔“

امامہ نے اس کی بات کا شدید۔ ”رہنے دو بس۔ اگر کچھ چھوڑنا ہے تو یہ جو تم انرجی ڈرنکس وغیرہ پیتے رہتے ہو

انہیں چھوڑ دو۔ میں تمہیں کچھ فریش، جو سوز وغیرہ بنا دیا کروں گی۔“

وہ ہنس پڑا تھا۔ وہ ان ڈرنکس کا واقعی بہت زیادہ عادی تھا اور اس کی بنیادی وجہ اس کا لائف اسٹائل اور پروفیشن تھا۔ ان انرجی ڈرنکس کے سہارے وہ ساری ساری رات بے حد آرام سے کام کرتا رہتا تھا اور فی الحال اس عادت نے اس کی صحت پر کسی قسم کے مضر اثرات نہیں ڈالے تھے۔ سی فوڈ کی نسبت انہیں چھوڑنا زیادہ مشکل تھا۔

اسے کھانے میں کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی نہ کبھی اس کی یہ خواہش رہی تھی کہ کوئی اس کے لیے کھانے کے

لوازمات کا اہتمام کرے یا اسے پیش کرنا پھرے، لیکن اسے اندازہ بھی نہیں ہو پارہا تھا کہ کتنے غیر محسوس انداز میں

وہ امامہ کے ہاتھ کے کھانے کا عادی ہونے لگا تھا۔ امامہ اس کے رات کو بہت دیر سے گھر آنے پر بھی اسے تازہ چپاتی

بنا کر دینے کی عادی ہو گئی تھی اور سالار نے زندگی میں کبھی ایسی چپاتی نہیں کھائی تھی۔ کسی کے گھر پر بھی

نہیں، ’نرم‘ خوشبودار، ذائقہ دار اور تازہ۔ کسی بھی ڈزنیبل پر۔ چپاتی کا پہلا لقمہ منہ

میں ڈالتے ہی اسے امامہ یاد آتی تھی۔ وہ اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی چپاتی، کسی سالن، چٹنی یا سلاڈ کے بغیر بھی بڑی خوشی کے ساتھ کھا سکتا تھا۔

وہ ناشتے میں دو سلائس ایک اینڈا کھا کر اور چائے کافی کے ایک کپ کے ساتھ بھاگ جانے والا آدمی تھا اور اب زندگی میں پہلی دفعہ ناشتے کا کوئی ”مینو“ ہونے لگا تھا۔ اینڈا تلے ہوئے یا ابلے ہوئے کے بجائے مختلف قسم کے آلیٹ کی شکل میں ملنے لگا تھا۔ بعض دفعہ پراٹھا ہوتا۔ ڈبے کے جوس کی جگہ تازہ جوس کے گلاس نے لے لی تھی۔ لنچ کے لیے گھر کے بنے ہوئے سینڈویچز اور سلاڈ ہوتے۔ وہ آفس میں سب کی طرح ایک فاسٹ فوڈ سے آنے والے لنچ پیک کا عادی تھا اور وہ اس کے ساتھ ”کمفو ٹیبل“ تھا۔

شروع شروع میں وہ امامہ کے اصرار پر کچھ بے دلی سے اس لنچ پیک کو گھر سے لاتا تھا جو امامہ اس کے لیے تیار کرتی تھی، مگر آہستہ آہستہ اس کی ناخوشی ختم ہونے لگی تھی۔ وہ ”گھر کا کھانا“ تھا، بے حد ”ویلیو ایبل“ تھا۔ کیونکہ اسے بنانے کے لیے صبح سویرے اٹھ کر اس کی پیوی اپنا کچھ وقت صرف کرتی تھی۔ ”بھوک“ وہ بازار سے خریدے گئے چند لقموں سے بھی مٹا لیتا، لیکن وہ لقمے اس کے دل میں گھر میں بیٹھی ایک عورت کے لیے شکر کا احساس پیدا نہ کرتے، جسے وہ ہر روز اس وقت محسوس کرتا جب بینک کے چکن سے کوئی اس کے لنچ کو گرم کر کے اس کے ٹیبل پر لا کر رکھتا تھا۔

وہ پانی کے اس گلاس کا بھی اسی طرح عادی ہونے لگا تھا، جو وہ ہر روز اس کے گھر میں داخل ہونے پر اسے لا کر دیتی تھی۔ کافی یا چائے کے اس کپ کا بھی، جو وہ دونوں رات کے کھانے کے بعد ٹیرس پر بیٹھ کر پیتے تھے اور گرم دودھ کے اس گلاس کا بھی، جو وہ رات کو سونے سے پہلے اسے دیا کرتی تھی اور جسے وہ شروع میں ناگواری سے گھورا کرتا تھا۔

”میں دودھ نہیں پیتا۔“ جب اس نے پہلی بار گرم دودھ کا گلاس اسے دیا تو اس نے بے حد شائستگی سے بتایا تھا۔

”کیوں؟“ جواباً اس نے اتنی حیرت کا اظہار کیا تھا کہ وہ کچھ شرمندہ سا ہو گیا تھا۔

”مجھے پسند نہیں ہے۔“

”مجھے تو بڑا پسند ہے، تمہیں کیوں نہیں پسند؟“

”مجھے اس کا ذائقہ اچھا نہیں لگتا۔“ وہ ایک لمحہ کے لیے سوچ میں پڑ گئی۔

”تو میں اس میں اووٹین ڈال دوں۔“ سالار نے اس کے جواب کو مکمل ہونے سے پہلے ہی گلاس اٹھا کر پی لیا

تھا۔ وہ زہریلا سا تھا، لیکن اووٹین نہیں اور یہ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دودھ پیتی ہے اس لیے اسے بھی دودھ پینا تھا۔ دودھ کے فوائد سے ہر حال اسے دلچسپی نہیں تھی۔

اس کے اپنے گھر میں مردوں کا جس طرح خیال رکھا جاتا تھا، وہ بھی اس کا اسی طرح خیال رکھ رہی تھی۔

یہ ”عادی“ تھا، ”خصوصاً“ نہیں اور اسے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ ”خیال“ کہیں ”رجسٹر“ ہو رہا تھا۔ ہر عورت کی طرح وہ بھی یہ سمجھتی تھی کہ اس کے ان تمام کاموں کو حق سمجھ کر لیا جا رہا ہے، کیونکہ ہر مرد کی طرح سالار بھی تعریف نہیں کر رہا تھا، ہر مرد کی طرح اس کے لیے بھی آئی لو یو کہنا آسان تھا، بجائے یہ کہنے کے کہ جو تم میرے لیے کرتی ہو اس کی مجھے بہت قدر ہے اور ہر مرد کی طرح وہ بھی اس احساس تشکر کو تحائف اور پیسے سے دلچسپ کر رہا تھا۔



امامہ کے لیے زندگی بدل گئی تھی۔ بدل گئی تھی یا بہت عرصے کے بعد پھر شروع ہوئی تھی؟ مارکیٹوں میں سالار یا نوشین کے ساتھ پھرتے چیزوں کو دیکھتے وہ عجیب سے احساسات کا شکار ہوتی رہتی۔ یہ احساس کہ وہ جن چیزوں کو دیکھ رہی ہے وہ انہیں اب خریدنے کے قابل ہے اور یہ احساس کہ اب ایک ایسی جگہ ہے جہاں وہ ان چیزوں کو اپنے لیے رکھ سکتی تھی۔ وہ ڈاکٹر سبط علی کا گھر نہیں تھا، ہاسٹل نہیں تھا، نہ ہی سعیدہ اماں کا گھر تھا، یہ اس کا اپنا گھر تھا۔ شکر، خوشی، آسودگی اور پھر بے یقینی اور حیرانی۔ نو سال کی مشقت کے بعد جو ملا تھا وہ اس کی اوقات سے بہت زیادہ تھا اور یہ سب ہر کسی کو کہاں ملتا تھا۔ نو سال بے نام، بے خاندان رہنے کے بعد اب جب کہ وہ ایک خاندان کا حصہ بنی تھی تو حیرانی کیسے نہ ہوتی۔؟ خواری اور بے سروسامانی کا سفر جہاں جا کر ختم ہوا تھا وہ نعمتوں کی معراج تھی۔ اپنے گھر سے نکلنے کے بعد اس نے اتنے عرصے میں صرف ایک چیز سیکھی تھی۔ اپنے نفس پر قابو پانا، اپنی خواہشات اور ضروریات کو کم سے کم کرنا، قناعت کرنا اور یہ بڑا مشکل تھا۔ وہ آسانسٹوں سے نکل کر آئی تھی۔ ریت کا ذرہ اسے تھور کے کانٹے کی طرح چبھتا تھا۔ پیسوں کو گن کر خرچ کرنا اور پھر بچانے کی کوشش کرنا، وہ کہاں عادی تھی ان چیزوں کی، لیکن وقت اور حالات نے اسے عادی بنا دیا تھا اور اب جب اتنے سالوں کے بعد اسے آسانسٹ ملی تو ناممکن تھا کہ اسے بات بات پر وہ نو سال یاد نہ آتے۔ وہ ضرورت پڑنے پر سالار کی دراز میں پڑے پیسوں کو نکالتے ہوئے ٹھنک جایا کرتی تھی، جن کو کمانے میں اس کی محنت شامل تھی، نہ ہی ان کی بچت میں اس کا کوئی حصہ تھا۔ اسے صحیح اندازہ نہیں تھا کہ دراز میں کتنی رقم موجود ہے، کیونکہ وہ انہیں کبھی گن نہیں پاتی تھی۔ وہ ہر روز اس دراز میں کچھ رقم کا اضافہ کرنے کا عادی تھا۔ اگر وہ اس دراز کو پورے کا پورا بھی خالی کر دیتی تب بھی اگلے دن وہ خالی نہیں ہوتا تھا۔ اس روپے کو خرچ کرنا اس کا ”استحقاق“ تھا اور اس رقم کے خرچ ہونے پر سالار نے کبھی اس سے سوال نہیں کیا تھا۔ وہ اس گھر کے سیاہ و سفید کی مالک تھی۔

وہ چیزوں کو پر اس ٹیک دیکھ کر خرید کرتی تھی، اپنی خواہش دیکھ کر نہیں، اور اب یک دم پر اس ٹیک دیکھ کر خریداری کرنا اس کے لائف اسٹائل کا حصہ نہیں رہا تھا۔ سالار زندگی میں خود بھی کبھی بار گینت گینا سستی چیزوں کے استعمال کا عادی نہیں رہا تھا اور وہ انتہائی فیاض اس کے معاملے میں بھی تھا۔ ناممکن تھا کہ اسے جو چیز اچھی لگتی وہ اسے نہ لے کر دیتا اور یہ صرف بازار میں نظر آنے والی چیزوں تک ہی محدود نہیں تھا، بلکہ اسے کسی میگزین یا ٹی وی پر بھی کوئی چیز اچھی لگ جاتی اور وہ سالار سے اس کا ذکر کرتی تو وہ چیز اگلے چند دنوں میں اس کے گھر پر ہوتی تھی اور وہ کس قیمت پر آئی تھی، سالار کو پروا نہیں ہوتی تھی۔ وہ رات کے تین بجے بھی اگر کسی چیز کے کھانے کی فرمائش کرتی تو وہ اسے لے جایا کرتا تھا۔

”میرا دل چاہ رہا ہے۔“

وہ اب اس جملے کو بولنے کی عادی ہو رہی تھی، کیونکہ کوئی تھا جو آدمی رات کو بھی آئس کریم کے دو اسکوپس، چائ کی ایک پلیٹ، پزا کے ایک سلاٹس، کافی کے ایک کپ، ہاٹ اینڈ سار کی خواہش ہونے پر اسے ملامت یا صبر کی تلقین کرنے کے بجائے اسے ساتھ لیے مطلوبہ چیز کی تلاش میں، ایک بھی شکایتی لفظ گے بغیر خالی سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا پھرتا تھا۔

شادی کے اس مختصر عرصے میں بھی لاہور کی کوئی ایسی جگہ نہیں تھی، جہاں کھانے کی کسی مشہور چیز کا اس نے سنا ہو اور سالار اسے وہاں نہ لے گیا ہو۔ گوالمنڈی میں فجر کے بعد حلوہ پوری کے سستے ناشتے سے لے کر پی سی کے چوبیس گھنٹے کھلے رہنے والے کیفے میں رات کے پچھلے پہر کھائے جانے والے لیمن ٹارٹس تک، جن کو کھاتے ہوئے دیر ہو جانے پر اس نے دبئی کی وہ فلاٹ بھی مس کر دی تھی جو ایک گھنٹہ بعد تھی۔

یہ ناممکن تھا کہ ایسا شخص کسی کی دعاؤں کا حصہ نہ بنے۔ اسے کبھی نماز کے بعد دعا کرتے ہوئے سالار کو یاد

نہیں کرتا پڑا تھا، وہ اسے ہمیشہ خود بخود یاد آجاتا تھا۔ اس سے نکاح ہو جانے کے بعد پہلی نماز پڑھنے پر بھی، جب وہ ناخوش تھی اور اس سے رشتہ ختم کرنا چاہتی تھی اور ڈاکٹر سبط علی کے گھر پر اسے دیکھنے اور سننے کے بعد بھی، جب اس نے پہلی بار ”اپنے شوہر“ کے لیے اجر کی دعا کی تھی اور رخصتی کے بعد اس گھر میں پہلی نماز کے دوران بھی، جب اس نے سالار کے لیے اپنے دل میں محبت پیدا ہونے کی دعا کی تھی، وہ اسے یاد آتا تھا یا یاد رہتا تھا۔
دن کی کوئی نماز ایسی نہیں ہوتی تھی جب وہ سالار کے لیے اللہ سے نعمتوں اور اجر کی طالب نہیں ہوتی تھی، تب بھی جب وہ اس سے شاک یا خفا ہوتی تھی۔ وہ اللہ کے بعد اس دنیا میں واقعی اس کا ”آخری سہارا“ تھا اور ”سہارے“ کا ”مطلب“ اور ”اہمیت“ کوئی امامہ سے پوچھتا۔



”آریو شیور۔ تم اکیلے رہ لو گی؟“ سالار اب بھی جیسے یقین دہانی چاہتا تھا۔
وہ دو ہفتوں کے لیے نیویارک اپنے بینک کی کسی بورکشاپ کے سلسلے میں جا رہا تھا اور امامہ اس بار ایار ٹمنٹ میں ہی رہنا چاہتی تھی۔ عام طور پر سالار گراچی یا کہیں اور جاتے ہوئے اسے سعیدہ اماں یا ڈاکٹر سبط علی کے ہاں چھوڑ جایا کرتا تھا، لیکن اس بار وہ بھند تھی کہ وہ وہیں رہے گی۔ اس کا خیال تھا کہ اب وہ وہاں اکیلی رہ سکتی ہے۔
”میں رہ لوں گی۔ ویسے بھی فرقان بھائی اور بھابی تو پاس ہی ہیں۔ کچھ نہیں ہوتا۔“ اس نے سالار کو تسلی دی۔ اس کی فلائٹ صبح گیارہ بجے تھی اور وہ اس وقت پیکنگ سے فارغ ہوا تھا۔
”میرے بغیر رہ لو گی تم؟“ اس نے امامہ کی بات سننے کے بعد کہا۔ وہ اب اپنے بریف کیس میں کچھ پیپر رکھ رہا تھا۔

”ہاں۔۔۔ وہی ہفتوں کی تو بات ہے۔“ امامہ نے بے حد اطمینان سے اسے کہا۔
”وہ ہفتوں میں بند رہ دن ہوتے ہیں۔“ سالار نے بریف کیس بند کرتے ہوئے کہا۔
”تو کوئی بات نہیں گزر جائیں گے۔“

سالار نے گہرا سانس لیا۔ ”ہاں تمہارے تو گزر جائیں گے۔ میرے نہیں گزریں گے، میں تو ابھی سے تمہیں مس کرنے لگا ہوں یار۔“ وہ ہنس پڑی۔
”پہلے بھی تو جاتے ہو تم۔۔۔ دو ہفتے پہلے وہی گئے تھے۔ پھر پچھلے مہینے سنگاپور۔“ اس نے تسلی دینے والے انداز میں اسے یاد دلایا۔

”دو دن کے لیے وہی گیا تھا اور چار دن کے لیے سنگاپور۔ یہ تو دو ہفتے ہیں۔“
”ہاں تو دو ہفتے ہی ہیں نا، دو مہینے یا دو سال تو نہیں ہیں۔“ اس نے کمال اطمینان کے ساتھ کہا۔
سالار اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”چلو، اچھا ہے یہ بھی۔۔۔ نہ میں یاد آؤں گا نہ نظر آؤں گا۔ نہ میرا کوئی کام ہو گا، وقت ہی وقت ہو گا تمہارے پاس۔“ وہ نجانے اس سے کیا سنتا چاہتا تھا۔

”ہاں کافی وقت ہو گا، میں ایک دو ہفتہ تک مکمل کروں گی۔ گھر کے کچھ اور کام ہیں، وہ بھی کروں گی۔ سعیدہ اماں کے بھی ایک دو کام ہیں، وہ بھی نمٹاؤں گی۔ میں نے بہت کچھ پلان کیا ہوا ہے۔“

اس نے ناول پکڑے، اپنی جمائی روکنے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ ہنس پڑا تھا۔
”تمہارے لیے تو blessing in disguise ہو گیا ہے میرا ٹپ، میں نے تو سوچا ہی نہیں تھا، میری وجہ

سے تمہارے اتنے کام پیڈنگ ہو رہے ہیں۔“

اگر اس کے لہجے میں گلہ تھا تو امامہ نے نوٹس نہیں کیا۔

”چلو یہ بھی اچھا ہے۔“ وہ بڑبڑایا تھا۔

”ویرالگا ہوتا تو میں تمہیں لے جاتا۔“ اسے پھر کچھ خیال آیا تھا۔

”تم پریشان مت ہو میں یہاں پر بالکل ٹھیک رہوں گی۔“ امامہ نے فوراً سے پشتر کہا۔

سالار جواب دینے کے بجائے چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔

”کیا دیکھ رہے ہو؟“ امامہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔

”تمہارا اطمینان۔“

”میں فلمی ہیروئز کی طرح ڈانٹا لگ نہیں بول سکتی۔“

”صرف فلمی ہیروئز ہی ڈانٹا لگ بولتی ہیں؟“

”نہیں ہیرو بھی بولتے ہیں۔“ وہ اطمینان سے ہنسی۔ سالار مسکرایا تک نہیں تھا۔ وہ پھر سنجیدہ ہو گئی۔

”مت جاؤ پھر۔؟ اگر اتنا مس کر رہے ہو تو۔“ اس نے جیسے اسے چیلنج کیا۔

”پیارے کہتیں تو نہ جاتا، لیکن میں تمہارا کوئی چیلنج قبول نہیں کروں گا۔ تم سے ہارنا پسند ہے۔“ وہ ہنسی۔

”تم بات بدل رہے ہو؟“

”نہیں، خود کو تسلی دے رہا ہوں۔ چلو آؤ! تمہیں کافی پلو اکرلاؤں۔“

وہ یکدم بستر سے اٹھتے ہوئے بولا۔

”اس وقت۔؟“ رات کو اس وقت امامہ تیار نہیں تھی۔

”ہاں۔ اتنے دن تک تو نہیں پلو اسکوں کا کافی۔“ وہ دراز سے والٹ اور کار کی چابیاں نکال رہا تھا۔

”لیکن اب میں پھر کیڑے بدلوں۔؟“

”مت بدلو، چادر لے لو۔ یہی ٹھیک ہے۔“

سالار نے اس کی بات کافی سہوہ اب سیل فون اٹھا رہا تھا۔

فورٹریس سے کافی منے کے بعد وہ اسٹینڈیم کے گرد بے مقصد ڈرائیو کرتا رہا۔

”اب گھر چلیں، تمہیں آرام کرنا چاہیے۔“ امامہ کو اچانک خیال آیا۔

”میں پلین میں آرام کروں گا۔“

امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اتنا سنجیدہ اور کسی گہری سوچ میں کیوں ڈوبا ہوا تھا۔ واپس آتے ہوئے اس نے

راتے میں ایک دکان سے بہت سا پھل خریدا۔

”تم یہاں نہیں ہو گے تو اتنا پھل خریدنے کی کیا ضرورت ہے؟“ امامہ حیران ہوئی تھی۔

”تمہارے لیے خریدا ہے شاید پھل کھاتے ہوئے ہی میں تمہیں یاد آجاؤں۔“ اس نے مسکرا کر کہا تھا۔

”یہ پھل کھانے کے لیے شرط ہے۔“ وہ بے اختیار ہنسی۔

”نہیں امید۔“ امامہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

واقعی اس کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ دو ہفتے کا ٹرپ اتنا لمبا تو نہیں تھا کہ اس پر کسی قسم کی اداسی کا اظہار کیا جائے۔

کم از کم سالار سے وہ اس طرح کی جذباتیت کی توقع نہیں کر رہی تھی۔



اسے واقعی سالار کے جانے کے بعد پہلے دو دن کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ وہ معمول کے کام کرتی رہی۔ اس نے

نامکمل تصویروں پر کام شروع کیا اور ساتھ ہی ایک نیا ناول بھی شروع کر دیا۔

سالار کی عدم موجودگی میں رات کا کھانا وہ فرقان کے ہاں کھایا کرتی تھی۔ دو دن تک تو وہ اطمینان سے ان کے ہاں کھانا کھانے اور کچھ دیر گپ شپ کرنے کے بعد گھر واپس آ جاتی، پھر کوئی ناول نکال لیتی اور سونے تک پڑھتی رہتی، لیکن مسئلہ تیسری رات کو ہوا تھا۔ اس دن سالار نے اسے دن بھر کال نہیں کی تھی اور اتنے مہینوں میں وہ پہلا دن تھا جب ان کے درمیان کسی قسم کا رابطہ نہیں ہوا تھا۔ اس کی طرف سے نہ میسج نہ کال اور نہ ہی کوئی ای میل آئی تھی۔ وہ پچھلی رات سے بہت مصروف تھا۔ اس نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ شاید اگلے چند دن وہ اس سے بات نہ کر سکے۔ نیویارک پہنچنے کے بعد سالار سے اس کی صرف پانچ منٹ کے لیے بات ہوئی تھی، لیکن پچھلے دو دن وہ وقفہ وقفہ سے مختصر سی سی اس کو ای میلز بھیجتا رہا تھا اور اب وہ بھی یکدم آنا بند ہو گئی تھیں۔

وہ اس رات فرقان کے ہاں کھانے پر نہیں گئی، اس کی بھوک غائب ہو گئی تھی۔ اس نے اس دن کمپیوٹر مسلسل آن رکھا ہوا تھا، اس آس میں کہ شاید وہ اسے ای میل کرے، حالانکہ وہ ورکشاپ کے دوران اسے ای میل نہیں کرتا تھا۔

رات کو اس نے کافی کے لیے کریم نکالنے کے لیے فریج کھولا تو اس نے ایک کاوہ نکڑا دیکھا، جو دو دن پہلے وہ اریورٹ جانے سے پہلے کھاتے کھاتے چھوڑ گیا تھا اور امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے ایک کاوہ بچا ہوا نکڑا فریج میں کیوں رکھ چھوڑا تھا۔ نہ صرف وہ نکڑا، بلکہ وہ کین بھی جس میں بچا ہوا جوس تھا۔ کچھ دیر وہ ان دونوں چیزوں کو دیکھتی رہی، پھر اس نے فریج بند کر دیا۔

کافی بنا کر وہ ٹیرس پر نکل آئی تھی، جہاں وہ ویک اینڈز پر اکثر بیٹھا کرتے تھے۔

منڈیر سے نیچے جھانکتے ہوئے اس نے سرخ اینٹوں کی اس منڈیر پر دو مگزر کے نشان دیکھے تھے۔ ایک ذرا گہرا، دوسرا بہت ہلکا۔ وہ رات کو اکثر یہاں کھڑے، نیچے دیکھتے ہوئے کئی بار یہیں پر اپنے مگزر رکھ دیا کرتے تھے۔ نیچے بلڈنگ کے لان میں کچھ نیچے اور لوگ چل قدمی کر رہے تھے۔

”تمہیں نیچے اچھے لگتے ہیں؟“ اس نے ایک دن وہاں کھڑے نیچے کھیلتے اور شور مچاتے ہوئے بچوں کو دیکھتے ہوئے سالار سے پوچھا تھا۔

”ہاں۔ لیکن اس طرح کے نہیں۔“ اس نے جواباً ”چائے پیتے ہوئے“ اپنے کندھے اچکا کر مگ سے ان بچوں کی طرف اشارہ کیا۔

وہ ہنس پڑی۔ اس کا اشارہ شور کی طرف تھا۔

”مجھے تو ہر طرح کے بچے اچھے لگتے ہیں۔ شور کرنے والے بھی۔“ اس نے نیچے جھانکتے ہوئے کہا تھا۔

Good for you but
I can't stand them.

سالار نے لا بروائی سے کہا۔

”دوسروں کے بچے ہیں“ اس لیے شور کرتے ہوئے برے لگتے ہیں۔ اپنے بچوں کا شور کبھی برا نہیں لگے گا تمہیں۔“ اس نے روائی سے کہا۔

”بچے؟ ایک بچہ کافی ہے۔“ وہ چائے پیتے پیتے اٹکا۔

امامہ نے کچھ چونک کر نیچے جھانکتے ہوئے اسے دیکھا۔

”ایک کیوں؟“

”تو کتنے ہونے چاہیے؟“ وہ سنجیدہ ہوا۔ اس نے ایک لمحہ کے لیے سوچا۔

”کم سے کم چار۔“

”اور زیادہ سے زیادہ بارہ۔“ سالار نے ہستے ہوئے اس کے جملے میں اضافہ کیا تھا۔ وہ اس مذاق سمجھتا تھا۔

”میں سیریس ہوں۔“ اس کی ہنسی رکنے پر اس نے کہا۔

”چار بچے۔ تم حواسوں میں ہو۔“ سالار نے مک منڈیر پر رکھ دیا۔

”کون پالے گا انہیں؟“ اسے بے اختیار تشویش ہوئی۔

”تم اور میں۔“ اس نے اطمینان سے کہا۔

”میں ایک بچہ پال سکتا ہوں، چار نہیں۔“

سالار نے دونوں ہاتھ اٹھا کر جیسے اسے حتمی انداز میں کہا۔

”ٹھیک ہے تم ایک پال لینا، تین میں پال لوں گی۔“ وہ اطمینان سے کہہ کر دوبارہ نیچے جھانکنے لگی۔

”امامہ! میں سنجیدہ ہوں۔“

”اور میں بھی۔“

”ہم چار بچے انورڈ نہیں کر سکتے۔“ اسے لگا کہ اسے امامہ کو منطقی انداز میں سمجھانا چاہیے۔

”میں تو کر سکتی ہوں۔ میرے پاس وہ پیسے ہیں جو۔“

”وہ میں نے اس لیے نہیں دیے کہ تم انہیں بچوں کی فوج پر انوسٹ کرو۔“ سالار نے جھنجھلا کر اس کی بات

کائی۔

امامہ کو برا لگا۔ وہ کچھ کہنے کے بجائے بے حد خفگی کے عالم میں پھر نیچے دیکھنے لگی تھی۔

”سوٹ ہارٹ! ہم کو۔“ سالار نے اس کے کندھے کے گرد بازو پھیلا کر اسے منانے کی کوشش کی تھی۔

”ہاتھ ہٹاؤ۔“ امامہ نے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

”میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ جھنجھلایا۔ ”تم چاہتی ہو میں گھر، آفس، اسکول، ڈاکٹرز اور مارکیٹوں کے چکر لگاتے

لگاتے بوڑھا ہو جاؤں۔“

”تو تم کیا کرتے ہوئے بوڑھا ہونا چاہتے ہو؟“ تڑ سے جواب آیا تھا، وہ لا جواب ہو گیا۔ وہ خفگی بھری سوالیہ

نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ رات کے وقت اپنے بچوں کو گھر میں کیوں نہیں رکھتے، دوسروں کو دکھانے

کے لیے باہر کیوں لے آتے ہیں۔“ وہ اس کے سوال کا جواب دیے بغیر منڈیر سے اپنا منگ اٹھا کر کچھ جھنجھلا ہٹ

کے عالم میں اندر چلا گیا تھا۔ امامہ کو بے اختیار ہنسی آئی تھی۔

وہ اب بھی ہنس پڑی تھی۔ منڈیر کے اس نشان کو دیکھتے ہوئے نجانے کیا کیا یاد آیا تھا۔ نیچے لان میں پھر وہی شور

بپا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیوار کے ساتھ لگے اس رگ کو دکھا جس پر وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کبھی کبھار بیٹھ کر

گٹار بچایا کرتا تھا۔ اسے اس کے گٹار میں دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اس سے باتیں کرنے کے لیے اس کے پاس

بیٹھا کرتی تھی۔ گٹار بجاتے ہوئے وہ خود نہیں بولتا تھا، صرف اس کی باتیں سنتا رہتا اور وہ میکا کی انداز میں وقفے

وقفے سے اس کے منہ میں کوئی نہ کوئی کھانے کی چیز ڈالا کرتی تھی۔ وہ اسے دکھاتا رہتا اور گٹار پر باری باری اپنی پسند

کی کوئی ٹیون بجاتا رہتا یا اپنے۔ انشرومنٹس کو نکال کر ان کی صفائی کرتا رہتا۔ یہ ویک اینڈز پر اس کا پسندیدہ مشغلہ

تھا۔

اسے احساس نہیں ہوا کہ کافی کا منگ ہاتھ میں لیے اس رگ کو دیکھتے اس کی کافی کب کی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ وہ

اسی طرح بھرا ہوا منگ بے پروا پس اندر آگئی۔

جس دفعہ مجھ میں ہیں آنا کہ ہم کسی کو کیوں یاد کرتے ہیں۔ یاد کرتے ہیں تو کوئی یاد آتا ہے۔ یا یاد آتا ہے تو یاد کرتے ہیں۔؟ دل یہ معہ کہاں حل کرپاتا ہے۔



فجر کے بعد وہ مسلسل کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی تھی۔ کال نہیں تو کوئی ای میل سی۔ اس نے وقفے وقفے سے اسے چارپانچ ای میلز کی تھیں پھر وہ مایوس ہو گئی۔ جواب نہ آنے کا مطلب تھا کہ وہ ای میلز چیک نہیں کر رہا تھا۔

اگلے دن اداسی کا دورہ پہلے سے بھی شدید تھا۔ اس دن وہ پینٹنگ کر سکی نہ کوئی کتاب پڑھ سکی اور اس نے کھانا بھی نہیں پکایا۔ فریج میں چھلے چند دنوں کا رڑا ہوا کھانا کھالیا۔ شام تک وہ اگلے دن سعیدہ اماں کے ہاں جانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس کا خیال تھا یہ تنہائی تھی جو اسے مضحک کر رہی ہے۔ وہ یہ بھول گئی تھی کہ وہ نو سال تنہا ہی رہی تھی۔ اس سے زیادہ تنہا اس سے زیادہ برے حالات میں۔

اس دن اسے سالار کی تین لائنوں کی ایک ای میل ملی تھی اور ان تین لائنوں کو اس نے رات تک کم از کم تین سو بار پڑھا تھا۔

“Hi Sweet heart! How are you? This work shop has really nailed me down! How is your painting going? Love you-”

”ہائی سویٹ ہارٹ!“

کیا حال ہے؟ اس ورک شاپ نے تو مجھے جکڑ لیا ہے۔ تمہاری پینٹنگ کیسی چل رہی ہیں ٹو پو۔“
ان تین جملوں کی ایک میل کے جواب میں اس نے اسے ایک لمبی ای میل کی تھی جس میں اسے اپنی ہر ایک ٹوٹی بتائی تھی۔ ایک کے بعد دوسرا دوسرے کے بعد تیسرا جھوٹ۔ وہ اس سے یہ کیسے کہہ دیتی کہ وہ اداس ہے پھر وہ وجہ پوچھتا تو اسے وہ اپنی اداسی کی کیا وجہ بتاتی۔؟



”بیٹا! چہ کیوں اتر اہوا ہے تمہارا؟ کوئی پریشانی ہے۔؟ جھگڑا کر کے تو نہیں گیا سالار تمہارے ساتھ؟“ سعیدہ اماں نے اس کے چہرے پر پہلی نظر ڈالتے ہی اپنے سوالوں سے اسے بوکھلادیا تھا۔ وہ بری طرح متفکر ہوئی تھیں۔
”نہیں، نہیں، کچھ بھی نہیں ہوا۔ بس ایسے ہی گھر میں اکیلی تھی شاید اس لیے۔“
اس نے مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ انہیں بہلایا، لیکن وہ مطمئن نہیں ہوئیں۔
امامہ نے کپڑوں کا بیگ کمرے میں رکھنے کے فوراً بعد ڈرائنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کو دیکھا۔ پانچ دنوں میں پہلی بار اس نے اپنے عکس پر غور کیا تھا۔ وہ واقعی بہت پریشان لگ رہی تھی۔ سعیدہ اماں اگر پریشان ہوئی تھیں تو کوئی حیرانی کی بات نہیں تھی کوئی بھی اس کا چہرہ آسانی سے پڑھ سکتا تھا۔
اگلے دس منٹ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ اپنے چہرے کے اعصاب اور تاثرات کو ریلیکس کرنے کی ریکش کرتی رہی۔ مسکرا کر ہنسنے کے تاثرات کو نرم رکھ کر پھر جیسے نہج ہو کر اس نے ٹھکست مان لی۔

”جنم میں جائے اب لگتی ہوں پریشان تو میں کیا کروں۔؟ کتنا مسکراؤں میں۔۔؟“
پھر وہ باہر نکل آئی۔ سونا وہاں بھی مشکل تھا اور اداسی ہاں بھی ویسی ہی تھی۔

”اتنی چپ تم پہلے تو کبھی نہیں رہیں بیٹا! اب کیا ہو گیا ہے تمہیں۔۔۔؟“ اگلی شام تک سعیدہ اماں حقیقتاً فکر مند ہو چکی تھیں، حالانکہ اس دن صبح سالار سے اس کی بات بھی ہوئی تھی۔

”تم سالار کے ساتھ خوش تو ہونا؟“ وہ تشویش سے پوچھ رہی تھیں اور وہ ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اداسی بری طرح بڑھی تھی۔ مسئلہ خوشی کا نہیں تھا۔ مسئلہ یہ نہیں تھا کہ وہ اس کے ساتھ خوش ہے یا نہیں۔ بات صرف اس کے ساتھ رہنے کی تھی۔ خوش یا اداس جیسے بھی لیکن اس کے ساتھ ہی۔

اس نے سعیدہ اماں کو جواب دینے کے بجائے موضوع بدل دیا تھا۔ دو دن وہاں رہ کر وہ پھر اسی بے چینی کے عالم میں واپس آئی تھی۔

”لیکن تم نے تو کہا تھا کہ تم میرے آنے تک وہیں رہو گی؟“ سالار اس کی واپسی پر حیران ہوا تھا۔

”میری مرضی۔“ وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی لیکن معلوم نہیں اس نے یہ کیوں کہا۔

”اوکے۔“ وہ جواب پر حیران ہوا تھا، لیکن اس نے کوئی مزید سوال نہیں کیا۔

”مجھے نیویارک سے ورکشاپ کے ختم ہونے کے بعد یہیں سے دو ہفتے کے لیے کینیڈا جانا ہے۔“

سالار نے اسے اگلی خبر سنائی اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

”کیا مطلب؟“

”جو کولیک مائٹریال والی کانفرنس اٹینڈ کر رہا تھا، اسے کوئی میڈیکل ایمرجنسی ہو گئی ہے۔ فوری طور پر مجھے کانفرنس میں جانے کے لیے کہا گیا ہے۔ کیونکہ میرے پاس ویزا بھی ہے اور میں قریب بھی ہوں۔“

وہ صدمے سے بول ہی نہیں سکی۔ دو ہفتے اور باہر ٹھہرنے کا مطلب تھا کہ وہ عید کے ایک ہفتے کے بعد واپس پاکستان آتا۔

”ہیلو!“ سالار نے اس کی لمبی خاموشی پر لائن پر اس کی موجودگی چیک کی۔

”یعنی عید کے بعد آؤ گے تم؟“

اس نے اپنے لہجے کی مایوسی پر قابو کرتے ہوئے سالار کو یاد دلانے کی کوشش کی کہ عید قریب ہے۔

”ہاں۔“ ایک حلی جواب آیا۔ یقیناً اسے یاد تھا۔

”اور میں عید پر کیا کروں گی؟“

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کیا بات کرے۔ ایو سی کی انتہا تھی جس کا وہ اس وقت شکار ہو رہی تھی۔ ایک ہفتہ کا انتظار تین ہفتوں میں تبدیل ہو گیا تھا اور تین ہفتوں کے لیے اس اپارٹمنٹ میں اکیلے رہنا۔

اسے سالار پر غصہ آنے لگا تھا۔

”تم اسلام آباد چلی جانا عید پر۔“ سالار نے کہا۔

”نہیں میں یہیں رہوں گی۔“ اس نے بلاوجہ ضد کی۔

”ٹھیک ہے یہیں رہ لیتا۔“ سالار نے باسانی گھٹنے ٹیک دیے۔

”تمہیں کیوں بھیج رہے ہیں۔؟ بھیجنا تھا تو پہلے کہنا چاہیے تھا انہیں۔“

اسے اب بینک والوں پر غصہ آ رہا تھا۔

”ایسی ایمرجنسی ہو جاتی ہے کبھی کبھار وہ کسی اور کو اتنے شارٹ نوٹس پر پاکستان سے نہیں بھیج سکتے ورنہ مجھے کہاں بھیجنا تھا انہوں نے۔“ سالار نے وضاحت کی۔

”پھر بھی۔ تم کہہ دیجئے کہ تم مصروف ہو، تمہیں ان دنوں پاکستان میں کچھ کام ہے۔“ وہ ہنس پڑا۔

”لیکن مجھے تو کوئی کام نہیں ہے۔ میں جھوٹ بولتا۔؟“

امامہ کو غصہ آگیا۔ ”زندگی میں بھی جھوٹ نہیں بولا کیا؟“
 ”نیور؟ اپنے کام میں؟ ضرورت ہی نہیں پڑی۔“ اس نے اطمینان سے کہا۔ امامہ کچھ بول نہیں سکی۔
 ”تم ایسا کرو ڈاکٹر صاحب کے گھر چلی جاؤ۔ اتنے دن اکیلے رہو گی تو پور ہو جاؤ گی۔“
 اس نے اسے مشورہ دیا۔

”نہیں میں پور نہیں ہوں گی۔ مجھے یہاں بڑے کام ہیں۔“ وہ اس کے مشورے پر کچھ جی سی گئی۔
 سالار کو اس کی ٹون نے حیران کیا تھا۔ وہ اس طرح کچھ بات نہیں کرتی تھی اور ابھی کچھ دیر پہلے تک تو وہ بے
 حد خوشگوار اور زرخوش انداز میں اس سے باتیں کر رہی تھی پھر یک دم اسے کیا ہوا تھا۔ کم از کم وہ یہ نہیں سوچ
 سکتا تھا کہ اس کے کینیڈا میں مزید رکنے کی وجہ سے وہ اپ سیٹ ہو رہی ہے۔ وہ امامہ سے پوچھنا چاہتا تھا، لیکن فوری
 طور پر اس نے موضوع کو بدلنا بہتر سمجھا۔

اپ سیٹ شاید ایک بہت چھوٹا لفظ تھا اس کیفیت کے لیے جو وہ اس وقت محسوس کر رہی تھی۔ وہ بے حد غم
 اور غصے میں تھی۔ اسے یہ ”ایکسٹینشن“ دھوکا لگ رہا تھا۔ آخر وہ اسے چار ہفتے کا کہہ کر تو باہر نہیں گیا تھا۔
 سوال یہ تھا کہ اگر چار ہفتے کا بھی کہہ کر جاتا تو اسے کیا اعتراض ہوتا تھا؟ اس نے تب بھی اسے اسی طرح خوشی خوشی

روانہ کر دیتا تھا یہ اندازہ لگائے بغیر کہ وہ بعد میں ان تیس دنوں کے ایک ایک گھنٹے کو گنے گی۔
 ”میں بھی اب اسے ای میل نہیں کروں گی نہ ہی کال کروں گی نہ ہی اس سے پوچھوں گی کہ اسے کب آنا ہے
 اور کب نہیں۔ آتا ہے تو آئے، نہیں تو نہ آئے۔ جہنم میں جائے، میرا ہی قصور ہے۔ بار بار اس سے نہ پوچھتی تو وہ
 اس طرح نہ کرتا۔“

اس رات بستر میں لیٹے ہوئے وہ بے حد رنجیدگی کے عالم میں ان تمام چیزوں کی فہرست بناتی رہی، جن میں اب
 اسے سالار کی نافرمانی کرنی تھی۔ بستر پر لیٹے چھت کو گھورتے ہوئے اس کی فہرست ابھی دو سو پچپن اینٹریز تک
 پہنچی تھی کہ اسے بیڈ کے بالکل اوپر چھت پر چھپکی نظر آئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اکیلا گھر اور چھپکی یہ فی الحال اس
 کے لیے بدترین تھا۔ وہ چھپکی کو دیکھتے ہی بیڈ سے اٹھ کر صوفے پر چلی گئی اور اسے پھر سالار پر غصہ آنے لگا تھا۔
 ایک چھوٹی سی چھپکی دو ہفتے پہلے اپارٹمنٹ میں نمودار ہوئی تھی اور وہ بھی سیدھا ان کے بیڈ روم میں۔ شاید
 کسی دن ٹیرس کا دروازہ کھلا رہنے کی وجہ سے اندر آگئی تھی۔

وہ اس وقت بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ آن کیے رات کو ناول پڑھ رہی تھی جو بے حد دلچسپ موڑ پر تھا جب بستر میں
 نیم دراز اپنی ٹانگیں سکڑے ہوئے، اس کی نظر اس اچانک چھت پر اپنے بیڈ کے بالکل اوپر موجود چھپکی پر پڑی
 تھی۔ ایک لمحہ کے لیے اسے یہ وہم لگا۔ اس نے کمرے کی لائٹ آن کر کے دیکھا، وہ چھپکی ہی تھی۔ سالار برابر
 والے بستر میں گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ عام حالات میں بھی اسے نہ جگاتی، لیکن یہ عام حالات نہیں تھے۔ اس نے
 اوندھے لیٹے ہوئے سالار کا کندھا جھنجھوڑا۔

”سالار۔ سالار۔“ وہ اس کی آواز پر نیند میں ہڑبڑا گیا۔

”کیا ہوا۔؟“

”وہ اوپر دیکھو، میرے بیڈ کے اوپر چھت پر چھپکی ہے۔“

امامہ نے حواس باختہ ہو کر اسے کہا۔ سالار نے موندی ہوئی آنکھوں کو مسلتے، لیٹے لیٹے ایک نظر چھت کو دیکھا،

پھر امامہ کو اور دوبارہ اوندھے منہ لیٹ گیا۔

”سالار!“ امامہ نے دوبارہ اس کا کندھا ہلایا۔

اس کا خیال تھا شاید وہ نیند میں اس چھپکی کو دیکھ نہیں پایا۔

”دیکھ لی ہے میں نے امامہ۔۔۔ سونے دو۔“ وہ لیٹے لیٹے بڑبڑایا۔

”دیکھ لی ہے تو کچھ کرو اس کا۔“ وہ اس کی بے توجہی پر ناراض ہوئی۔

”چلی جائے گی خود ہی۔ تم لائٹ آف کر کے سو جاؤ۔“ وہ پھر بڑبڑایا۔

”میں کیسے سوؤں۔۔۔؟ وہ مجھے دیکھ رہی ہے۔“ اس کی خفگی بڑھی۔

”لائٹ بند کرو نہ تم اسے دیکھو نہ وہ تمہیں دیکھے۔“

اسے اس کے مشورے سے زیادہ اس کی بے حسی پر غصہ آیا۔

”تم میرے لیے ایک چھپکلی نہیں مار سکتے؟“

”میں رات کے اڑھائی بجے چھپکلی نہیں مار سکتا۔ جسٹ انگور اٹ۔“

”میں نہیں انگور کر سکتی اسے۔ یہ اگر گرے تو سیدھا میری ٹانگوں پر گرے گی۔“

اس نے چھت کو دیکھتے ہوئے بے بسی سے کہا۔ وہ واقعی اس کی ٹانگوں پر ہی گرتی۔

”یار میں تمہاری سائیڈ پر آجاتا ہوں تم میری سائیڈ پر آ جاؤ۔“

وہ کروٹ لیتے، کہتا ہوا اسی طرح اس کی سائیڈ پر چلا گیا۔ وہ اس کے ایثار سے زیادہ اس کی دلیری سے متاثر ہوئی

تھی۔ کمرے کی بڑی لائٹ دوبارہ بند کرتے ہوئے وہ اپنا ناول لیے سالار کا بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ آن کر کے اس کے بستر میں بیٹھ گئی۔ سالار تب تک اسی طرح اوندھے منہ لیٹے لیٹے اس کا سائیڈ لیمپ آف کر چکا تھا۔ خود کو قدرے محفوظ مانتے ہوئے، کچھ پرسکون انداز میں اس نے ناول کے چند جملے پڑھے، پھر دوبارہ چھپکلی کو دیکھا۔ وہ جیسے اسی جگہ پر چپک کر رہ گئی تھی۔ امامہ نے سالار کو دیکھا۔ وہ اس چھپکلی کے عین نیچے بے حد اطمینان سے اسی طرح کمرے کا کمرے اوڑھے اوندھے منہ لیٹا تھا۔

”سالار تم مرد کتنے بہادر ہوتے ہو۔“ اس نے مردوں کو سراہنا ضروری سمجھا۔

”اور سمجھ دار بھی۔“ اسے جواباً بڑبڑاہٹ سنائی دی۔

”سمجھ دار کیسے؟“ وہ صفحہ پلٹتے پلٹتے چونکی۔

”چھپکلی گرتی تمہارے بیڈ پر، لیکن بھاگتی میرے بیڈ کی طرف۔ اس کا منہ میرے بیڈ کی طرف ہے۔“ جمابہی

لیتے اسی طرح آنکھیں بند کئے سالار نے سیدھے ہوتے ہوئے کہا۔

امامہ نے سراٹھا کر چھت کو دیکھا اور اگلے ہی لمحے وہ بیڈ سے باہر تھی۔ چھپکلی کا رخ واقعی سالار کے بیڈ کی طرف تھا۔

”تم سارے مرد بے حد خود غرض ہوتے ہو اور ایک جیسے ہوتے ہو۔“

وہ بیڈ روم سے باہر نکلتے ہوئے، جتنی بلند آواز میں یہ اس سے کہہ سکتی تھی اس نے کہا۔

سالار نے بالآخر آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ اسے تنگ کر رہا تھا، لیکن اب اسے اندازہ ہوا تھا کہ تنگ کرنے

کے لیے یہ موقع شاید غلط ہے۔

دس منٹ کے بعد اسے چھپکلی کا صفایا کرنے کی اطلاع دے کر وہ اسے منا کر لاؤنج سے واپس لے گیا تھا۔ اس

نے اگلے کئی دن یہ چھپکلی نہیں دیکھی تھی اور آج یہ چھپکلی پھر آگئی تھی۔ یقیناً اس نے جھوٹ بولا تھا اس نے اس

چھپکلی کو نہیں مارا تھا۔ وہ اتنا بات اس وقت اس کے لیے ایک اور پوائنٹ ہو گیا تھا۔

اگلے دن فون پر اس نے سالار کو اس چھپکلی کے دوبارہ نمودار ہونے کے بارے میں بتایا۔

”تم نے مجھ سے جھوٹ بولا کہ تم نے اسے مار دیا تھا۔“ اس نے چھوٹے ہی سالار سے کہا۔

”میں نے اسے واقعی مار دیا تھا، یہ کوئی اور چھپکلی ہوگی۔“ سالار نے لاپرواہی سے کہا۔

”نہیں یہ وہی چھپکلی تھی، تم نے اگر اسے مارا ہو تو تم مجھے دکھاتے۔“ وہ اپنی بات پر مصر تھی۔
 سالار کا سر گھوم کر رہ گیا وہ امامہ سے اس سے زیادہ احمقانہ گفتگو کی توقع نہیں رکھ سکتا تھا۔
 ”تم اگر کہیں تو میں تمہیں وہ مری ہوئی چھپکلی بھی دکھا دیتا۔“ اس نے محل کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تھی۔
 ”نہیں یہ وہی تھی میں اسے پہچانتی ہوں۔“

”اگر یہ وہی تھی تو اتنے دن سے کہاں تھی۔؟“
 اس نے ایک ال بوجیل چیز لاجب دینے کی کوشش کی۔
 ”جہاں بھی تھی مجھے نہیں پتا، لیکن تم یہی چاہتے تھے کہ میں پریشان ہوں۔“
 سالار نے بے اختیار گہرا سانس لیا، وہ اس الزام کے جواب میں کیا کہتا۔ امامہ کو کچھ ہوا تھا، لیکن کیا ہوا تھا۔ یہ اسے سمجھ میں نہیں آیا۔

”تمہیں پتا ہے مجھے چھپکلی سے ڈر لگتا ہے، لیکن تم پھر بھی اسے یہاں چھوڑ کر گئے، کیونکہ تمہیں احساس نہیں ہے میرا تم مجھے پریشان دیکھ کر خوش ہوتے ہو، تمہارے لیے ہر چیز مذاق ہے۔“ اس کی کسی بات کا کوئی سرپیر نہیں تھا۔ کم از کم سالار نہیں ڈھونڈ سکا لیکن وہ اس کی ”گفتگو“ سن رہا تھا۔

”تم ہمیشہ میرے ساتھ اس طرح کرتے ہو اور مجھے پتا ہے، تم نے ہمیشہ اسی طرح کرنا ہے۔ کیونکہ تمہارے لیے صرف تمہاری اپنی اہمیت ہے اور میں تمہارے گھر کی نوکرائی ہوں یا ہاؤس کیپر۔ تم جہاں مرضی پھو، لیکن میں ہمیشہ گھر پر ہوں جیسے غلام رہتے ہیں۔ میں سارا دین کام کروں اور تم میرے لیے ایک چھپکلی نہیں مار سکتے۔“ وہ اس بے ربط گفتگو کے اختتام پر ہچکچوں سے رو رہی تھی۔

ساری گفتگو میں ایٹو کیا تھا چھپکلی کا نہ مارا جانا۔ اس کی خود غرضی، اس کا گھر پر نہ ہونا یا گھر کے وہ کام جو اسے کرنے پڑے تھے وہ سمجھ نہیں سکا۔ وہ اسے سے زیادہ تک جانے والی گفتگو نہیں تھی۔ X سے $\frac{1}{2}$ 3 تک جانے والی گفتگو تھی جس کو سمجھنے کے لیے جس فارمولے کی ضرورت تھی وہ فی الحال سالار کو نہیں آتا تھا۔
 اگلے پانچ منٹ وہ بے حد تحمل سے اس کی ہچکچوں کے تھمنے کا انتظار کرتا رہا اور پھر جب بالآخر طوفان کچھ تھما تو اس نے کہا۔

”آئی ایم سوری، میرا قصور ہے۔ میں فرقان سے کہتا ہوں، ملازم کو بھیجے، وہ چھپکلی کو مار دے گا۔“ فی الحال معذرت کے علاوہ اسے اس صورت حال سے نپٹنے کا کوئی اور راستہ نظر نہیں آیا۔

”نہیں اب میں چھپکلی کے ساتھ رہوں گی تاکہ تمہیں پتا چلے۔“ اس نے ناک رگڑتے ہوئے اسے کہا۔
 سالار کو بے اختیار ہنسی آگئی اور اس نے کھانسنے پر قابو پایا۔ وہ جلتی پر تیل نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ امامہ کا مسئلہ کیا تھا، وہ اسے سمجھ نہیں پا رہا تھا، لیکن وہ حیران تھا اگر یہ موڈ سو نگز تھے تو یہ بدترین قسم کے تھے اور اگر یہ tantrums تھے تو سمجھ میں نہ آنے والے، لیکن پاکستان سے اتنی دور بیٹھے وہ سوچنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

فرقان کے ملازم نے اگر اس دن وہ چھپکلی ماری تھی، لیکن اس چیز نے بھی امامہ کے دل میں کسی ممنونیت کو پیدا نہیں کیا تھا۔

اگلے دن کھانا پکاتے ہوئے اس کے ہاتھ پر چھری سے کٹ لگ گیا۔ سنک میں پانی کے نیچے انگلی رکھے اسے پھر وہ یاد آنے لگا۔

”یہ کیا ہوا ہے؟“
 وہ اس دن آفس سے آنے کے بعد لاؤنج میں ٹہلتے ہوئے فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ امامہ ڈنر کے لیے

برتن لگا رہی تھی۔ وہ بات کرتے ٹھلے ہوئے، پکن کاؤنٹر پر پڑے پالے سے کچھ بینز کھا رہا تھا جب امامہ نے آکر وہاں رکھے چاول اٹھائے۔ سالار نے اس کے ہاتھ کی پشت پر چند آبلے دیکھے۔ فون پر بات سنتے سنتے اس نے بے اختیار اس سے کہا ”یہ کیا ہوا؟“

”یہ...؟“ امامہ نے چونک کر اس کی نظروں کے تعاقب میں اپنا ہاتھ دیکھا۔
 ”کچھ نہیں کھانا بنا رہی تھی تو آئل کے کچھ چھینٹے گر گئے۔“ اس نے لا پرواہی سے بتایا۔
 وہ اسی طرح فون پر بات سنتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر دیکھنے لگا۔ پھر اس کا ہاتھ چھوڑ کر وہ اسی طرح فون پر بات کرتے لاؤنج سے غائب ہو گیا۔ وہ فریج سے پانی نکال رہی تھی جب وہ دوبارہ نمودار ہوا۔ اسی طرح فون پر اشاک مارکیٹ کے کسی ایٹو پر بات کرتے ہوئے اس نے امامہ کا ہاتھ پکڑ کر چند لمحوں میں اس پر مرہم لگایا اور پھر اسی طرح دوبارہ چلا گیا۔ وہ ہل نہیں سکی تھی۔ اتنے سالوں میں اس کے کسی زخم پر رکھا جانے والا وہ پہلا مرہم تھا۔ وہ اتنے سالوں میں شاید بے حس ہو گئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی تکلیفوں اور جوٹوں پر رونا اور ان کی پروا کرنا اس نے چھوڑ دیا تھا۔ اسے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ کسی زخم کو مندل کرنے کے لیے بھی کچھ کیا جاتا تھا۔ مرہم دوسرے رکھتے ہیں اور اس کی زندگی میں کوئی دوسرا رہا ہی نہیں تھا۔

کھانا کھاتے ہوئے سالار کی نظر ایک بار پھر اس کے ہاتھ پر پڑی تھی اور اس نے قدرے خفگی کے عالم میں اس سے کہا۔

”اگر اسی وقت ہاتھ پر کچھ لگالیتیں تو یہ آبلے نہ پڑتے۔“

”مجھے اس سے تکلیف نہیں ہوئی۔“

”مگر مجھے تکلیف ہو رہی ہے سوٹ ہارٹ!“

وہ اس سے نظریں ملا کر جواب نہیں دے سکی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اسے تکلیف ہو رہی ہوگی اور اس مرہم سے زیادہ ٹھنڈک اس کے اس جملے نے پہنچائی تھی اسے تو اب کوئی تھا جسے اس کے ہاتھ پر آنے والے ایک معمولی زخم پر بھی تکلیف ہوتی تھی۔

اس کے ہاتھ پر چھوٹے موٹے زخموں کے کئی نشان تھے۔ وہ ان میں سے ان زخموں کو بڑی آسانی سے پہچان سکتی تھی جو اس گھر میں آنے کے بعد لگے تھے۔ ان زخموں میں اسے تکلیف ہوئی تھی اور یہ تکلیف اس لیے ہوئی تھی کیونکہ ہر بار کسی نے بڑے پیار سے ان پر کچھ لگایا تھا یا لگانے کو کہا تھا۔

جیل، مرہم، پلاسٹ، اسپرٹ، اینٹی سپیشک کریم۔ وہ درد کے احساس سے جیسے دوبارہ آشنا ہو رہی تھی اور اب اتنے مہینوں کے بعد یہ پہلا کٹ تھا جس کے بارے میں اس سے پوچھنے والا کوئی نہیں تھا اور اسے وہ ”پوچھنے والا“ ایک بار پھر بری طرح یاد آیا تھا۔

دوسرے مہینے کے اختتام تک وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی بری طرح جھنجھلائے لگی تھی۔ ملازمہ کے ساتھ مالی کے ساتھ اس گھر میں آنے والے فرقان کے بچوں کے ساتھ اور خود سالار کے ساتھ۔

”امامہ! کیا ہو رہا ہے تمہیں...؟ سب ٹھیک ہے نا؟“ سالار کو بالآخر اس سے بہت ڈائریکٹ ہو کر پوچھنا پڑا

تھا۔

”کیا ہوتا ہے مجھے؟“ وہ اس کے سوال پر بری طرح چڑی۔

”وہی تو پوچھ رہا ہوں میں۔“ اس نے حل سے کہا۔

”کچھ نہیں ہو رہا مجھے۔“

”پھر تمہیں وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔ یہ کتنا ذرا مشکل تھا کہ وہ اس کے ساتھ تلخ ہو رہی تھی۔“

”پھر میں کیا۔؟“ امامہ نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔
 ”کچھ نہیں میں ابھی دو تین دن تک تم کو فون نہیں کر سکوں گا۔“
 ”کیوں؟“ وہ بری طرح بگڑی۔ ”اتنا بھی کیا کام ہے کہ تم مجھے چند منٹ کے لیے بھی کال نہیں کر سکتے۔“
 ”میں تمہیں ای میل کر دیا کروں گا“ اگر وقت ملا تو کال بھی کر لوں گا۔ لیکن شاید نہ کر سکوں۔“ وہ تحمل سے اسے سمجھا رہا تھا۔

”تم ای میل بھی نہ کرو مجھے اس سے اور بھی وقت بچے گا تمہارا۔“
 اس نے بے حد غفلت کے عالم میں فون بند کر دیا۔ اسے سالار پر بری طرح غصہ آ رہا تھا۔ چند منٹوں کے بعد دوبارہ کال آنے لگی تھی۔ وہ کال ریسیو نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اسے ریسیو کرنا پڑی۔
 ”تم نے فون بند کیا تھا؟“ وہ دوسری طرف حیرانی سے اس سے پوچھ رہا تھا۔

”ہاں۔“

”کیوں؟“

”ناکہ تمہارا وقت ضائع نہ ہو۔ میں نے کل ایک میگزین میں پڑھا تھا کہ جن مردوں کو احساس کمتری ہوتا ہے وہ اپنی بیویوں کو اپنی جھوٹی مصوفیات کے قصے سناتے رہتے ہیں۔“ سالار نے کچھ ہکا بکا ہو کر اس کا جملہ سنا تھا۔ اسے اس بات کا کوئی سرپر سمجھ میں نہیں آیا۔ ”ناکہ ان کی بیویوں کو یہ امپریشن ملے کہ وہ بہت اہم ہیں اور دنیا ان کے بغیر نہیں چل سکتی۔“ سالار نے اسی اچھے میں اس کے بانی جملے بھی سنے تھے۔ ”اس سے ان کی esteem self بڑھتی ہے۔“

اس نے آخری جملہ کہہ کر کچھ دیر سالار کے رد عمل کا انتظار کیا۔ وہ خاموش تھا۔
 ”ہیلو۔“ امامہ کو خدشہ ہوا کہ شاید کال ڈراپ ہو گئی ہے۔
 ”میں سن رہا ہوں اس میگزین میں بس اتنا ہی لکھا تھا؟“
 وہ سنجیدہ لگ رہا تھا لیکن بات سنجیدہ نہیں تھی۔
 ”ہاں۔“

”گٹ۔ ڈینٹسٹ کے پاس گئی تھیں تم؟“ اس نے کسی رد عمل کا اظہار کیے بغیر بات بدلی تھی۔
 امامہ کی جھنجھلاہٹ میں اضافہ ہوا۔ وہ ایسا نہیں چاہتی تھی وہ اس سے بحث کرنا چاہتی تھی۔
 دو گھنٹے کے بعد اس نے ان دو ہفتوں پر پروگرام چارٹ اسے ای میل کر دیا۔ کانفرنس کی آرگنائزنگ باڈی کی طرف سے شرکا کو بھیجے ہوئے اس ڈاکومنٹ کو پڑھنے میں اسے کم سے کم پندرہ منٹ لگے۔ اس کے پندرہ دن کا شیڈول واقعی بہت hectic تھا۔ یہ ای میل اسے اس کے کس جملے کی وجہ سے کی گئی تھی وہ اندازہ کر سکتی تھی لیکن اس کے باوجود اس نے جوابی ای میل میں اس شیڈول کے بارے میں ایک لفظ کہا نہ ہی اپنی شرمندگی کا اظہار کیا۔

”تم نے فرقان کے گھر ڈنر پر جانا کیوں چھوڑ دیا؟“ سالار نے اس دن اس سے پوچھا۔
 ”میری مرضی۔“

وہ کہنا چاہتی تھی کہ ڈنر ٹیبل پر فرقان کو یا اس کی بیٹی کو دیکھتے ہوئے اسے وہ یاد آتا تھا اور وہ ہر روز ڈنر کے بعد کچھ زیادہ اپ سیٹ ہو رہی تھی اس لیے اس نے وہاں جانا چھوڑ دیا تھا لیکن وہ یہ سب نہیں کہہ سکتی تھی۔
 ”میں جانتا ہوں تم بہت بہادر ہو“ اکیلے رہ سکتی ہو تو ڈنر کرنا بھی تمہارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ پھر بھی ان کے گھر چلی جائیں تو کوئی ایکٹیوٹی ہوتی تمہارے پاس ان بے کار ٹائمرز کو پڑھنے کے علاوہ۔“

”تمہیں کیا پروا ہے؟“ اس نے سالار کے جملے پر جڑبڑہا کر کہا تھا۔
 ”مجھے تمہاری پروا ہے۔۔۔ یہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر بیٹھنا چھوڑ دو۔“ وہ سنجیدہ تھا۔
 ”تم نے مجھے نصیحتیں کرنے کے لیے فون کیا ہے؟“ وہ جھجھلائی۔
 ”ہاں۔“

”تو کرتے رہو۔“

”تم پر کوئی اثر نہیں ہو گا۔۔۔ یہی کہنا چاہتی ہو تم؟“

”تم باہر جا کر مجھ سے مس ملی ہو کر کرنے لگے ہو۔“

”کیا؟“ سالار کو لگا اسے سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔

”میں بار بار نہیں دہرا سکتی اپنی بات۔“ اس نے سرد مہری سے کہا۔

”میں مس ملی ہو کر رہا ہوں تمہارے ساتھ؟“ اس نے بے یقینی سے اس سے پوچھا۔

”ہاں۔“ جواب بالکل دو ٹوک تھا۔ سالار نے بے اختیار گہرا سانس لیا۔

”میں اگر تمہیں کوئی عقل کی بات سمجھاتا ہوں تو میں مس ملی ہو کر رہا ہوں تمہارے ساتھ؟“

”اب تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ میں بے وقوف ہوں؟“ سالار کا داغ گھوم کر رہ گیا۔

”میں نے کب کہا تم بے وقوف ہو؟“

”اب تم مجھ کو جھوٹا کہہ رہے ہو؟“ وہ بے بسی سے ہنس پڑا۔

”کیا ہوا ہے تمہیں امامہ؟“

”اب تم کہہ دو میرا داغ خراب ہو گیا ہے۔“

”پانی پیو۔“

”کیوں پیوں؟“

”اچھا مت پیو۔ موسم کیسا ہے باہر کا؟“

وہ اب موضوع بدلنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر وہ امامہ کے رد عمل پر بری طرح حیران تھا۔

”امامہ! کوئی پریشانی ہے تمہیں؟“ وہ اگلے دن نوشین کے ساتھ اس کے کہنے پر فورٹریس آئی تھی، جب ساتھ

چلتے چلتے نوشین نے اچانک اس سے پوچھا۔ وہ بری طرح چوکی، پھر اس نے مسکراتے کی کوشش کی۔

”نہیں۔۔۔ نہیں تو۔۔۔ کیوں؟“

”پھر اس طرح گم صدم کیوں ہو؟“ نوشین کے لہجے میں تشویش تھی۔

”نہیں میں۔۔۔ میں کچھ سوچ رہی تھی۔“

”سالار کے ساتھ تو بات ہوتی ہے تمہاری۔؟ کوئی جھگڑا تو نہیں ہے؟“

”نہیں تو۔۔۔ روز بات ہوتی ہے۔“ اس نے بے اختیار مسکراتے کی کوشش کے ساتھ ہی ڈسپلے پر لگے ایک

سوٹ کی طرف نوشین کو متوجہ کیا۔ وہ اسے یہ کیسے بتاتی کہ یہاں اس کے ساتھ پھرتے ہوئے اسے سالار بری طرح

یاد آ رہا ہے۔ وہ ہفتے میں دو یا تین بار اس کے ساتھ وہاں آ کر کافی یا چائے پیتے ہوئے اسی طرح ونڈو شاپنگ کرتے

تھے جس طرح اب وہاں سے گزرتے ہوئے کچھ دوسرے جوڑے کر رہے تھے وہ اسے کیسے نہ یاد آتا؟



”میگزین میں آج تم نے کچھ نہیں پڑھا ان مردوں کے بارے میں جو احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں اور اپنی بیویوں کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں؟“ سالار نے اگلے دن فون پر اس سے بات کرتے ہوئے اسے چھیڑا۔
امامہ کا موڈ بری طرح آف ہوا۔

”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو کہ ایسے مرد نہیں ہوتے اور میں نے فضول بات کہی ہے۔“
”میں مذاق کر رہا تھا امامہ۔“ وہ کچھ محتاط ہوا۔

”ایک سنجیدہ بات کو مذاق میں لے رہے ہو تم۔“

”کون سی سنجیدہ بات۔؟ امامہ! تم آج کل کون سے میگزین پڑھ رہی ہو؟“ وہ کہے بغیر نہیں رہ سکا۔
”تمہیں اس سے کیا؟“ وہ مزید بگڑی۔

”اگر تم مجھے اس طرح کے اسٹوپڈ ایکسپریس سناؤ گی تو میں پوچھوں گا تو سہی نا؟“

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ بحث کرنے لگا تھا۔ اب تقریباً ”ہر روزی“ کچھ ہو رہا تھا۔ پچھلے چار دن سے فون کال کے اختتام پر اسے معذرت کر کے فون بند کرنا پڑ رہا تھا۔ یہ بھی صرف اس لیے تھا کیونکہ وہ وہاں اپنی عدم موجودگی میں اس سے کوئی جھگڑا کر کے فون بند نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ خود اس کے لیے بہت مشکل کا باعث ہوتا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ امامہ کو کیا ہوا ہے۔ وہ ناراض پہلے بھی ہوتی تھی مگر اس طرح کی باتوں پر کبھی نہیں ہوتی تھی۔



سالار اگر اس کے بننے بگڑتے موڈ کو نہیں سمجھ پا رہا تھا تو وہ خود بھی اپنے آپ کو نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ وہ سارا دن اس کے بارے میں سوچ سوچ کر اداس ہوتی رہتی اور اس سے بات کرتے ہوئے وہ بلاوجہ اس سے جھگڑتی۔ اسے اس پر شدید غصہ آتا تھا اور کیوں آتا تھا یہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

وہ کئی سالوں بعد اتنے لمبے ڈیپریشن کا شکار ہوئی تھی اور زندگی میں پہلی بار تین ہفتوں میں وہ ایک ناول بھی مکمل نہیں کر پائی تھی، پینٹنگ تو خیر دور کی بات تھی۔

وہ سارا دن بی وی آن کے اس کی کال کے انتظار میں بیٹھی رہتی یا پھر کمپیوٹر آن کیے پرانی ای میلز پڑھتے ہوئے کسی نئی ای میل کے لیے بیٹھی رہتی۔ چند لائسنز کی وہ ای میلز جن میں وہ اس کا حال پوچھتا تھا اور اپنی ایکٹیویٹی بتاتے ہوئے اس سے پوچھتا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے، وہ ان ای میلز کو درجنوں بار پڑھتی۔ ایک لمبا چوڑا جواب لکھ کر اس کی ای میل کے انتظار میں ساری ساری رات اس کی چیریس نکال کر صاف کر کے ری آرینج کر لی یا پھر اس کی کو لیکشن میں موجود چار لیز بھینوں کی موویز دیکھتی رہتی۔ یہ واقعی بے بسی کی حد تھی کہ اسے وہ ایکٹریس بھی اب بری لگنا بند ہو گئی تھی جس کو وہ پہلے سالار کے سامنے دیکھنا پسند نہیں کرتی تھی۔

ہر روز کھانے کی ٹیبل پر وہ اس کے برتن بھی لگا دیتی، یہ جیسے کھانے کی ٹیبل پر اپنی تنہائی دور کرنے کی کوشش تھی۔

رات کو سونے کے لیے اپنے بستر میں لیٹے، وہ لائٹ آف کرنے کے بعد بھی کروٹ لیے، کتنی کتنی دیر اس کے بستر اور سرہانے کو دیکھتی رہتی۔ وہ سونے سے پہلے لائٹ آف کرنے کے بعد بھی اس سے کچھ دیر باتیں کیا کرتا تھا اور اب یہ خاموشی اس کے اعصاب کو بری طرح مضحک کر رہی تھی۔

عید کے لیے اسلام آباد جانے تک گھر کی اس خاموشی اور تنہائی نے اسے مکمل طور پر حواس باختہ کر دیا تھا۔

اسلام آباد سے آنے کے بعد بھی اس نے خود کو بہتر محسوس نہیں کیا تھا۔ سالار کی پوری فیملی میں سے صرف عمار اور یسری عید منانے کے لیے وہاں موجود تھے، باقی افراد بیرون ملک تھے۔ پچھلی عید جیسی رونق اس بار وہاں نہیں تھی۔

سالار نے طیبہ کو اس کی عید کی شاپنگ کروانے کے لیے کہا تھا۔ وہ بڑے بجھے دل کے ساتھ ان کے ساتھ چلی گئی تھی، لیکن پچھلی عید جیسا اشتیاق اس بار اسے کپڑوں کے لیے نہیں تھا۔ اسلام آباد آکر یہ بھی پہلی بار ہوا تھا کہ اس نے گیسٹ روم کی کھڑکی سے لگ کر اپنے گھر والوں میں سے کسی کے نظر آنے کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔ عید کی صبح پہلے کی طرح اس بار بھی وہ سالار کی کال پر ہی اٹھی تھی۔ وہ مائٹریال میں اپنا سیشن ختم کر کے کچھ دیر پہلے ہوٹل آیا تھا۔

”کون سے کپڑے پہن رہی ہو تم آج؟“ اس نے مبارک باد دینے کے بعد اس سے پوچھا۔

”تمہیں بتانے کا فائدہ؟“ اس نے بیڈ کے کراؤن کے ساتھ پشت ٹکاتے ہوئے کہا۔

”میں تصور کرنا چاہ رہا ہوں کہ تم کیسی لگ رہی ہو گی؟“

”میرے سامنے تم نے کبھی میرے کپڑوں کو غور سے دیکھا تک نہیں اب وہاں بیٹھ کر کیا تصور کرو گے؟“

”امامہ! ہم کم از کم آج آرگے نہیں کریں گے۔“ سالار نے مداخلت کرتے ہوئے جیسے پیشگی جنگ بندی کا اعلان کیا۔

”تمہیں کیا چاہیے آج؟ فلاورز اور ٹیک تو می سے میں نے کہا ہے تمہارے لیے کچھ اور چاہیے؟“

”نہیں۔“ وہ بے حد ادا اس تھی۔

”مجھے مس تو نہیں کر رہیں تم؟“ سالار نے مذاق کیا تھا لیکن اس نے جیسے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اٹھ آیا تھا۔ اس نے اپنی آستین کے ساتھ آنکھوں کو رگڑ کر صاف کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس کی خاموشی پر غور کیے بغیر بات کر رہا تھا۔ کینیڈا میں عید پہلے ہی ہو چکی تھی اور وہ عید کے دن بھی کانفرنس اٹینڈ کرتا رہا۔ وہ زندگی میں کئی عیدیں اسی طرح گزار چکا تھا۔ پچھلی عید اسے کم از کم اس عید والے دن اپنی مصروفیات کی وجہ سے یاد نہیں آسکی تھی، لیکن پچھلی عید امامہ کو پچھلے دو دن سے تنگ کر رہی تھی۔

”کب کی فلائٹ ہے تمہاری؟“ اس نے کوشش کی تھی کہ اس کی آوازیات کرتے ہوئے نہ بھرائے، یہ احتمالہ چیز تھی، باقی چیزوں پر رونا ٹھیک تھا۔ لیکن کم از کم وہ اس کے سامنے اس کے نہ ہونے کے لیے نہیں رو سکتی تھی۔ وہ بڑی شرمندگی محسوس کرتی اگر وہ یہ جان جاتا کہ۔

وہ اب اسے فلائٹ کا بتا رہا تھا۔

”تم نے مجھے کپڑوں کا کٹر نہیں بتایا؟“ سالار کو بات کرتے کرتے یاد آیا۔ ”تم نے می کے ساتھ جا کر کپڑے لیے تھے؟“

”ہاں لیے ہیں میں نے۔ جو آج پہنوں گی وہ ہیزل گرین ہے۔“

”ہیزل گرین؟“ وہ بے اختیار اٹکا۔ ”وہ تو آنکھیں ہوتی ہیں۔“

”آنکھوں کا کٹر ہوتا ہے۔ ہمیشہ کی طرح اس نے تصحیح کی۔

”اوہ۔ آج میں جینز کی آنکھوں کو غور سے دیکھوں گا۔“ اس نے ڈنر پر اپنی کسی ساتھی کا نام لیا۔

”کیوں؟“

”اس کی آنکھوں میں مجھے اپنی وائف کے کپڑوں کا کٹر نظر آئے گا۔“ وہ سنجیدہ تھا۔ وہ بے اختیار ہنس پڑی۔

”امامہ۔! جب سے میں یہاں آیا ہوں آج پہلی بار تم ہنسی ہو۔“ سالار نے اس کی ہنسی کو نوٹس کیا تھا۔

”اور شادی کے بعد اتنے مہینوں میں یہ پہلا کمر ہے جسے تم نے Identify کیا تھا اور وہ بھی کسی عورت کی آنکھوں کی وجہ سے۔“

”تم جہلس ہو رہی ہو؟“ وہ بھی ہنس پڑا تھا۔

”ہاں اب بس یہی تو ایک کام رہ گیا ہے میرے کرنے کے لیے۔“

اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

”یعنی نہیں ہو رہی ہیں یا نہیں ہو سکتیں؟“

وہ پوچھ رہا تھا اور وہ جواب نہ دے سکی۔ اس کی خاموشی پر وہ ہنسا تھا۔

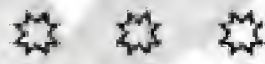
”اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے؟“ وہ کچھ جزبہ ہوئی تھی۔

”اپنی خوش فہمی پر ہنسا ہوں، تم کم از کم کسی عورت سے میرے لیے تو جہلس نہیں ہو سکتیں۔“

وہ اسے تنگ کر رہا تھا اور وہ جانتی تھی اس کا اشارہ رمشا کی طرف تھا۔

”تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ کب آرہے ہو؟“

اس نے بات بدلنا بہتر سمجھا تھا اور وہی گھسا پٹا سوال کیا جو وہ اس سے کرتی آرہی تھی۔



وہ عید کے دوسرے دن رات کی فلائٹ سے واپس لاہور آگئی تھی۔ کیونکہ اگلی رات آٹھ بجے کی فلائٹ سے وہ

واپس آرہا تھا۔ وہ زور زور سے اور حساسیت جو پچھلے چار ہفتوں سے اسے ناخوش رکھے ہوئے تھی وہ یکدم جیسے کہیں غائب ہو گئی تھی۔

اور چار ہفتے کے بعد بالآخر اس نے ایک کاغذ ٹکڑا اور وہ کین ڈسپوز آف کر دیے۔

اگر فرقان کو سیدھا ہاسپٹل سے ایمرپورٹ نہ جانا ہوتا تو وہ خود اسے ریسیو کرنے چلی جاتی، وہ کچھ اتنی ہی ایکسائٹڈ ہو رہی تھی۔

نونج کرپینٹائیس منٹ پر بالآخر ڈور بیل بجی اسے دروازے تک پہنچنے میں سیکنڈز لگے تھے۔

”خدا یا! کیا خوشی اس کو کہتے ہیں جو اس شخص کے چہرے پر پہلی نظر ڈالتے ہیں نے محسوس کی ہے؟“ اس نے

دروازہ کھول کر ڈور ہینڈل پر اپنا کپکپاتا ہاتھ رکھے سالار کو دیکھ کر اچھٹے سے سوچا تھا۔

فرقان سے باتیں کرنا دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ سیدھا ہوا اور ان دونوں کی نظریں ملیں۔ وہی گرم جوش مسکراہٹ جس کی وہ عادی تھی اور ہمیشہ کی طرح سلام میں بھی پہل اسی نے کی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی چند لمحوں کے لیے جیسے ساکت ہو گئی تھی۔

”امامہ! سامان کی ڈلیوری دینے آیا ہوں، چیک کر لو، کوئی بریکج یا ڈامیج تو نہیں ہے۔“ فرقان نے ایک سوٹ کیس کھینچ کر اندر لے جاتے ہوئے اس کو چھیڑا۔ سالار مسکرایا تھا۔

امامہ نے سلام کا جواب دینے کی کوشش کی تھی، لیکن اس کے گلے میں کوئی گرہ لگنے لگی تھی۔ بات گلے کی گرہ تک رہتی تو ٹھیک تھی، لیکن آنکھوں میں پانے کیسے اور کیوں آگیا تھا؟ وہ آگے بڑھا اور اس نے ہمیشہ کی طرح اسے گلے لگایا، جیسے وہ آفس سے آنے کے بعد لگایا کرتا تھا۔ بے ساختہ آنسوؤں کا ایک اور ریلہ آیا۔ یہی پتہ تو وہ ڈھونڈتی پھر رہی تھی، پچھلے چار ہفتوں سے، یہی نرم لمس، اپنے گرد بازوؤں کا یہی حصار۔ اس کے ساتھ لگے اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ اس کے جسم سے اٹھتی کلون کی منگ، ڈریسنگ ٹیبل پر کلون کی شیشی سے اٹھتی

مہک سے بالکل الگ تھی۔ وہ اس کے جسم پر لگنے کے بعد زیادہ مسحور کن تھی، زیادہ جان لیوا تھی۔
 ”کیسی ہو تم؟“ وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ گلے کی گرہیں اور بڑھ گئی تھیں۔ اس نے اب اسے خود سے الگ کیا اور اس کا چہرہ اور آنسو دیکھے۔

”کیا ہوا؟“ وہ ٹھٹھا اور سوٹ کیس اندر لے جاتے ہوئے فرقان نے پلٹ کر دیکھا۔
 ”میں ابھی۔۔۔ ابھی سلاڈ کے لیے پاز کاٹ رہی تھی۔“ اس نے کچھ گھبراہٹ میں مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ پھر شاید اسے خود ہی یہ بہانہ کمزور لگا۔ ”وہ سر میں بھی کچھ درد تھا۔۔۔ اور قلو تھا۔“ وہ فرقان کی مسکراتی ہوئی نظروں سے کچھ گڑبڑائی تھی۔
 سالار نے فرقان کو نظر انداز کیا اور اسے ایک بار پھر ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔
 ”تو بار! کوئی میڈیسن لیتی جا ہے تھی۔“

”کو کنگ ریج پر کچھ رکھ کر آئی ہوں۔“ وہ رکے بغیر کچن میں چلی آئی۔
 اس کے سامنے کھڑے رہ کر اس سے نظریں ملا کر جھوٹ بولنا بڑا مشکل ہو گیا تھا۔ سنک میں چہرے پر پانی کے چھپا کے مارنے کے بعد اس نے کچھ پانی پیا۔ آواز کی تھر تھراہٹ صرف اسی طرح ختم ہو سکتی تھی۔ وہ دونوں اب اس کے عقب ’لاؤنچ‘ میں کچن کاؤنٹر کے پاس کھڑے باتیں کر رہے تھے اور ان میں سے کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اپنا چہرہ کچن رول سے تھپتھپاتا کر اس نے چند گہرے سانس لے کر خود کو نارمل کیا۔
 ”بیٹھو! کھانا کھا کر جاؤ نا۔“ وہ جب لاؤنچ میں آئی تو سالار ’فرقان‘ سے کہہ رہا تھا۔

”نہیں“ اس وقت نہیں کھانے پر انتظار کر رہے ہوں گے بچے۔ کچھ دنوں کے بعد چلیں گے کہیں ڈنر کے لیے۔“ وہ بیرونی دروازہ کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ سالار دروازے تک اسے چھوڑنے گیا۔ وہ کچن میں آکر کھانے کے برتن نکالنے لگی۔

وہ دروازے سے واپسی پر کچن میں سیل فون پر بات کرتے ہوئے آیا تھا، فون پر سکندر تھے۔ امامہ نے اسے کچن کاؤنٹر پر رکھی پانی کی بوتل کو کھولتے دیکھا۔ فون ٹھنڈھے اور کان کے نیچے دبائے اس نے بوتل کا ڈھکن کھولا۔ امامہ نے اس کے گلاس کی طرف جانے سے پہلے ایک گلاس لا کر اس کے سامنے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ سالار کے ہاتھ سے بوتل لے کر اس نے گلاس میں اس کے لیے پانی ڈالا۔ سالار نے سکندر سے بات کرتے ہوئے سر کے اشارے سے اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر پانی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

”ایسا خیریت پوچھ رہے ہیں تمہاری۔“
 فریق کا دروازہ کھولتے ہوئے وہ مسکرائی۔
 ”میں اب ٹھیک ہوں۔“ سالار نے اس کے جملے پر غور کیے بغیر سکندر تک اس کا جملہ پہنچا دیا۔

کاؤنٹر پر پڑے سلاڈ میں سے سیب کا ایک ٹکڑا کاٹنے سے اٹھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے وہ اسی طرح فون پر سکندر سے بات کرتے ہوئے کچن سے نکلا۔ امامہ نے اسے ٹیرس کا دروازہ کھول کر ٹیرس کے پودوں پر نظر دوڑاتے

دیکھا۔ ٹیبل پر برتن رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر نمی آنے لگی۔ ایک مہینہ کے بعد یہ جگہ اسے ”گھر“ لگی تھی اور اس کی وجہ گھر میں گوجی وہ ”آواز“ اور ادھر سے ادھر جاتا اس کا وجود تھا۔ برتن رکھنے کے باوجود وہ جیسے بے اختیاری کے عالم میں ٹیبل کے پاس کھڑی ’فون کان‘ سے لگائے سالار کو ٹیرس پر ادھر سے ادھر ٹھہرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ بات محبت کی نہیں، عادت کی تھی۔ اسے اس کی عادت ہو گئی تھی اور عادت بعض دفعہ محبت سے بھی زیادہ جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔

اسے اچانک خیال آیا کہ وہ کھانا کھانے سے پہلے کپڑے تبدیل کرے گا۔ بیڈ روم میں جا کر وہ اس کے لیے کپڑے نکال کر واش روم میں لٹکا کر آئی۔

وہ واش روم سے نکل رہی تھی جب بیڈ روم میں داخل ہوا۔

”میں شاور لے کر کھانا کھاؤں گا۔“ اس نے جیسے اعلان کیا تھا۔

وہ نہ بھی کتا پھر بھی وہ جانتی تھی وہ سفر سے واپسی پر ہمیشہ نما کر ہی کھانا کھاتا تھا۔

”میں نے تمہارے کپڑے اور ٹاوٹر رکھ دیے ہیں اور یہ میں تمہارے لیے نئے سلپرز لے کر آئی تھی۔“ وہ سلپرز کا ڈبا شوریک سے نکالتے ہوئے بولی۔

”رہنے دو امامہ! میں خود ہی نکال لوں گا۔“

رسٹ وائچ اتارتے ہوئے اس نے امامہ کو منع کیا۔ اسے کبھی بھی کسی دوسرے کا اپنا جوتے اٹھانا پسند نہیں تھا، وہ جانتی تھی۔ لیکن اس کے منع کرنے کے باوجود وہ سلپرز نکال لائی تھی۔

”کچھ نہیں ہوتا۔“ اس نے سلپرز اس کے پاس رکھ دیے۔

وہ اب بیڈ پر بیٹھا اپنے جوتے اور جرابیں اتار رہا تھا اور وہ بے مقصد اس کے پاس کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ شادی کے اتنے مہینوں میں آج پہلی بار وہ اس طرح بے مقصد اس کے پاس کھڑی تھی۔ سالار نے کچھ حیرانی سے نوٹس کیا تھا۔

”یہ یلو کپڑے تم نے میرے انتظار میں بنے ہیں؟“ اس نے جرابیں اتارتے ہوئے امامہ کو چھیڑا۔ وہ بے وجہ ہنسی۔ وہ مسٹرڈ کو یلو کہہ رہا تھا، لیکن آج اس نے اس کی تصحیح نہیں کی اور اس نے آج بھی اس کی تعریف نہیں کی تھی مگر اسے یہ بھی برا نہیں لگا تھا۔

”مائس سلپرز!“ اپنی جرابیں اور جوتے اٹھاتے ہوئے اس نے سلپرز بننے اور امامہ سے کہا۔

”میں رکھتی ہوں۔“ امامہ نے جوتے اور جرابیں اس سے لینے کی کوشش کی۔

”کیوں یار، پہلے کون رکھتا ہے؟“ سالار نے کچھ حیرانی سے اسے روکا، امامہ رک گئی۔ واقعی وہ اپنے جوتے خود اٹھانے کا عادی تھا۔ جوتے شوریک میں رکھتے ہوئے اس نے لائڈری باسکٹ میں جرابیں ڈالیں اور واش روم میں گھس گیا۔

امامہ نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑی اس کی رسٹ وائچ اور سیل فون کو دیکھا۔ ہر خالی جگہ بھرنے لگی تھی۔

وہ جب تک نما کر آیا امامہ کھانا لگا چکی تھی۔ سالار نے ڈائمنگ ٹیبل پر نظر ڈالتے ہی بے اختیار کہا۔

”امامہ! کیا کیا پکا رکھا ہے یار!“

”جو جو تمہیں اچھا لگتا ہے۔“ اس نے ساوگی سے کہا۔

”مجھے۔۔۔؟“ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے ٹیبل پر پھیلی ہوئی ڈشز دیکھ کر جیسے کسی سوچ میں پڑا۔

”تم نے اپنا وقت ضائع کیا۔“

کوئی اور وقت ہوتا تو وہ پورے دن کی محنت پر بولے جانے والے اس جملے پر بری طرح ناراض ہوتی، لیکن آج اسے کچھ برا نہیں لگ رہا تھا۔ کسی بات پر غصہ نہیں آ رہا تھا، وہ اتنی ہی سرشار تھی۔

”میں نے اپنا وقت تمہارے لیے استعمال کیا۔“ اس نے مدھم آواز میں سالار کی تصحیح کی۔

”لیکن تم تھک گئی ہو گی۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔ کیوں تھکوں گی میں؟“ اس نے چاولوں کی ڈش سالار کی طرف بڑھائی۔

سالار نے اس کی پلیٹ میں ہمیشہ کی طرح پہلے چاول ڈالے۔ اپنی پلیٹ کے ایک کونے میں پڑے ان چاولوں کو دیکھ کر اس کا دل بھر آیا تھا۔ تو اتنے دنوں سے یہ ایک چیز تھی جو وہ مس کر رہی تھی کھانے پر اور یہ ”ایک“ چیز نہیں تھی۔ وہ اب اپنی پلیٹ میں چاول ڈال رہا تھا۔ ایک مہینے کے بعد وہ اس کے اتنے قریب بیٹھی تھی۔ کھانا سرو کرتے اس کے ہاتھ دیکھ رہی تھی۔ سفید شرٹ کی آستھنیں موڑے اس کے ہاتھوں نے ہمیشہ کی طرح اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ اس کا دل بے اختیار اس کے ہاتھ چھونے کو چاہا اس نے بمشکل نظر ہٹائی خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس کے لیے یہ یک دم بہت مشکل ہو رہا تھا کہ وہ اس کے قریب ہو اور وہ صرف کھانے کی طرف متوجہ رہے۔

”ہینٹنگز مکمل ہو گئی ہیں تمہاری؟“

وہ کھانا شروع کرتے ہوئے اس سے پوچھ رہا تھا۔ امامہ نے چونک کر ٹیبل پر پڑا کانا اور ہچکچا اٹھایا۔

”کون سی ہینٹنگز؟“ اس نے بے خیالی میں کہا وہ ٹھٹکا۔

”تم ہمارے تھیں نا، کچھ؟“ اس نے یاد دلایا۔

”یہ بھی لو۔“ جواب دینے کے بجائے اس نے ایک اور ڈش اس کی طرف برہائی۔

”ڈر تو نہیں لگا تمہیں یہاں اکیلے رہتے ہوئے؟“ سالار نے اس سے پوچھا۔

”کھانا اچھا ہے؟“ امامہ نے ایک بار پھر جواب گول کیا۔ وہ مزید جھوٹ نہیں بول سکتی تھی بالکل ویسے ہی جیسے

وہ سچ نہیں بول سکتی تھی۔

”ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔“ وہ مسکرایا تھا۔

”کتنے ناؤ لڑ رہے تم نے؟“ وہ اب پوچھ رہا تھا۔

”یہ چوپس بھی ہیں۔“ اس نے ایک اور ڈش سرو کی۔

”تمہاری فلائٹ ٹھیک رہی؟“

اس سے پہلے کہ وہ اس سے کوئی مشکل سوال کرتا اس نے پوچھنا ضروری سمجھا تھا۔

”ہاں! اور آل کچھ bumpy رہی۔ لیکن ٹھیک ہی تھی۔“ اس نے بتایا۔

”اور کانفرنس بھی اچھی رہی؟“

”ایکسی لہنٹ“ اس نے بے اختیار کہا۔

”کیا رو مین تھیں تمہاری؟“ وہ اسے موضوع سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔

”میری رو مین۔“ وہ سوچ میں پڑی۔

”ہاں! کیا کرتی تھیں سارا دن؟“ وہ اب چپاتی کا ٹکڑا توڑتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”جو پہلے کیا کرتی تھی۔“ اس نے نظریں چرا کر ایک اور ڈش اس کی طرف برہائی۔

”لیکن تب تو بہت زیادہ وقت ہوتا ہو گا تمہارے پاس۔“ اس نے کرید اٹھا۔

”بالکل ساری شام ساری رات۔“

”پھر تو عیش ہو گئے ہوں گے تمہارے؟“ اپنی پلیٹ میں قورمہ نکالتے ہوئے اس نے مسکرا کر کہا۔

امامہ نے جواب دینے کے بجائے اپنی پلیٹ کو دیکھا جس میں چیزوں کا ڈھیر بالکل اسی طرح پڑا تھا۔ اس سے کچھ

کھایا نہیں جا رہا تھا۔ سالار کو اتنی رغبت کے ساتھ کھاتے دیکھ کر اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا پیٹ بھر رہا ہو۔

”تم سعیدہ اماں کو یہاں لے آئیں۔“ سالار نے یک دم اس سے کہا۔ اسے بتائیں کیا خیال آیا تھا۔

”میں نے کہا تھا ان سے، لیکن تمہیں تو ہوتا ہے، وہ اتنے دنوں کے لیے اپنا گھر نہیں چھوڑ سکتیں۔“
اس نے جواب دیا۔

”That's understandable۔“ سالار نے کھانا کھاتے ہوئے بے اختیار ایک نوالہ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ آخری لقمہ ہمیشہ اسے ہی کھلاتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ ٹھنکی پھر اس نے لقمہ منہ میں لے لیا، لیکن وہ اسے چبا نہیں سکی۔ وہ لقمہ جیسے آخری حد ثابت ہوا، وہ بے اختیار رو پڑی۔ وہ پانی پیتے پیتے ایک دم رک گیا۔
”کیا ہوا؟“ وہ ہکا بکا تھا۔ ہونٹوں پر ہاتھ رکھے وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئی گئی۔
”کیا ہوا ہے امامہ؟“ وہ بری طرح جد حواس ہوا۔ کم از کم اس وقت اس طرح کی گفتگو کے دوران آنسو۔؟ وہ ان کی وجہ تلاش نہیں کر سکا۔

ایک دفعہ آنسو بہہ جانے کے بعد سب کچھ آسان ہو گیا تھا۔ مزید رونا، بے بسی کا اظہار اور کمزوری کا اعتراف۔ اب مزید دیواریں کھڑی رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

”فار گاڈ سیک۔ تمپاگل کر دو گی مجھے، کیا ہوا ہے۔؟ سب کچھ ٹھیک رہا میرے بعد؟ کسی نے تمہیں پریشان تو نہیں کیا؟“ وہ اب مکمل طور پر حواس باختہ تھا۔ ٹشو پیپر سے آنکھیں رگڑتے ہوئے امامہ نے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے سر ہلایا۔

”تو پھر کیوں رو رہی ہو؟“ سالار مطمئن نہیں ہوا تھا۔

”ایسے ہی بس میں تمہیں بہت مس کرتی رہی اس لیے۔“ وہ کہتے کہتے پھر رو پڑی۔

کیا شرمندگی سی شرمندگی تھی جو اس نے یہ اعتراف کرتے ہوئے محسوس کی تھی۔ سالار کو لگا اسے سننے میں کچھ غلطی ہوئی تھی۔
”کس کو مس کیا؟“

”تمہیں۔“ اس نے سر جھکا کر روتے ہوئے کہا۔ وہ چند لمحوں کے لیے ساکت ہو گیا۔

”مجھے کس لیے؟“ یہ بے یقینی کی انتہا تھی۔

وہ روتے روتے ٹھنکی۔ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، پھر بے حد خفگی کے عالم میں ٹیبل سے اپنی ڈنر پلیٹ اٹھاتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

”میرا دل غ خراب ہو گیا تھا اس لیے۔“ وہ کچھ بول نہیں سکا۔

شادی کے تقریباً ”چار ماہ میں اس نے پہلی بار یہ جملہ اس سے کہا تھا، ورنہ وہ آئی لو یو کے جواب میں بھی تھینک یو کہنے کی عادی تھی۔

وہ اب برتن اٹھا اٹھا کر اندر لے جا رہی تھی اور سالار بالکل ہونق سا پانی کا گلاس ہاتھ میں لیے، اسے اپنے سامنے سے برتن ہٹاتے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے رونے سے کبھی اتنا حواس باختہ نہیں ہوا تھا، جتنا اس کے اس معمولی سے اعتراف سے ہو گیا تھا۔

وہ شاکذ نہ ہوتا تو کیا کرتا۔ وہ چار ہفتے پہلے بڑے دھڑلے سے اسے کہہ رہی تھی کہ۔ اور پانی کا گلاس ہاتھ میں لیے، بت کی طرح کرسی پر بیٹھے، کوئی اس کے سامنے جیسے کسی معمر کے ٹکڑے ترتیب دینے لگا تھا۔ وہ چار ہفتے باہر رہ کر اس کے جس رویے کو سمجھنے کی کوشش میں ناکام ہو گیا تھا، وہ اب سمجھ میں آ رہا تھا۔ یہ ناقابل یقین تھا کم از کم اس کے لیے کہ امامہ اسے۔

اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ کچن میں ادھر سے ادھر جاتے ہوئے اسی طرح آنکھیں رگڑتے ہوئے

جس پر سمٹ رہی تھی۔

وہ گلاس نیبل پر رکھ کر کچن میں آگیا، وہ فریج سے سویشڈش نکال رہی تھی۔ سالار نے اس کے ہاتھ سے ڈونگا پکڑ کر کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ کچھ کے بغیر اس نے اسے گلے لگایا تھا۔ بڑی نرمی سے یوں جیسے تلافی کر رہا ہو، معذرت کر رہا ہو۔ وہ خفگی سے الگ ہونا چاہتی تھی، اس کا ہاتھ جھٹکنا چاہتی تھی، لیکن بے بس تھی۔ فی الحال دنیا میں وہ واحد شخص تھا جو اسے اس طرح گلے لگاتا تھا۔ برسات پھر ہونے لگی تھی۔ وہ اس کی عادتیں خراب کر رہا تھا کسی پیراسائٹ کی طرح اسے اپنا محتاج کر رہا تھا۔

وہاں کھڑے دونوں کے درمیان ایک لفظ کا بھی تبادلہ نہیں ہوا تھا، کوئی معذرت، کوئی اظہار محبت، کچھ نہیں۔ زندگی کے اس کھیل میں لفظ فالتو تھے، جس میں وہ لیڈ کر رہے تھے۔ برسات سمجھنے لگی تھی۔ وہ ہاتھ سے گال اور آنکھیں خشک کرتی اس سے الگ ہو گئی۔ ”دراصل میں گھر میں اکیلی تھی اس لیے مس کرتی رہی۔“

انکار، اقرار، اعتراف، پھر انکار۔ یہ مشرقی عورت کی زندگی کا دائرہ تھا، وہ بھی اسی دائرے میں گھومنے لگی تھی۔ جھوٹ کی ضرورت پھر آن پڑی تھی۔ اپنے گرد کھڑی دیوار کے شکاف کو اس نے پھر سے بھرنا شروع کر دیا۔ ”ہاں“ اکیلے ہوں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔“ سالار نے اس جھوٹ کو سچ بنانے میں اس کی مدد کی۔ امامہ کا حوصلہ بڑھا۔

”دانت میں درد تھا تو۔ تو۔ اس لیے مجھے رونا آگیا۔“ وہ انکی پھر اس نے کہا۔ ”ہاں“ مجھے اندازہ ہے دانت کا درد بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ایک دفعہ ہوا تھا مجھے۔ میں جانتا ہوں کیا حالت ہوتی ہے۔“ ایک دوسرے کے سامنے کھڑے، وہ نظریں ملائے بغیر جھوٹ بول رہے تھے۔ ”آ۔ آ۔“ وہ انکی اب تیسرا جھوٹ ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ جو سوال آ رہا تھا اس نے وہی پوچھا ”تم نے مجھے مس نہیں کیا؟“ وہ پھر گلی کے اسی موڑ پر آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ”ہردن، ہر گھنٹہ، ہر منٹ، ہر سیکنڈ۔“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہہ رہا تھا اور امامہ کی آنکھوں میں

جیسے ستارے جھلکانے لگے تھے۔ بعض دفعہ ہم کوئی فلاسفی، کوئی حقیقت نہیں سننا چاہتے، بس وہی روایتی باتیں سننا چاہتے ہیں، جنہیں فلم کے پردے اور کتاب کے صفحے پر ہم ہزاروں بار پڑھتے ہوئے ہنستے ہیں، وہ بھی روایتی باتیں کر رہا تھا، وہی جملے جو اس وقت اس کے منہ سے سننا چاہتی تھی۔

”چار ہفتے تمہارے ساتھ نہیں تھا۔ اگر تمہارا خیال ساتھ نہ ہوتا تو میں مرجاتا۔“ ”تم جھوٹے ہو۔“ وہ بھرائی آواز میں روتے ہوئے ہنسی تھی۔ ”تم بھی۔“ سالار نے بے ساختہ جتایا۔

وہ روتے ہوئے ہنس رہی تھی یا ہنستے ہوئے رو رہی تھی، لیکن چار ماہ میں پہلی بار سالار کے لیے وہ برسات قابل اعتراض نہیں تھی۔ اتنے عرصے میں پہلی بار اسے احساس ہوا کہ وہ ”برسات“ اسے کبھی بھی ڈبو سکتی ہے۔



وہ اس رات بیڈ پر اس سے چند انچ دور، کروٹ کے بل لیٹے، کہنی تکیے پر ٹکائے اس سے باتیں کرتی رہی تھی۔ ایک مہینے کے دوران اکٹھی ہو جانے والی ساری باتیں۔ بے مقصد، بے معنی چیزوں اور واقعات کی تفصیلات، کس کی کال آئی، کس سے اس کی کیا بات ہوئی، ملازمہ نے اس سے کیا کہا، ٹی وی پر چلنے والے کسی پروگرام میں اس نے کیا دیکھا، کون سے میگزین میں اس نے کیا پڑھا۔ ٹی وی پر رکھے کتنے لوگوں پر نئے پھول نکلے ہیں، فرقان اور

نوشین کے بچے کتنی بار اس کے گھر آئے وہ نوشین کے ساتھ کتنی بار بازار گئی، کیا خرید، کیا پسند نہیں آیا۔ اسے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ صرف وہ بول رہی تھی۔ سالار بالکل خاموش چپت لیٹا اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اسے سن رہا تھا۔ ایک ہاتھ پر سر ٹکائے وہ دوسرے ہاتھ سے غیر محسوس انداز میں اس کے بازو پر انگلی سے چھوٹے بڑے دائرے بناتے ہوئے اس سے باتیں کرتی رہی۔ وہ ”خاموش سامع“ پلکیں جھپکائے بغیر صرف اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

اس کی آنکھوں کے تاثرات اس کے چہرے پر جھلکنے والے رنگ اس کے ہونٹوں کی حرکت بات کرتے ہوئے اس کی ہنسی کی کھلکھلاہٹ اس کے چہرے پر کھلنے والے رنگ وہ جیسے سینما کی فرنٹ رو میں بیٹھا ہوا ایک محرزہ ناظر تھا۔ کہنی کے بل ہم دراز جب وہ ٹھک جاتی تو پھر اس کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہتی ”اچھا، چلو، اب سو جاتے ہیں۔“

یہ جملہ وہ شاید تجسس دفعہ کہہ چکی تھی۔

اس کے کندھے پر سر رکھے اسے پھر کچھ یاد آتا تو وہ یک دم سر اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھتی ”میں نے تمہیں یہ بتایا ہے کہ۔؟“

سالار نفی میں سر ہلاتا گفتگو پھر دوبارہ وہیں سے شروع ہو جاتی۔ خاموش سامع پھر ”وہی“ فلم دیکھنے لگتا۔ ”یہ کون سی اذان ہو رہی ہے؟“ وہ بات کرتے کرتے چوٹکی۔

دور کہیں سے اس نے اذانوں کی آوازیں سنی تھیں۔

”فجر کی۔“ سالار نے پرسکون انداز میں کہا۔ وہ بری طرح گڑ بڑاتی۔

”اوہ مانی گاڈ! فجر ہو گئی۔ اور میں۔۔۔ تمہیں تو سونا چاہیے تھا تم تو تھکے ہوئے تھے مجھے بتا ہی نہیں چلا۔ تم مجھ سے کہہ دیتے۔“ وہ اب بری طرح تادم ہو رہی تھی۔ ”مجھ سے کہنا چاہیے تھا تمہیں۔ کیوں نہیں کہا تم نے؟“

”کیا کہتا؟“ وہ اب پرسکون تھا۔

”یہی کہ تم سونا چاہتے ہو۔“

”لیکن میں تو سونا نہیں چاہتا تھا۔“

”لیکن مجھے تو وقت کا پتا نہیں چلا، کم از کم تمہیں بتانا چاہیے تھا مجھے۔“ وہ واقعی شرمندہ ہو رہی تھی۔

”تمہارا خیال ہے مجھے وقت کا احساس تھا؟“

”تم سو جاؤ اب اور آئی ایم سوری۔ کتنی فضول باتیں کیں میں نے، تم بھی کیا سوچ رہے ہو گے؟“ اسے اب احساس ہوا تھا کہ وہ کتنی دیر سے اکیلی ہی بول رہی تھی۔ وہ ہوں ہاں تک نہیں کر رہا تھا۔

”میں تو نماز پڑھ کر سووں گا اب اور میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ آج تم نے مجھ سے اتنی باتیں کیسے کر لیں۔“

”تم نے تو غور سے سنی بھی نہیں ہوں گی میری باتیں۔“ وہ کچھ شرمندگی سے مسکرائی۔

”ایک ایک بات سنی ہے۔ چاہو تو شروع سے دہرا دیتا ہوں۔ آج تک تم نے جب جب جو جو کہا ہے، مجھے یاد ہے۔ ہمیشہ یاد رکھوں گا۔“

اس کا لہجہ ہموار تھا، لیکن آنکھوں میں کوئی تاثر تھا جس نے چند لمحوں کے لیے امامہ کو باندھا تھا۔

”اسی طرح جاتیں کہو گی تو ہر رات جاگ سکتا ہوں تمہارے لیے۔“ امامہ نے نظریں چرائیں۔

بعض دفعہ اس سے نظریں ملانا اس کی باتوں پر یقین کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ اور بعض دفعہ اس زندگی کے بارے

میں بھی کچھ کہنا مشکل ہو جاتا تھا جو وہ اس کے ساتھ گزار رہی تھی۔

اس سے کچھ دور ہٹتے ہوئے اس نے تکیے پر سر رکھ دیا۔ وہ اب سیدھی لیٹی چھت کو دیکھ رہی تھی۔
سائڈ ٹیبل پر پڑے سیل فون کے یکدم بجتے الارم کو بند کرتے ہوئے سالار نے اس کی طرف کروٹ لی۔ کہنی کے بل۔ ہم دراز اس نے امامہ سے کہا۔

”کچھ اور بتانا ہے تم نے؟“ امامہ نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ سنجیدہ تھا۔
”نہیں۔“ اس نے مدھم آواز میں کہا۔

”آئی لو۔“ جواباً سالار کے جملے نے چند لمحوں کے لیے اسے ساکت کیا۔ وہ اس کے پاس تھا، اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا جیسے جواباً اس سے کچھ سننے کی خواہش رکھتا ہو۔ امامہ نے کبھی اس کی آنکھوں کو اتنی آسانی سے نہیں پڑھا تھا۔ شاید وہ اتنے قریب تھا اس لیے۔ وہ جیسے اپنی آنکھوں سے اسے پہناٹا کر کیے ہوئے تھے۔

”تھینک یو۔“

وہ بے اختیار ہنسا۔ ایک گہرا سانس لے کر ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کرتے ہوئے اس نے جیسے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ بعض خواہشیں کوشش سے پوری نہیں ہوتیں اور بعض سوالوں کا کوئی جواب نہیں مل پاتا۔ وہاں اس کے اتنے قریب کوئی اور عورت ہوتی تو اسے ”اظہار محبت“ ہی ملتا۔ یہ امامہ ہاشم تھی اس کا ”اظہار تشکر“ ہی کافی تھا۔ اس پر جھکتے ہوئے اس نے بہت نرمی سے اس کے ہونٹ چھوئے پھر اس کا ہاتھ پھر وہ بیڈ سے اٹھ گیا۔



”یہ میں تمہارے لیے لایا تھا۔“ وہ دس بجے کے قریب اس کے ساتھ ناشتہ کرنے کے بعد ٹیبل صاف کر رہی تھی جب وہ بیڈ روم سے ایک خوب صورت پیکنگ میں ایک باکس لے کر اس کے پاس آیا تھا۔
”یہ کیا ہے؟“ وہ ٹیبل صاف کرتے کرتے رک گئی۔
”دیکھ لو۔“ سالار نے باکس اس کی طرف بڑھایا۔

”جیولری ہے؟“ اس کو ————— لیبل اور باکس کے ڈیزائن سے کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔ سالار جواب دینے کے بجائے کندھے اچکا کر خاموش رہا۔ امامہ نے بڑے تجسس اور احتیاط سے اس باکس کی بے حد نفیس اور خوب صورت پیکنگ کو ہٹا کر باکس کھول لیا۔ سرخ مخمل جیسے ایک بے حد تہنیں اور چمک دار کپڑے کی تہوں کے درمیان ایک کرشل رنگ کیس تھا اور اس کیس سے نظر آنے والی رنگ نے کچھ دیر کے لیے اسے ساکت کر دیا تھا۔ اسکو رڈائمنڈز کے بینڈ کے ساتھ وہ ایک پلائٹینم ٹیولپ ڈائمنڈ رنگ تھی۔ چوہ قیراط کے اس ڈائمنڈ کے گرد ننھے ننھے عظیم کے گول گول نگینوں کا ایک دائرہ تھا۔ بہت دیر۔ سمرا نے اس رنگ پر نظر میں جمائے اس نے بے اختیار گہرا سانس لے کر اپنا پہلا رد عمل دیا۔ یہ صرف ڈائمنڈ ہی نہیں تھے جو اس کی نظروں کو خیرہ کر رہے تھے بلکہ وہ پیچیدہ ڈیزائن بھی جس میں وہ سارے جیولر جڑے تھے۔

”یہ بہت خوب صورت ہے۔“ اس نے بمشکل کہا۔ سالار نے ہاتھ بڑھا کر کرشل کا کیس کھول کر رنگ کو نکال لیا۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے وہ رنگ اس کی انگلی میں پہنا دی۔
”ہاں یہ اب خوب صورت لگ رہی ہے۔“

رنگ پہنانے کے بعد اس نے اس کے ہاتھ پر ایک نظر ڈالنے کے بعد کہا۔
”اور دیکھو! یہ بالکل میری انگلی کے سائز کے مطابق ہے۔“ وہ جیسے کچھ اور ایکسائینڈ ہوئی تھی۔
”تمہاری انگلی کا سائز لے کر بتائی گئی ہے کیونکہ تمہاری ایک رنگ لے کر گیا تھا میں۔“

اس نے اس ہاتھ کو چومتے ہوئے کہا جس میں وہ رنگ تھی۔ اس رنگ نے اس کے ہاتھ کو سجا دیا تھا۔ وہ جس ہاتھ میں بھی ہوئی دیکھنے والے پر ایسا ہی تاثر چھوڑتی۔
 ”یہ ویڈیو گفٹ ہے تمہارے لیے۔“ سالار نے اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔ اس نے کچھ حیران ہو کر سالار کو دیکھا۔

”ویڈیو گفٹ۔؟ چار ماہ ہو گئے ہیں شادی کو۔“
 ”ہاں! میں نے تمہیں ویڈیو گفٹ نہیں دیا تھا۔ پہلے یاد نہیں تھا بعد میں پیسے نہیں تھے۔“ اس نے اس کر کہا۔

”اور اب کہاں سے آئے پیسے؟“
 ”آگئے نہیں سے۔“ اس نے ٹالا۔ امامہ نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔
 ”کوئی غلط کام نہیں کیا میں نے۔“ وہ بے اختیار شرمندہ ہوئی۔
 ”میں نے کب کہا کہ۔“

”چلو! ڈاکٹر صاحب کے ہاں چلتے ہیں اور سعیدہ اماں سے بھی مل کر آتے ہیں۔ میرے بیک میں کچھ گفٹس ہیں ان کے لیے وہ نکال لو۔“ سالار نے اسے بات مکمل کرنے نہیں دی تھی۔
 ”تھینک یو سالار!“ وہ جاتے جاتے ٹھٹکا۔
 ”کس لیے؟“
 ”ہر چیز کے لیے۔“

”یہ سب تمہارا ہی ہے۔“ امامہ نے نظریں چرائیں۔
 ”میں نے سوچا تمہیں یاد بھی نہیں ہو گا کہ تم نے مجھے شادی پر کوئی گفٹ نہیں دیا۔“ اپنے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے خوشی سے سرشار ہو رہی تھی۔ وہ واحد گلہ تھا جو وہ اپنے دل میں سالار کے لیے رکھے ہوئے تھی۔
 ”نہیں بھولا نہیں تھا۔“

امامہ کو لگا کہ وہ کچھ اور کہنا چاہتا ہے۔ سالار نے بات ادھوری چھوڑی تھی یا بدلی تھی یہ وہ سمجھ نہیں سکی۔



”مائی گاڈ۔! دیکھو۔“ وہ واکیوے پر چلتے چلتے بے اختیار ٹھٹکی تھی۔
 سالار نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔ وہ دونوں ریس کورس میں لگنے والے ایک میلے کو دیکھنے آئے تھے۔ اب بے مقصد میلے کی جگہ سے کچھ دور چل قادی میں مصروف تھے جب امامہ اس واکیوے کے داہنی طرف درختوں کے اطراف پانی میں ڈوبی ہوئی گھاس میں نظر آنے والے عکس کو دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔ وہ پچھلی رات کی بارش کا پانی تھا جو ابھی پوری طرح ڈرین آؤٹ نہیں ہو سکا تھا۔ دیو قامت درختوں کے تنوں اور شاخوں پر لگے رنگین برقی ققمیوں اور ٹیوب لائٹس کا عکس نیچے جمع شدہ پانی میں پڑ رہا تھا۔
 اس عکس کو دیکھتے ہوئے وہ بھی کچھ دیر کے لیے اسی طرح سحر زدہ سا ہو کر رہ گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی رنگ و نور سے بھری کسی وادی کے کنارے کھڑے اس میں چمکتے ہوئے رنگین ہیرے جواہرات کے درخت دیکھ رہے ہوں یا الف لیلیٰ کا کوئی منظر دیکھ رہے ہوں۔ ہوا کے جھونکوں سے پانی میں بہت ہلکا سا ارتعاش پیدا ہو رہا تھا اور ان روشنیوں اور درختوں کا عکس منعکس ہو کر جیسے محور قص تھا۔ طلسم ہو جیسا جیسے پانی کی لہروں پر ڈول رہی تھی۔

”نیوں لگ رہا ہے جیسے جنت میں رات ہو گئی ہے۔“
طویل خاموشی کے بعد اس نے امامہ کی آواز سنی۔ اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ پلکیں جھپکے بغیر ابھی تک اس پانی کو دیکھ رہی تھی جس کی روشنیوں کا عکس اس کے چہرے پر پڑ رہا تھا۔
”ایسی ہوتی ہوگی جنت؟“ سالار نے اسے کہتے سنا۔

وہ کچھ کہنے کے بجائے دوبارہ اس پانی کو دیکھنے لگا۔ اس وسیع و عریض پارک کی روشنیوں سے جتنے نور بنے ہوئے حصے میں گھومتے لوگوں کو اندازہ بھی نہیں ہو پارہا ہو گا کہ وہاں سے بہت دور ایک نیم تاریک روش پر کھڑے دو لوگ پانی میں نظر آنے والے ایک عکس میں جنت ڈھونڈ رہے تھے۔
”جنت میں ستارے ہوں گے؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔

”ہاں! بہت سارے ہوں گے۔“ اس نے اندازہ لگایا۔
”اتنے رنگوں کے؟“ اس نے ان روشنیوں کے رنگ گنے۔
”کائنات میں موجود ہر رنگ۔“ وہ بے اختیار محفوظ ہو کر ہنسی اسے جواب پسند آیا تھا۔
”رات ایسے ہی منور ہوتی ہوگی؟“ عکس پر نظریں جمائے وہ جیسے بے خود ہو رہے تھے۔
”اس سے زیادہ روشن اس سے زیادہ منور۔“ سالار نے بے اختیار کہا۔ وہ جھکی اور اس نے اپنی انگلیوں سے عکس کو چھونے کی کوشش کی۔ سالار نے بروقت اسے کھینچا۔
”درختوں پر لائٹس آن ہیں پانی میں کرنٹ بھی ہو سکتا ہے۔“ وہ ناراض ہوا تھا۔
”میں اسے چھونا چاہتی تھی۔“
”یہ عکس جنت نہیں ہے۔“
”جنت میں اور کیا ہو گا؟“

”تم؟“ اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا وہ عکس کو دیکھ رہا تھا۔
”صرف میں اور تم نہیں ہو گے؟“ پتا نہیں اس نے گردن موڑ کر بے حد عجیب مسکراہٹ کے ساتھ اسے

دیکھا۔
”تو پھر تم کیسے جانتے ہو کہ میں وہاں ہوں گی؟“ اس نے اسے تنگ کیا۔
”جنت کے علاوہ کہیں اور رکھا جاسکتا ہے تمہیں؟“ اس نے جواباً سوال کیا۔ اس کے لہجے میں رشک تھا وہ

ہنس پڑی۔
”اتنی آسانی سے مل جاتی ہے جنت؟“ اس نے جیسے سالار کو حتمایا۔
”مجھے آسانی سے نہیں ملے گی تمہیں آسانی سے مل جائے گی۔“ اس کا لہجہ پھر عجیب سا تھا۔
”کیوں؟“ وہ حیران ہوئی۔

”تم جتنی آسانی سے ہر چیز میں ”جنت“ ڈھونڈ لیتی ہو میں آج تک نہیں ڈھونڈ سکا۔ اس لیے کہہ رہا ہوں۔“
وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔

دو دن پہلے وہ گھر کے لیے لیمپ خریدنے گئے تھے۔ انہوں نے بیڈ روم کے لیے لیمپس کا ایک سیٹ خریدا اور وہ رات کو ٹاول پڑھتے پڑھتے لیمپ شیڈ کو دیکھنے لگی۔ وہ ای میل چیک کرنے کے بعد اپنا لیمپ ٹاپ بند کرنے لگا تو اس نے امامہ کو دیکھا۔ وہ اب بھی اسی طرح لیمپ شیڈ پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔
”کیا دیکھ رہی ہو تم؟“ وہ حیران ہوا۔

”بیوی قُل۔“ اس نے جواباً بے ساختہ اسی طرح لیمپ شیڈ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

سالار نے قدرے حیرانی سے اپنے سائیڈ ٹیبل پر پڑے لیمپ شیڈ کو دیکھا۔
 ”ہاں! اچھا ہے؟“ اس نے سرسری انداز میں کہا۔ وہ خوب صورت لیمپس تھے لیکن اتنے بھی نہیں تھے کہ وہ ان پر یوں نظریں گاڑ کر بیٹھ جاتا۔

”یہ کون سے پھول ہیں؟“ وہ ابھی بھی لیمپ شیڈ پر نظریں جمائے کمرہ رہی تھی۔
 ”پھول؟“ سالار نے حیرانی سے لیمپ شیڈ کو دوبارہ دیکھا۔ اس نے پہلی بار اس پرل کلر کے شیڈ پر بنے پیٹرن کو دیکھا۔ اس شیڈ کا ٹھیکسچر کچھ عجیب تھا۔ کاغذ نما اس کپڑے پر سنہری مائل پیلیے پھولوں کا ایک بے حد مہین اور نفیس پیٹرن تھا جو صرف لیمپ کے آن ہونے پر نظر آ رہا تھا۔ ان پھولوں میں کہیں کہیں کرمرن کلر کی کوئی چیز چمکتی ہوئی نظر آتی، مدھم پڑتی، پھر چند لمحوں کے بعد وہی چیز چمکتی۔

”نہ یہ گلاب ہیں اور نہ ہی ٹیولپ ہیں“ تھوڑا سا بلوئیل سے ملتا جلتا ہے لیکن وہ بھی نہیں۔“ وہ جیسے پھولوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی، پھر جیسے اس نے ہتھیار ڈال دیے۔
 ”ایسے پھول جنت میں ہوں گے۔“ وہ ہنس پڑا۔

”اچھا۔“

”وہ کچھویہ پھول رنگ بدل رہے ہیں۔ لیکن یہ رنگ نہیں بدل رہے بلکہ یہ کھل رہے ہیں۔“ وہ لیمپ شیڈ پر بنے پھولوں پر اب انگلی پھیر رہی تھی۔ سالار جیسے کسی سحر میں آیا تھا۔ وہ پھول واقعی بار بار کھلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

”Lovely۔“ وہ سراہے بغیر نہ رہ سکا۔ انہیں اب سمجھ آیا تھا کہ وہ لیمپ اتنے مہنگے کیوں تھے۔ دن کی روشنی میں سیلزمین کبھی انہیں وہ پیٹرن نہیں دکھا سکتا تھا۔ شاید اس لیے اس نے انہیں صرف ڈیزائن اور روشنی ہی کے حوالے سے بتایا تھا۔

اور ایک ہفتہ پہلے اس کی دراز صاف کرتے ہوئے، سالار کی ویسٹ پیپر باسکٹ میں سے وہ ایک پوسٹ کارڈ اس کے پاس لے کر آئی۔

”ہاں! اسے پھینک دیا ہے میں نے۔ بے کار ہے۔“ اس نے ٹی وی دیکھتے ہوئے امامہ کے ہاتھ میں وہ پوسٹ کارڈ دیکھ کر کہا تھا۔ وہ اس کارڈ کو لیے اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

”سالار! یہ دیکھو کتنی خوب صورت جھیل ہے اور وہ کچھو کتنا سکون ہے اس جگہ پر۔“ سالار نے اس کے ہاتھ سے پوسٹ کارڈ لے کر اس پر ایک نظر دوڑائی۔ وہ کسی پینٹنگ کا پوسٹ کارڈ تھا۔ کسی پینٹر کا بنایا ہوا لینڈ اسکیپ، ایک بہت چھوٹی سی کم گہرے کنارے والی جھیل، جس کے کنارے جنگلی پھولوں سے بھرے ہوئے تھے اور ان پھولوں کا عکس جھیل کے پانی میں نظر آ رہا تھا۔ کچھ پھول ٹوٹ کر پانی کی سطح پر تیر رہے تھے۔ جھیل کے کنارے ایک چھوٹی سی لکڑی کی کشتی بھی جس میں صرف ایک چوپڑا تھا اور وہ کشتی صرف دو افراد کے لیے تھی۔ جھیل کی سطح پر کچھ آبی برندے تیرتے نظر آ رہے تھے۔

”یہ صندل کی لکڑی سے بنی ہوئی ہے۔ اس کشتی کا رنگ دیکھو، یہ صندل کا رنگ ہے۔“

وہ پوسٹ کارڈ پر انگلی پھیرتے ہوئے اسے بتانے لگی تھی۔

”ایسا لگتا ہے جیسے صبح سویرے کوئی اس کشتی میں بیٹھ کر کہیں جاتا ہو۔ ایک مہکتی، خوشبودار بھیگی ہوئی کشتی میں۔ اور ہوا چل رہی ہو۔ اور جھیل میں اس کشتی میں بیٹھے خوشبودار ہوا کے جھونکے۔ ذرا تصور کرو۔“ اس نے بے اختیار گہرا سانس لیا، یوں جیسے اپنی قلبی تصویر سے خود محفوظ ہوئی ہو۔

”کتنی Screenity ہے اس سین میں۔ ایسے جیسے یہ جنت ہو۔ میں نہ بتاتی تو تم تو اسے پھینک رہے تھے۔“

وہ بے اختیار اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ واقعی اس کی زندگی میں نہ آتی تو وہ جنت کو۔
 ”اس کی پکچر بنا لو سیل فون کے ساتھ۔“ امامہ کی آواز نے یک دم اسے چونکا دیا۔ وہ اب بھی اسی عکس کو دیکھنے
 میں مصروف تھی۔ سالار نے سیل فون نکال کر چند تصویریں کھینچیں اور سیل اسے تھما دیا۔ اس نے باری باری ان
 تصویروں کو دیکھا اور پھر مطمئن ہو گئی۔
 ”چلیں؟“ سالار نے کہا۔

”ہاں۔“ ان دونوں نے ایک آخری نظر اس عکس پر ڈالی اور پھر آگے چل پڑے۔
 سالار نے چلتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
 ”خاموش کیوں ہو گئے۔؟ کوئی بات کرو۔“ امامہ نے چند قدم چلنے کے بعد اس سے کہا۔
 ”تم کرو میں سن رہا ہوں۔“

”ہو سکتا ہے تمہیں مجھ سے پہلے جنت مل جائے۔“ امامہ نے اپنے جملے کا مفہوم سمجھے بغیر اسے تسلی دی۔ وہ
 ہنس پڑا تھا۔

”چاہتا تو میں بھی یہی ہوں۔“ وہ مدھم آواز میں بڑبڑایا۔
 ”تم سے پہلے مرنا چاہتا ہوں میں۔“ اسے چلتے ہوئے ٹھوکر لگی۔ کوئی چیز جیسے اس کے جسم سے ایک لمحہ کے
 لیے اسے تھرائی ہوئی گزری تھی۔ وہ جو جنت ڈھونڈتی پھر رہی تھی اس سے پہلے جو ”شے“ سامنے کھڑی تھی وہ
 اسے بھول گئی تھی۔ ان کا ساتھ سالوں کا تھا اور ان کا ساتھ مہینوں کا تھا۔ اس نے سالوں میں کبھی جدائی محسوس
 نہیں کی تھی، لیکن وہ ان ہفتوں کا ساتھ ختم ہونے کا سوچ کر بھی لرز گئی تھی۔
 ”تم کیوں کہہ رہے ہو اس طرح؟“ وہ رک گئی اور اس نے سالار سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔
 ”تم نے ہی تو کہا تھا کہ شاید مجھے تم سے پہلے جنت مل جائے۔“
 ”لیکن میں نے مرنے کا نہیں کہا۔“

”کیا اس کے بغیر مل سکتی ہے؟“ وہ بول نہیں سکی۔ نیم تاریکی میں اس روش پر ایک دوسرے کے مقابل کھڑے

وہ ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے رہے۔ پھر سالار نے اس کی آنکھوں میں پانی اٹھاتے دیکھا تھا۔
 ”ٹھیک ہے جو مرضی کہو۔“ اس کی آواز میں خفگی تھی۔
 سالار نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے جیسے معذرت خواہانہ انداز میں دبایا۔

”میں نے صرف تمہاری بات دہرائی تھی۔“
 ”اور میرا وہ مطلب نہیں تھا جو تم نے نکالا ہے۔“
 ”میں سمجھتا ہوں۔“ وہ دونوں پھر چلنے لگے۔
 ”کیا تم جنت میں مجھے اپنا پارٹنر منتخب کرو گی؟“
 چند قدم چلنے کے بعد اس نے سالار کو نرم آواز میں کہتے سنا۔ وہ بول نہیں سکی۔ وہ ہنس پڑا۔
 ”یعنی نہیں۔“

”میں نے یہ کب کہا؟“ وہ رک گئی۔
 ”لیکن تم نے کچھ بھی کب کہا؟“
 ”میں سوچ رہی تھی۔“
 ”سوچ لیا؟ پھر اب بتاؤ۔“ وہ ہنس پڑی۔
 ”تمہیں کیا ہوا ہے؟“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”جنت کی بات تمہنے شروع کی تھی۔“ اس نے سالار کا چہرہ دیکھا۔

”شاید۔“ وہ خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

”تمہیں یقین نہیں ہے؟“ اس نے ہنس کر اس سے پوچھا۔

”یقین کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”اگر تم جنت میں پہنچ گئے تو پھر تمہیں ہی چننا پڑے گا۔“ اس نے مذاق کیا۔

”اور اگر کوئی اور بھی پہنچ گیا تو؟“ اس کی مسکراہٹ حائب ہو گئی تھی۔

دونوں کے درمیان خاموشی کا لمبا وقفہ آیا تھا۔ اس ”اور“ کا تعارف نہ امامہ نے مانگا تھا نہ سالار نے کروایا تھا۔ مگر اس ”اور“ نے اس کو سالار سے نظریں چرانے پر مجبور کیا تھا۔ وہ نظریں نہ جراتی تو اتنی تکلیف نہ ہوتی سالار کو جتنی اب ہوئی تھی۔ وہ اس سے کہہ نہیں سکی، بات اس کے انتخاب پر کبھی نہیں رہی تھی، بات جلال کے انتخاب پر تھی۔ اس کا انتخاب جنت میں بھی شاید وہ کبھی نہ ہوتی، لیکن یہ اعتراف کرنے میں کوڑے کھانے جیسی ذلت تھی۔ چپ بہتر تھی لیکن اسے یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ اس کی چپ سالار کو اس وقت کوڑے کی طرح لگی تھی۔

اس روش سے روشنیوں تک کا باقی فاصلہ خاموشی میں طے ہوا تھا۔



سکندر عثمان کو چند لمحوں تک اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا۔

”آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے؟ وہ پلاٹ تو بگ ہی نہیں سکتا۔ سالار کے نام ہے وہ۔“

انہوں نے احتشام الدین سے کہا۔ وہ ان کے ایک کاروباری دوست تھے، اور چند منٹ پہلے انہوں نے سکندر عثمان کو فون کر کے ایک پلاٹ کی فروخت کے بارے میں شکایت کی تھی۔ ان کے کسی دوست نے ان ہی کے وکیل کے ذریعے ایک ایسا پلاٹ کچھ دن پہلے خریدا تھا جو سکندر عثمان کا تھا اور جس کو ایک ڈیڑھ سال پہلے احتشام الدین

نے خریدنے کی آفر کی تھی، لیکن سکندر نے تب انہیں یہ بتایا تھا کہ وہ پلاٹ جائیداد کی تقسیم کے دوران سالار کے نام کر چکے تھے۔ البتہ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ اگر کبھی اس پلاٹ کو فروخت کرنے کی ضرورت پڑی تو وہ احتشام الدین کو ترجیح دیں گے۔

”میرے وکیل کے ذریعے سارا پیپر ورک ہوا ہے۔ آپ کہیں تو آپ کو نیوز پیپر میں پلاٹ کی منتقلی کا ایڈ بھی بھجوا دیتا ہوں۔ آپ کے بیٹے نے یہ پلاٹ ڈیڑھ کروڑ میں بیچا ہے۔ مجھے تو افسوس اس بات کا ہے کہ میرے وکیل نے منتقلی کے بعد بتایا مجھے، وہ بھی اتفاقاً۔“ کچھ دیر پہلے بتا دیتا تو میں کبھی یہ پلاٹ کسی اور کو خریدنے نہ دیتا۔“

چند لمحوں کے لیے سکندر عثمان کا سر گھوم کر رہ گیا۔ پچھلے سال انہوں نے اپنی جائیداد کی تقسیم کر دی تھی۔ یہ ان دو پلاٹس میں سے ایک تھا جو سالار کے حصے میں آیا تھا۔

”میں ابھی سالار سے بات کر کے دوبارہ آپ سے بات کرتا ہوں۔“ سکندر عثمان نے یکدم کہا۔

انہیں ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان کو بتائے بغیر پلاٹ بیچ سکتا ہے۔

سالار اس دن اسلام آباد میں تھا اور اس وقت اپنے کسی کام سے مارکیٹ کی طرف جا رہا تھا جب اسے سکندر کی

کال ملی۔

”سالار! تم نے اپنا پلاٹ بیچ دیا ہے؟“

وہ اس وقت ایک سنگل بیر کا تھا اور اس کے ہیلو کہتے ہی سکندر نے دوسری طرف سے کہا۔

چند لمبے سالار کچھ بول نہیں سکا۔ پلاٹ کی فروخت کا سکندر کو اتنی جلدی پتا چل جائے گا اسے اندازہ نہیں تھا۔ اس کی چند لمبوں کی خاموشی نے سکندر کے بدترین خدشات کی تصدیق کر دی تھی۔
 ”تم میرے آفس آؤ۔“ انہوں نے بے حد سرد مہری سے کہہ کر فون بند کر دیا۔
 ”کب بیچا تھا پلاٹ؟“ اس کے آفس پہنچ کر کرسی پر بیٹھتے ہی سکندر نے اس سے کہا۔ ان کا لہجہ قطعی خوشگوار نہیں تھا۔ وہ اس کی جائیداد تھی لیکن وہ بچنے کے لیے نہیں دی گئی تھی۔
 ”پچھلے مہینے۔“ اس نے لہجہ ہموار رکھنے کی کوشش کی۔
 ”کیوں؟“

”مجھے کچھ رقم کی ضرورت تھی۔“

”کس لیے؟“ سالار اس بار جواب دیتے ہوئے جھجکا۔

”کس لیے رقم کی ضرورت تھی؟“

”مجھے امامہ کو ایک رنگ خرید کر دینی تھی۔“ سکندر کو لگا کہ انہیں سننے میں غلطی ہوئی ہے۔
 ”کیا؟“

”امامہ کے لیے ایک رنگ خریدنی تھی۔“ اسی نارمل انداز میں اس نے اپنا جواب دہرایا تھا۔

”لاکھ دو لاکھ کی رنگ کے لیے تم نے پلاٹ بیچ دیا؟“

سکندر نے اس کے جواب سے بالکل غلط نتیجہ نکالا۔

”اپنا کریڈٹ کارڈ استعمال کرتے بینک سے پرسل لون لے لیتے یا مجھ سے کہتے۔“

”میں لون لے کر اسے گفٹ نہیں کرنا چاہتا تھا اور ایک دو لاکھ کی انگوٹھی نہیں تھی، کچھ زیادہ مہنگی تھی آپ

اتنے مہنگے کبھی نہ دیتے مجھے۔“ وہ بڑی رسانیت سے کہہ رہا تھا۔

”گفتنی مہنگی ہوتی، چار یا پانچ لاکھ کی ہوتی۔۔۔ چلو دس لاکھ کی ہوتی۔۔۔ دے دیتا میں تمہیں۔“

سکندر بے حد خفا تھا۔ وہ پلاٹ پونے دو کروڑ کا تھا جسے وہ ڈیڑھ کروڑ میں بیچ آیا تھا۔

”دس لاکھ کی بات نہیں تھی۔“ سکندر نے اسے کہتے سنا۔

”پھر؟“ سکندر کے ماتھے پر بل آئے۔ سالار نے اپنا گلا صاف کیا۔

”13.7“ یہ واحد طریقہ تھا جس سے وہ اس انگوٹھی کی قیمت تین ہندسوں میں کر پایا تھا۔

”کیا۔۔۔؟“ سکندر کو کچھ سمجھ نہیں آئی۔

”13.7“ سالار نے ایک بار پھر گلا صاف کر کے اگلا لفظ کہا۔ سکندر کو چند لمبے سانس نہیں آیا۔ انہیں پہلی بار

اس کی بات سمجھ میں آئی تھی۔

”13.7 ملین کی رنگ دی ہے تم نے اسے؟“ ان کا ذہن جیسے بھک سے اڑ گیا تھا۔ سالار سر جھکائے ٹیبل پر

پڑے پیپر وٹ پر انگلیاں پھیر رہا تھا۔ فی الحال وہ اس کمرے میں کچھ اور نہیں کر سکتا تھا۔

”سالار ایک کروڑ سہتیس لاکھ روپے کی رنگ خرید کر دی ہے تم نے اسے؟“

سکندر عثمان کی خود بھی سمجھ نہیں آیا کہ انہوں نے اس سے دوبارہ یہ کیوں پوچھا تھا۔

”جی۔۔۔“ اس بار سالار نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

سکندر بے یقینی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔ سالار نے نظریں چرائیں، وہ اب ان کے عقب میں دیوار

پر لگی پینٹنگ دیکھ رہا تھا اس کے علاوہ وہ اور کیا کرتا؟ اس کے چہرے پر نظریں جمائے سکندر نے ریو الونگ چیئر کی

پشت سے ٹیک لگالی۔ وہ اگر اسے الو کا پٹھا کہتے تھے تو ٹھیک ہی کہتے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

خجک کے چاند

”ہاجرہ۔“

تیس سال قبل میرے باپ نے تمہاری پھوپھی کو
میرے چچا کا رشتہ کیوں نہیں دیا تھا۔
تم حیران ہو رہی ہو گی یہ آج مجھے کیا ہوا۔ بیٹھے
بٹھائے کون سے غم یاد آگئے۔
شاید کہنے کو کوئی خاص بات نہیں ہے آج۔
یا شاید۔ اپنے ساتھی کے نام آئے اس کی بیوی کے
خط کو دیکھ کر میرے دل کا کوئی ٹانکا اُدھر گیا ہے۔ اس
کے بچپن کی محبت آج اس کی بیوی اور دو بچوں کی ماں
ہے۔ بہت خوش نصیب ہے وہ۔ میں بھی ہوں۔
تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
میں تم سے دور رہ سکتا ہوں ہاجرہ۔ تمہارے بغیر
نہیں رہ سکتا۔

قریبیں لاکھ خوب صورت ہوں
دوریوں میں بھی دلکشی ہے ابھی
میں اور تم۔ ایسے ہی خود کو بہلا میں گے بالآخر۔
شریف، بزدل، نامراد اور گھائل لوگ۔ میں اور
تم۔
”کیا لکھوں“ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ دنیا کا سب سے
مشکل امر ہے اپنے احساسات کی لفظوں میں ترجمانی
کرنا۔ اس طرح کہ سننے والا اسی طرح ایمان لے
آئے کہ جس طرح کہنے والے کے دل پہ اس کا نزول
ہوا تھا۔ زندگی کے کسی موڑ پہ دن کے کسی حصے میں
تم نے مجھے جھوٹا اور بے وفاتو سمجھا ہو گا۔ کہ جس نے
محبت کے اظہار کیے بس۔ محبت نہیں کی۔ سو اسی
شرمندگی کے باعث آج میں کچھ نہیں لکھ پا رہا۔ مگر
کوئی تو بات ہونی چاہیے۔

خوش نصیبی کی بلندی پہ کوئی خود کو اگر
پاتا ہے تو بلاشبہ وہ میں ہوں۔ اپنی خوش نصیبی کو
بیان کرنے کو اگرچہ میرے پاس وہی روایتی باتیں
ہیں۔ والدین کی محبت، ان کی دعائیں۔ اچھی
صحت۔ وطن میں روزگار۔ مٹی پہ پر جان دینے کا
عزم بھی موقع بھی اور۔ اور تم۔
تم میری خوش نصیبی ہو یا خوش نصیب ہونے کا
سبب۔ میں فیصلہ نہیں کر پاتا۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ تم
ہو تو میں ہوں۔ ورنہ عدم ہوں۔

امن کے دن ہیں۔ سب پر سکون ہے۔ اور اندر کی
دنیا باہر کی دنیا سے یکسر مختلف ہے۔ تلاطم، تصادم۔
بناؤ، تباہی۔ بے چینی دے کیفی کی صورت میں تمہارا
تصور سکون کا ضامن ہے۔

اس مختصر سی زندگی اور اب تک گزاری عمر میں
میں دو باتیں جان پایا ہوں۔ ایک یہ کہ۔ ہر وہ شخص تا
مراد ہے جو بزدل ہے، شریف ہے۔ نامراد نہیں تو
گھائل ضرور ہے۔ جیسے میں۔ جسم پر اب کسی زخم کا
نشان نہیں۔ سب مند مل ہو گئے مگر۔ دل تار تار
ہے۔ جانے کس چیز سے چھلنی کیا تھا کہ رفو ہونے
نہیں پاتا۔ دوسری بات جس پر میں آج سب کو قائل
کرنا پھرتا ہوں۔ وہ یہ کہ۔ رشتے بڑے مجبور کرتے
ہیں۔ رشتے بڑے مجبور ہوتے ہیں۔ اب میری ہی
مثال لو۔ میں کیپٹن ابو بکر۔ تمغہ جرات۔ مخالف
کے ٹینک تباہ کرنے والا۔ دشمن کی آنکھ میں آنکھ ڈال
کر چھاتی پہ گولی کھانے کو تیار۔ ایک تمہارے ابا کو
راضی نہ کر سکا۔ ان کے سوال کا جواب نہ دے سکا کہ



Copied From Web

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

چلو یوں کر رہا ہوں میں تمہیں اپنی آنکھیں بنا کر بھیجتا ہوں۔ تم دیکھنا کہ ان میں صرف تم ہی دکھتی ہو۔ جو سوتی ہوں تو خواب کی صورت۔ جاگتی ہوں تو عکس بن کر۔

میں تمہیں اپنے خواب بنا کر بھیجتا ہوں۔ رات کے پہلے پہر کے ہوں تو تعبیر کی صورت۔ صبح کلاب کے ہوں تو بشارت تم ہو۔

میں تمہیں اپنے لب بنا کر بھیجتا ہوں۔ پکار کی صورت۔ بازگشت کی صورت۔ سوال تمہارا جواب بھی تم ہو۔ گنگناتے ہوں تو نغمہ تم نغمگی بھی تم۔ مسکاتے ہوں تو باعث تم۔

میں تمہیں اپنا دل بنا کر بھیجتا ہوں۔ نہیں اپنی سانسیں۔ ایسا کرتا ہوں اپنے تخیل اپنے دکھ۔ اپنا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں اور کیا کہہ رہا ہوں۔ شاید میں اپنی زندگی میں تمہاری اہمیت بتانا چاہ رہا ہوں۔ مگر وہ تو تم جانتی ہو۔ یا شاید میں تمہارے ساتھ کچھ وقت گزار کر اپنی محفلن اتارنا چاہتا ہوں۔ اور اس کے لیے تو ہمیں ماضی میں جانا ہوگا۔ مستقبل میں تو ہم ساتھ ہو ہی نہیں سکتے۔ تمہارا مستقبل تو۔

اپنے شوہر کو میرا سلام تو تم خیر نہیں کہہ سکتیں۔ اپنے بچوں کو میری طرف سے پیار ضرور کرنا۔ ہمارا مستقبل میں بس یہی تعلق ہے۔

اب اجازت دو۔ ہاں یاد آیا۔ ایک آخری بات۔ شاید خط اسی لیے لکھا تھا۔

اپنا خیال رکھنا۔ پتا ہے ناکوں۔ کیونکہ میں نے شہید ہونے تک زندہ رہنا ہے۔

تمہارا۔ ابو بکر



پچھلے چند سالوں سے اس کمرے کا موسم نہیں بدلا تھا اور وقت بھی جیسے رکا ہوا تھا۔ اس کمرے میں ہر چیز معدوم تھی یا مدہم۔ باہر دنیا بدل جالی۔ یہاں گرد تک

نہ اڑتی۔ احساسات تک منجمد تھے۔ کمرے کا روغن خراب ہو چلا تھا مگر اس حد تک نہیں کہ نیا کروانے کا خیال آتا۔ سامنے والی دیوار سے لگا منقش لکڑی کا پلنگ اس کے ساتھ رکھی چھوٹی پتائی اور دو کرسیاں پائنتی کی طرف ایک میز اور کرسی۔ کمرے کے بائیں دیوار کے ساتھ رکھی لکڑی کی الماری سامنے والی دیوار پہ جڑی چھوٹی سی کھڑکی پلنگ اور الماری کے درمیان تھوڑی سی جگہ پہ پچھلی رنگین دری۔

ہاجرہ کے ہاتھوں ہر ماہ بدلی جانے والی کمرے کی ترتیب اس دن کے بعد سے یوں ہی رہ گئی تھی۔ اس دن کے بعد سے وہ خود بھی اس کمرے کے ساز و سامان کی طرح اپنی جگہ پر سیٹ ہو گئی تھی۔ جیسے میز پہ رکھی کتابیں، قلم۔ پتائی پہ رکھی دوائیں۔ پیچھے میدان میں کھلنے والی کھڑکی پہ لٹکا بڑے بڑے پھولوں والا پردہ

اور جیسے پلنگ پر چادر کی طرح بچھا اس کا وجود۔ ساکت اور بے جان۔

اڑے ہوئے نیلے رنگ کی لکڑی کی خستہ بوسیدہ کھڑکی کھلتی تو پتا چلتا تھا کہ سورج سوانیزے پہ ہے یا بارش بس برسے کو ہے۔ آندھی آنے والی ہے یا طوفان گزر چکا ہے۔ مگر بستر پہ بڑا وجود ان موسموں کے آنے جانے سے بے نیاز اور یکسر لا پرواہ تھا۔ اس کی دن بہ دن معدوم ہوتی سماعتوں کو اگر کسی سے فرق پڑتا تھا تو طیبہ کی آواز سے۔ وہ جو مژدہ جاں فزا سنایا کرتی تھی۔

اس کمرے میں شور بالکل نہ تھا۔ بس ارتعاش تھا۔ کھلی کھڑکی سے آنے والی ہواؤں کی سرسراہٹ۔ گرمیوں میں چلتے پنکھے کی آواز۔ آتے جاتے لوگوں کے قدموں کی چاپ اور اس کی عیادت کو آئے لوگوں کی افسوس، ترحم، ہمدردی، عبرت میں ڈوبی آہ۔

اس کا دھڑکتا دل اس کو دفنانے نہیں دیتا تھا ورنہ وہ کب کی میت بن چکی تھی۔

کمرے کے دروازے پہ جانے کو تیار کھڑی زندگی اور آنے کو تیار کھڑی موت۔ آپس میں اس جیتے جی

مر جانے والے شخص کے بارے میں بات کرتیں۔ گویا عالم برزخ تھا۔ کوئی دن جاتا تھا کہ زندگی ایک طرف کو ہو کر موت کو اندر آنے کا راستہ دے دے۔



ہاجرہ اور طیبہ کے ابا خاندانی تھے نہ زبان و وعدے کے پابند۔ ہاں مگر ان پرست تھے شملہ اونچا نہ تھا۔ ناک اونچی تھی۔ جب ابو بکر کے والد نے ان کی بہن کو اپنے چھوٹے بھائی کے لیے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ عمر میں بڑی ہے تو اس کا بدلہ انہوں نے اس طرح لیا کہ ابو بکر کو ہاجرہ کا رشتہ نہ دیا۔ جب بہن نہیں لی تو بیٹی کیوں دیں۔ ایک دفعہ نہیں ابو بکر کے والد پانچ دفعہ ان کی دلہن پر آئے تھے مگر پانچوں مرتبہ پانچ عذر پیش کر دیے رستے سے انکار کے ساتھ میں پرانا حوالہ دیتا بھی کبھی نہ بھولے۔ ان کے انکار سے ابو بکر کے چچا اور ہاجرہ کی پھوپھی کو کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ دونوں کی شادیوں ہو گئی تھیں۔ دونوں ہی اپنے گھروں میں خوش تھے مگر اب کے دل کا معاملہ تھا۔ ہر دفعہ ابو بکر کے والد کے ان کے ہاں آنے پر دونوں کی امید بندھ جاتی اور ہر دفعہ ہاجرہ کے ابا کے انکار پر وہ سولی پر لٹک جاتے۔ ابو بکر فوج میں بھرتی ہوا تو ابائے گھر میں تبصو کیا۔ ہاجرہ پپ سے پالی بھر رہی تھی۔

”چچا ہوا منع کر دیا میں نے آئے روز محلہ پر جانا پڑا۔ بس جاتا تو ناک کٹ جاتی میری خاندان میں۔“ وہ تسخرانہ ہنکارا بھرتے۔ طیبہ کن اکھیوں سے ہاجرہ کو ضبط کرتی دیکھتی۔

”اور شہید ہو جاتا تو۔ میری ہاجرہ کی تو زندگی برباد ہو جاتی۔“ ابا بے نیاز بولے جارہے تھے انہیں احساس ہی نہیں ہوا ان کے شہید کہنے یہ کیسا گھونا پڑا تھا اس کے دل پہ۔ انہوں نے بس اتنا دیکھا کہ ہالٹی بھرتے ہوئے پانی چھلکا ہے۔ جبکہ طیبہ نے دیکھا اس کی آنکھیں بھی چھلکی ہیں۔

”اب شہید کی بیوہ بنا کر بٹھا رکھوں تو بیٹی پاگل

ہو جائے۔ دوسرا کے بہادریوں تو لوگ تھو تھو کریں۔ نہ پابند۔ میں ایسے ماتھے کام نہیں کرتا۔“ اس سے زیادہ برداشت نہ ہوا تھا ہاجرہ سے۔ باورچی خانے میں جا بیٹھی۔ چولہے کے پاس آسن تھا رونا۔ آنکھیں سرخ ہو جائیں یا آنسوؤں سے بھر جائیں، کوئی نہیں پوچھتا۔ اور طیبہ سے کچھ چھپانہ تھا۔

ابا کو خبر نہ تھی بیٹی کی خواہش کی شدت کی حالت کی۔ جانتے اگر تو بھی محبت پہ غیرت کو فوقیت دیتے جو کہ اصل میں تھی ہی نہیں۔ ناک تھی بس۔ دکھاوا تھا۔ نام نہاد لہسہ تھا۔ جو چوہدری یا جاگیردار نہ بن پانے کے سبب خود میں پیدا کر لیا گیا تھا۔ بہن کے دل کی خواہش باپ کے علم میں لانے کی جرات طیبہ میں نہ تھی۔ ہاجرہ میں کہاں ہوتی۔ دعاؤں کا آسرا تھا بس۔ پھوپھی سے مدد منی چاہی۔ وہ دہل کر بولیں۔

”غلطی سے بھی نہ بتاؤ۔ ابو بکر کے ایسا پانچ دفعہ آئے تھے تمہارا ہاتھ مانگے۔ بلوچو ذیل کر کے لوٹا نے کہ۔ عام بات نہیں ہے۔ بھائی صاحب کو پتا چلا کہ اس میں ابو بکر کی مرضی ہے تو مانتے ہوتے بھی پلٹ جائیں گے۔ ہاجرہ کو تو بھول ہی جائیں گے۔ ابو بکر سے بیراتندہ لیں گے۔ ان کو اپنے انتقام کا مزا ہی تب آئے گا۔ ایسا غضب مت کرنا ہاجرہ! اس بات کو جلال بھائی کی کمزوری بتا دیں گے۔“

اس کی یہ آس بھی ٹوٹی۔ انہوں نے ہاجرہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”خود گولا بڑا کر لو ہاجرہ! اپنے ابا کو بھٹک تک نہ بڑنے دنا کہ تم کیا چاہتی ہو۔ اسی میں کچھ گنجائش نکل سکتی ہے۔“

ہاجرہ کچھ نہ بول پائی۔ حلق میں آنسوؤں کا گولا سا پھنس گیا تھا۔ ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ بے بسی سے انگلیاں موڑتی، پلکیں جھپک جھپک کر آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں اس کی ٹھوڑی لرز رہی تھی۔

ابرو سکڑے ہوئے تھے۔ پھوپھی کو اس پہ بے حد ترس آیا۔

”مجھ سے بدگمان نہ ہونا ہاجرہ! میں نے ذرا بھی حمایت لی تا اس رشتے کی تو تمہارے حق میں برا ہو جائے گا اور میں جو تقریباً اپنی عمر گزار چکی صاف ستھرے دامن کے ساتھ بھائی صاحب سمجھیں گے میں کوئی پرانی محبت کے راستے ہموار کر رہی ہوں۔“

پھوپھی کو بھی احساس ہوا کہ جوان بچوں کی ماں ہونے کے بعد آج بھی وہ کتنی بے بس ہیں۔ اسی بے بسی کے احساس تلے وہ ہاجرہ کے سامنے ہاتھ جوڑ گئیں۔

”مجھے معاف کرنا ہاجرہ! میں تیرے لیے کچھ نہ کر سکی۔“

ہاجرہ نے تڑپ کر ان کے ہاتھ تھام لیے۔ اور پھر دونوں پھوپھی بھینچی دل کھول کر روئیں۔ دروازے میں کسی کے آنے جانے کے خیال سے پرے کو بٹھائی طیبہ بھی منہ پر دوپٹے کا پلور کھ کر سسکی دبانے لگی۔

اور پھر ہاجرہ اور ابوبکر کی بد قسمتی۔ ابا کو پتا چل گیا۔

ابوبکر کے ٹریننگ پہ جانے سے ایک دن قبل جب وہ اس سے مل کر آرہی تھی۔ روٹی ٹکراتی پڑتی، نڈھال نیم جاں ہاجرہ کو کھینچی طیبہ خود بھی بس کرنے کو تھی۔ وہ جھلکتی دوپہر میں نکلی تھیں۔ تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ اس وقت ابا بھی عموماً گھر پہ نہیں ہوتے تھے۔

ابا کا مسلسل انکار مستقبل میں دوریوں کے اندیشے لاحق کرتا تھا۔ مگر وہ کم از کم اسے روز دیکھ تو لیا کرتی تھی۔ کبھی کھڑکی سے، کبھی چھت سے، کبھی سیلی کے گھر جاتے، کبھی پھیری والے سے سبزی خریدتے۔

لحوظ پہ محیط ملاقات۔ نظر ملتی، مسکراتی، جھکتی، ختم۔ اسی میں حال احوال، اسی میں قول قرا۔ کبھی جو موقع ملے تو وہ میدان کو کھلتی کھڑکی پہ آجاتا۔ اور اس وقت میدان سے گزرتے کسی کے دیکھ لیے جانے کا ڈر، ابا کے اچانک چلے آنے کا ڈر، دو گھڑی سکون سے ایک دوسرے کو دیکھنے دیتا نہ کہنے دیتا۔

”ابا آجائیں گے۔ اب جاؤ۔“ ہر دوسری بات کے جواب میں ہاجرہ کے منہ سے نکلتا تھا۔

وہ جھلاتا، گھورتا، مسکراتا۔ پھر اچھل کر کھڑکی کی خستہ چوکھٹ پہ دھری اس کی گلابی انگلیوں کو چھوتا اور چلا جاتا۔

کیسے آتا اور وہ کیسے بلاتی۔ یہ بھی بڑا دلچسپ تھا۔ جب ابوبکر کو بات کرنی ہوتی۔ وہ ایک چھوٹا سا پتھر اندازے سے اس کے باورچی خانے کی سمت پھینکتا۔ وہ کمرے کی طرف لپکتی۔ پھر کھڑکی کے پٹ پر دو سرا پتھر لگنے پہ کھڑکی کھول دیتی۔

اور جب ہاجرہ نے بلانا ہوتا۔ وہ اپنے گھر کا دروازہ کھول کر صحن میں اندر کی طرف کھڑی ہو جاتی۔ تاکہ گلی میں آتے جاتے لوگ اس کو دیکھ نہ سکیں۔ پھر اپنے بالکل سامنے والے مکان کی کھڑکی پہ زور سے پتھر مارتی۔ لوہے کی کھڑکی بج اٹھتی۔ اس کے بعد اس کے دوست کی ڈیوٹی ہوتی کہ وہ ابوبکر کو بتانے جاتا کہ کوئی اسے یاد کر رہا ہے۔ اس کے بعد محسن تین دفعہ اپنی کھڑکی کھول کر بند کرتا۔ یہ اس بات کا اشارہ ہوتا کہ

اس کا پیغام آگے پہنچا دیا گیا ہے۔ دس منٹ میں آ رہا ہے۔

اب وہ ٹریننگ پہ جا رہا ہے۔ پتا نہیں کب آئے۔ روح کانپنے لگتی تھی یہ سوچ کر۔ حالانکہ اس نے کہا تھا۔ وہ ہر چھ ماہ بعد آئے گا مگر خوف تھا کہ کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ یہ عارضی جدائی مستقبل جدائی کا اعلان کر رہی لگتی تھی۔ وہ اس کی قیص کی آستین پکڑ کر رو پڑی تھی۔

”بہت مشکل لگتا ہے ابوبکر! مت جاؤ۔ کچھ ہو جائے گا۔ کچھ غلط ہو جائے گا میرے ساتھ۔“ جواباً وہ اسے بے بسی سے دیکھتا رہا تھا۔

”میں نہیں رہ سکوں گی ابوبکر۔“ اس نے اس کے شانے پہ پیشانی نکالی۔

وہ فوجی بنے جا رہا تھا۔ جرات، شجاعت اور دلیری کا نشان، دشمن کو تہ تیغ کرنے کا عزم رکھنے والا اپنی ذاتی

زندگی کی خوشیوں کو چھیننے والے کا کچھ نہ بگاڑ سکتا تھا۔
اس نے اپنے شانے سے لگی ہاجرہ کے کندھے پہ
بجھکتے ہوئے ہاتھ رکھا۔

مدر سے جانے والی عمروں کا ساتھ تھا۔ پانچویں تک
اسکول بھی ساتھ پڑھے تھے ایک بیچ پہ بیٹھ کر۔ پھر تین
سال الگ الگ جماعتوں میں پڑھا مگر اسکول ایک ہی
تھا۔ پھر دو سال بعد اسکول بھی الگ ہوا۔ اس کے
بعد ابو بکر نے شہر جا کر پڑھا۔ اور اس کی کتابوں کو ہاجرہ
نے گھر میں پڑھا۔ یوں ہاجرہ نے بغیر امتحان دیے ابو بکر
کے ساتھ بارہ جماعتیں پڑھ لیں۔

کھڑکی کی چوکھٹ پہ دھرے اس کے ہاتھ کی کھڑکی
کے باہر قدرے نیچے کھڑے ابو بکر کو تراشیدہ ناخنوں والی
صرف تین انگلیاں نظر آتی تھیں۔ جنہیں اچھل کر
چھوٹنے میں اسے لمحے سے بھی کم وقت لگتا تھا۔ آج
اتنے برسوں کے ساتھ کے باوجود پہلی مرتبہ اس نے
ہاجرہ کو چھوا تھا۔ دھڑکنیں بے ترتیب ہوئی تھیں۔
رنگتک پہ جانا گراں لگا تھا۔

پچھڑنے سے پہلے ملنے میں ملنے کی لذت سے زیادہ
پچھڑنے کا خوف دل میں۔ جگہ گھیرے ہوتا ہے۔

ابو بکر نے اس سے پہلے کبھی اپنے آپ کو اتنا بے بس
محسوس نہیں کیا تھا۔ ہاجرہ اب ہچکیاں لے رہی تھی۔
وہ ہاجرہ کے ابا کو منا سکتا تھا۔ ہاجرہ کو بھگا سکتا تھا۔ نہ
ہاجرہ کو بھلا سکتا تھا۔ اس نے ضبط کرنے کی کوشش میں
اپنا نچلا لب دانتوں میں دبایا۔

”ابو بکر۔“

ہاجرہ نے آنسوؤں سے ترچہ اٹھایا۔ لرزتی ہانپتی،
خوف زدہ آواز۔ بھگا، متورم، سرخ چہرہ۔ کپکپاتے
ہونٹ اور آنکھیں۔ جیسے۔ پانی کے کٹورے میں دو
کنجے رکھ دیے گئے ہوں۔ ابو بکر ڈوب کر ابھرا۔ بے
اختیار بے تاب ہوا اور اپنی ہتھیلیوں میں اس کا چہرہ
بھر لیا۔

ہجر کا خوف سارے خوب صورت جذبات کو مار دیتا

ہے۔

اس کا دل بھر آیا تھا۔ آنکھیں کیوں نہ بھرتیں۔
ابو بکر نے اپنی پیشانی اس کی پیشانی سے ٹکادی۔ آبشار
کی صورت دونوں کی آنکھوں سے گرتے آنسو ایک
دوسرے میں جکڑے ان دونوں کے ہاتھوں کی پشت
بھگونے لگے۔

اور جس دم وہ شکستہ جاں طیبہ کے سہارے گھر میں
داخل ہوئی۔ اباد صوب میں ٹہل رہے تھے۔ دونوں کے
قدم رک گئے۔ سانس بھی۔ طیبہ کو اپنے ہاتھوں پہ
بوجھ بڑھتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اور جب تک وہ اسے
سنہالنے کو تیار ہوتی۔ ہاجرہ کے ساتھ ہی گر پڑی تھی۔



”روزنامہ کرو۔ مزار پہ جا کر بیٹھ جاؤ۔ پنکھے سے ٹٹک
جاؤ۔ مرضی تمہاری مگر۔ گھول کر لی لو یہ بات کہ جلال
کی بیٹے سے تمہاری شادی نہیں ہوگی۔“ ابا نے کہہ دیا
تھا۔ پھوپھی کی بات سولہ آنے درست ثابت ہوئی
تھی۔

ہاجرہ چار دن بخار میں پھنکتی رہی۔ ابو بکر کے جانے
کا دکھ۔ ابا کو پتا چلنے کا صدمہ۔ اور ان کا پتھر کی لکیر
جیسا فیصلہ۔ ابا نے دولا کر دی نہ حال پوچھا۔ پانچویں

روز وہ خود ہی کمرے سے نکل آئی۔ البتہ کوشش کرتی
کہ ابا سے سامنا نہ ہو۔ خود ابا بھی نہیں چاہتے تھے۔

چھ ماہ بعد خبر ملی ابو بکر آیا ہے۔ ابا ٹالا ڈال کر جانے
لگے۔ صحن میں چار پانی ڈال کر سونے لگے۔ ایک دن وہ
کھڑکی پہ آگیا۔ پہلے کے مقابلے میں زیادہ دیر ملاقات
رہی۔ مگر بات دونوں میں سے کسی نے نہ کی۔ نہ پوچھا
کچھ نہ بتایا کچھ۔

ہاجرہ کی زردی مائل رنگت، ابو بکر کی بے بس
مسکراہٹ حاصل کلام رہیں۔

اگلی دفعہ کی ملاقات میں طیبہ نے کھڑکی میں آکر کہا
تھا۔ ”اس کی طبیعت بہت خراب رہنے لگی ہے۔ ابا
نے کہا ہے، جیسے ہی طبیعت سنہلے، اعجاز چاچا کے بیٹے
سے بیاہ دیں گے۔“

اس کے دل میں بھلا کھس گیا تھا۔
پھر لیفٹیننٹ بن کر آیا تو طیبہ کو محسن کے گھر
بلوایا۔

”ہاجرہ سے کہو میرے ساتھ شہر چلے۔ اس کے سوا
کوئی راستہ نہیں ہے۔“ ہاجرہ دہل گئی۔
”مورے گاؤں میں بات پھیل جائے گی۔ ابا کی بے
عزتی ہوگی۔ پھر ابا طیبہ پہ بہت ظلم کریں گے۔ میرے
بدلے بھی اس سے کیس گئے۔ نہیں نہیں۔“ وہ رو
دی تھی۔ ”کوئی اور حل سوچو۔ ایک دفعہ اور ابا سے
بات کرلو۔“

ابو بکر نے اس کی سادگی پہ سر ہنساتھا۔ اس کی پھوپھی
کے بچے کالج میں پڑھنے لگے ہیں اور اس کے ابا اس
انکار کو نہیں بھولے۔ یہ ابھی تک کس خوش فہمی میں
ہے۔ اسی کشمکش میں اس کی چھٹیاں پوری ہو گئیں۔ وہ
چلا گیا۔

ہاجرہ سوچ سوچ کر بیمار پڑتی جا رہی تھی۔ اعجاز چاچا
نے خود ہی منع کر دیا۔

”تمہاری لڑکی بیمار رہنے لگی ہے۔ شہر جا کر علاج
کرواؤ۔ کہیں دق نہ ہو گئی ہو اس کو۔“ ابا نے نفرت
سے سر جھٹکاتھا۔

پھر گاؤں میں بات پھیل ہی گئی، جس کا ہاجرہ کو
خوف تھا۔ مگر ہاجرہ کی بیماری کا سن کر نہیں۔ ابا کی جلال
چاچا سے عداوتوں کے کھلے عام مظاہرے سے۔ پھر
اعجاز چاچا تو کیا گاؤں کے کسی گھر سے اس کا رشتہ نہ
آیا۔ ہاجرہ کو تسلی سی ہوئی۔ آس کا دامن پھر ہاتھ آگیا۔
مگر جب ابا کا اطمینان دیکھا تو دل دکھ سے بھر گیا۔

”چلو خیر ہے۔ طیبہ کو بیاہ دوں گا۔ تو میرے ساتھ
ہی رہنا۔ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ دونوں بیاہ جاتیں
تو میرے برہمچے میں کون سہارا بنتا۔ پر تو تو خود بیمار
رہنے لگی ہے اوس۔ جلدی سے ٹھیک ہو جا ہاجرہ!
شباباش میرا بچہ!“ ابا کا اطمینان کمال کا تھا۔



محسن ابا کے کمرے کا نیا پنکھا لگانے آیا تو نظر بچا کر

پانی کے خالی جگ میں ایک کانڈ پھینک دیا اور ہاجرہ سے
پانی مانگنے کے بہانے اشارہ کر دیا۔ ہاجرہ کو اچنبھا ہوا مگر
چپ چاپ جگ اٹھا کر باورچی خانے چلی آئی۔ طیبہ
کے ہاتھ پانی بھجوا دیا اور کانڈ کھول کر پڑھا۔ ابو بکر نے خط
بھیجا تھا۔ ہاجرہ پہ شادی مرگ طاری ہو گیا۔

آنکھوں سے لگایا۔ سینے سے لگایا۔ ہونٹوں سے
لگایا۔ بارہ سطرں لکھی تھیں۔ باورچی خانے میں بیٹھے
بیٹھے بارہ دفعہ ہی پڑھ لیں۔ خط دیکھ کر جہاں خوشی سے
دل دھڑکنے لگا خط پڑھ کر وہیں خوف سے دل رکنے بھی
لگا۔ بڑوسیوں سے جھڑپیں ہو رہی تھیں۔ ابو بکر کو
آپریشن پہ جانا تھا۔ ابا کی بات یاد آگئی۔ شہادت والی۔
اس کا دل۔ جیسے کسی نے ہاون دستے میں ڈال کر کوٹ
ڈالا ہو۔

ابا اور محسن باہر نکلنے لگے۔ اس نے خط دوپٹے میں
چھپایا۔

”آواز کر رہا ہے چاچا۔ دو دن دیکھ لیں۔ پھر بد لوا
دوں گا۔“ محسن نے باورچی خانے کے باہر کھڑے ہو کر
کہا اور چلا گیا۔

دوسرے ہی دن ہاجرہ نے اس کی خیریت، عافیت اور
سلامتی کی ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ اس کو جلد آنے کی
تاکید والا جواب لکھا اور عثمان کو بھجوا دیا۔ پھر یہ سلسلہ

باقاعدہ چل نکلا۔ محسن ان کا قاصد بن گیا تھا۔
جب تک اس کا جواب نہیں آیا، وہ دہلتی رہی۔
خوف نوعیت بدل کر اس کے مساموں سے پھوٹنے
لگا۔ اس کی نمازیں بڑھ گئیں۔ دعائیں طویل
ہو گئیں۔

”یا اللہ! بے شک مجھے ابو بکر نہ دے۔ مگر اسے
سلامت رکھنا۔“

دعا کے الفاظ بدلے تھے، شدت وہی تھی۔ مبینوں
بعد سہی، مگر وہ اسے دیکھ لیا کرتی تھی۔ یہ بھی کیا کم تھا
اگر وہ اس سے آگے سوچ نہ پائی۔ ابا کو دیکھتی تو
شہادت والی بات یاد آ جاتی۔ سینے میں نیزہ سا گڑنے لگتا
تھا۔ اور پھر اس دن۔

اس روز صبح سے ہی ہوا تھمی ہوئی سی تھی۔ اس ٹھہراؤ میں سکون نہیں تھا۔ اضطراب تھا اضطراب تھا۔ نہ سمجھ میں آنے والا۔ بے نام سی اداسی نے اس کے اندر باہر گھیرا ڈالا ہوا تھا۔ آسمان پر دور دور تک بادل نہیں تھے۔ موسم اچھا محسوس ہو رہا تھا نہ بُرا۔ اسی کیفیت کے زیر اثر اس نے ٹالتے ٹالتے دوپہر کے بعد کپڑے دھوئے تھے۔ چھت پر پھیلا کر نیچے اتر رہی تھی۔ ابھی سیڑھی کے پہلے قدم پر ہی تھی کہ دروازہ دھڑ دھڑاتے ہوئے محلے کا ایک بچہ تقریباً "بھاگتے ہوئے" اندر آیا۔ طیبہ باورچی خانے سے نکل رہی تھی۔ اسے روک۔

"باجی بلجی۔" اس کا سانس پھول رہا تھا۔ ہاجرہ اوپر ہی رک کر دیکھنے لگی۔

"اپنے ابا کو جلال چاچا کے گھر بھیجو۔ سب وہاں جمع ہو رہے ہیں۔ اطلاع آئی ہے۔ ابو بکر بھائی شہید ہو گئے ہیں۔ جلدی بھیجوا نہیں۔" اس نے کہا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ غالباً "سب کو اطلاع دے رہا تھا۔"

"ابا۔" سینے پہ ہاتھ رکھ کر چیختے ہوئے طیبہ مڑی تو نظر اوپر کھڑی ہاجرہ پر پڑی۔ ایک لمحہ کو خیال آیا کہ اس سے چھپا لے۔ مگر وہ اوپر ساکت کھڑی جس طرح دیکھ رہی تھی۔ طیبہ سمجھ گئی کہ اس نے سن لیا ہے اور اب وہ کچھ اور نہیں سنے گی۔ اور پھر اس کے کچھ کہنے اور

کچھ کرنے سے پہلے ہی ہاجرہ کھڑے کھڑے گر گئی۔ اس کا سر درمیانی سیڑھی پہ لگا اور طیبہ کے اگلے سانس سے پہلے وہ نیچے اس کے قدموں میں پڑی تھی۔ سینٹ کی پکی گیارہ سیڑھیاں تھیں جن کے نیچے میں وہ سر کے بل پٹہ کھا کر سیدھی نیچے آئی تھی۔ اس کے سر کے نچلے حصے سے خون یوں بہا کہ ایک لحظہ طیبہ کو لگا، اس کا بھیجا باہر آگیا ہو۔ اس کے بعد خود طیبہ کو بھی نہیں معلوم کیا ہوا۔

بہت سارے دن اسپتال میں رہ کر آئے تو پتا چلا وہ خبر جھوٹی تھی۔ ابو بکر عافیت سے ہے۔ ہاجرہ ایک دم چپ ہوئی اور پھر رو پڑی۔ ہوش میں آنے کے بعد اس

کا خون تو رک گیا تھا "آنسو نہیں رک رہے تھے۔ کبھی کبھی طیبہ کو لگتا، وہ اتنا روتی ہے۔ کہیں اندھی نہ ہو جائے۔"

ابا کا دل نہ پسجا۔ انہوں نے ابو بکر سے اور عناد پال لیا۔

"قلم کاپی لاؤ طیبہ! ابو بکر کو خط لکھو۔ اسے لکھو، اسے بتاؤ۔ میں اس لیے نہیں مر سکی کہ وہ زندہ تھا۔ اسے لکھو۔ میں مرنا نہیں چاہتی مگر اس کے بغیر جینا بھی نہیں چاہتی۔ اس سے کہو۔ شہادت بھلے عظیم رتبہ ہو مگر اسے میرے لیے غازی رہنا پڑے گا۔ اس سے کہو طیبہ۔ میں اس ہوا میں سانس بھی نہ لوں گی جس میں وہ سانس نہیں لیتا ہو گا۔ وطن کے جیالے لاکھوں ہوں گے مگر میرا ابو بکر ایک ہے۔ بس وہ ایک۔ اسے میری خاطر زندہ رہنا ہو گا۔ اس سے کہو طیبہ۔! قسمت بار بار ساتھ نہیں دے گی میرا۔ مجھے ہوش اسی لیے آگیا تھا کہ وہ مرا نہیں تھا۔ مگر اگلی دفعہ میں آنکھیں نہیں کھولوں گی۔ میں سانس نہیں لوں گی۔ اسے لکھ دو طیبہ۔ اسے بتا دو۔"

وہ بولتے بولتے ہانپ گئی۔ اس کی رگیں پھولنے لگی تھیں۔ وہ زرد پڑ رہی تھی، ایک دم سرخ ہو گئی۔ طیبہ کو ڈر لگا کہ اس کے ٹانگے نہ پھٹ جائیں۔ طیبہ نے اسے خود میں بھینچ لیا۔

"اسے کہہ دو مجھے آکر لے جائے۔ میں تیار ہوں۔" وہ اس کے سینے میں منہ گھسا کر بولی تھی۔



دو دن بھی نہ گزرے تھے، محسن نے طیبہ کو خط پکڑا لیا۔ وہ حیران ہوئی کہ ابھی تو اس تک خط پہنچا بھی نہیں ہو گا پھر جواب۔

مگر خط کھولنے پہ معلوم ہوا کہ جب تصدیق کے لیے اس کے گھر والے کیسپس گئے تو اسے زخمی حالت میں دیکھ کر شکر ادا کیا اور اس انواہ پر اپنے گھر میں ٹوٹنے والی قیامت کے ساتھ ہاجرہ کے بارے میں بھی بتا دیا کہ وہ سیڑھیوں سے گر گئی ہے۔ اٹھارہ ٹانگے آئے ہیں

صرف سر پہ۔ اس نے تڑپ کر خط لکھ ڈالا تھا۔

اس کے خط کا متن بھی ہاجرہ کے خط سے مختلف نہ تھا۔ اس نے لکھا۔

”ایک گولی بایاں کندھا چیرتے ہوئے نکل گئی۔ دھماکے کے سبب ایک لوہے کا ٹکڑا ہینڈل میں پیچھے کی طرف گھس گیا۔ ٹھنڈ اور دھند نے تکلیف کو حد سے سوا کر دیا تھا۔ مگر اڑتالیس گھنٹے بعد یہ تکلیف دس گنا بڑھ گئی۔ جب مجھے اطلاع ملی کہ تم۔۔۔ سیر میوں سے گر گئی ہو۔

میں اشتعال میں اپنی پوزیشن سے بہت آگے بڑھ گیا تھا۔ پکڑا بھی جاسکتا تھا۔ مارا بھی جاسکتا تھا۔ مگر کیمرپس کے بستر پر لیٹے ہوئے مجھے اندازہ ہوا کہ گولی محض میرا کندھا چیرتے ہوئے کیوں نکل گئی۔ دھماکے میں لوہے کا ایک ٹکڑا ہی میری ہینڈل میں کیوں گھسا۔ اس لیے کہ آٹھ گھنٹے بعد ہی سی مگر میری ہاجرہ کو ہوش آگیا تھا۔ جب تم زندہ تھیں تو میں کیسے نہ بچتا۔ مگر تمہیں میری قسم ہے ہاجرہ! تم اپنا خیال رکھو۔ اگر مجھے عازمی دیکھنا چاہتی ہو تو تمہیں خود بھی زندہ رہنا ہوگا۔ ورنہ اگلی دفعہ میری دعا ہوگی کہ گولی صرف میرا بازو چیرتے ہوئے نہ نکل جائے۔ دل میں بیوست ہو جائے۔“

ہاجرہ نے کرب سے آنکھیں بھیجنے لگی تھیں۔ محبت اور تکلیف آج دونوں اپنی انتہاؤں پہ پہنچی محسوس ہو رہی تھیں۔ طیبہ نے دیکھا۔ اس کی بند آنکھیں لرز رہی ہیں۔ ہونٹ کپکپا رہے ہیں۔ اس نے ضبط کی کوشش میں ہانگ کی چادر منھی میں سمیٹ لی ہے۔

”ہاجرہ!“ اسے لگا اس کے دماغ کی رگ پھٹ جائے گی۔

”طیبہ!“ اس نے آنکھیں کھولیں۔ ایک ساتھ ڈھیر سارے آنسو اس کے گالوں پہ گرے۔ وہ آگے بڑھی۔ اسے اٹھنے سے روکا۔ ہاجرہ نے اس کے ہاتھ تھام لیے اور بڑی لجاجت سے کہا۔

”طیبہ۔۔۔ ابو بکر کو کبھی میری کسی تکلیف کا نہ بتانا۔

میں مر بھی جاؤں تو اسے نہ بتانا۔ مجھے اس کی زندگی چاہیے۔ اس کی سلامتی۔ بس!“

طیبہ نے اس کے ہاتھ دبا کر اس کا ہاتھ چوم کر اس سے وعدہ کیا تھا۔



کچھ لوگوں کی عداوتوں میں کچھ لوگوں کی محبتوں میں اضافہ کرتے کچھ دن آگے بڑھے۔ ایک ایک پل کو ماضی بناتے وقت نے ان دونوں کی جھولی میں کوئی خوشی نہیں ڈالی تھی۔ سوائے ایک کے۔

ابو بکر کیپٹن بن چکا تھا۔ بہت خوش تھا۔ ہاجرہ اس کی خوشی میں خوش تھی۔ ایک دکھ بھی تھا۔ ہاجرہ کے سر میں اس دن کے بعد سے مستقل درد رہنے لگا تھا۔ اکثر آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا۔ اکثر ہی وہ بے ہوش بھی ہو جاتی۔ ٹیسس انکھیں مگردل میں اٹھنے والی ٹیسوں سے مقابلتا ”کم درد کی حامل ہوا کرتی تھیں۔ سہ جاتی تھی۔ ابو بکر اس کے درد میں شریک نہ تھا۔ بے خبر جو تھا۔

گزرتے دنوں میں جلال چاچا شہر میں جا بے تھے۔ ان کے چھوٹے بیٹے کو شہر میں پی نوکری مل گئی تھی۔ ہاجرہ نے گھر سے باہر جھانکنا ہی چھوڑ دیا۔ ایک تو وہ اب بیمار رہنے لگی تھی۔ دوسرا اب ان گلیوں میں اس کے قدموں کے نشان تھے نہ خوشبو۔ رابطے کا بظاہر ذریعہ محسن تھا۔ مگر کبھی کبھی اپنے اپنے آسمانوں پہ دکھتے چاند

کو اپنے دل کی کیفیتیں سنا دیتے اور مطمئن ہو جاتے کہ جب وہ اس کے آسمان پہ چمکے گا تو ہمارا پیغام بھی دے دے گا۔ پھر جو چاند مسکرا نا دکھتا۔ تو سمجھ جاتے ہمارا محبوب خوش ہے۔ بجھا بجھا سا لگتا تو مسکراہٹ ٹھم جاتی کہ اس طرف اداسی ہے۔ کبھی جو شرمندہ دکھتا تو بھی سمجھ جاتے کہ ابھی چاند نے پیغام پہنچایا نہیں ہے۔ پھر۔ ایسا کرتے کہ چاند سے ہی خفا ہو کر سونے کی تیاری کرتے کہ اب خواب میں ہم خود ہی بتا دیں گے۔ تم رہنے دو!!

رات کے ڈھلنے میں اور صبح کے ہونے میں کچھ وقت تھا۔ جب زور سے الارم بجا۔ سب ہڑپٹا کر اٹھے اور اٹھتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ پہلے سے ہی جاگ رہا تھا اور بستر چھوڑنے میں اس نے بھی لمحہ نہیں لگایا۔ بنیان پنی اور بیلٹ کتے ہوئے ہاتھ روم سے نکلا۔ برابر والے بستر پہ اب تک سوئے پڑے رافع پہ نظر ڈالی۔ وہ نیند کا دمٹی تھا۔ اس نے شرٹ کی آستین میں ہاتھ ڈالے اور اسے آواز دی۔

”رافع!“ اس کی بند آنکھوں میں ذرا سی جنبش ہوئی۔

بٹن لگائے بغیر وہ جوتے پہنے لگا۔ ایک جوتے کے تسمے باندھ کر اس نے رافع کا پاؤں پکڑ کر جھٹکادیا۔

”اٹھ جلدی۔“ وہ ذرا سا کسمسلیا۔ وہ بیدار ہو چکا تھا مگر اس کی نیند نہیں ٹوٹ رہی تھی۔ اس نے دوسرے جوتے کے تسمے کے اور بٹن لگانا تیزی سے باہر کی طرف بڑھا۔

”میرے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے کمرے سے باہر آ جا۔“ اس نے باہر نکلنے سے پہلے رک کر کہا اور دروازے کے ساتھ والے بستر سے تکیہ اٹھا کر زور سے رافع کے منہ پہ پھینکا اور نکل گیا۔

وین کی طرف بھاگتے ہوئے وہ قیص بیلٹ میں اڑس رہا تھا۔ گاڑی کے پاسیدان یہ پاؤں رکھ کر اس نے پلٹ کر دیکھا اور مسکرا دیا۔ رافع بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔ اس طرح کہ اس نے شرٹ کا ایک کندھا ڈال لیا تھا اور دوسرے ہاتھ میں جوتے پکڑے ہوئے تھے۔ تاریکی میں دور سے نظر نہیں آ رہا تھا مگر اسے یقین تھا کہ اس کی آنکھیں ابھی بھی نیند سے بند ہیں اور وہ اندازے سے بھاگ رہا ہے۔ اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

رافع گاڑی کی طرف آنے کے بجائے گیٹ کی طرف دوڑ رہا تھا۔ وہ راستہ کم تھا۔ گاڑی کے پیچے چرچائے اور وہ تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھی۔ گیٹ سے نکلنے سے قبل اس کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے اس نے وین کا سائیڈ والا ڈنڈا پکڑا اور اچھل کر پاسیدان

پہ قدم جمایا اور دو سرا پاؤں اندر رکھا۔

”نیند کی گولی کھا کر نہ سو تو کبھی بلا وجہ ایسے بہادری کے مظاہرے نہ کرنے پڑیں۔“ اس نے پیار سے طنز کیا۔ رافع نے گہری گہری دو تین سانسیں بھریں پھر اسے گھورتے ہوئے جواب دیا۔

”ہمیں بھی کسی سے اتنا پیار ہو گیا ہو تا تو ہم بھی کھنٹی بچنے سے پہلے تیار بیٹھے ہوتے۔“ وہ جوتے پہنے لگا۔ وہ مسکرا دیا۔

”سارگٹ پورا نہیں کیا تم نے۔ میں گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔“ اس نے دوبارہ چوٹ کی۔

”آپ کے خطوط سنبھال کر رکھ رہا تھا۔ جو جناب لکھتے لکھتے چھوڑ آئے تھے اور جو تکیہ تحفے میں دیا تھا نا“ اسی کے نیچے حفاظت سے رکھ کر آیا ہوں۔“

”واپس نہ آیا تو یاد سے بھجوا دینا مکمل کر کے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”اور حکم؟“ رافع چڑ گیا تھا۔

”بس یہی۔“ اس نے ہنوز مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”میرے خیال میں اب تمہیں تسمے بھی باندھ لینے چاہئیں اور بٹن بھی لگا لینے چاہئیں۔“ عبدالسلام نے دونوں کو ٹوکا تو رافع اسے گھورنے کا سلسلہ بند کر کے نیچے جھک گیا۔ ابو بکر نے آسمان کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ خط تو پتا نہیں کب پہنچا۔ اس نے چاند کو پیغام دے دیا۔

وہ آپریشن رجا رہا تھا۔ اس کا پھلاز خم بھر چکا تھا۔ وہ دور تھے مگر ایک ہی چاند تلے تھے یہ یقین بڑا جاں نواز تھا۔



”ابو بکر“

ہمیشہ کی طرح خیریت، عافیت اور صحت و سلامتی کی ڈھیروں دعائیں۔ گاؤں نہ آنے کی تاکید اور خود آنے کے وعدے کے ساتھ تحریر کی صورت میں تمہارے سامنے ہوں۔

اور سینے میں اٹھنے والے کرب کو چھپانا سخت دشوار ہو جاتا ہے۔

محلے سے جانے والے لوگوں کے محض ذکر پہ رونا کیوں آگیا۔ خاموشی اور بہت دھیان سے چائے پینے کے بلو جو پھندا کیوں لگ گیا۔ ہاتھ سے چیز اچانک کیوں چھوٹ کر گر پڑی۔ میرے پاس بہانے ختم ہو گئے ہیں ابو بکر۔

میں بہت خوش ہوں۔ مجھے کوئی یاد نہیں آتا۔ یہ ظاہر کرتے کرتے تھک چکی ہوں۔ ہر دوسری نظر مجھے مشکوک لگتی ہے۔ ایسے میں یہ مصنوعی زندگی بہت بھاری لگتی ہے مگر تم اور تمہاری یاد۔ اس مصنوعی زندگی کا حسن ہے۔ اور حسن بھلا کب دل و نظر کو گراں گزر تا ہے۔

گاؤں مت آتا۔ پرانی تاکید کے ساتھ خط سمیٹتی ہوں۔ مشکوک نظروں کو زبان مل جائے گی۔ میری کوششیں تو بے کار ہیں۔ تم دعا کرو۔ دل سے۔ شاید میں تم سے ملنے آسکوں بلکہ شاید تمہاری دعاؤں سے ہی آسکوں۔ ورنہ تو میں مجبور ہوں۔ بے بس ہوں۔ بے حد۔

رافع نے خط پڑھا اور موڑ کر وہیں مٹی پہ رکھ دیا۔ کچھ دیریوں ہی بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

اس نے معمول بنالیا تھا۔ جب وہاں سے خط آتا۔ اس کی قبر کے پاس بیٹھ کر با آواز بلند سناتا۔ وہ سنتا تھا یا نہیں۔ بس سناتا تھا۔

اس دن آپریشن سے ابو بکر زندہ نہ لوٹا تھا۔ اور ہنسی مذاق میں کسی اس کی بات کو رافع نے اپنی شہادت تک بھلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اس کا ہراز تھا۔ وہاں۔ طیبہ اس کی ہراز تھی۔

ہراز جانتے تھے۔ دو زندگیاں ایک دوسرے سے مشروط ہیں۔ سو۔

ابو بکر کے خط بنام ہاجرہ۔ ہاجرہ کے سرہانے جمع ہو رہے تھے۔ تکیے میں۔

اور ہاجرہ کے خط بنام ابو بکر۔ ابو بکر کے سرہانے جمع ہو رہے تھے۔ کتبے میں۔

مجھے اندازہ ہے۔ تم اب تک مجھے وعدہ خلاف سمجھنے لگے ہو گے۔ میں ہر خط میں شر آنے کا وعدہ کرتی ہوں اور۔ کتنے ہی سال ہو گئے یہ وعدہ کرتے ہوئے۔ تم جانتے ہو، سمجھتے ہو اچھی طرح میری مجبوریاں۔ میں تم سے ملنے تب ہی آسکتی ہوں کہ جب میرا شوہر شہر گیا ہو اور طیبہ فارغ ہو۔ اور یقین کر دے یہ دونوں سہولیات ایک ساتھ مجھے میسر ہی نہیں آئیں۔ تمہارے پوچھا تھا۔ کیا تم یاد آتے ہو مجھے؟

اس سوال میں چھپی تمہاری ناراضی میں جان سکتی ہوں۔ میں بڑی دیر میں خط لکھ پاتی ہوں تمہیں۔ اور تاخیر سے بھیجے ہوئے ان خطوط میں بھی بس ادھر ادھر کی فضول بے سرو پاتیاں۔ جو ستر بار تمہیں لکھ چکی ہوں اور تم خود بھی جانتے ہو جیسے۔ اعجاز چاچا کے پورے گھر والے دوبارہ عمو کر آئے۔ بی بی خالہ نے مین منزلہ گھر بنالیا۔ فضل دین چاچا نے اور زمینیں خرید لیں۔ میری پھوپھی کا بڑا بیٹا شہر میں ڈاکٹری پڑھنے گیا ہے۔ اس کا پہلا سال ہے۔ دوسرا سال ہے۔ تیسرا۔ اس کی تو ایسے خبر دیتی ہوں تمہیں جیسے ڈاکٹر بن کر وہ ہمارا ہی علاج کرے گا۔ کیا پتا کرے بھی۔ جب ہم بہت زیادہ بیمار ہو جائیں۔

قریب المرگ۔ ابو بکر۔ تم کوئی سبق نہیں ہو۔ کہ جسے کسی مخصوص وقت میں باقاعدہ بیٹھ کر سامنے رکھ کر مل کر یاد کیا جائے۔ تم۔ میرا معمول ہو۔ روزانہ

نپٹائے جانے والے کاموں کی طرح جسے کرنے کو کوئی کہتا نہیں ہے اور جسے کرنے کے لیے میں سوچتی نہیں ہوں۔ جیسے دھڑکتوں کا تسلسل، جیسے سانس کی روانی۔ کوئی بھی کلام نمٹاتے ہوئے ان میں کبھی خلل نہیں پڑتا۔ ایسے ہی تمہاری یاد بھی رہتی ہے میرے پاس پاس، میرے ساتھ ساتھ۔ میرے اندر، میرے باہر۔ دہلی پکاتے ہوئے، تریپائی کرتے ہوئے، کاجل لگاتے ہوئے، کھانا کھاتے ہوئے۔ پر جب کوئی شگساہٹی باتوں میں پرانے حوالے نکالتا ہے تو بڑی اذیت ہوتی ہے۔ تمہارے ذکر پہ ہونٹوں پہ پھیلنے والی مسکراہٹ



مثینہ عظمت علی کالجی دلائل

عدد افسانہ ہی لکھ لو۔ کتنا عرصہ ہو گیا تمہیں کچھ لکھے ہوئے۔

”لکھتی تو رہتی ہوں ہر وقت۔“ میں نے کچن میں رکھے کٹھنات کے پلندے اٹھائے۔ سامان کی لسٹ بجٹ کھانے کی ترکیبیں ٹوٹکے وغیرہ وغیرہ۔

”افسانہ کہہ رہا ہوں بھی۔“

”وقت بھی تو ملے۔ گھر کی مصروفیات۔“

”ایسی بھی کیا مصروفیات ہیں۔“ وہ چڑ گئے۔ ”ہم دو

ہی تو ہیں۔ پھر پھر بھی آتی ہے۔ اپنی سستی اور کابلی پر مصروفیات کا پردہ نہ ڈالو۔“

ہم دونوں کی یہی کمزوری تھی۔ وہ مصروفیات کا سن کر بڑبڑاتے اور میں ان کی چڑچڑ جاتی۔ یعنی۔ یعنی میرا کام نظر ہی نہیں آتا۔ افس۔

”صبحان اللہ۔ باقی سارا دن تو چھوڑیں۔ صرف آفس جانے کے بعد گھر کا منظر ہی دیکھ لیا کریں۔“ میں نے حتمایا۔

”لیکن آفس جانے کے بعد میں گھر کا منظر کیسے دیکھ سکتا ہوں۔“ بھولہن کی انتہا۔

”تو جاتے وقت ہی دیکھ لیا کریں۔“

”سارے گھر کے بچے رواں رواں۔ پوری طرح بیدار۔ حالانکہ پورے بیدار آپ مجھے کبھی نظر نہیں آئے۔ تین جگہ آپ آرام فرماتے ہیں۔ کمرے سے اٹھ کر لاؤنج میں استراحت فرماتے ہیں۔ پھر کبھی ادھر کبھی ادھر۔ تکیہ، تولیہ، کپڑے، چادر کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔ ہر طرف کی لائٹ کھلی ہوئی چائے کا

گئے دنوں کی بات ہے۔ خاصے دنوں کی۔

ملنگا کو گیند اور کوہلی کو بٹا کھماتے دیکھ کر میرا سر گھوم گیا جو کہ پہلے ہی سالن میں ڈوٹی گھما گھما کر گھوما ہوا تھا۔ اسی گھمن گھبروں میں۔ میں ان کی طرف گھوم گئی۔

”آخر آپ یہ فائل دیکھ ہی کیوں رہے ہیں؟“ میں نے تپلا کر کہا۔

”کیوں بھی؟“ انہوں نے مزالے کر کہا۔ میرے میاں کرکٹ کے شائق تھے جبکہ میرے لیے پاکستان کے ہارنے کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہتی تھی۔

”تم خود کو بڑا محب وطن سمجھتی ہو کہ بس ہم انڈیا سے ہار گئے تو تم ٹورنامنٹ کا بائیکاٹ کر کے بیٹھ گئیں جبکہ اصل محب وطن میں ہوں۔ انڈیا کو فائل ہوا کر۔ ہی انھوں گاٹی وی کے آگے سے۔“ وہ حوش سے بولے۔

”کیسے اٹھیں گے۔ یہ کوئی آخری میچ ہے؟ اس

کے بعد ویسٹ انڈیز، آسٹریلیا، آئرلینڈ۔ میں کہے دیتی ہوں کہ اس کمرے میں اب یہ لی وی رہے گا یا میں؟“ میں نے ساؤں پٹختے ہوئے کہا۔

”لیکن اتنی گرمی میں تم بغیر اے۔ سی کے کیسے رہو گی۔“

وہ معصومیت سے بولے تو میں واک آؤٹ کر کے کچن میں آ گئی۔ اور اپنے لیے چائے کا ایک اور کپ بنایا۔

”یوں چائے پی پی کر دل جلانے سے بہتر ہے کہ اس کے ساتھ ہاتھ میں کٹھن اور قلم ہی لے لو اور ایک

کپ اونڈھا، کٹکھی پلیٹ میں، کمرہ ہولناک، ہاتھ روم
ہیٹ ناک، صابن زمین بوس، شاور الگ گریہ کرتا ہوا
اور۔ اور۔

”اف بس کرو اب۔ تمہارے گھر کے منظر نے تو
موت کے منظر کو بھی مات دے دی۔ ممتاز نہ ہی
اسکا لڑکی طرح بولے چلی جا رہی ہو۔“

”اچھا۔ آپ کب سے سینٹر تجزیہ کار بن گئے۔“
”ارے میں کیسے بن سکتا ہوں۔ ابھی تو میں نیوز
کاسٹر بھی نہیں بنا۔“

”تو اس میں بھلا کتنا وقت لگتا ہے۔ دو ہفتے خبریں
پڑھیں، پھر اگلے ہفتے پروگرام اینکو بن جائیں۔ اس
سے اگلے ہفتے تجزیہ کار اور اس سے اگلے ہفتے سینٹر
تجزیہ کار۔“

”یعنی۔ تجزیہ کار نہ ہوا۔ سلمان گرندی
ہو گیا۔“

”آہ اس کا ساتویں دن اینڈ تو ہوا تھا۔ یہاں تو
ادھر ڈوبے، ادھر نکلے، ایک چینل پر ڈوبنے والا ستارہ



”سرے چھیل پر سورج جن کر ظلموع ہوتا ہے۔“
 ”تو اس پر ہی لکھ ڈالو کچھ۔“
 ”ہاں۔ کار جمل دراز ہے۔“



شام کو تپا بھائی جان چھوٹے بھیا سب آدمی کے
 اور میری بی بی ہوئی چائے اور پکوٹوں پر میری قبل از
 وقت ریٹائرمنٹ کا جشن منایا۔

”مان لو کہ ایک وقتی اہل کے تحت تم نے چند
 کہانیاں لکھ ماریں۔ اب تم سے کچھ نہیں ہو سکتا۔“
 پکوٹوں کی چوتھی پلیٹ لے جانے پر بھائی جان
 نے مصرعہ طرح کی طرح یہ جملہ پھینکا۔ دل تو چاہا کہ
 ”جولیا“ پوری غزل عرض کروں، لیکن اس وقت شمع
 محفل اپنی طرف کرنے کا وقت نہیں تھا۔ پیچھے کڑاہی
 میں پکوڑے جل رہے تھے۔

”یار! بہت دن سے تمہارے ہاتھ کی بریانی نہیں
 کھائی۔“ چھٹی پلیٹ پر چھوٹے بھیا نے باؤنسر پھینکا۔
 ”جمعہ رکھ لیتے ہیں۔“ انہوں نے فوراً کہا۔ میں
 نے گھور کر انہیں دیکھا۔

”توں نے چارے کو دکھ رہی ہو۔“ آپا نے ڈانٹتے
 ہوئے کہا۔ ”لگتا ہے اس مسکین کو کچھ کھانے کو نہیں
 دیتیں۔“

مسکین نے یہ سن کر اپنے اوپر مزید مسکینی طاری
 کر لی۔

میرے میاں بھی میاؤں کی اس قسم سے تھے جو
 سرایوں کے ساتھ اس قدر بنا کر رکھتے ہیں کہ اگر
 میاں بیوی کے درمیان کچھ مسئلہ ہو جائے تو سارے
 سرالی ان کی طرف ہو جائیں اور بیٹی منہ دیکھتی رہ
 جائے۔

وہ سب لوگ تو ہم پر جملے کس کس طعنے دے کر
 چلے گئے۔ رات کو یہ بھی سو گئے، لیکن میں دیر تک
 ”ٹارزن کی واپسی“ کی طرح کہانیوں کے آئیڈیاز پر غور
 کرتی رہی۔



اگلے دن ان کے آفس چلے جانے کے بعد ادھر
 ادھر کے کام کے بجائے اپنی فائل نکالی۔ کانڈات
 چھانٹے، رف نوٹس پڑھے۔

”ارے میرے پاس تو اچھے خاصے آئیڈیاز رکھے
 ہیں۔“

چائے کا کپ پینا کس۔ کافی کے کپ جتنی
 انٹلکچوئل نہیں تھی اور ایک موضوع منتخب کر کے
 لکھنا شروع کیا۔ دو تین صفحات جم کر لکھے، پڑھے تو
 مڑا آیا۔

”ٹھیک ہی تو کہتے ہیں سب۔ خواہ مخواہ میں اپنا
 لٹریٹ ضائع کر رہی ہوں۔ یوں ہی باقاعدگی سے لکھتی
 رہوں تو۔“

ابھی باقاعدگی سے چھ سات افسانوں تک خیالوں کی
 اڑان نہیں گئی تھی کہ فون بجنے لگا۔

”کیا ہے بھئی۔ فون ہی نہیں اٹھاتیں۔ اوپر سے
 یہ انیس سو تار کی کا گانا لگایا ہوا ہے۔ کل بھی اتنی
 مرتبہ نمبر ملایا۔ نہ کل بیک نہ کوئی مسیج بندہ ایک
 مس کال ہی دے دیتا ہے۔“ یہ ہماری دوست نوشین
 تھی جو ہمیشہ کسی نہ کسی کا کفن پھاڑ کر ہی بولتی تھی۔
 ”کب بھئی۔“ میں نے ذرا صفائی دینے کی
 کوشش کی۔

”ہاں تم تو بڑی مصروف ہو، بڑی آئیں خادم
 اعلیٰ۔“

”لیکن اس وقت تو تمہارا جوش خطابت خادم اعلیٰ کو
 بھی مات دے رہا ہے۔“ میں نے قدرے تحمل اختیار
 کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا۔ اچھا۔ اب زیادہ یونس بٹ بننے کی
 ضرورت نہیں اور ہاں۔ یو فون ہے نا تمہارا۔ میرا
 ہیکج ہے۔“

اس نے اپنا ہر فون کال پر کیا جانے والا سوال دہرایا
 اور حسب معمول جواب کا انتظار کیے بغیر اپنا بیان
 جاری رکھا اور وہ کوئی بے وقوف نہیں تھی۔ اچھی
 طرح چیک کرنے کے بعد ہی نمبر ملاتی تھی۔

”کل میری بسن آئی تھی۔ تمہارا پوچھ رہی تھی

یار۔ تم نے بہت عرصے سے کوئی افسانہ نہیں لکھا، شکایت کر رہی تھی۔“

”اس؟ شکایت۔ میں نے کیا اسے ہر ماہ ایک افسانہ پہنچانے کا وعدہ کیا تھا؟“

”مگر ایک تو وہ تمہارے افسانے پڑھتی ہے۔ میں نے ہی اس سے کہا تھا کہ میری دوست لکھتی ہے۔ وہ بھی خوش ہو کر سسرال میں اتراتی پھری کہ اس کی بہن کی دوست رائٹر ہے۔ اب اس کی نند کہہ رہی ہیں کہ تم نے لکھنا ہی چھوڑ دیا ہے۔“

”اب مجھے کیا معلوم تھا کہ میرا افسانہ بھی تمہاری بہن کے جینز کا کوئی آئٹم ہے اور تمہاری۔ تمہاری بہن اور اس کی نند اور ان کے تمام اہل خانہ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں اس وقت ایک عدد افسانہ ہی لکھ رہی ہوں۔“

یہ دراصل اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اب وہ فون بند کر دے، لیکن اس نے ماہانہ پیکیج اس لیے تو نہیں لیا تھا کہ بات صرف چار منٹ میں ختم کر دے۔

”ارے تمہیں بتا ہے۔ وہ جو۔“

پھر جو وہ اپنی ساس، نند کے قصوں سے شروع ہوئی تو لان کے نئے برش تک جا پہنچی وہاں سے لیفٹ ٹرن لیا تو بات ترنگی ڈراموں سے شروع ہو کر ”پیارے افضل“ پر آن رکی اور بلا مبالغہ پچیس منٹ رکی رہی، پھر ٹاک شوز کی طرف مڑ گئی۔ پھر ایوارڈز شو۔ حتیٰ کہ ٹی وی نہ دیکھنے، فون نہ اٹھانے، اس کی دوست ہونے اور وہ سروس استعمال کرنے پر جس کا اس نے پیکیج لیا ہوا تھا کی ابھی طرح سزا دینے کے بعد آخر کار بولی۔

”چھا۔ اب افسانہ لکھ دنا جلدی۔“

میں نے ادھر رے افسانے، سن ہاتھ، گرم کان، گھوٹے دماغ، لوہیٹری کا سگنل دیتے فون، خشک حلق اور سوتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ”چھا“ کہنے کی کوشش کی، لیکن ناکام ہوئی۔ لیکن اس کا کچھ فائدہ بھی نہیں تھا۔ وہ اچھا برا سب کہہ کر فون بند کر چکی تھی۔ میں نے بھی افسانہ بند کر کے رکھ دیا۔

دو دن پھیروں ہی گزر گئے۔ تیسرے دن ہمت کر کے پھر فائل سنبھالی۔ ابھی تین صفحے ہی لکھے تھے کہ فون کی بیل بجی۔ پچھلی بار کے تجربے کے بعد اس بار عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے موبائل فون آف کر دیا تھا۔ لیکن یہ عقل مندی کام نہ آئی اور لینڈ لائن نمبر بجنا شروع ہو گیا۔ فون کرنے والے سے پہلے تو میاں پر غصہ آیا۔ کئی بار کہا تھا کہ موبائل فون کے ہوتے ہوئے اس کی ایسی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ لیکن جواباً ”وہ اس کی افادیت پر ایک لمبی چوڑی تقریر کرتے جس کے اختتام سے پہلے ہی میں فون کے حق میں دستبردار ہو جاتی۔“

بالکل خواستہ کاغذ اور قلم پٹخے اور نہایت غصے سے ریسپور کان سے لگایا، اور ایسا کرتے ہی کان پھٹنے لگے۔ پہلے تو سمجھ ہی نہیں آیا کہ کس نے ہمیں فون کر کے بم دھماکے کی ریکارڈنگ لگادی ہے یا جج جج کہیں بم پھٹ رہے ہیں۔

”الٹی خیر۔“ کچھ اوسان بحال ہوئے تو اس آواز سے کچھ قریبی رشتہ محسوس ہونے لگا۔ حتیٰ کہ وہ آواز پہچان ہی لی۔

”کہاں مر گئی ہو۔ موبائل آف اور یہ فون ہے کہ اس کی بیل بج کر سحری کرنے والی ہے۔“ آپا مجھ پر برس ہی پڑیں۔

”لفظ ”سحری“ سن کر ایک جھٹکا سا لگا۔ افسانہ دھماکے، فون آپا سب ذہن سے ہٹ گئے اور یاد آیا کہ میں تو اپنے میاں سے پوچھنا ہی بھول گئی تھی کہ اس دن ویرات کوہلی کی سحری ہوئی تھی یا نہیں۔ اس وقت ساری خواہشات پس پشت چلی گئیں۔ سوائے اس کے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ کوہلی کی سحری ہوئی تھی یا نہیں۔ (یعنی اصل خواہش یہ تھی کہ کہیں کوہلی تو نہیں؟)

”آپا! یہ بتاؤ تم نے ٹی ٹوئنٹی کا فائنل دیکھا تھا۔ کوہلی کی سحری۔ ہوئی۔ تھی۔“

”اس۔۔۔“ یہیں سے آپا کا کھلا ہوا منہ نظر آنے لگا۔ ”لگتا ہے کہ پاکستان کی ٹھکست نے تمہاری ذہنی

حالت پر مضر اثرات ڈالے ہیں۔ اس کو تو بہت دن ہو گئے اور آج کہاں سے یاد آگیا اور مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو، جانتی ہو کہ مجھے ان ”خرافات“ سے کوئی دلچسپی نہیں اور میں کوئی نجوم سیکھی ہوں۔ یہی حسینی کہ ماجد بھٹی۔؟ آپا کا غصہ تو عروج پر تھا ہی معلومات عامہ بھی اس ”خرافات“ سے دلچسپی نہ ہونے کے باوجود غضب کی تھیں۔

”اور نہ ہی مجھے کسی کو نر پروگرام میں واٹر کولر جیتنا ہے۔“ آپا نے مزید اضافہ کیا اور بس الٹی سیدھی ہانکے جا رہی ہو۔ یہ بھی نہیں پوچھ رہیں کہ فون کیوں کیا ہے؟

”فون کیوں کیا ہے؟“ میں نے جلدی سے پوچھا مبادا ان کا زور خطابت مزید زور نہ پکڑ جائے۔
”کیوں؟“ وہ براہی مان گئیں۔ ”بڑی بہن ہوں تمہاری۔ فون بھی نہیں کر سکتی؟“
”اے۔۔۔ میں تو ہکا بکا ہی رہ گئی۔“

”اوہو بھٹی۔۔۔ ان ٹالا نقول نے سر ہی گھما دیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ جنوں میں کیا کیا بک رہی ہوں۔“ آپا نے کہا۔
”کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔“

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر اپنی فائل کو دیکھا۔ آپا کے اپنے ہونہار اور لاڈلے سپوتوں کے ذکر نے ہی مجھے باور کروا دیا کہ آپا کی طرف سے مجھے کوئی ”مشن امپاسبل“ تفویض ہونے والا ہے۔ جس کی تکمیل تک کوئی کام کرنا تو دور کی بات سوچنے تک کی مہلت ملی ہو، تاریخ ایسی گواہی دینے سے قاصر ہے۔
”ویسے تو پڑھائی میں اچھے ہیں، لیکن بس اردو پڑھ کے نہیں دیتے۔“ آپا نے بیان جاری رکھا۔ ”آج تمہارے بھائی جان سے کہا ہے کہ اسکول سے واپسی پر تمہارے گھر چھوڑ دیں۔ ذرا ان کو تیاری کروادو۔ دو دن بعد ان کا گرینڈ ٹیسٹ ہے۔“

”جی آپا! ضرور۔“ کچھ بھی تھا۔ اپنے بھانجے مجھے جی جان سے عزیز تھے۔

”اور دیکھو لٹچ پر نوڈلز وغیرہ بنالیا یا نکٹس۔ ہزار

نخروں سے تو کھاتے ہیں۔“

”جی اچھا۔“

”اور بتاؤ افسانہ لکھا کہ نہیں؟“ (گویا اس کے بعد بھی افسانہ لکھنے کی گنجائش تھی؟)
”کہاں آیا۔ وقت ہی۔“

”وقت کی اچھی کمی تم نے۔“ انہوں نے بات کٹ دی۔ ”بس خود کو مورد الزام نہ ٹھہراتا“ سدا کی کابل کام کی نہ کالج کی، میاں تمہارا اللہ میاں کی گائے، ہتھیلی کا چھلا بنا کر رکھا ہوا ہے۔ راوی ہر طرف چین لکھتا ہے اور تم سے دو حرف لکھے نہیں جاتے، تلج نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔“

اور میں سخت برا مان گئی۔ اس لیے نہیں کہ آپا نے مجھ پر تنقید کی تھی، بلکہ اس لیے کہ آپا کو اردو پڑھانے کے لیے بچے میرے پاس بھیجنے کی ضرورت تھی بھلا۔

”خالہ۔“ کامران اور سلمان نے آتے ہی نعرہ بلند کیا۔

”Wifi کاپس ورڈ بتائیے جلدی سے۔“
”ارے۔۔۔ یہ کہاں سے آئے؟“ ہم نے ان کے ٹیبس کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ ”اسکول میں اجازت ہے لے جانے کی؟“

”نہیں ہم نے پایا سے کہا تھا کہ ساتھ لے آئیں۔ ان کے بغیر پڑھائی کیسے ہوگی۔“

”جن سے پڑھتے ہو نا۔ وہ سب ان کے بغیر ہی پڑھے تھے۔“ میں نے بتایا۔

”لیکن ہم تو کسی جن سے نہیں پڑھتے۔“ کامران نے سنجیدگی سے کہا۔

”اوہ میرے ننھے جن! پہلے کھانا تو کھاؤ۔“

کھانے کے بعد کتابیں لے کر بٹھایا۔

”بتاؤ کیا پڑھنا ہے؟ کیا پوچھنا ہے۔“

”خالہ! یہ مذکر مونث سمجھ میں نہیں آرہے۔“ سلمان بولا۔

”لو بھلا ان میں کیا مسئلہ ہے۔“

”جگنو!“ وہ بولا۔ ”جگنو!“ میں بھونچکی رہ گئی۔
جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کرنے والے بچے تو
سنے تھے۔ جگنو کی مونٹ پوچھنے والا یہ پہلا بچہ تھا۔
”بانے۔“ اس نے دو سرالفظ بتایا۔

اپنے زمانہ طالب علمی میں تو ہم بس لڑکا۔
لڑکی۔ اماں۔ ابا۔ بہن بھائی کارنامہ کرنا کر مونٹ
سے فارغ ہو جایا کرتے تھے اور کسی دن حقوق حیوانات
کا خیال آیا تو شیر شیرنی مرغی مرغی اللہ اللہ خیر صلا۔
”خالہ! یہ ایک ہی آواز کے اتنے مختلف لیٹرز کیوں
ہیں نہ۔ نہ۔ ض۔ ظ۔ ہمیں کیسے پتا چلے گا کہاں کیا
لکھنا ہے۔“

ابھی میں باز اور جگنو میں ہی پھنسی ہوئی تھی کہ
ایک اور سخت سوال۔
”یہ تو کسی ماہر لسانیات سے ہی پوچھنے پڑیں گے۔“
میں نے کہا۔

”تو امی ہمیں پہلے ہی کسی ماہر نفسیات کے پاس بھیج
دیتیں۔ آپ کے پاس کیوں بھیجا؟“
”ماہر نفسیات نہیں الو! ماہر لسانیات، لیکن تم
دونوں نے مزید دو ایسے سوالات پوچھے تو شاید مجھے کسی
ماہر نفسیات سے رجوع کرنا پڑ جائے اچھا اور کیا ہے؟
ان کو پھر دیکھتے ہیں۔“

میں نے ذہن میں اپنے اردو دان نیٹ فرینڈز کے
نام یاد کرنا شروع کر دیے۔

”کبریٰ“ اصغری ہے۔ دو بہنوں کی کہانی، پہلا حصہ
میری کلاس میں ہے، دو سرا بھائی کی۔ ”کامران نے
بتایا۔

”چھا ٹھیک ہے، ایسا کرو۔“ میں نے کہا۔
”میرے پاس اور بچل ناول ”مرآۃ العروس“ موجود
ہے، میں وہ لے کر آئی ہوں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے
کہا۔

”ارے۔“ ایک دم سے میرے ذہن میں جھماکا
ہوا۔

کچھ دن پہلے نیٹ پر شغلا ”سرلنگ کرتے ہوئے
پرائیڈ مارا العروس ملا تھا جو کسی زمانے میں صبح کی

نشریات میں دکھایا گیا تھا اور بے حد مقبول ہوا تھا۔
ارے غزل اور عارفہ صدیقی کے یادگار کردار۔
”میں تم لوگوں کو ایک لی وی پی دکھاتی ہوں۔ اس
سے پورا ناول بھی سمجھ آئے گا اور اردو کا تلفظ بھی صحیح
ہوگا۔“

پلے کے نام پر وہ خوش ہو گئے۔
”خالہ! یہ ابھی تک چلتا ہے۔“ سلمان نے ہمارے
پارے اکلوتے لاڈلے کمپیوٹر کی طرف اشارہ کیا۔
”کیوں نہیں چلتا، پاگلو خبردار۔ جو اس پر تنقید
کی۔ کمپیٹی ڈال کر لیا تھا۔“

سلمان اور کامران ”کھی کھی“ کرنے لگے، لیکن میں
نے مطلق پروا نہ کی۔ انہیں وہاں بیٹھا کر میں ان کے
ٹیب پر سرچ کرنے لگی۔ وہی مذکر مونٹ، پھر چائے
بنا کر پینے لگی۔

”ارے تم یہاں بیٹھی چائے پی رہی ہو۔ وہ دونوں
کہاں گئے۔ کچھ پڑھایا نہیں۔“
”ارے آیا۔ تم۔ اچانک۔“

”ہاں۔ بس اکیلے میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ اس
لیے چلی آئی۔ چائے پلاؤ اور یہ ہیں کہاں؟“
”مرآۃ العروس دیکھ رہے ہیں ایک کھٹے سے۔“
میں نے تحریر بتایا۔

”کیا پڑھنے کی چیز کو دیکھ کیسے رہے ہیں؟“ وہ حیران
تھیں۔

میں نے انہیں اپنا ڈاؤن لوڈڈ کارنامہ بتایا، لیکن
انہیں یقین نہ آیا کہ ان کے مستی لوڈڈ بچے ایک پرائیڈ
ڈراما اور وہ بھی پی پی وی کا اتنے سکون سے دیکھ سکتے
ہیں۔

”اور اگر وہ واقعی دیکھ رہے ہیں تو۔“ آپا گھبرا
گئیں۔

”تو گھبرانے کی کیا بات ہے اس میں۔“
”کہیں عاقل جیسے ڈفر ہی نہ ہو جائیں یا کامل جیسے
گھامڑ۔“

”اور ہو سکتا ہے کہ اصغری سے اچار اور مرثوں کی
ترکیبیں ہی سیکھ لیں۔“ میں نے شرارت سے کہا۔

”لیکن بلا عظمت کی مکاریاں سیکھ لیں تو۔“ آپا کا سوال۔ ہم نے کمرے میں جا کر دیکھا تو حق حق وہ گئے ڈھنکا چھکا ڈھنکا چھکا۔

نہ بلا عظمت کی چلاکیں، نہ عاقل کی نالائقیوں وہ دونوں تو سلمان خان سے بارہ مہینوں میں بارہ طریقوں سے پیار جاننے کے طریقے سیکھ رہے تھے۔



کچھ دن مزید سستی، کابلی، گرمی اور لوڈ شیڈنگ کی نذر ہوتے رہے، پھر بالآخر کسی سرکاری محکمے کی طرح پرانی فائل باہر نکالی اور آئیڈیاز کانٹے سرے سے جائزہ لیا۔ پچھلی کہانی سے تو دل اٹھ گیا تھا۔ اسے ادھوری کہانیوں والی فائل میں ڈال دیا، جس میں کہانیوں کی تعداد آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھی۔ جسے پورا کرنے کا عہد ہمیشہ خود سے کیا کرتی تھی، لیکن وہ وعدے بھی حکومتی وعدوں کی طرح ہی تھے۔ ہر بار پچھلے پلان ٹال کر نئے پلانز شروع ہو جاتے۔ اگر ہنگامہ کر کے ایک آئیڈیا منتخب کیا اور ابھی لکھنے کا سوچ رہی تھی کہ۔

ڈنگ ڈنگ۔

میں نے کچن نہیں دھرے اور کافذات کھولنا شروع کر دیے، لیکن ڈنگ ڈنگ ڈنگ ڈنگ کا سلسلہ قیامت تک رکنے کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ آخر اٹھنا ہی پڑا۔

”آئی! السلام علیکم!“ ایک ٹین ایجر لڑکا تھا کوئی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ اپنے علاوہ اور کوئی نظر نہیں آیا۔

”آئی! مجھے بلو پھپھو نے بھیجا ہے۔“

”بلو پھپھو؟“

”وہ سامنے۔“ اس نے سامنے والے سفید گیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

”اچھا اچھا۔ وہ بلقیس باجی۔“

”جی۔ جی۔ وہ ہی۔ ہمارے اسکول میں ڈبیٹ ہے۔ پھپھو نے کہا کہ آپ بہت اچھی تقریر لکھتی ہیں۔“ اس نے ایک کافذ میری طرف برعیا۔ ”اس پر

ٹاپک لکھا ہے۔ اس کی مخالفت میں پوائنٹس لکھنا ہیں۔“

”اچھا۔“ میں نے کافذ لیا اور اندر آ گئی۔

غضب خدا کا، بلو باجی جنہوں نے ہمیں گوروں میں کھلایا اور اب ان کا اتنا لبا ترنگا بھتیجا آئی کہہ کر چلا گیا۔ تسلی نہ ہوئی تو جا کر آئینے کے آگے کھڑی ہو گئی، لیکن اپنے آپ میں آئی پن کے کوئی آثار۔ نظر نہ آئے۔

”لو۔ شادی ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ کل تک جو نام لے کر لاتے تھے یا زیادہ سے زیادہ باجی کہتے تھے وہ آئی کہنے لگ جلتے ہیں اور چلے ہیں تقریریں لکھوانے۔“

دل تو چاہا کہ کافذ ہی پھاڑ کر پھینک دوں، لیکن ایک تو طبیعت کی مروت۔ اوپر سے جوش خطابت۔ کہاں جاتا۔ موضوع پڑھا۔

لازم ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

ارے۔ میں تو خود کبھی کبھی تو کیا ہمیشہ کے لیے دل کو تنہا چھوڑنے کی قائل تھی اور عقل کو اس کے پاس بھٹکنے سے بھی حتی المقدور روکنے کی حامی۔ تو اب اس کی مخالفت میں کیا لکھا جائے۔ یعنی عقل کو دل کا چوکیدار بنا دیا جائے، جو دن رات سیٹھیں بجاتی رہے اور ایسے دلائل دے جائیں کہ حاضرین سیٹھیں بجاتے رہ جائیں۔ لیکن اقبال کا شعر تھا اور وہ ان کا کوئی واحد شعر تو نہیں تھا۔ ان کے اشعار کا سب سے

بہترین مصرف تو ہماری قوم کے لیے یہ ہی ہے کہ تقریروں میں ہر دوسری سطر کے بعد پڑھے جائیں اور مکے مار مار کر ڈانس توڑ دیا جائے۔ ”شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات“ سے شروع کر کے ”لایا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا“ پر ختم کیا جائے۔ زمانہ طالب علمی گواہ ہے کہ حج صاحبان ابتدائی اور اختتامی اشعار اور مکوں کی آواز کے علاوہ کچھ نہیں سنتے اور انعام کا فیصلہ ان ہی اشعار اور مکوں کی تعداد پر ہوتا ہے۔

تقریر لکھنے بیٹھی تو افسانے کا فلسفہ ہی بھول گئی۔
تقریر پوری ہوئی تو کئے مار مار کر اس قدر بڑھل ہو چکی
تھی کہ کچھ اور کرنے کی ہمت نہیں رہی، بلکہ مزید کچھ
بھی کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ بلو بلو جی کا جھنجھا تقریر لے
کر اور ”تھینک یو آئی“ کہہ کر چلا گیا تو پھر گویا
یادداشت واپس آگئی۔ آئینے میں دوبارہ چہرہ کا جائزہ لیا
اور خواتین ڈائجسٹ کے پرانے شمارے نکل کر خوب
صورت بننے کی ترکیبیں بڑھتے ہوئے خیالوں ہی
خیالوں میں ایٹن بمیں، عرق ٹھاب، ملکنی مٹی، چہرے پر
لگائی رہی۔ پھر پانچ منٹ میں چہرہ چمکنے کی ترکیب
بڑھی جس کے لیے ”دو دن پہلے“ تیاری کرنی تھی۔
اچھی اس پر غور ہی کر رہی تھی کہ بلو بلو جی کا مہیج آیا۔
”بہت اچھی تقریر لکھی ہے، لیکن افسانہ کب
لکھو گی؟“ یعنی ہر اس شخص کا میرے افسانے سے کام
تھا جسے مجھ سے کچھ کام تھا۔“

سر جھٹک کر فرحت اشتیاق کا لہلہا پڑھنا شروع کیا
اور خیالوں ہی خیالوں میں دو خواب دیکھتی رہی۔ ایک
ایلیٹن پڑا کھانا اور دو سرائے آف خواب دیکھنے میں کیا
ہے۔
”فرحت جیسا دو ہزار صفحات کا لہلہا لکھنا۔“



”کیا لکھا؟“ رات کو شوہر صاحب نے پوچھا۔
”ٹھارہ اشعار والی ایک تقریر اور پانچ منٹ میں چہرہ
چمکانے کا نسخہ جس کے لیے دو دن پہلے تیاری کرنی پڑی
ہے۔“



”صل میں ساری کمزوری تمہاری ہے۔“
ناشتے کی میبل پر انہوں نے رات سے اچانک
اختیار کر لینے والی خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔
”تو کیا ساری رات کی سوچ و بچار کے بعد آپ پر یہ
انکشاف ہوا۔“ میں نے چائے کا گرم گھونٹ بے
مہری سے لیتے ہوئے کہا۔
”نہیں۔ یہ تو مجھے پہلے سے پتا تھا، بس رات

سکون سے گزارنے کے لیے تمہیں صبح بتانے کا فیصلہ
کیا۔“ انہوں نے اطمینان سے ارشاد کیا۔ ”یہ کیا
بہانے ہیں کہ کوئی آگیا، کسی کا فون آگیا، کسی نے تقریر
لکھوائی۔ وغیرہ تم خود ہی مصنفین کے قصے سناتی ہو
کہ فلاں کے اتنے بچے ہیں، کوئی جاب کرتی ہے، کسی
کا بھرا راکھ رہا ہے۔“

”نہیں جی! قصہ ہی ختم، اب سارے دن کی گپ
شب کے لیے ایک وہی میسر تھے، اسی اکلوتے پن کی
وجہ سے میں ہر بات ان سے شیر کر لیتی تھی، جو کہ بعد
میں میرے لیے باعث آزار ہوتی۔ وہ کسی ظالم ساس
کی طرح کو تباہی مگواتے، چالاک نند کی طرح طنز
فرماتے، مخالف دیورانی، جھٹھالی کی طرح خامیوں پر نظر
رکھتے، یعنی پوری سسرال کا کردار بخوبی ادا کرتے۔
میری تمام ماؤں سے اپیل ہے جو چھڑے جھانٹ رشتے
پر خوش ہوتی ہیں کہ بیٹی ساس، نند کے جھنجھٹ سے
بچی رہے گی تو وہ لڑکے سے ذرا تفصیلی تعارف اور جان
پہچان ضرور پیدا کریں کہ سارا کچھ اسی ایک بندے
میں تو نہیں ہے۔“

”اچھا رہنے دیں۔“ میں نے برامانتے ہوئے کہا۔
”آپ کو بھلا اتنی دلچسپی کیوں ہے، افسانہ نگار کامیاں
بننے سے کون سامیڈل مل جاتا ہے۔“
”وہ افسانہ نگار گو ہی نہیں ملتا تو اس کے شوہر کو کیا
ملے گا۔“
وہ آفس جانے کے لیے کھڑے ہوتے ہوئے
بولے۔



اس دن تو بس فیصلہ کر لیا کہ اب تو دنیا تیاگ کر لکھنا
ہے اور دنیا ہی کو دکھانا ہے۔
سوان کے آفس جانے کے بعد سارے فون آف
کر کے ملازمہ کو سختی سے تاکید کی کہ کسی سے نہیں ملنا
اور کمرہ بند کر کے بیٹھ گئی کہ آج تو باہر ایک کہانی لکھ کر
ہی نکلنا ہے۔
اب کہانی لکھنے کسی بونے نے تو آنا نہیں تھا، سو خود

تو گڈی نے مجھے سیاہی سے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ میرے پاس اب اڑاکاری کے جوہر دکھانے کا موقع نہیں بچا تھا سو وہ اپنے بیان کے جوہر دکھائے چلی جا رہی تھی۔

”کیسی ہو گڈی؟ اچانک چلی آئیں۔“

میں نے بمشکل کہا اور حیرت انگیز طور پر جملہ بوہا کرتے میں کامیاب ہوئی گئی۔ سوجہ دیوار پر لگی وہ تصویر تھی جس کی طرف وہ لمحہ بھر کو متوجہ ہوئی تھی اور میں اپنے لبوں سے کچھ الفاظ ادا کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔

کیا ہی اچھا ہوتا اگر گڈی اس اعلا تعلیم کے بجائے کسی اسکول میں بچوں کو مباحثوں کی تیاری کرواتا، وہ وہ شعلہ بیاں مقرر پیدا ہوتے کہ اسکول کا نام ملک بھر میں روشن ہو جاتا اور کسی ٹاک شو میں اپلائی کرنے کے لیے صرف یہ کہہ دینا ہی کافی ہوتا کہ امیدوار اس تعلیمی ادارے سے فارغ التحصیل ہے جہاں گڈی مباحثوں کی تیاری کرواتا تھی بلکہ وہ خود کسی چینل کو اپنی صلاحیتوں سے مستفید ہونے کا سنہری موقع فراہم کرتی تو سب کا فائدہ ہوتا اور سب سے زیادہ فائدہ تو خود ہم گھروالوں کو ہوتا کیونکہ ٹی وی تو پھر بھی بند کیا جاسکتا ہے۔

لیکن اس وقت تو یہ جیتی جاگتی گڈی میرے آگے کھڑی تھی، سونے پہ ساگہ میں اس سے ہینڈ رڈ ملین ڈالرز کا سوال بھی پوچھ چکی تھی کہ۔

”کیسی ہو؟“

”لو۔ کیسی ہو سکتی ہیں کتنا کہا تھا کہ میرا ایڈمیشن حیدر آباد ہی کروادیں، وہاں ہاسٹل تو ہوتا یا میں ماموں کے گھر ہی رہ لیتی۔ اور ہاں۔“

اس نے اچانک رک کر مجھے ضروری اطلاع دینے کے انداز میں دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ دان گوگ کی ہینڈ گز لگانا کوئی صحت مند رجحان نہیں ہے۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ وہاں تو اس فلیٹ میں، میں خوار ہو گئی ہوں۔ ایک تو ساتویں منزل پر فلیٹ ہے یہ جو آج اچانک آکر میں نے تمہیں

ہی کہانی لکھنا شروع کی اور لکھتی رہی، لکھتی رہی، حتیٰ کہ بچپن کے کچھڑے ہوئے ہیرو ہیروئن ایک جگہ آئے۔ طے ہیروئن کا دل دھڑ دھڑ دھڑک رہا تھا کہ اوہر دھڑ دھڑ دھڑانہ بچنے لگا۔ پہلے تو اسے اپنے قلم کا کرشمہ ہی سمجھا کہ ہیروئن کے دل کی دھڑکن سنائی دے رہی ہے۔ لیکن پھر احساس ہوا کہ مبالغے کی ساری حدیں پھلانگ کر بھی دل سحری جگانے والے کے دھول کی طرح نہیں دھڑک سکتا۔ اس دھڑ دھڑ کے پیچھے ضرور کوئی اور ہاتھ تھا۔

”آخر کون ہو سکتا ہے؟“ شدید بے زاری کے ساتھ دروازہ کھولا تو سامنے میری بہن گڈی کھڑی تھی۔

”کیا ہے بھئی۔ تم کیا رجب میں ہی احتکاف میں بیٹھ گئیں یا پھر سے مایوں بیٹھنے کا شوق چڑا یا ہے۔ اوپر سے وہ تمہاری ملازمہ کہتی ہے کہ آپ اندر نہیں جاسکتیں۔ میں نے اس سے کہا کہ اس بات پر تو میں تمہیں اندر کروا سکتی ہوں۔ بھلا مجھے کون روک سکتا ہے۔ آفٹر آل چھوٹی بہن ہوں اور تم سے زیادہ تو دودھا بھلی مجھے اپنی بہن سمجھتے ہیں اور امی کے گھر تو سب سو رہے ہیں۔ میں کھکی ہاری، گھر کو ترسی ہوئی، اتنا سفر کر کے آئی اور خواب میں بریائی کھاتی ہوئی آئی، لیکن یہاں سب خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہیں، آیا کو فون کیا تو کامران نے بتایا کہ وہ بھی محو خواب ہیں۔ آخر یہاں سب کو اتنی نیند کیوں آتی ہے؟ اوہر میرا یہ حل ہے کہ ایگزامز کی ٹینشن نے دن رات کی نیند اڑا رکھی ہے۔“

در اصل گڈی اعلا تعلیم کے لیے کراچی میں رہتی تھی، وہاں وہ چند اور کالج فیلوز کے ساتھ رہتی تھی، لیکن پڑھائی کی شدید مصروفیات اور ایک دوسرے سے علیحدہ ٹائم میبل کی وجہ سے گڈی کو اپنے خطیبانہ جوہر دکھانے کا موقع کم ہی ملتا تھا۔ اس لیے وہ اپنے الفاظ کا ذخیرہ بڑی فیاضی سے ہم پر لٹایا کرتی تھی۔ لہذا گڈی کو دیکھتے ہی سب کو نیند آنے لگتی اور جسے نہیں آتی وہ کم از کم نیند کی ایکٹنگ ضرور کر لیتا تھا، لیکن آج

سر رائے۔ (سہہ پرائے) دیا ہے اس کی وجہ بھی یہ ہی ہے گیٹ پر ہی چاچا گارڈ نے بتادیا کہ لفٹ خراب ہے۔ میں نے سڑک کی طرف دیکھا تو بس آرہی تھی۔ بس پھر کیا تھا، میں بس میں بیٹھی اور یہاں آگئی۔ اتنی بد تمیز لڑکیاں ہیں، پھوٹر بد سلیقہ، کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کرتیں۔

”پھوٹر بد سلیقہ۔ تم کیا ہوم اکنامکس پڑھ رہی ہو؟“

میں نے بیچ میں جلدی سے کہا۔ حالانکہ پوچھنا تو یہ تھا کہ وین گوگ کی پینٹنگز کا ذہنی صحت سے کیا تعلق تھا، لیکن اس کی باتیں تھیں کہ اچھے بھلے انسان کے اوسان خطا ہو جائیں۔

”اوفوہ! یہ کیا بے تکلی بات کہی تم نے۔ کیا سلیقہ بس ہوم اکنامکس پڑھنے کے لیے چاہیے! تم سے اس کے علاوہ توقع ہی کیا کی جاسکتی ہے۔ تم تو بقول امی کے سدا کی ست اور کابل واقع ہوئی ہو۔“

”ارے۔ ارے۔“ میں نے کہنا چاہا کہ بھلا میرے اس سوال کا سستی اور کابل سے کیا تعلق ہے اور کب امی نے مجھے ست اور کابل کہا۔ لیکن گڈی کی گڈی اٹنے سے چلی جارہی تھی۔

”نیلی فریج لے کر آئی اور بڑی فراخ دلی سے سب کو استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ میں بھی خوش ہو گئی۔ آپا سے سالن، امی سے کباب اور تم سے وہی پھلکیاں، چنے، نکٹس (پھر بھی سستی کا طعنہ؟) بنوائے کہ رمضان آنے والا ہے، اس نیلی کی بچی نے میرا اور ریمہ کے ساتھ سب اڑا دیا۔“

”کیوں انہوں نے جاوید شیخ کو افطاری پر بلوایا تھا یا شان اور معمر رانا کو؟“ میرا سوال۔

”معمر رانا کو بلائیں یا شکور رانا کو، لیکن میرے کھانے کی ساری چیزیں اڑا دیں اور ذرا جو شرمندہ ہوں۔ نیلی صاحبہ فرمانے لگیں کہ فریزر اتنا بھر گیا ہے کہ کچھ بتا ہی نہیں چلتا۔ بائے دواوے تمہیں یہ پاکستانی ہیرو کہاں سے یاد آگئے بھلا وہ کیوں اتنے ”معمر“ رانا کو بلائے لگیں اور وہ تو پاکستانی فلمیں دیکھتی بھی نہیں ہاں

بریڈیٹ کو بلا لیں تو اور بات ہے، لیکن وہ کیا تو رومہ اور وہی پھلکی کھائے گا؟“

”پھر وہ اپنے نام۔“

”کیا ہے تجھی۔ خود ہی بولے چلی جارہی ہو، اتنی توفیق نہیں کہ چھوٹی بہن اتنے عرصے کے بعد (پچھلے ہفتے ہی آئی تھی۔) آئی ہے کہ چار باتیں اس کے دل کی بھی سن لو۔ پھر کیا ہوا۔ اگلے دن میرا استری کیا ہوا سوٹ پہن کر چلی گئی۔ میں نے شام کو پوچھا کہ ”کیا سوٹ بھی فریزر میں گڈا ہو گئے تھے؟ (الحمد للہ میرے پاس اپنی الماری موجود ہے) تو کہنے لگی کہ ”میرے پاس تجھی بالکل ایسا ہی سوٹ ہے۔ غلطی ہو گئی۔“ پھر ریمہ سے منہ بنا کر کہنے لگی۔ ”آج کل تو ڈیزائنر سوٹس کے نقل بھی آجاتے ہیں۔“ مجھے تو اس قدر تاؤ آیا۔

وڈی آئی امیر عدنان کی سگی۔“

گڈی کی باتیں سن سن کر میرا سر چکر ا گیا تھا۔ بھلا ہو میری ملازمہ کاجو ہمارے لیے چائے لے آئی۔

”یہ کیا ہے؟“ گڈی نے کاغذات اٹھائے۔

”میں افسانہ لکھ رہی تھی۔“ میں نے جتا کر کہا۔

”چھا؟ واقعی۔ اللہ کرے کہ یہ مکمل ہو جائے۔ خوا مخواہ میں نے کالج میں اور ان نیلی، ”میرا“ ریمہ کی بچیوں کو بھی غلطی سے بتا دیا۔ ایک سال ہونے کو آیا۔ اب تو وہ میرا مذاق اڑاتی ہیں۔ میں نے انہیں پرانے ڈائجسٹ دکھائے، لیکن وہ کہتی ہیں کہ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ کوئی اور ہیں۔ لوجی۔ محض تمہاری سستی کی وجہ سے ان نالا نقوں نے مجھے وہم کا مریض قرار دے دیا۔“

”کیا ہے بھئی۔ سستی سستی۔ سب نے شور مچا رکھا ہے، لکھنا کوئی بٹن دبائے پر ہے، تخلیقی کام ہے۔ موڈ اور ماحول سے ہوتا ہے۔“

”ہاں۔ ہاں۔ تم آخر آگ کا دریا کے پائے کے ناول لکھتی ہو، کوئی آسان کام تھوڑا ہی ہے۔ بڑی محنت چاہیے۔“ اس نے چائے پیتے ہوئے نہایت اطمینان سے کہا۔

افسہ لڑکی کس قدر چالاک ہے۔ گھر کا کوئی کام ہو

تو سخت پردھانی کا شور مچاتی ہے اور کم بخت کوئی کتاب نہیں چھوڑتی۔
 ”ڈراما کیوں نہیں لکھ رہیں، لوگ پڑھتے کم ہیں، ٹی وی زیادہ دیکھتے ہیں۔“ ایک اور فرمائش۔
 نیچے یہاں افسانہ لکھنے کا ٹائم نہیں اور اسے ڈرامے کی پڑی ہے۔ لیکن اس بار بھی وقت کا رونا رو کر ایک بار پھر کالمی کا طعنہ سستی؟

”چھوڑو۔ سارے ایک سے ٹاپک، ایک سے ڈرامے۔“

”کوئی نہیں اتنے اچھے آرہے ہیں سب۔“ گڈی نے یوں برا مانا گویا سارے ڈراموں کی رائٹر ڈائریکٹر پروڈیو سر اور وہ ہاں کیا کہتے ہیں اسکرپٹ ایڈیٹر وہ خود ہی ہو۔

”وہ دیکھا ہے۔“ گڈی نے کسی ڈرامے کا نام لیتے ہوئے کہا۔ ”اللہ دیورانی اور جٹھانی ایک ہی ہیرو کے پیچھے پاگل ہو رہی ہیں۔“

”خدا کا خوف کرو گڈی! اس سے پہلے بھی تم نے جس ڈرامے کا ذکر کیا تھا اس میں بھی یہی قصہ تھا۔“ میں نے کہا۔

”ارے نہیں، اس میں دیورانی، جٹھانی نہیں تھیں۔ بھابھی اور نند تھیں۔“

”وہ تو اس سے پہلے بتایا تھا۔“ میں نے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

”نہیں، بھئی وہ دونوں تو کزنز تھیں۔“

”اور اس سے پہلے۔“

”وہ تو دونوں پڑوسی تھیں۔“

”پڑوس والا بھی بتایا تھا اس سے پہلے گڈی۔“ میں نے عاجز ہو کر کہا۔

”تم تو بالکل بھلکڑ ہو۔ وہ تو پھوپھی اور بھتیجی تھیں۔“

”اور اس سے پہلے والا۔“

”ہاں۔ وہ دونوں بہنیں تھیں۔“ آخر کار اس نے اعتراف کر ہی لیا۔

”تو اس میں بھی تو وہ بہنیں ہی تھیں نا۔“

”بے وقوف پہلے وہ دونوں بہنیں تھیں۔ اب وہ بھائیوں سے ان کی شادی ہو گئی تو وہ دیورانی اور جٹھانی بن گئیں۔“ گڈی نے فخریہ انداز میں کہا۔
 ”تو ان کو بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اب وہ دیورانی اور جٹھانی بن چکی ہیں۔“
 ”پھر ڈراما کیسے چلے گا۔“

”یہ ڈراما چلا رہے ہیں یا ناظرین کا دماغ۔ ایک ہیرو ہے تو سارے شہر کی لڑکیاں اس کے پیچھے پاگل ہو رہی ہیں۔ ایک لڑکی ہے تو گلی، محلے، گھر خاندان، کالج، آفس کا ہر لڑکا اس کے لیے سرگرداں و پریشان ہے۔ اب لڑکے کو جو لڑکی پسند ہے تو پورا خاندان اس کے پیچھے اور لڑکی کو جو لڑکا پسند ہے اس کے پیچھے پولیس لگا دو۔ لو جی۔ چھتیس قسطیں تو اس میں نکل گئیں۔ اب کچھ صلح صفائی ہونے لگی تو بیرون ملک سے یا یہیں سے چک تعلقے سے ایک نیا ہیرو برآمد۔“ میں ہانپ گئی۔
 ”تم جانتی ہو کہ کیا کسے جارہی ہو؟“ گڈی نے حیرت سے کہا۔

”تو تمہارے خیال میں ڈرامے کو معلوم ہے کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔“

”اب کیا ڈراموں کی باتیں کرتی رہو گی۔ اتنی بھوک لگی ہے۔“ گڈی نے دبائی دی۔

”ڈراموں کی باتیں۔ میں کر رہی تھی؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”تو کیا میں کر رہی تھی؟“ گڈی نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹلاتے ہوئے کہا۔

میں نے ایک نظر کاغذات اور دوسری ایک بجاتی گھڑی پر ڈالی۔ ہیروئن کا دل تو دھک دھک کرنا بند کر چکا تھا۔ میں دھپ دھپ کرتی کچن میں آ گئی۔



گڈی کے اس طوفانی و ہنگامی دورے کے آفر شاخس نے کئی دن مجھے اپنی لپیٹ میں رکھا اور میں نے اپنی حسیات لپیٹ کر رکھ دیں اور بس چادر لپیٹ کر بیٹھا کیسے۔ آخر ایک دن بستر لپیٹ کر رکھا۔ فائل نکالی اور



”بھوکا سلاؤں کیا؟ کچھ بناؤ۔“
 ”ہاں۔“ ہارٹ اٹیک کے بارے میں لکھنے اور
 اسے خود پر محسوس کرنے کا فرق اب معلوم ہوا۔
 ایک ٹوکھالی کی روانی ٹوٹ گئی۔ وہ سرایہ کہ اب کیا
 بنایا جائے۔

میں بچن میں کھڑی ہوئی سوچ رہی تھی۔ مہینے کا بھی
 اختتام تھا اور مہینے کا بھی، کل صبح سارا سامان آنا تھا۔
 فرزندنگ بھی ختم ہو چکی تھی۔ کوئی افسانہ تو نہیں تھا کہ
 مہینے کے کسی دن، دن کے کسی پر مہمان آجائیں تو گھر
 میں کباب، چکن مسالہ، پنخنی پلاؤ کی پنخنی اور نہ جانے
 کیا، کیا موجود ہو کہ مہمان پانچ منٹ میں شان دار کھانا
 ملنے پر حیران پریشان رہ جائے۔

نہ ہی لیفٹ اور کوری میک کرنے کا امکان۔
 یا اللہ! مراقبے میں پسندیدہ مصنفین کے تصور میں
 ایک جھلک انور مقصود صاحب کی بھی دیکھی تھی۔
 زبیدہ آپا بھی کسی کو نے میں موجود ہوں گی حویہ افتاد آن
 پڑی۔

ہمارے افسانے کی ہیروئن کی سب سے زیادہ
 آزمودہ اور پسندیدہ ڈش ہوتی ہے۔ بچے ہوئے فیے
 کے پرانے بنانا جو آج تک میں بنا نہیں سکی، کیونکہ
 قیمہ تو بچتا ہی نہیں، بلکہ آج رات کے کھانے میں بھی
 قیمہ مٹ رہا ہے، لیکن وہ پالہ تو ایسا صاف ہوا کہ۔
 اب کیا کروں، کتنی بری بات ہے۔ کباب ہی
 ہوتے تو کام ہو جاتا۔

لیکن میرے میاں کو جوں ہی معلوم ہوتا کہ کبابوں
 کا نیا اشاک فریزر میں بن کر پہنچ چکا ہے تو دنیا کی ہر غذا
 سے ان کا دل اچاٹ ہو جاتا۔ کسی میں نمک کم لگتا تو
 کسی میں مرچ زیادہ۔ کسی سے پیٹ میں درد ہونے
 لگتا تو کسی سے ہاضمہ خراب۔

”یار۔ چکن میں تو آج بالکل مڑا نہیں آ رہا۔“
 کباب بناؤ۔“

”جائے کے ساتھ کچھ کھانے کا دل چاہ رہا ہے،“
 کباب مل۔“

”کھانا کھانے کا دل نہیں چاہ رہا۔“ کباب مل کر

میں کو کانوں میں اڑس کر ایک نہایت اویبانہ آسن
 جمایا۔ آنکھیں بند کر کے اپنے سارے پسندیدہ
 مصنفین کا تصور باندھا اور ان سے روحانی طور پر قوت
 حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس مشق کے بعد خود کو
 خلاصا نامہ دم محسوس کیا اور گھل ہوا کہ آج تو ضرور کوئی
 شہو آفاق چیز تخلیق ہونے والی ہے۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو چکے تھے اور میاں
 لاؤنج میں بیٹھے نیوز کے اوپر ویوز اور پھر ویوز کے بعد
 دوبارہ نیوز کا سلسلہ لگائے ہوئے تھے اور قوی امکان تھا
 کہ رات دیر تک یہ سلسلہ جاری رہے گا، کیونکہ کل
 اتوار تھا۔ یعنی قدرت نے ایک شاہکار تخلیق کے لیے
 سازش مکمل کر لی تھی۔

درد اتنا تھا کہ اس رات دل وحشی نے
 ہر رگ جوں سے الجھتا چلا
 فیض صاحب کا ”ہارٹ اٹیک“ میری کھالی کا
 بنیادی خیال تھا اور خیال اس وقت بڑی سبک خرامی
 سے کلغز پر بے چلے جا رہے تھے۔
 ”سنو!“ دروازہ کھلا۔

”یارو۔“
 ”کیا کر رہی ہو؟“ او۔ لکھ رہی ہو۔ سوری۔“ وہ
 ذرا ہچکچائے۔
 ”ایک دوست آگیا ہے اچانک۔“ وہ قریب آکر
 بولے تو میں چونک گئی، اور ناگہی سے ان کی طرف
 دیکھنے لگی۔

”جی۔ کیا ہوا؟“
 ”تم نے کچھ نہیں سنا۔“
 ”نہیں۔ آپ نے کچھ کہا؟“
 ”ووف۔ میرا ایک دوست اچانک آگیا ہے۔
 کراچی سے کسی کام سے آیا تھا، گاڑی خراب ہو گئی
 ہے۔ یہاں آگیا ہے، صبح جائے گا۔“
 ”ہاں۔ تو ٹھیک ہے۔ گیسٹ روم میں سو جائے
 گا۔“

”بھوکا؟“
 ”مطلب۔“

”ویسے کوئی بات نہیں۔“ چند گھنٹوں تک میرا پھولا ہوا منہ دیکھنے کے بعد انہوں نے پھر بات شروع کی۔ ”میرے دوست کو ایک وقت کم اور ایک وقت زیادہ نمک والا آلیٹ کھلایا تو کیا ہوا۔ میرے بعض دوستوں کی بیویاں تو اتنا بھی نہیں کرتیں۔ پھر تم بہت سی اور ڈشز اچھی بناتی ہو۔ تقریریں اچھی لگتی ہو اور سب سے بڑھ کر افسانے لکھتی ہو۔“

”اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ سب سننے کے بعد میں آپ سے آپ کے خراٹوں کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گی تو یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔“ میں نے ان ہی جیسا اطمینان اختیار کرتے ہوئے جواب دیا۔



اگلی شام آیا، بھائی جان، چھوٹے بھیا اور گڈی نے اس ماہ بھی ڈائجسٹوں میں میری کوئی تحریر نہ ہونے پر میری بنی ہوئی چائے اور پکوڑوں پر میری قبل از وقت ریٹائرڈ منٹ کا جشن منایا۔

”مان لو کہ ایک وقتی اہل کے تحت۔“ بھائی جان۔

”ایک ماہ میں ایک کہانی بھی نہیں۔“ چھوٹے بھیا۔

”تاچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔“ آبا۔
”سدا کی ست اور کال۔“ گڈی۔
”اصل میں ساری کمزوری۔“ میاں۔
آہ۔ کار جہاں دراز ہے۔



”آج تو ناشتے میں پرائٹ کے ساتھ دو کباب۔ دو کباب کا یہ پہاڑہ جاری رہتا، تو قتیگہ تقسیم کے اس عمل میں صفر جواب آجاتا۔ اوہو۔ اب کیا بناؤں ان کے دوست کے لیے۔“

”بچے ہوئے بچکن کے ریشے کر کے چافنیز، اٹالین، اسپیشل آلیٹ۔“

نہ جانے کون سے خوش نصیب گھر ہوتے ہیں جہاں سالن میں اتنا بون لیس چکن بچ جائے کہ اس سے ایک نئی ڈش بنالی جائے۔ ہمارے گھر میں گوشت، مرغی میں جو ہڈیاں باقی رہ جاتیں انہیں شاید سفلی علوم میں استعمال کر کے اچانک آنے والے مہمان کو کبوتر بنا کر اڑایا تو جاسکتا ہے، لیکن اس سے بنی ہوئی کوئی ڈش اسے کھانے کے لیے پیش نہیں کی جاسکتی۔

”کیا ہوا بھئی۔ اتنی دیر ہو گئی۔ کسی تکلف کی ضرورت نہیں، بس آلیٹ اور پرائٹ بنادو اس کے بعد چائے۔“

شکر کہ انڈے موجود تھے۔ سادہ آلیٹ ہی بنادیا اور کمرے میں آکر۔
ورد اتنا تھا کہ اس سے بھی گزرنا چاہا۔
چپ کر کے سو گئی۔



صبح ان کا دوست ڈنر سے ملتا جلتا بلکہ تقریباً ”ویسا ہی ناشتا کر کے روانہ ہو گیا۔“
”یہاں آنا میرے دوست کے لیے بہت سبق آموز اور اس کی بیوی کے لیے نیک ثابت ہو گا۔“
”اچھا۔ وہ کیسے۔“

”وہ ایسے کہ اب اسے سمجھ آ جانا چاہیے کہ ساری بیویاں ایک جیسی ہوتی ہیں، بلکہ شاید وہ اپنی بیوی کو دو نمبر زیادہ دے دے، کیونکہ وہ آلیٹ میں نمک بالکل صحیح ڈالتی ہے۔“ وہ سودے کی لسٹ اٹھا کر چلے گئے۔
”اوہ۔ لفاظی تو دیکھیں۔ خود ہی بن جائیں رائٹر، جلدی مشہور ہو جائیں گے۔“ میں نے جل کر

سے شخص کو دیکھا۔ اس کی بے تاثر آنکھیں بھی سرد تھیں۔ اس نے نگاہ اٹھا کر اسے دوبارہ دیکھنے کی غلطی نہیں کی تھی۔ اس نے اس رات کے بارے میں جو کچھ سنا تھا سب جھوٹ بلکہ اس تھا۔

پوری رات اس کا ”آپا نامہ“ ختم نہ ہوا۔ اس نے رنگوں کی برسات کا سنا تھا۔ کوئی رنگ اس کی آنکھوں میں اتر نہ سکا۔ نہ ہی چاندنی و خوشبو کا کوئی جھونکا گزرا۔ اس نے اتنے خوابوں کو آنکھوں میں سجایا کیوں تھا۔ کچھ بھی ایسا نہ تھا جس کا تصور اسے گدگدایا کرتا تھا۔ سامنے بیٹھے ہوئے شخص کی ساری ”سردی“ اس کے دل میں اترنے لگی تھی۔ وہ سرد نہیں تھا، برف تھا برف۔



”اس دفعہ ہونے والے کارنیوال میں تم کس نئی سوچ کے ڈرامے میں پرفارم کرو گی دیا؟“
ماہم نے چپس کا پیکٹ کھولتے ہوئے اس سے

اس نے پیروں کے دونوں انگوٹھوں پر زور دے کر خود کو جھولے میں اور بلند کیا۔ چند سیکنڈ میں وہ ہوا کو چرتی پھر زمین کے نزدیک تھی۔ اس نے ہولے سے آنکھوں کو بھینچا اور پہلے سے زیادہ پیروں کے انگوٹھوں پر دباؤ دیا۔ یہ تحمل کا رد عمل تھا۔ وہ جتنا پیروں کے انگوٹھوں پر زور لگاتی، خود کو ہوا میں اتنا ہی بلند پاتی۔ پستی سے بلندی کے سفر میں کیف تھا، سرور تھا اور ہواؤں میں اڑنے کا غرور تھا۔

وہ ایک سنہری جھولا تھا۔
اور وہ کانچ کی گڑیا تھی۔



”آپا میرا سب کچھ ہیں۔ ماں، باپ، دوست۔ ان کے بچوں کو کبھی غیر مت سمجھنا۔ انہیں میری ہی اولاد سمجھنا۔“

شرم و حیا سے جھکے چہرے کو اس کے آخری جملے سے جھٹکا لگا تھا۔ پہلی ہی رات اس شخص کے پاس اتنی روکھی پھسکی باتیں؟ اس نے نگاہ اٹھا کر سامنے بیٹھے سرد

مکمل ناول

وجہ احمد





سوالیہ انداز میں پوچھا تھا۔ اس نے آخری گھونٹ بھر کر سوٹ ڈرنک کے کین کو کچرے دان میں اچھالتے جواب دیا۔

”ایک نیو آئیڈیا پر سوچ رہی ہوں۔ جتنا شان دار یونیورسٹی کا میلہ ہوگا وہ میرے آئیڈیا سے ”لٹ“ جائے گا۔“

”یعنی میلہ لوٹ لینے والی اسکیم بنارہی ہو تم!“ ماہم نے منٹے ہوئے کہا تو بھی ہنسنے لگی۔

”کل فاسٹل کر کے بتاؤں گی تمہیں کہ میں کیا پیش کرنا چاہتی ہوں۔“

وہ دونوں کیفے ٹیرا کی حدود سے نکل کر ڈپارٹمنٹ کی طرف جانے والی روش پر چلنے لگیں۔



کل کی رات جتنی ”سرد“ تھی اس کی نسبت آج موسم کچھ معتدل تھا۔ ”سنو مین“ نے آج اس کا مندی والا ہاتھ تھاما تھا۔

”آپ کافی خوش شکل ہیں۔“

یہ پہلی تعریف تھی جو اس نے سترہ گھنٹے اور چوبیس منٹ بعد کی تھی۔ اس نے کل سے اس کمرے میں گھسنے گھسنے میں ہی تو وقت گزارا تھا۔ ”آپ کافی خوش شکل ہیں“ کے جواب میں کرار اس کا جواب اس کے

ہونٹوں پر آکر دم توڑ گیا تھا۔ اسے بالکل ایسا لگا تھا جیسے ماما نے کلن میں کہا ہو۔ ”اچھی بیٹیاں سسرال میں نرم لہجے میں بات کرتی ہیں۔“

اس نے کمرے کے جس زدہ ماحول میں دراڑ محسوس کی تھی۔ عورت انزل سے مروی تعریف ہی کی تو متلاشی رہی ہے نا، سو وہ بھی عورت تھی اور اسے اپنی تعریف اچھی لگی تھی۔ وہ گزر جانے والی سرد ترین رات کو بھلانے لگی اور اپنے اندر اٹھنے والے جوار بھانا کو بھی ہولے ہولے بٹھانے لگی تھی۔

”آپ کو تعریف کرنا بھی آتی ہے؟ حیرت ہے۔“ اور وہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنسا تھا اس کے اس

انداز پر۔ اس کی چوڑیوں کو آکے پیچھے کرنا گویا ہوا تھا۔ ”حیرت کی بات کیا ہے اس میں۔ اب ضروری تو نہیں بس بندہ بیوی کو دیکھتے ہی تعریفوں کے پل باندھنے لگ جائے۔ اپنی ہی چیز ہے بھی! جب جی چاہے انسان تعریف کر دے۔“

”اچھی منطقی ہے آپ کی۔“

وہ صرف یہ کہہ سکی تو وہ بھی کچھ مسکراتا مزید تعریف کے سوڈ میں آیا ہی تھا کہ دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور آیا بڑے کمرے سے چلتی عین بیڈ کے سامنے آن رکی تھیں۔ اس نے شرم محسوس کر کے چوڑیوں سے کھٹکتے ہاتھ کو اپنے مجازی خدا کے ہاتھ کی گرفت سے چھڑا کر اپنی گود میں رکھا تھا اور وہ بھی آپا کی مخصوص ”آد“ سے گھبرا کر سیدھا بیٹھا تھا۔

”تم ابھی تک کمرے میں گھسے بیٹھے ہو۔ باہر اتنے کام ہیں۔ میں اکیلی جان کون کون سے کام نبھاؤں اے بھیا! شادیاں تو سب کی ہوتی ہیں۔ ایک ہی رات میں بیویوں کے عاشق بننے کا رواج ہمارے خاندان میں نہیں۔ شام کو ولیمہ ہے۔ جا کر شادی ہال کا جائزہ لے کر آؤ۔ اٹھو۔“

وہ بے تکان بولتی تھیں یا انہیں بولنے کا ضبط تھا۔ وہ جزبہ زسی حیرت کدہ میں تھی۔ شادی کے دوسرے ہی دن اتنی چبھتی ہوئی باتیں بھی برداشت کی جاتی ہیں؟ مگر عورت کو تو اللہ نے بنایا ہی برداشت کے لیے ہے۔

اور برداشت ہڈیوں کو چیرتی دلوں کی دیواروں کو ڈھاتی دلوں کو مار دیتی ہے تو پھر کھرٹوٹ جاتے ہیں اور اس وقت ماں کے دیے ہوئے سارے اسباق خلاصے کی صورت اس کے کانوں میں سنائی دے رہے تھے۔ اس نے جھجکتی ہوئی آواز میں آپا کو بٹھنے کے لیے کہا تو وہ اسے کھوجی ہوئی نگاہوں سے دیکھتی باہر ہزار بکھیروں کو سمیٹنے کا کہہ کر چل دیں۔ وہ ان کے جانے کے بعد بھی ان کی موجودگی کو محسوس کرتی پھر گھڑی کو تھکنے لگی تھی۔ گھڑی کی سوئیوں کا سفر تھا اور وہ پہلی ہی منزل پر تھکنے لگی تھی۔

”کیا اسپیشل ہے یا ردیا! بتا بھی دو کیا ڈیرائن کیا ہے تم نے اپنے گروپ کے لیے؟“ ماہم کے کچھ میں تجسس اور تجنبلاہٹ کے عناصر تھے۔ اس نے مزا لے کرتانا شروع کیا۔

”ڈراما پیش کریں گے ہم لوگ“ کٹھ پتلی۔ ”رات بھر لکھا ہے جاگ کر میں نے۔“

”اچھا! کون کون پر فارم کرے گا اور دیکھو! حسن کو اس دفعہ لیڈنگ رول مت دیتا۔ بہت اتراتا پھرتا ہے۔ ہیرو سمجھنے لگتا ہے اپنے آپ کو۔“

وہ ماہم کی بات پر مسکرانے لگی تھی اور جب وہ مسکراتی تھی اس کی باتیں آنکھ کے نیچے بھنور بنتا تھا۔ اور کوئی اس بھنور میں آجائے تو۔

زندگی کسی مرکز پر ٹھہراتی ہے؟ نہ حیاتی نہ بچاتی۔ ”اس دفعہ ہیرو حسن نہیں ہوگا اور نہ ہی ہیروئن ماہم۔“

”پھر کاسٹ میں کون ہے؟“

”کاسٹ۔۔۔ کاسٹ میں روٹی بھری گڑیا گڈے ہیں، جنہیں کٹھ پتلیاں کہا جاتا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ ماہم کنفیوز تھی۔

”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ ہم پس پردہ پر فارمنس دیں گے، یعنی وائس پر فارمنس اور باریک ڈوریوں سے بندھی

کٹھ پتلیاں فزیکل پر فارمنس (جسمانی پر فارمنس) دیں گی۔“

”اچھا اسی طرح نا“ جیسے داوی کے زمانے میں چار پائی کو کھڑا کر کے اس پر پردہ ڈال کر پیچھے سے کچھ لوگ آوازیں نکالا کرتے تھے اور باریک ڈوریوں سے بندھے

گڑیا گڈے کریکٹر پر فارمنس دیا کرتے تھے ثانی اور داوی وغیرہ اپنے بچپن کی باتیں اسی طرح کی بتاتی ہیں نا؟“

ماہم کی بات پر ردیا نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”ہاں اسی طرح کی پر فارمنس ہوگی۔ گڈے کا کریکٹر نیم جو ہر ہوگا یعنی ہیرو اور ہیروئن کا کریکٹر نیم

صدف ہوگا۔ ایک کردار ہیرو کی ماں کا۔ دوسرا کردار

اس نے برسوں پرانا کٹھ پتلیوں سے بھرا بیگ اسٹور میں رکھے بکس میں سے نکالا تھا۔ اس نے بیگ کی زپ کھولی تو مانوس سی بو اس کے نعتوں سے ٹکرائی تھی۔ روٹی سے بھرا سفید سلک کے کرتے میں ایک گڈا تھا۔ سر پر براؤن پگ بھی تھی۔ سفید لٹھے کی شلوار تھی۔ اس نے گڈے کو اٹھا کر چہرے کے سامنے کیا اور سنہری یادیں اس کے چاروں طرف پھیل گئی۔ وہ گڈا اس کی داوی کے ہاتھوں سے تیار کیا گیا تھا۔ اس نے گڈے کو سائیڈ میں احتیاط سے لٹایا، حالانکہ وہ کالج کا گڈا نہیں تھا۔ پھر اس نے ایک روٹی بھری گڑیا کو نکالا۔ سرخ لالچے اور سبز قیص، سرخ گونا گونا رنگ لگے دوپٹے میں وہ مومی موتیوں سے بنی بندیا لگائے آج بھی ویسی کی ویسی تھی۔ خوب صورت اور بہت حسین۔

پھر سنہری یادوں نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھا اور اسے یاد آیا۔ کتنا ضد کر کے وہ داوی کے ساتھ بازار سے آدھے آدھے گز کے کپڑے خرید کر لائی تھی اور نہ نہ کرتی داوی سے ضد کر کے اس کا گڈے سے بھرا عروسی لباس تیار کرایا تھا۔ پھر ایک کے بعد کئی چھوٹے بڑے سائز کی کٹھ پتلیاں اس کے اطراف میں پھیل گئی تھیں۔ ہر رنگ میں موجود روٹی کی گڑیا اور گڈے۔

اس نے ایک جوڑے کو الگ کیا۔ باقی گڑیا گڈوں کو ایک خاندان بنا کر ایک دوسرے بیگ میں بھر لیا۔ اسے کارنیوال میں ایک ڈراما پیش کرنا تھا۔ کاسٹ مکمل تھی۔ کہانی کی ترتیب باقی تھی اور اسے آج یہ سارا کام مکمل کر کے سونا تھا۔ وہ کٹھ پتلیوں کے درمیان بیٹھی

قلم تھامے ڈانٹا لگ لکھتی رہی۔ اسے خبر نہیں تھی بے جان کٹھ پتلیوں میں جان بھی آجائے تو وہ کٹھ پتلی ہی رہتی ہیں۔ انہیں چلانا کوئی اور ہے اور ان کے پیچھے سے آوازیں کسی اور کی ہوتی ہیں۔ بے خبری کی مار لگ جائے تو جیون میں باقی بھی کچھ رہتا ہے؟

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

اس کی بہن کا ہو گا۔ کچھ ایکسٹرا کٹھ پتلیاں سپورٹنگ رول کریں گی۔ جیسے ہیروئن کی فرنڈز وغیرہ ہیروئن کی آواز زینو کی ہوگی۔ ہیرو کی آواز ارباز کی ہوگی۔ تم اور حسن تانت کے تاروں کو انگلیوں سے حرکت دو گے، یعنی ان کی باڈی لینگویج کی ذمہ داری تمہاری ہوگی۔ یہی کام سب سے اہم ہو گا۔ ہمارے پاس سات دن ہیں، اور سات دن تم دونوں کو پریکٹس کے لیے کافی ہوں گے۔ اصل پر فارمنس تمہاری ہوگی۔ کٹھ پتلیوں کو آواز کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ آگے پیچھے کرنا آسان کام نہیں۔ آج بھی یہ تماشا دور وراز کے گاؤں میں رو فیشن کے طور پر کہیں نہ کیس دکھائی دیتا ہے۔ پر وہ لوگ پروفیشنل ہوتے ہیں۔ سارا فن ان کی انگلیوں کا ہوتا ہے۔“

دیا نے ایک لمحے کا توقف کیا تو ماہم اسے گہری سوچ میں دکھائی دی، پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے دیا سے کہنے لگی تھی۔

”یار! مشکل لگ رہا ہے مجھے۔“

”ہاں تھوڑا مشکل ہے پر ناممکن نہیں۔ ابھی چلتے ہیں، کیفے ٹیرا میں سارے اودھم باز وہیں ہوں گے۔ ڈسکس کر لیتے ہیں ان لوگوں سے بھی۔“ دیا نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ کہنے لگی۔

”وہ سارے نکمے ٹوٹلی تم پر ہی ڈپنڈ کرتے ہیں۔ سب نے تمہیں ”لیس باس“ ہی کہنا ہے۔“



ولیمہ کے دوسرے دن وہ اپنے میکے آگئی تھی۔

دوستوں اور کزنز سے شیئر کرنے کے لیے کچھ بھی ”خاص“ اس کے پاس نہیں تھا۔ دو دن میں اسے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔ اس کے سسرال میں اس کی منڈان چھ عدد بیٹیوں کا قبضہ تھا۔ اس کا شوہر ان عورتوں کا ”مقبوض“ وفادار جانور تھا جسے صرف دم ہلانا آتی ہو، اور کبھی کسی لمحے کسی بشری تقاضے کے سبب وہ اسے دیکھ بھی لیتا تو ان عورتوں کی جماعت میں سے اس ”کچھ“ کے حسن میں رنگ میں بھنگ ڈالنے کو کوئی

ماہم کی بات پر وہ ہنستے ہوئے کھڑی ہو گئی تو وہ بھی اس کے پیچھے۔ کیفے ٹیرا کی جانب چل دی۔



جب وہ پیدا ہوئی تو اس کی مائی نے اسے سنہری جھولا تحفے میں دیا تھا۔ بالکل ”سوئے“ کا جھولا لگتا تھا اور وہ اسی میں پانچ سال سوئی تھی۔ پانچ سال کے بعد اس کے پاؤں جھولے کی مستطیل دیواروں سے نکلنے لگے تھے۔ پر جھولے پر اتنی عمدہ پالش تھی کہ وہ پانچ سال بعد بھی ”سوئے“ کا جھولا ہی لگتا تھا۔ اس کی ماما نے

بھی عورت نازل ہو جاتی۔

نہیں۔ ”اور یہ سن کر بیچ میں روشنی بول پڑی۔

”دادی! جو ڈول دیا کے پاس ہیں وہ مور تیں نہیں؟“

”ہاں ہاں بیٹی! وہ بھی مور تیں ہیں۔ میرے منع کرنے پر بھی اماں باوا لادیتے ہیں تو پکڑان کی ہوگی۔ انسان جتنی چیز تو بندہ بنا لیتا ہے جان بھی ڈال سکتا ہے کیا؟“

دادی کی بات سن کر گھر کی سب بہو بیٹیاں آنکھوں ہی آنکھوں میں ہنسنے لگیں گھر کے کام کاج میں لگ گئی تھیں۔ اور وہ روٹی کی گڈی کی رٹ لگائے کراچی لوٹ آئی تھی اور پھر اس کی ضد دادی کے لیے امتحان بن گئی۔



وہ اسے لینے آیا تھا اور وہ بے دلی سے تیار ہوئی تھی رنگ و بو کے بنا۔ اس نے ماں کے نہ نہ کرنے پر بھی سفید رنگ کا سادا سوٹ پہنا تھا جو کہ شادی سے پہلے کبھی پہنا کرتی تھی۔ ماں کو اس نے دلیل دی تھی۔ ”اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ رنگ دار پہنوں یا بے رنگ۔“

”بکوں نہیں بڑا فرق تمہاری شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا شادی کے بعد ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں۔“

”دیکھنے والے کو ہی فرق نہیں پڑتا تو میں دنیا کی پروا کیوں کروں۔“ اس نے دل میں سوچا ”پر ماں سے کہہ نہ پائی۔ پھر وہ ماں کی نگاہوں سے ہٹ کر کہیں اور مصروف ہو گئی تاکہ وہ مزید سوال نہ کریں۔

اور بیٹیاں ماؤں کو دکھ دینا ہی کب چاہتی ہیں اور اچھی بیٹیاں تو ماں کو بالکل بھی دکھ نہیں دیتیں۔ اور وہ اچھی بیٹی تھی۔ آج اس نے آنکھوں میں کاجل نہیں ڈالا تھا۔ کالے رنگ کی موت اس کی آنکھوں میں ہوئی تھی چپکے سے اور بغیر کسی کوتاہی کے۔

راستے بھر دونوں کے درمیان رسمی سی بات چیت رہی۔ وہ کوئی سوال کرتا تو وہ ہاں ہوں میں جواب دے دیتی۔ وہ اندر ہی اندر گھٹ رہی تھی۔ اس نے ایک

اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس کی زندگی شادی کے ستر گھنٹوں میں اتنی بے کیف بھی ہو سکتی ہے۔ وہ تو بہت مکمل اور رنگ دار لڑکی تھی۔ اپنی عمر کے چودھویں سن میں اس نے ہاتھ میں برش پکڑ کر رنگوں سے کھیلنا سیکھا تھا۔ اسے نہیں پتا تھا ”رنگوں کی موت“ بھی ہو سکتی ہے۔ پہلی موت سچی خوشی کے گلابی رنگ کی ہوئی تھی جو اس کے چہرے پر شادی کی پہلی رات مرا تھا۔



اپنی عمر کے ساتویں برس وہ اپنی ماما اور دادی کے ہمراہ اپنے بابا جانی کی خالہ کے گھر اندرون پنجاب کے گاؤں احمد پور میں گئی تھی اور اس نے زندگی میں پہلی بار دادی کی بہو کو روٹی بھری گڑیا بناتے دیکھا تھا۔ اس نے تو ہمیشہ قیمتی سے قیمتی گڑیا سے کھیلا تھا تو روٹی بھری گڑیا اسے عجوبہ لگی تھی۔ خاص کر کالا ریشم جب سر کی سلائی کرتے ہوئے اس کی رشتے کی ماما نے نہایت مہارت سے لگاتے اسے لمبے بالوں کی شکل دی اور پھر کالے ریشم سے گڑیا کے لبو ترے چہرے کو نقش عطا کیے پھر اطلس کے گلابی غرارے میں۔ تو اس گڑیا نے اس کے دل سے اس کی گڑیا میں نکال پھینکی تھیں۔ وہ ہزار ضد کے باوجود اس گڑیا کو گینے میں ناکام رہی تھی۔ جس کا سبب دو لوگ تھے ایک رشتے کی ماما کی ہم عمر بیٹی روشی جس کے لیے وہ گڑیا تیار کی گئی تھی اور دوسری اس کی دادی ماں! دادی ماں جب بھی اس روٹی بھری گڑیا کو دیکھتیں کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ توبہ کرتیں اور بھانجی بہو کو خدا کے غضب سے ڈراتیں۔

”اے بہو! بی بی! اللہ کے غضب سے ڈر۔ جان ڈالنا پڑے گی ان مورتیوں میں۔ خدا کی برابری مت کرو۔ اللہ کو کوئی مورت پسند نہیں۔ بچیوں کو یہ شوق ابھی سے پڑ گئے تو زندگی بھر یہ مورتیں ان کا پیچھا نہیں چھوڑیں گی۔ تخلیق کا فن بس خدا کے لیے ہے۔ بے جان شکلوں کو گھروں میں رکھنا مومن کا چلن

دفعہ بھی تو اسے نگاہ بھر کر نہیں دیکھا تھا۔
اور اس ایک ”نگاہ“ ہی کی تو پیاس تھی اسے۔
کیا تھا جو وہ اس کی پیاس بجھا دیتا۔

وہ اس کی نکاحی بیوی تھی۔ اس کا گریز اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ اسے کوئی جواب نہ مل پاتا اور آج اس کے ساتھ وہ کیا کرنے والا تھا، اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ زندگی ایسے بھی رنگ دکھا سکتی ہے؟



آج ان کی فاسٹل سیرسل تھی۔ چھت پر لکڑیوں کی چرخیوں پر لپٹی تانت کے تاروں سے کٹھ پتلیاں منسلک تھیں۔ پردے کے پیچھے بیٹھے حسن اور ماہم کے ہاتھوں میں تاروں کے سرے تھے۔ چرخیوں بہت رواں تھیں۔ ہاتھ کے اشارے سے چلتی تھیں۔ ان دونوں کے پاس مرکزی کردار تھے ہیرو اور ہیروئن کے باقی چرخیوں سے اور دوسرے کرداروں کی کٹھ پتلیاں منسلک تھیں جو کہ گروپ کے دوسرے ممبران کے حوالے تھیں۔ بیک گراؤنڈ میوزک بھی حسن کے لپ ٹاپ میں تھا۔ لپ ٹاپ کا کنکشن ہال میں جگہ جگہ نصب کیے گئے اسپیکرز سے تھا اور وائس پرفارمنس دینے والے چہرے پر ہیڈ فون تھے۔ ان کا کنکشن بھی ایکو سٹم سے تھا۔ ہر چیز تیار تھی۔ حسن اور ماہم کے کرداروں کی باڈی پرفارمنس سب سے اہم تھی۔ سیرسل کے دوران ہی ان کے ڈرامے کی دھوم مچ رہی تھی۔ ہر کوئی سراہ رہا تھا۔

پھر ان لوگوں کو پتا چلا کہ یونیورسٹی کے سالانہ کارنیوال میں بھارتی وفد جو کہ شاعروں اور مصنفین پر مشتمل ہے، شرکت کر رہا ہے اور گورنر کی شرکت بھی ممکن تھی۔ اسے لگا تھا وہ ہواؤں میں ہے۔ اس کا دل چاہا تھا وہ گھر پہنچ جائے اپنے سنہری جھولے میں۔ جہاں بلندی کے سفر سے روشناس ہوئی تھی۔



وہ دیر تک اس کا انتظار کرتی رہی۔ اسے اکیلے سونے کی عادت نہیں تھی۔ وہ جیسا بھی سلوک کرتا رہتا تو کمرے میں ہی تھا نا۔ اس کے لیے یہی سہارا تھا، کہ وہ ”نہ ہوتے ہوئے“ بھی ہے اور ہوتے ہوئے بھی ”نہ ہونا“ کی اذیت کے باوجود وہ اس گھٹن زدہ کمرے میں اس کے انتظار سے تنگ آگئی تو خالی جگہ اٹھا کر کچن کی طرف چلی تھی اور اسے احساس ہوا تھا کہ آپا کے کمرے میں شور شرابے والی ”رونق“ میں سب سے چمکتی آواز اس کے نصف بہتر کی بھی جس نے اسے ”نصف“ ہی رکھا تھا ”مکمل“ نہ کیا تھا۔ آپا کے دو عدد دامادوں کی چبھتی ہوئی نگاہوں سے بچنے کے لیے وہ ان کی روزانہ کی آمد پر سلام دعا کے بعد اپنے کمرے میں محدود ہو جایا کرتی تھی۔ اس نے آہستگی سے پانی کا جگ بھرا، جب نند کی بیٹی کی تیز آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔

”ماموں تو شادی کے بعد اتنے بدل گئے ہیں کہ کبھی ہمارے ہی بیچ میں سوتے تھے اور اب تو ڈھنگ سے بیٹھتے بھی نہیں۔“

”ارے میرے بیٹے تم نے یہ کیا بات کی؟ آپا! آج میرا بستر ہی لگا دیں آپ جب تک یہ رونقیں رکھنے آئی ہیں۔ میں پیس سویا کروں گا پہلے کی طرح۔“

”ارے بھیا! رہنے دے بس۔ تیری بیگم کے تو پہلے ہی مزاج نہیں ملتے ہم سارے سارا دن سر بستر میں دیے بڑی رہتی ہے نا جانے کس چیز کا زعم ہے اسے۔ ہماری جیسی دولت کبھی نہیں ہے اس کے باپ کے پاس پھر کا ہے کا غروب۔“

آپا کی سپاٹ بغیر کسی اتار چڑھاؤ والی آواز اس کے کانوں میں بڑی تھی اور وہ جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی تھی۔ اس کے دل میں ایک خواہش نے بڑی سرعت سے سراٹھایا تھا کہ ”وہ“ جو کچھ بھی نہیں ”سب کچھ“ بن کر دو بول اس کی ڈھال کے لیے بول دے۔ اس کی خواہش نے سراٹھاتے ہی دم توڑ دیا تھا۔ ”اس کی“ آواز تیز دھارے کی طرح کان میں داخل ہوئی تھی۔

کمرے میں نہیں سوئے گا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دروازے کو دیکھتی رہی۔



اس نے گلابی پیروں کے پنجوں پر زور دیا۔

اور خود کو ہواؤں کے سنگ پایا۔

”کل کا دن کتنا خوب صورت ہو گا۔ جب میرا ڈراما ہٹ ہو جائے گا۔“ اس نے دھیرے سے پلکوں کی جھلک کو آنکھوں پر گرایا اور آنکھیں میچ لیں۔ پیروں کے پنجوں پر زور دیا اور خود کو مزید بلند کیا۔

”میں یونیورسٹی سے باہر بھی مشہور ہو سکتی ہوں۔ ہاں ہاں کیوں نہیں۔ کل کا دن مجھے بلندیوں پر لے جائے گا۔ ضرور۔“

اس نے جھوٹے لیے اور بہت چھوٹے لیے۔ ”سب کچھ تو ہے میرے پاس۔ ہر رنگ۔ ہر خوشی۔ اور میں جو وہاں جا پہنچوں۔ جہاں بلندی اور بلندی۔ شہرت کی بلندی۔ تو میں مکمل ہو جاؤں۔“ جھولے کے فریم سے چوں چوں چرچراہٹ کی آوازیں آنے لگی تھیں۔



ماما کی کال ڈائریکٹ صفدر کے سیل فون پر آئی تھی، ورنہ وہ عموماً اسی کے ذریعے صفدر کی خیر خیریت لے لیا کرتی تھیں۔ وہ دو دن سے آیا کے کنبے کے بیچ بستر گا کر سو رہا تھا۔ ماما نے ان دونوں کو رات کے کھانے پر بلایا تھا۔ اس کے پاس انکار کا کوئی جواز نہیں تھا اور جب وہ دونوں تیار ہو گئے تو آپا کی سب سے چھوٹی بیٹی غانہ سے چہرے لیے ان کے سروں پر سوار تھی۔

”ماموں جان! مجھے عفرہ کی انکھی جھنٹ پر جانا ہے۔ آپ چھوڑ کر آجائیں پلیز۔ میں آپ کو پہلے بتانا بھول گئی تھی۔ اگر میں نہیں گئی تو وہ ناراض ہو جائے گی۔“ آپا بہت طاقتور تھیں مگر اسے اندازہ تھا۔ پر آپا کی بیٹیاں بہت ہی باور فل تھیں۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا۔

”پاپ کی ہی پسند کے آگے سر جھکایا تھا میں نے تو بھی۔ اب جیسی بھی ہے آپ لوگ ہی بھگتیں۔ میں نے تو زینہ خالہ کی بیٹی کا کہا تھا پر آپ کو تو وہ سخت پسند تھی۔ پڑھی لکھی اکلوتی کا گیت آپ ہی گایا کرتی تھیں نا سو برداشت کریں اور رہی بات غرور کی تو سارا نشہ ہرن کر سکتا ہوں میں اس کا۔ شادی مجھ پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتی۔ میں اب بھی ویسا کا ویسا ہی ہوں۔ تمہارا ماموں نہیں ہوں تمہارا دوست ہوں۔“

اس نے سارا پانی سنگ میں اینڈیل دیا اور بھلا چیزوں کو اینڈیلنے سے بھی کبھی کسی کے لیے نہیں جگہ بن جاتی ہے۔ اس نے غائب دماغی سے خالی جگہ اٹھایا اور چپ چاپ کمرے میں آ بیٹھی۔ جب ہی وہ تانتا سا کمرے میں آیا تھا۔

”تم سے دو گھڑی میری بچیوں کے پاس آکر نہیں بیٹھا جاسکتا؟ کبھی کبھی تو رکنے آتی ہیں یہ لوگ۔ اس چیز کے زعم میں منہ بنا کر بیٹھی رہتی ہو تم۔“

وہ پھنکارتا اس کے رویہ تھا اور اس کے اندر موت کا سا سکوت تھا اور جب موت کا سکوت طاری ہوتا ہے تو جسم ایک گنبد بن جاتا ہے جہاں آوازیں بازگشت کی صورت گنبد کی دیواروں سے ٹکرا کر خود کو لوہان کر لیتی ہیں اور وہ اس وقت ایسی ہی آواز تھی۔ لوہان پر خاموش۔

وہ سسرال نامی جامعہ میں تھی جہاں کیمپائی لب کی طرح مختلف تجربات اس کی زندگی کے رنگین کٹھنڈ کو موت کی نیند سلا رہے تھے۔ زندگی سے اتنے سبق تو اس نے اکیس سالہ زندگی میں بھی نہیں سیکھے تھے۔

جتنے چند ماہ کی ازدواجی زندگی نے سکھادیے تھے۔ اس کے پاس کوئی دلیل نہ تھی کہ وہ خود کو بہادر ثابت کرتی۔ یہ وہ میدان کارزار تھا۔ وہ جہاں وہ کند ہتھیاروں کے ساتھ اتری تھی اور اس کی شکست یقینی تھی۔ وہ بڑبڑاتا کمرے سے نکل گیا تھا اور اسے بتا دیا تھا کہ وہ آج سے

”تم چلو بیٹا! میں آتا ہوں۔“

وہ فرط مسرت سے ماموں کے گلے آن لگی۔

”متھنک یو سوچ ماموں! مجھے پتا تھا آپ انکار نہیں کریں گے اور آپ انکار کر بھی کیسے سکتے ہیں، اکلوتے ماموں ہیں آخر کو ہمارے۔“

لہرائی بل کھاتی وہ باہر چل دی اور وہ حسرت بھری نگاہوں سے صند کو تکتے لگی۔

”آئی کو کال کرو ہم لیٹ ہو جائیں گے۔“

وہ بغیر جواب سے باہر نکل گیا اور واپسی میں ایم اے جناح روڈ کی ٹریفک میں ایسا پھنسا کہ جب گھر پہنچا تو بارہ بج چکے تھے۔ عفرہ کی انگنہ جمنٹ کا فنکشن شہر کے آخری کونے کے کسی ہال میں رکھا گیا تھا اور جب اس نے کمرے میں قدم رکھا تو وہ کارپٹ پر بیٹھی بیڈ پر سر رکھے سوچکی تھی۔ جوڑے کی کالی ہنص سفید بنڈ ٹیٹ پر ایک ترتیب سے رکھی تھیں اور وہ سرخ ٹوٹی ہوئی چوڑیاں اس کے پیروں میں پڑی تھیں۔

اس نے خاموشی سے تکیہ اٹھایا اور آپا کے کمرے کی راہ لی۔ اس کے سائلنٹ موڈ پر لگے سیل پر اس کی گیارہ مسئلہ کالز تھیں۔

ازدواجی زندگی کی سچے موتیوں کی مالا سے ٹوٹ کر یہ کون سا موتی گرا تھا اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ اسے سچی خوشی آپا سے جڑے رہنے میں ملتی تھی۔ سو وہ تو خوش تھا۔



ہال کچھا کچھ بھرا تھا۔ اگلی قطار میں بھارتی عمائدین بمعہ گورنر سندھ کے تشریف فرما تھے۔ بیک گراؤنڈ میوزک شروع ہوا جو کہ خوش گواریت لیے ہوئے تھے۔ آٹومینک پردے دونوں اطراف سمٹ گئے۔ اسٹیج کا منظر صاف دکھائی دیے جانے لگا۔ لیپ ٹاپ سے متصل اسپیکرز کے ذریعے ایک ایک ڈانپلاگ صاف سنائی دے رہا تھا۔ ہال میں موجود ہر شخص اسٹیج پر بکھری کٹھ پتلیوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

اسٹیج پر شادی کا منظر تھا۔ دو لہوا لہن ایک نئے رشتے میں بندھ رہے تھے۔ جب ہی ایک ہلکے سے فائر کی آواز کے بعد اسٹیج پر گلاب کی پتیاں چھت سے کٹھ پتلیوں پر برسی تھیں اور اسپیکرز سے ڈانپلاگ شروع ہو گئے تھے۔ پس پردہ بیٹھے حسن نے ماہم کو تانت کی تاریں ہلانے کا اشارہ دیا۔ ماہم کی انگلیوں کی جنبش سے ہیروئن اپنے سرخ لاپے کو ہلاتی ہیرو کے روبرو آئی تھی۔ باقی کٹھ پتلیوں کو پس پردہ بیٹھے مزید لوگ ایک طرف۔ کرچکے تھے۔ زنیو کی آواز ہال میں گونجنے لگی تھی۔

”ساری کشتیاں جلا کر میں تمہاری کشتی میں آن بیٹھی ہوں۔ جھاگ اڑاتے سمندر کے کناروں پر کھڑے میرے خونی رشتے مجھے دیکھ سکتے ہیں۔

آنسو بہا سکتے ہیں۔

پر مجھے واپس بلا نہیں سکتے۔

کہ ان کی ہر خوشی۔ میرے تم سے جڑے رہنے میں ہے۔

مانا کہ میں نے تم سے محبت کی۔ ان سے ناتے توڑ کر تم سے ناتا جوڑا ہے۔ بولو! مجھے تم چھوڑو تو نہ دو گے نا؟“ زنیو کی آواز سکسنے لگی۔ حسن کے ہاتھوں کی حرکت سے ہیرو ہیروئن کے کچھ اور نزدیک آتا ہے۔ بیک گراؤنڈ میوزک کی ٹیون بدلی۔ ارباز کی آواز ہال میں گونجنے لگتی ہے۔

”تمہیں پانے کے لیے میں نے زمانے سے ٹکری ہے۔ سمندروں کو ٹپا ہے۔ پھر کہیں جا کر تمہیں پایا ہے۔ تمہیں پانا تو ایسا ہی تھا جیسے سیپ سے صدف کو پانا اور کوئی صدف کو بھی بے مول کرتا ہے کبھی؟ تم میرے لیے نایاب ہو۔ میرے سیپ کا سچا موتی۔ میری صدف ہو تم۔“

ارباز کی ڈانپلاگ ڈلیوری نہایت شان دار تھی اور اس کی آواز گمبھیر تھی۔ ہال میں ابھی تک سکوت طاری تھا۔

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بے بال اکاٹا ہے
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- یکساں منیہ
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے



قیمت - 120 روپے

سوہنی ہیرائل 12 جی بوتلوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تمہاری مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خرید یا جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف - 120 روپے ہے، دوسرے شہروں والے منی آرڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوائیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آرڈر اس حساب سے بھجائیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے 300 روپے
- 3 بوتلوں کے لئے 400 روپے
- 6 بوتلوں کے لئے 800 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور ٹیکس ہمارے شامل ہیں۔

منی آرڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، یکم فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیرائل ان جگہوں سے حاصل کریں
بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، یکم فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی
فون نمبر: 32735021



اس کے اندر سنائوں کا راج تھا۔ رات صفر نے جو بھی اس کے ساتھ کیا، سکوت طاری ہو جائے تو دل کی دیواریں ٹٹنے لگتی ہیں اور اس کے دل کے دیواریں ٹٹنے لگی تھیں۔

وہ صبح آفس جا چکا تھا بغیر کوئی معذرت کیے۔ اسے لگا، وہ اس کے لیے ایک شوپیں ہے، جسے وہ گھر میں سجا کر بھول گیا تھا۔ اس نے ہمت کی اور اٹھ کر ”آپا کی جنت“ میں جا پہنچی۔ جہاں وہ بیڈ پر مہارانی کی طرح محو استراحت تھیں۔ چھ کی چھ عدد بیٹیاں ملکہ عالیہ کے آس پاس براجمان تھیں۔ اسے کمرے میں آتے دیکھ کر سچ کی چمک ان کی آنکھوں میں کوندی تھی۔ لبوں پر استہزائیہ سی مسکراہٹ رقصاں تھیں۔ چھ عدد ”سندوں“ نما بھانجیوں نے اسے دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں پیغامات کی ترسیل کی تھی۔

وہ بغیر کچھ کئے آپا کے بیڈ کی پائنٹی میں بیٹھ گئی تھی۔ آپا کا انداز، ہنوز وہی تھا، وہ ہنکارا بھرتی گویا ہوئی تھیں۔

”او آؤ بی بی! آج کمرے سے نکلنے کا خیال کیسے آگیا تمہیں۔ اپنا اکلوتا گھرو جوان بھائی تمہارے حوالے کیا تھا میں نے۔ مجھے کیا خبر تھی یوں لات مار کر کمرے سے نکال پھینک دو گی اسے۔ کئی راتوں سے میرے پاس سو رہا ہے۔ کم صبر رہتا ہے۔ تمہیں تو ذرا جو خیال ہو اس کا۔ بس تمہیں تو ہم نے ایک ہی شوق میں دیکھا۔ ہر وقت بس میکے بھاگنے اور وہاں کی سڑکیں تاپنے کا۔ ارے اتنا ہی ناپ تول کا شوق تھا تو بی بی! ”کار“ لے آئیں اپنے باوا سے جینز میں۔“

آپا نے توقف کیا تو اسے لگا، اس کے ہاتھوں میں پسینہ آگیا ہے اور دل اتھاہ گہرائی میں ڈوبے ڈوبے جاتا ہے۔ وہ تو آپا کو کہنے آئی تھی کہ اکیلے سوتے میں ڈر لگتا ہے۔ صفر کو کہیں کہ وہ آج سے کمرے میں سوئیں، بریساں تو الزامات کی نئی کھوپ تیار تھی۔ اس نے کچھ کہنے کو ہونٹ واہ کیے ہی تھے کہ چوتھے نمبر کی بھانجی

نے ماں کو نئے محاذ کی کمک پہنچائی۔

”اتنے خوب صورت ہیں ہمارے ماموں۔ آپ تو ان کے ساتھ بالکل بھی نہیں جچتیں۔ ہر وقت بھگنوں والے حلیے میں پھرتی ہیں۔ کل صائمہ نے آپ کو ایسے ہی حلیے میں دیکھ لیا ہوگا جب ہی تو کہہ رہی تھی کہ تم نے اپنے ماموں کے لیے دیکھا ہی کیا ہے۔“ وہ دبے دبے لہجے میں گویا ہوئی تھی۔

”جب تمہارے ماموں کو ہی میرے بننے سنورنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تو فائدہ۔ اور رہی بات ماموں کے خوب صورت ہونے کی تو میرے بابا کے گھر کی دھول آپ نے لے لی تھی۔ میں خود تو چل کر یہاں نہیں آئی نا اور صفدر کو بتا دیجئے گا۔ اگر آج وہ کمرے میں نہیں سوئے تو میں ماما کو بتا دوں گی۔“

”دھمکی۔۔۔ ای۔۔۔ امی دھمکی دے رہی ہیں ماما تو۔ میں تو ابھی کل کر کے بتائی ہوں ماموں کو۔“

یہ پہلے نمبر کی بال بچوں والی بھانجی تھی جو کھٹ کھٹ کل ملا چکی تھی۔ آپا پیروں کو سمیٹ کر دل تھامے بیٹھی تھیں۔ وہ اس ذہنی یار چر سیل نما کمرے سے چپ چاپ اٹھ کر چل دی تھی۔ رات میں ایک طوفان آنے کو تیار کھڑا تھا۔

جب وہ پنجاب سے کراچی لوٹی تھی روٹی بھری گڑیا کے ہجر میں دن رات تڑپی تھی اور بخار چڑھا بیٹھی تھی۔ اس کا بخار سے سرخ تہتا چہرہ دیکھ کر اس کے ماما بابا نے دادی سے درخواست کی تھی کہ اس کے لیے بالکل ویسی ہی گڑیا کا انتظام کر دیں۔ پوتی کی شدید محبت دادی کے لیے امتحان بن گئی۔ وہ ساری نصیحتیں بلائے طاق رکھ کر سفید مہل کے کپڑے کو جو کہ ان کا دہپٹا تھا گڑیا کی شکل میں کاٹ کر روٹی بھرنے لگیں۔ دادی نے کبھی گڑیا نہیں بنائی تھی انہیں مور توں سے خوف آتا تھا۔ پھر بھی روٹی بھری گڑیا کو جب اطلس کے گلابی غرارے میں اس کے ہاتھ میں دیا گیا تو اس کا بخار جاتا رہا تھا۔ دادی کے ہاتھوں سے ایک شان دار

گڑیا تیار ہوئی تھی اور پھر پوتی کی فرمائش پر تخلیق پر تخلیقات ہوتی گئیں اور اس کا کمرے روٹی بھری گڑیاؤں سے بھرنا گیا۔ اسے گڑیاؤں سے عشق ہو گیا تھا۔

وہ اکلوتی تھی۔ ان گڑیاؤں نے رشتوں کی جگہ لے لی۔ اکیلے کمرے میں کوئی گڑیا اس کی بہن بن جاتی، کوئی بھائی۔ یہ اس کی بد قسمتی تھی کہ وہ اکلوتی پیدا ہوئی تھی۔ دادی ہر گڑیا بنانے سے پہلے اسے بازار گھنے کی تلقین کرتیں۔ ”جان ڈالنی پڑے گی“ جیسی باتیں کرتیں۔ وہ ضدی نہیں تھی فرماں بردار تھی پر اپنے اس شوق پر کسی بھی قسم کا سمجھوتا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ دادی ہر تخلیق کے بعد مصلیٰ لے کر بیٹھ جاتیں اور نماز استغفار ادا کرتیں ایسے ہی کئی سال بچ میں سے سرک گئے۔ وہ سمجھ دار ہوئی تو ساری گڑیا میں بیک میں بھر کر اسٹور میں رکھ دیں۔

اور پھر ایسا ہوا گڑیاؤں کے رکھتے ہی دادی بھی زندگی سے روٹھ کر افق کے اس پار جا سوئیں۔ دادی کے بہت سارے فلسفے اس کے لاشعور میں بیٹھ گئے اور وہ اپنی زندگی میں مصروف ہوتی گئی۔ پہلے وہ مور توں سے کھیلتی تھی پھر اس نے برش ہاتھ میں پکڑا تو وہ بہت سی مور تیں خود تخلیق کرنے لگی تھی۔ پھر اسی دوران اس کی زندگی تبدیل ہونے کو تھی۔

اس نے فون کر کے ماما کو بلوایا تھا۔ ماما بابا اس سے ملنے آئے تھے۔ گھر کا کوئی بھی شخص ان سے آکر نہیں ملا تھا۔

”تمہاری نند اور ان کی بیٹیاں نہیں ہیں گھر پر کیا؟“ ماما نے ناگواری سے پوچھا تھا۔ بابا نے میگزین اٹھا کر ورق گردانی شروع کر دی تھی۔ صفدر آفس سے نہیں آیا تھا۔ اس نے اپنی ماں کو ابھی تک کچھ بھی گوش گزار نہیں کیا تھا۔

”وہ لوگ مہمانوں سے آکر نہیں ملتیں۔ ان کے ہاں کارواج یہ ہے کہ مہمان خود جا کر ان لوگوں کے

کمرے میں گھستے پھر بس ملنے کے لیے۔“

بابا کو اس کا لہجہ سنا لگا تھا۔ انہوں نے ذرا کی ذرا نگاہ اس پر ڈالی تھی۔ سامنے فکر مندی سے پوچھا۔
”سب ٹھیک تو ہے نا بیٹا؟“

”جی ٹھیک ہے سب۔ صدف راستے بڑی ہیں آج کل میں اسی لیے آنہیں پائی۔ یوں آپ کو کال کر کے بلوایا ہے آج۔“

وہ کچھ بتاتے بتاتے رکی تھی۔ اسے اپنے ماں باپ کی تھلائی کا خیال آیا تھا۔ اپنے باپ کی بیماری کی نوعیت یاد آئی۔ وہ کچھ بھی بتانہ پائی تھی۔ وہ اٹھ کر چائے بنا لائی پر کوئی بھی ان دونوں سے ملنے کے لیے نہیں آیا تھا۔

کارپورچ میں کھڑی بابا کی گاڑی کو آیا اپنی تیز نگاہوں سے ملاحظہ فرما چکی تھیں اور منہ ڈھک کر سوتی بن گئی تھیں۔ اس کے والدین بغیر کسی سے ملاقات کیے صدف کا انتظار کرتے کرتے چلے گئے تھے انہیں اندازہ ہو گیا تھا ان کی بیٹی خوش نہیں ہے اور والدین کو اس بات کا احساس بہت جلد ہی ہو جاتا ہے۔



رات گئے صدف گھر لوٹا تھا۔ پہلی حاضری آیا کے حجرے میں لگتی تھی۔ کھانا بھی وہیں تناول فرمایا گیا۔ ایک کی چار لگا کر اس کا برسن واش کیا گیا۔ والدین کی آمد کو غلط رنگ دے کر پیش کیا گیا اور جب صدف نام کی بوتل لباب بھر گئی تو ڈاٹ لگا کر اس کے کمرے میں روانہ کر دیا گیا اور وہ گیس بھری کونڈر تک کی طرح کمرے میں جاتے ہی ابلا تھا۔

”تمہیں شرم نہیں آتی میری ماں جیسی بہن سے بد تمیزی کرتے۔ تمہیں کیا پتا کہ کس طرح ماں بن کر زلمے بھر کی مصیبتیں اٹھا کر مجھے پال پوس کر بڑا کیا ہے اور تم جو اس بنگلے نما گھر میں بیٹھی ہو نا تو ان کی ہی کرم نوازی ہے جو تم کو ایک چھوٹے گھر سے اٹھا کر بڑے گھر میں لے آئیں اور تمہاری جرات کیسے ہوئی میری بچیوں کو دھمکانے کی۔ منہ توڑ کر ہاتھ میں دے دوں گا

تمہارا جو آئندہ نگاہ اٹھا کر دیکھا بھی کسی کو۔ سمجھتی کیا ہو خود کو تمہاری اتنی نعمتیں دیکھ کر بھی خوش نہیں رہیں تو ہمارا کیا قصور؟ سارا دن کمرے میں گھسی رہتی ہو اور تمہارے باپ کی نوکر نہیں ہیں میری بچیاں جو پکا پکا کر تمہیں کھلائیں۔ صحیح کہتی ہیں آپ۔ تمہارے ہر ٹائم لٹکے منہ کے پیچھے کوئی نہ کوئی لازمی وجہ ہے۔ یہ منہ مار کر تو نہیں آئیں تم۔؟ جو ہر وقت منہ بنا رہتا ہے اور تمہارے ماں باپ آئے تھے تو مل کے جاتے نا آیا ہے۔ یونہی ایک طرف بات سن کر چلتے بنے؟“

وہ لڑاکا عورتوں کی طرح کمر پر ہاتھ رکھے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے ذرا سانس لینے کا توقف کیا تو وہ منمنائی تھی۔

”میں۔ میں۔ نے تو۔ کچھ بھی۔ نہیں بتایا ماں۔ بابا کو۔“

”ہاں تو بتانے کو تھا ہی کیا تمہارے پاس۔ ساری غلطی تو تمہاری ہی ہے۔ تمہیں ضرورت ہی کیا تھی فساد کرنے کی گھر میں۔“

”آپ میرے پاس کیوں نہیں سوتے صدف! کیا بیویوں کو اسی لیے لایا جاتا ہے گھروں میں کہ ان کو تھاکر کے بہنوں کے پاس سویا جائے۔“

آنسوؤں میں کھلی گدلی گدلی سی آواز کو صدف نے دھاڑ سے خاموش کر لیا تھا۔

”شٹ اپ جسٹ شٹ اپ۔ تم میں کوئی ایسی کشش ہے ہی نہیں کہ مرد تمہارے پاس آئے۔“

ایک اور الزام! وہ ٹوٹ کر رہ گئی۔ ”کیا کمی ہے مجھ میں؟“ وہ خود سے پوچھنے لگی اور وہ مغالطات بلکنا کمرے سے نکل گیا تھا۔ لان میں لگے کہیں دور سنہری جھولا اپنی کانچ کی گڑیا کو یاد کر کے رو رہا۔ وہ آج اندر سے خالی ہو گئی تھی۔

اور خالی گھر کے سنائے

موت ہوتے ہیں موت۔



ہل میں ویسا ہی سکوت ابھی تک قائم تھا یا تو گورنر

ہیروئن پھر ملے کپڑوں میں ہوتی ہے۔ اس کی دراز
ریشمی کالی زلفیں اس کے اطراف بکھری ہوتی ہیں۔
ایک سپورٹنگ کٹھ پتلی اس کے پاس آکر رکتی ہے اور
اسے معنی خیز لہجے میں بتاتی ہے۔

”جو ہر واپس آگیا ہے۔ وہ سمجھتا ہے تم گھر سے کسی
کے ساتھ بھاگ گئی ہو۔ اگر تم اسے کہیں نظر آگئیں تو
جان سے مار ڈالے گا تمہیں۔ وہ محبت جو بھی تم سے
کرتا تھا وہ سب خواب ہوئی۔ کل اس کی شادی ہے۔
میں نے تمہیں سب سے چھپ کر اپنے گھر میں پناہ
دے رکھی تھی، پر تم اب اپنے وطن کو لوٹ جاؤ۔“
سپورٹنگ کٹھ پتلی یہ کہہ کر پردے سے غائب
ہو جاتی ہے۔

ہیروئن آستگی سے اٹھتی ہے۔ اسٹیج پر بنی مصنوعی
سڑک پر چلنے لگتی ہے۔ اس کے پس منظر سے زنیو کی
دکھ بھری آنسو سے غم ہوئی آواز گونجنے لگتی ہے۔
میں صدف سیپ کا سچا موتی۔

ان انجان رستوں میں یوں بے مول ہوئی
میرا نصف جو محبت کو ایمان کہا کرتا تھا
ایمان محبت سے منکر ہو ہوا
تو محبت جرم میرے ایمان کا ٹھہری۔
محبوب کی گلی کی خاطر

جھاگ اڑاتے سمندر سے پرے
میں نے ہر خون سے بندھے رشتے کو توڑا۔
میں نے چپ چاپ ہر دکھ سے اور میں بے وفا
ٹھہری

اور وہ جو وفاؤں کا سردار بنا پھر تا تھا
کیا نکلا۔؟
ڈوروں سے بندھا
کٹھ پتلی مرد۔

پردے برابر ہو گئے۔ ہال تالیوں سے گونجنے لگا اور
تالیوں کے شور نے سب کو باور کرا دیا تھا ڈراما ہٹ ہے۔
پرفارمنس بے حد شان دار تھی۔ پردے پھر کھلتے ہیں۔
پوری ٹیم کٹھ پتلیوں کو ہاتھ میں اٹھائے اسٹیج پر موجود
تھی۔ سب کے ہاں پر ہیڈ فون لگے تھے۔ ان سب

اور بھارتی وفد کے خوف سے عوام خاموش بیٹھی تھی یا
ڈرامے کے مختلف جان دار کرداروں اور کئے بعد
دیگرے آنے والے مناظر میں ایسا ربط تھا کہ کوئی بھی
آواز نہیں نکال رہا تھا۔ اب ایک نیا منظر چل رہا تھا۔

ہیروئن کو چھوڑ کر ہیرون ملک چلا جاتا ہے۔
ہیروئن اس کے بھر میں البیہ شاعری پڑھتی ہے۔ ہیرو کی
ماں بہنیں اس پر پھبتیاں کستی ہیں کہ وہ اب کسی انگریز
کو لے کر آئے گا اور اسے بھول چکا ہے۔ پھر ایک منظر
میں ساری سپورٹنگ کٹھ پتلیاں ہیروئن پر پل پڑتی ہیں،
اور سب اسے مل کر مارتی ہیں کیوں کہ اس کا جرم محبت
تھا اور وہ اپنی ساس نندوں کے لیے ایک ناپسندیدہ ہو
ہوتی ہے اور ایسی صورت حال میں اس کا شوہر گھر
والوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے باہر ملک چلا
جاتا ہے۔ پیچھے سے گھر والے اسے مار پیٹ کر گھر سے
نکل دیتے ہیں اور بیٹے کو فون پر بتا دیتے ہیں کہ وہ گھر
سے کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔ ہیرو کی آواز ہال میں
گونجنے لگی ہے۔

”بھاگ گئی۔ اسے بھاگنے کیوں دیا؟ جان سے
کیوں نہیں مارا۔ میری عزت کو ٹال گا گئی وہ۔ ماں تمہیں
ایسا غضب کیوں ہونے دیا۔ میں نے محبت کی تھی،
عزت گروی نہیں رکھی تھی اس کے پاس۔“

ارباب کی آواز میں ایک مخصوص قسم کی دھاڑ تھی۔
دوسری کٹھ پتلیوں کی ملی جلی ہنسی کی طنزیہ آوازیں
اسپیکرز سے گونجنے لگتی ہیں، پھر ہیرو کی ماں کی آواز آتی

ہے۔
”ہو نہ! آئی بڑی محبت کے گیت گانے والی محبت
کے پیچھے دریاؤں سمندروں کو پاٹ کے آئی تھی۔ ہم
سے ٹکری تھی۔ دیکھا! بسنے بھی نہ دیا تا ہم نے۔“
پھر ہنسی کی ہیبت ناک آوازیں گونجنے لگتی ہیں۔
”محبت کا راگ گانے والے کبھی بس ہی نہیں
پاتے محبت بسنے ہی کب دیتی ہے کہیں۔“

پردے برابر ہو جاتے ہیں پھر تھوڑے سے وقفے
کے بعد پھر کھلتے ہیں اور ڈرامے کا آخری سین چلا
ہے۔

آنکھیں پھاڑے دیکھنے لگی تھی۔ اسے لگا تھا اس نے ایک تیز جھوٹا لے کر خود کو بلندی پر ہواؤں کے سنگ ہم آہنگ کیا ہو۔



وہ سب موج مستیوں میں گمن تھے جب ایک نیم سرکاری الیکار نے دیا تو مکش کمار کا کارڈ دیتے ہوئے بتایا تھا کہ آپ سے ملاقات چاہتے ہیں اور آپ کو پھیل کے آفس میں بلا رہے ہیں۔ وہ۔۔ ٹھنڈے ہوتے ہاتھوں کے ساتھ گئی۔ کھبراہٹ اس کے چہرے سے مٹ گئی۔

”دیا جی! میں آج کل ایک راجستانی ڈرامہ پروڈیوس کرنے والا ہوں۔ میں چاہتا ہوں نیوٹیلنٹ کو سامنے لاؤں۔ میں آپ کو آفر دے رہا ہوں آپ راجستانی ڈرامے ”دیپک راج“ کے لیے پلے بیگ سنگنگ کریں تو میں آپ کا مشکور رہوں گا۔ مانا کہ ہمارے دیش میں کلا کاروں کی کمی نہیں مگر آپ کی آواز کا سوندا سا سحر میرے ٹائٹل سانگ کے لیے بہت سوٹ ایل ہوگا۔ اگرچہ میں نے آپ کو گاتے ہوئے نہیں سنا تھا بولتے دیکھا ہے۔“

وہ فکر فکر مکش کمار کی شکل کو تک رہی تھی۔ اس کی تو سات نسلوں میں کوئی گلوکار نہیں گزرا تھا۔ اس کے والدین نمازی پرہیز گار تھے۔ لکھنے کی حد تک تو ٹھیک تھا پر اس نے خود بھی میڈیا میں کام نہیں کیا تھا۔ گوکہ دل میں شوق ضرور تھا مشہور ہونے کا۔ اس کی خاموشی کو دیکھ کر وہ ہنس دیا کو اچانک احساس ہوا تھا کہ وہ ایک بے حد بینڈ سم انسان کے رویہ ہے۔

”دیا جی! آپ کو شاید میں نے مشکل میں ڈال دیا ہے۔ ایسا کریں آپ سوچ لیں، میرا کارڈ تو آپ کو مل ہی چکا ہے۔ میرے راجستان اور ممبئی دونوں آفس کے نمبرز ہیں فیس بک پر بھی آپ مجھے وزٹ کر سکتی ہیں۔ جیسے آپ کو سہولت ہو۔ کونٹیکٹ کر لیجئے گا۔ میں انتظار کروں گا۔ سنگنگ کے علاوہ اور پروڈیکٹ بھی میرے پاس ہیں۔ آپ تو اتنی سندر ہیں کسی

کی صوتی ادکاری تھی۔ دیا کے ہاتھ میں ہائیک تھا۔ وہ رائٹر بھی اور ڈائریکٹر بھی۔ ارباز نے سلام کر کے ناظرین کا شکریہ ادا کیا۔ پھر ارباز نے دیا کا تعارف کرایا تھا۔

”یہ ہیں دیا احمد جو کہ اس ڈراما کی رائٹر پروڈیوسر ڈائریکٹر ہیں۔ اب یہ خود آپ کو اپنے بارے میں بتائیں گی کہ یہ کیا چیز ہیں۔“

سامعین کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ بھارتی وفد میں ایک غیر ملکی چینل کا نامور پروڈیوسر مکش کمار بھی شامل تھا۔ وہ ایک بینڈ سم اور تجربے کار آدمی تھا۔ اس کی نگاہ دیا پر جمی تھی اور اسے لگا تھا پورے ہل میں اندھیرا ہے اور بس ایک دیا ٹھنڈا رہا ہے۔ دیا مسکرائی ہوئی گویا ہوئی تھی۔

”السلام علیکم میں آپ کے سامنے دیا احمد ایک آئیڈیا ذہن میں آیا تھا سو ایک مختصر دورانیے کا ڈراما آپ کے سامنے پیش کر دیا۔ میں پوری ٹیم کی بہت شکر گزار ہوں جن کے تعاون کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں تھا۔ ڈرامے کا سارا حسن آوازوں کے اتار چڑھاؤ کا تھا جس میں ارباز اور زبیر کی آوازوں نے چار چاند لگائے۔ اور سب سے زیادہ شکریہ میری دوست کٹھ پتلیوں کا جو بچپن سے میری ساتھی ہیں۔ یہ سب کٹھ پتلیاں میری دلدی کے ہاتھ کی تیار کی ہوئی ہیں۔ ان کے ملبوسات کی کارستانوں میں کچھ ہاتھ میرا بھی ہے۔“

ناظرین کے چہروں پر مسکراہٹ تھی اور مکش کو لگا تھا اس سے زیادہ دلکش آواز اس نے پہلے کبھی نہیں سنی۔ جو ہل کے اندھیوں میں جھللا رہی تھی۔ پھر اسے اسے آکر کسی نے کیا بولا اس کی نگاہیں اس پر سے ہٹیں تو وہ کچھ سنتا۔

گور نے اعزازی خطاب کیا اور پھر۔۔ غیر ملکی وفد اظہار خیال کے لیے کیے بعد دیگرے اسٹیج پر آئے مکش کمار نے غیر نصیبی سرگرمیوں کو سراجے سراجے میڈیا کے شعبے میں مل جل کر کام کرنے کے تجویز کے ساتھ براہ راست دیا کو اپنے چینل کے لیے کام کرنے کی آفر کردی اور دیا دم بخود

نہیں کیا تو میں ابھی آپ کو فائل نہیں جاسکتی۔ میں آج مشورہ کر لوں پھر آپ کو انفارم کرتی ہوں۔“

بابا کے تنے تنے سے تاثرات میں نرمی آئی تھی۔ اس کی آواز بخوبی ان کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ اس کی بات بروہہ کچھ اور شوخ ہوا تھا۔

”اف مشقی لڑکیاں۔ سب کام پیرٹس سے پوچھ کر کرتی ہیں۔ شادی بھی آپ پیرٹس کی پسند سے کریں گی کیا؟“

ڈرامے میں ہیروئن بھی کلاسٹ کر سکتا ہوں میں۔“

اسے بولنے کا خط تھا۔ دیا کو اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ مسکرا کر جی جی ہی کرتی رہی اور مکیش نے اتنی خوب صورت مسکراہٹ کبھی نہیں دیکھی تھی۔ بھارتی وفد اور اس کے سینئر پرو فیسر اسے رشک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے وہ مکیش کمار کی نگاہوں میں آئی تھی کوئی معمولی بات تو نہ تھی۔ اور مکیش نے جب اس سے کانٹیکٹ نمبر مانگا تو وہ ذاتی نمبر کے بجائے لینڈ لائن کا نمبر بتا بیٹھی تھی۔



وہ سنہری جھولے میں بیٹھی سوچوں میں گم تھی۔ اس نے خود کو ہواؤں میں پایا۔ اوپر سے نیچے نیچے سے اوپر۔

”مجھے کیا جواب دینا چاہیے مکیش صاحب کو۔“

وہ اوپر سے نیچے آئی۔ ”ماما بابا تو اس بات کو سخت ناپسند کریں گے۔“ اس نے انگوٹھوں پر زور دے کر خود کو بلند کیا ایک تیز جھوٹالے کر ”سنگٹنگ نہیں۔ مجھے لکھنے کی بات کرنی چاہیے۔“ اور سے نیچے آتے لاؤنج سے آتی فون بیل بروہہ جھولا روگ کر بھاگی تھی۔ بابا فون اٹھائے کھڑے تھے۔

”دیا! تمہارا فون ہے مکیش کمار نامی کسی لڑکے کا۔“

اسے لگا تھا بابا کو ناگوار گزرا ہے۔ وہ کچھ ڈرتے ہوئے فون پر بات کرنے لگی تھی بابا قریب ہی۔ بیٹھے اسے ملاحظہ فرما رہے تھے۔ ریسور سے مکیش کی چچھاتی آواز نکلی تھی۔

”دیا۔ دیا۔ دیا جی آپ کی تلبنا کی نے تو رات بھر سونے نہیں دیا۔“

دیا کا دل اکھل۔ پھٹل ہونے لگا تھا۔ اکیس سال کوئی زیادہ عمر تو نہیں ہوتی۔ معصوم ہوتی ہیں۔ اس کا لہجہ اتنا کھلا تھا کہ دیا کو سرد موسم میں بھی سینے آنے لگے تھے۔ وہ ڈرے ڈرے لہجے میں گویا ہوئی تھی۔

”اچھ جولی! میں نے اپنے پیرٹس سے ڈسکس

اس نے کام کی بات کے بیچ میں ایک بے ربط بات کی۔ دیا نے ذرا کی ذرا نگاہ بابا پہ ڈال کر کہا تھا۔ ”جی میری اولین ترجیح میرے پیرٹس ہیں۔ وہ جیسا کہیں گے میں ویسا ہی کروں گی۔ میں آپ کو کال بیک کرنی ہوں رات تک۔“

اس نے جلدی جان چھرائی اور بابا کے روبرو جا بیٹھی۔ اسی اثنا میں ماما بھی بابا کے پہلو میں آن بیٹھی تھیں۔ اس نے بابا کو مخاطب کرتے کہا تھا۔

”بابا! کل میں نے یونیورسٹی میں ایک ڈراما پیش کیا تھا۔ گورنر سندھ اور بھارتی عمائدین کا وفد بھی شامل تھا۔ جن کی کال آئی تھی وہ مکیش کمار صاحب تھے۔ کسی ہندی چینل کے پروڈیو سر ہیں۔ میرا ڈراما پسند آیا تھا اسیں۔ چینل پر کام دینے کے آفر کر رہے ہیں۔“

اس نے پلے بیک سنگٹنگ والے تذکرے کو سرے سے گول کر دیا تھا۔ وہ بڑی محتاط نگاہوں سے اپنے والدین کے تاثرات جانچ رہی تھی۔ گو کہ شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ اس کے منہ سے کوئی بات نکلی ہو اور ماما بابا نے اسے پورا کرنا اپنا فرض نہ سمجھا ہو۔ اور پھر اس نے کبھی کسی چیز کی ضد کی بھی نہیں تھی۔ پر اب معاملہ دوسرا تھا۔ کسی دوسرے ملک کے چینل کے لیے کسی ہندو لڑکے کے ساتھ مل کر کام۔ وہ بیٹی کے دل کی خواہش جان کر بھی چپ تھے کیونکہ اس شوق کی تکمیل پر بات ساری آئی جاتی ہے عزت پر۔ بابا دو ٹوک کہتے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”صاف انکار کر دو بیٹا! یونیورسٹی تک تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ پریوں کسی انجیل غیر مسلم کی آفر کو

سوچتا بھی ہمیں زیب نہیں دیتا۔ کجاوہاں جا کر ان لوگوں کے ساتھ مل کر کلم کرنا۔ ہسلا پھسلا کر سہاں سے ہماری بیٹیوں کو لے جا کر کچر کے باہر پر ان کی عزتوں کی نیلای بندووس کا شیوا ہے بیٹے! تمہیں کچھ سوچنا بھی نہیں ہے۔ انکار کرنا ہے وہ ٹوک۔ دیش اس۔

بلیا کے انکار پر وہ چپ چاپ پھر جھولے پر جا بیٹھی تھی۔ اس نے ہلکا تیز کسی بھی قسم کا جھوٹا نہیں لیا تھا۔ خواہشات کی موت پر ایسا ہی سکوت پھیلتا ہے جیسا اس کے اندر پھیلتا تھا۔

”صنذر! مجھے ملا کے گھر لے چلیں۔ کتنے دن ہو گئے ہیں مجھے گئے۔“

اس کے لہجے میں نجانے کیا تھا وہ ایک نگاہ ڈال کر بولا۔

”شام میں لے چلوں گا لیکن آپ سے اجازت لے لیتا پہلے سورنہ وہ یہ سمجھیں گی کہ ہم نے ان کو بڑا نہیں بلکہ دو سری بات یہ کہ ان سے تعلقات صحیح رہیں گے تمہارے تو میرا موڈ بھی ٹھیک رہے گا۔ میرے دل کے تمام رستے تپا اور بچیوں سے ہوتے آئے ہیں۔“

”میں جاتی ہوں ان لوگوں کے پاس، وہ لوگ مجھ سے ٹھیک سے بات نہیں کرتے۔ انہیں لگتا ہے میں آپ لوگوں کے بیچ زبردستی کھس آئی ہوں۔“ اس کی بات سن کر وہ طنز بنے لگا تھا۔

”کہتی تو ٹھیک ہیں۔“

حلق سے الفاظ کیسے ٹوٹ ٹوٹ کر دل پر گرتے ہیں۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ بات کو طول دیتا نہیں چاہتی تھی سو خاموشی سے بیٹھ گئی۔ یہی غنیمت تھا کہ وہ اس دن سے کمرے میں سو رہا تھا۔ کروٹ بدل کر ہی سہی۔ یہی سارا بہت تھا کہ کوئی تو اس کی تنہائی میں شامل ہے۔

وہ برف کیس اٹھا کر کمرے سے نکل گیا۔ وہ آپا کے پاس جا پہنچی۔ وہ ساری مل بیٹیاں اس قدر جلیل تھیں، اسے دیکھتے ہی جیسی ٹھنڈوں میں لگ جاتی تھیں۔ آپا

اس کی آمد پر طنز ہنکار بھرتی تھیں، سو آج بھی بھر کر اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی تھیں۔ اس نے خیریت دریافت کی تو وہ اپنے پرانے جاہلانہ انداز میں تیر کمان لے کر میدان میں کود پڑی تھیں۔

”آج میری خیریت دریافت کرنے کا خیال کیسے آگیا ملکہ عالیہ کو؟“ وہ ”محاذ“ پر آتے ہی گڑ بڑا جاتی تھی۔ لڑکیاں جتنی بھی براعتاوت نہیں ”سسرالیوں“ کے سامنے سارا اعتماد جھاگ کی طرح جیٹھ جاتا ہے۔

”نو چھتی تو ہوں اکثر۔“ اس کے ڈرے سے لہجے نے آگوا اور بھی شیر بنادیا بلکہ وہ پیدا لکھی شیر تھیں۔

”کام کی بات کرو لی بی! میرا نام ضائع مت کرو۔“ اور وہ جو میکے جانے کی اجازت طلب کرنے آئی تھی اسے لگا تھا دنیا میں شاید اس سے زیادہ مشکل کام کوئی اور ہے ہی نہیں پھر وہ یونہی چپ چاپ اٹھ گئی بغیر کچھ کہے اور رات میں صفدر کے آنے پر اس نے منہ سے جانے کی بات نکالی ہی نہیں۔ نہ اس سنگدل نے اس سے جھوٹے منہ دریافت کیا کہ اسے جانا بھی ہے نہیں۔

اور یہ دستور تو ہمارے ہی گھروں کا ہے شادی سے پہلے تک گھر میں آنے والی بہو اور بھابھی چاند کا ٹکرا لگتی ہے اور جب یہ چاند آنگن میں اتر آتا ہے تو سسرالیوں کے ناز بارو سے چاند کو ”گرہن“ لگا دیتے ہیں۔

پیروں کی دھول بنادیتی ہے ایسی حیثیت۔ جس عورت کو سب کی پسند کے بعد ”بہو“ بننے کی سند دی جاتی ہے اسے گھر میں تو جگہ مل جاتی ہے، ”دل“ میں کیوں جگہ نہیں دی جاتی؟ ہمارے معاشرے کا چلن اتنا برا کیوں ہے؟

کیا ہوا اگر گھر بڑے ہوں تو دل بھی وسیع کر کے آنے والے مہمان کو سچے دل سے خوش آمدید کہا جائے؟

یہ آسانی بھی ہر کسی کے نصیب میں کہیں؟ مشکلات بھری راہوں میں، سنگریزوں سے بھری گلیوں میں ننگے پیروں کا سفر کتنا ٹھن، کتنا صبر آزما ہوتا،

ہوتا ہے۔ کسی اور کے دکھوں کو کسی اور نے کاندھے پر اٹھایا ہے کبھی۔ تو وہ بھی چپ چاپ سارے دکھوں کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے تھی اسی خامشی اس سکوت سے جو اس کے اندر ”بے جرم“ کے اتر تھا۔



ہوٹل کے آرام وہ کمرے میں وہ سوچوں میں مگن تھا جب راہول نے ہلکے سے دروازے کو کھٹکھٹا کر اندر جھانکا۔

”ارے جگر! کن سوچوں میں ہو۔“ وہ راہول کو دیکھ کر اٹھنے لگا۔

”یار! وہ لڑکی میری آنکھوں سے نہیں اترتی۔“

”کون؟“

”وہی یونیورسٹی والی۔“

”اوہ!“ اس نے معنی خیزی سے لبوں کو سکوڑا۔ ”کیا کہانی ہے جگر! کوئی لو اسٹوری تو کری ایٹ نہیں ہو گئی؟“

”یس۔ آئی ایم فال ان لویار!“

”یہ بیماری تو سہ ماہی ہے۔“ وہ طنزیہ ہنسا تو مکیش نے تکیہ کھینچ مارا اور راہول قہقہہ لگا کر ہنسا۔

”اپنے دلش میں لڑکیوں کی کمی تھوڑی ہے۔“

”پر یار! بہت اٹریکٹو ہے بیان سے باہر۔“

”دشمن ملک کی لڑکی سے عشق و محبت بے کار

چیزیں ہیں۔ سرحدیں محبت کو پروان چڑھنے نہیں

دیتیں اور اہم بات وہ دھرم کی بھی نہیں موٹلی ہے۔“

”سو واٹ راہول! پاکستانیوں کی سوچ بدل گئی ہے۔“

یہاں کی کتنی ایکسٹریس ہیں جو وہاں جا کر اپنا دھرم بھلا

بیٹھتی ہیں۔ وہیں کے رنگ میں رنگی ہیں انہیں دیکھ کر

کوئی کہہ سکتا ہے یہ مسلمانوں کی ڈھکی چھپی عورتیں

ہیں۔ بس ایک دفعہ وہ کام کرنے کے حامی تو بھر لے پھر

دیکھنا میں انہولی کو کسے ہونی پتا ہوں۔“

وہ باتوں میں لگے تھے کہ فون بجنے لگا۔ آپریٹر نے

اسے بتایا کہ دیا نام کی لڑکی لائن پر ہے اگر وہ اجازت

دے تو وہ کل اس کے کمرے سے کنیکٹ کر دے اور

اس کی تو من چاہی مراد پوری ہونے کو تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کی مدد بھری آواز ماؤتھ پیس سے اس کی سماعتوں کی نذر ہوئی تھی اور اس نے راہول کو آنکھ مار کر ساری توجہ اس پر مرکوز کی تھی۔

”السلام علیکم مکیش کمار صاحب! میں دیا!“

”والسلام۔ نمسکار دیا جی! کہیے مزاج کیسے ہیں؟“

مکیش کی آواز میں ایک مخصوص جلت رنگ تھی اور دیا کا دل دھڑک اٹھا۔

”اچھ جولی میرے پیرٹس نے آپ کی آفر کو قبول

کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ ایم ریٹی ساری۔ میں

آپ کے ساتھ کسی بھی قسم کا کام نہیں کر سکتی۔“

”آپ نے پیرٹس کو کنوینس نہیں کیا ہو گا؟“

”اچھ جولی میں ایک کنزرویشنو فیملی سے بی لونگ

کرتی ہوں۔“

”اف ہر جگہ دین دھرم کی باتیں! مذہب کو ایک

جگہ اٹھا کر رکھ دیں تو ہم بہت آگے جاسکتے ہیں۔“

اس نے جال بٹا۔

”میں کچھ نہیں کر سکتی اب۔“

اس کے لہجے میں التجا تھی وہ پہلی نگاہ کا شکار ہوا تھا۔

اسے لگ رہا تھا ہر طرف گھپ اندھیرے میں ایک

ٹٹمٹایا ”دیا“ ہے جو اسے اپنی جانب مسلسل کھینچ رہا

ہے۔

”وہ نہیں مانیں گے۔“ اسے بابا کا قطعی لہجہ یاد آیا۔

”پھر بھی میں ایک کوشش تو کر سکتا ہوں۔“

پچھے ہی بابا آن کھڑے ہوئے۔ وہ گھبرا کر اللہ حافظ

کہتی کمرے کی جانب چل دی اور بابا فکروں میں

گھرے کتنی دیر تک فون کو تکتے رہے۔



گھر بھر میں ادھم بپا تھا۔ بات ہی ایسی ہوئی تھی انہولی۔

اس گھر میں جس کی ہر عورت کے پاس زیورات

کے ڈھیر تھے۔ ان ڈھروں سے لبا کے قیمتی سونے کے

زیورات کی صندوقچی چوری ہو گئی تھی۔ ”تپا کی

سلطنت میں وزیروں اور مشیروں کی عدالت بھی تھی اور جرم کی نامزدگی میں اسی کا قریہ نکل آیا تھا۔
مندوں کی بیٹیوں نے آگے بڑھ کر بیان داغے

تھے۔
”ان کے گھر سے تو ان کو اتنا زور ملا نہیں تھا۔ جب بھی ہمیں ”امی“ کے زیور پہنے دیکھتی تو بس دیکھتی رہ جاتی تھیں۔ ان ہی کو سب سے زیادہ جلن حسد ہم سے ہے کہ ہمہاموں کے ساتھ کیوں رہتے ہیں۔“
”ان کے بابا کو بھی تو گھانا ہوا ہے نا کاروبار میں سوچ رہی ہوں گی ایسے ہی پیچھے والوں کا پورا ڈال دوں۔“ بابا کو دانتوں سے چبایا تھا ڈائن سی لڑکی نے۔
”میں نے تو خود کمرے میں چوری چھپے داخل ہوتے دیکھا تھا امی کے۔“ یہ سب سے چھولی چیزیل تھی۔
وہ گھر ایک بھوت جنگلے کا منظر پیش کر رہا تھا۔
سب کی شکلیں بہت ناک تھیں اور آوازیں کرسمس اور چمکے پھٹکار زدہ۔ وہ جو وہ دن میکہ میں رک کے آتے کٹھ پتلیوں کو بھی بیگ سمیت اٹھا لائی تھی۔ کمرے کی تنہائی کو بانٹنے کے لیے بچپن سے یہ سکھی سا تھی تھے۔ میکے میں تھی تو بہن بھائی کے کرداروں میں تھے اور سسرال میں آئی تو سسرالی کریمٹروں میں ڈھلے سب دنیا کے بہترین انسان تھے۔ اور سب سے خوب صورت تو اس کا جیون سا تھی تھا۔
لہجے کے سفید سوٹ میں پگ باندھے صدر۔
گھر کے تنے تنے ماحول کو اس نے کوئی اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ وہ تو اپنی دنیا میں ہی گم تھی۔ اسے اچانک احساس ہوا تھا کہ وہ صدر سے محبت کرنے لگی ہے۔ باوجود یہ کہ وہ ایک برف کا آدمی تھا عورت کی قربت بھی جس کا کچھ بگاڑ نہ پائی تھی۔
بابا اسے آکر لے گئے تھے دو دن رہنے کے لیے اور صدر ان کے سامنے خود کو اچھا داماد ثابت کر رہا تھا۔
اس کی غیر موجودگی میں زیور کی صندوقچی اس کے کمرے میں کس طرح چھپائی گئی تھی اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو سکی تھی اور وہ جو واپس آئی تو ہر جگہ گہرا سکون تھا اور وہ سکوت کسی طوفان کا ہی تو پیش

وہ سنہری جھولے میں تھی۔ بلندی اور پستی کے درمیان۔ ابھی ابھی۔ سفید لباس میں سنہری جھولے کی پری۔ دروازے کے سامنے دو گاڑیاں آن۔
رکیں۔ ڈور نیل پر علی بخش چاچا نے گیٹ کھول کر دیکھا اور پولیس کی بوین کو دیکھ کر کم صم سے ہو گئے۔
مکیش کمار نے ہوٹل کی گاڑی سے اتر کر اپنا کارڈ دیا۔ علی بخش چاچا نے بغیر کچھ پوچھے اسے اندر آنے کا راستہ دے دیا۔ وہ تیز جھونٹا لیتے نگاہ کو مرکزی گیٹ پر جمائے ہوئے تھی اور مکیش کو یوں گھر کے لالہ میں کھڑے دیکھ کر وہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔
اور وہ اس سفید پری کو اتنے خوب صورت جھولے میں بیٹھا دیکھ کر خود اپنے ہوش و حواس کھونے لگا۔ دیا نے خود کو کمپوز کرتے جھولے سے اترنے میں عافیت جانی تھی۔ اسے یوں اچانک بغیر اطلاع کے دیکھ کر وہ خود بے ہوش ہونے کی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی اس کے روبرو آئی۔
”آ۔ آپ۔“
”نہستے!“ اس نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ کر ماتھے تک لے جا کر کہا۔ وہ ابھی تک گنگ اسے دیکھ رہی تھی۔
”آپ کے ہاں مہمانوں کو اندر بلائے کا چلن نہیں ہے کیا؟“

اس نے شرارت سے کہا۔ وہ بہت شرمندہ ہوئی۔ اسے ڈرامنگ روم میں لے گئی تھی۔ ماما بابا کسی کام سے گھر سے باہر تھے اور خوف کے مارے اس کے اندر اکھاڑ بچھاڑ ہونے لگی تھی۔

”اچھو ٹلی آج رات کی فلاٹ سے ہم انڈیا واپس جا رہے ہیں۔ میں نے سوچا ایک دفعہ آپ کے پیرس سے مل کر کنوینس کرنے کی کوشش کر لوں۔ میرا تو کام ہی نئے چہروں کو فیلڈ میں آگے لانا ہے۔ آپ کو دیکھا تو بس۔ پھر کچھ دکھائی نہ دیا۔“ اس کا لہجہ

گھبر تھل دیا کے ہاتھ لرزے لگے تھے۔

”لما پلا گھر پر نہیں ہیں اور آنے کا ٹائم بھی کنفرم نہیں۔ آپ نے فضول میں زحمت کی۔ وہ نہیں مانیں گے۔ پلیز ٹرائی ٹو ایڈر اسٹینڈی۔“

وہ التجا کرنے لگی۔ اور اس کا التجائی لہجہ اس کے دل میں اثر کر گیا۔

”گو کے۔ جلتے سے آپ کو دیکھنا تھا۔ سود کچھ لیا۔ آپ پریشان مت ہوں میں چلتا ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور وہ ٹھنڈے ہوتے جسم سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔ اسے یہ سمجھتا تھا کہ بعد میں ہونا تھا کہ کم از کم چائے کا تو پوچھ لیتی۔

مکیش کمار کو گورنمنٹ کی طرف سے پروٹوکول دیا گیا تھا۔ بھارتی وفد کا کوئی بھی رکن کہیں بھی جاتا۔ ایک خصوصی دستہ سیکورٹی کے لیے موجود ہوتا۔ اور اس کے جانے کے بعد اسے ایک کے بعد ایک خیالات آرہے تھے۔

”مکیش صاحب کو میرا ایڈریس کہاں سے ملا؟“

اس نے خود سے سوال کیا۔ یقیناً ”اس نے لینڈ لائن نمبر سے اس کا ایڈریس نکالوایا ہوگا۔ مکیش کمار کی اچانک آمد اسے اندر تک ہلا گئی تھی۔

اور ہلایا تو اس کو بابا کی خاموش نگاہوں نے بھی تھا۔ جب علی بخش چاہا تو انہیں مکیش کمار کی آمد کا بتایا تھا اور پولیس کی وین کا سن کر تو وہ چپ کے چپ رہ گئے تھے۔ حالانکہ وہ سیکورٹی کے لیے ساتھ آئی تھی۔

اسے مکیش کمار سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دلچسپی بس کلام کرنے اور مشہور ہونے سے تھی۔ رات کی فلائٹ سے مکیش کمار واپس چلا گیا تھا اور وہ رات بھر کو نہیں بدلتی رہی۔ اس کے اندر گہری عیش خاموشی اتری تھی۔

اس نے یونیورسٹی جانا شروع کر دیا روٹین کے مطابق۔ پھر تین دن ہی گزرے تھے اس کی چپ کو توڑنے کے لیے بابا لاماری گھونسنے کا پروگرام بن رہا ہے۔

تھے۔ بابا کے جگری دوست وہیں رہائش پذیر تھے۔ بابا کو اندازہ تھا کہ وہ کچھ اپ سیٹ ہے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ ایک فرماں بردار بیٹی ہے۔ وہ ہلکی پھلکی کپ شپ میں مشغول تھے کہ فون بیل بجنے لگی۔ دیا فون کے قریب تھی۔ سو وہ کال ریسیو کرنے چل دی تو اس نے سرسری سے نگاہ سی۔ اہل۔ آئی پر ڈالی تھی۔ بہت بڑا سا نمبر سی اہل آئی پر جگمگ کر رہا تھا۔ اسے کوڑکی پہچان نہیں تھی اس نے ریسیور اٹھا کر سلام کے بعد ہیلو کہا تھا۔

دوسری جانب وہی شیخ کھنکھتا ہوا لہجہ تھا۔ ”میں نے دعا کی تھی کہ کال دیا جی ریسیو کریں۔“ دیا کے کانوں میں زن زن کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ چپ کی چپ تھی پھر وہ دوبارہ گویا ہوا تھا۔

”ارے پہچانا نہیں کیا آپ نے؟ میں مکیش کمار۔“

وہ صرف جی کہہ سکی۔ وہ بہت پر اعتماد مرد تھا۔ فلمی دنیا کی چکا چوند میں گمن رہنے والا آدمی۔ دیا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیسے ہینڈل کرے۔

”ارے کچھ تو بولے! سمندروں کے پرے سے

جسٹ آپ کی آواز سننے کے لیے تو کال کی ہے میں نے۔“ اس نے رائنگ نمبر کہہ کر ریسیور کو اس طرح رکھا کہ دوبارہ کال آنے کی صورت میں اسے نمبر

انگیج ملتا۔ پھر یوں ہوا کہ وقفے وقفے سے مکیش کی کالز آنے لگیں اور وہ فون اٹھانے سے گھبرانے لگی۔

پھر ایک دن بابا کو کسی نمبر پر کال بیک کرنا تھی وہ سی۔

اہل آئی سے نمبر چیک کر رہے تھے۔ ان کی نگاہوں میں انڈیا کے کوڈ والا نمبر بھی آگیا تھا۔ انہوں نے ماما سے استفسار کیا تو انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کر دیا۔ دونوں کا ذہن مکیش کمار تک نہیں گیا تھا۔

پھر اس رات بابا ماما اپنے کمرے میں تھے جیسے ہی فون بجنے لگا۔ دیا نے ریسیور اٹھا لیا۔ بغیر نمبر پر نگاہ ڈالے عجلت میں کسی کام سے وہ فون کے نزدیک سے گزر رہی تھی۔ دوسری جانب ایکسٹینشن پر بابا بھی ریسیور کلن سے لگا چکے تھے۔ دیا کے ہیلو پر مکیش کمار بولا تھا۔

”دیا جی پلیز۔ میری بات تو سن لیں آخری بار!“
”جی کیسے۔“

”آئی ڈونٹ نو۔ میں۔ میں نہیں جانتا کہ یہ سب کیسے ہوا؟“

اس نے توقف کیا۔ دیا کے دانتوں میں پسینہ آنے کو تھا۔ اسے اندازہ تھا ایکسٹنشن سے ریسیور اٹھالیا گیا ہے۔ لائن میں شور آنے لگا تھا۔

”میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میرا بالکل دل کسی اور دیش کی لڑکی کے لیے چل جائے گا۔“ دیا کی سانس پھولنے لگی تھی۔ سینے میں دل تھا کہ ڈوبے ڈوبے جاتا تھا۔ وہ بغیر کچھ کے ریسیور رکھ کر کمرے میں بھاگ گئی تھی۔ اور بھلا بھاگ جانے سے بھی کبھی کچھ ٹھیک ہوا ہے؟

بابا ریسیور کان سے لگائے کھڑے تھے۔ ان کا رواں رواں کان بنا تھا۔ ان کے کمرے میں جلتی بدھم روشنیاں تاریکی میں ڈوبنے لگی تھیں۔ وہ سانس روکے کھڑے تھے اور یہی وہ سکوت تھا جو اس گھر کے تین مکینوں کے رگ و جان میں اترنے کو تھا۔ مکیش کو اندازہ نہ ہو سکا تھا کہ وہ ریسیور رکھ کر جا چکی ہے۔ اس نے ریسیور کریڈل پر نہیں رکھا تھا۔ مکیش اسی جذب میں بول رہا تھا۔

”دیا جی! مجھے آپ سے پہلی نگاہ میں محبت ہو گئی ہے۔ میں نہیں جانتا ایسا کیوں ہوا۔ بر جو ہوا اچھا ہوا۔ مانا کہ دیش جدا دھرم الگ پر محبت بھی کبھی سرحدوں کی محتاج ہوتی ہے بھلا۔ میں آپ کو حاصل کرنا چاہتا ہوں ہر قیمت پر بس ریکویسٹ تو یہ ہے کہ دل بے قرار کا مقدمہ آپ کی عدالت میں ہے جو چاہیں فیصلہ کریں۔“

وہ ایک سیکنڈ کور کا تھا۔ اس کی کہانی بس چند لمحات کی ہی تھی۔

”دیا جی! آپ بولتی کیوں نہیں؟“
ریسیور سے اٹھنے والی آواز دیا کی نہیں تھی۔ اور جس کی تھی اسے اس کا اندازہ نہیں تھا۔
”آپ جو کوئی بھی ہیں آپ کو آپ کے دھرم کا

واسطہ! میری معصوم بچی کو مت ورغلائیں۔ آپ کو یہاں آنے میں کچھ ٹائم لگے گا۔ اور مجھے چند گھنٹے لگیں گے یہاں سب کچھ ختم کرنے میں۔“

اور مکیش جو بے تکان بولتا تھا اور بے حد بولتا تھا۔ اسے آج اندازہ ہوا تھا۔ کبھی کبھی انسان کے پاس بولنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ خود بخود دیکھتے ہی دیکھتے سارے الفاظ مرجاتے ہیں۔ وہ بھی مرے ہوئے لفظوں کے قبرستان میں خالی خالی سا بیٹھا تھا اور اسے مرہ لفظوں کی بستی میں باقی زندگی بتانی تھی۔ اس کا چاند اس کی بستی میں اتر ہی کب تھا۔

اور یہ دو سرے دن کی صبح کا ذکر ہے۔
سورج نارنجی شعاعوں سمیت اس کی بستی میں اُترا تھا۔ سب سفر ختم تھے۔

ایک نیا سفر اس کی دہلیز کو پکڑے دروازے کو کھٹکھٹاتا تھا۔

وہ یونیورسٹی نہیں گئی تھی۔ بلایا نے اسے ایک لفظ بھی نہ کہا تھا۔ بروہ بے حد حساس تھی اور حساس لوگوں کو کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی کب ہوتی ہے۔ اسے اچھی طرح اندازہ تھا بابا نے مکیش کی ساری باتیں سن لی ہیں۔

بابا آفس کے لیے نکلے تھے۔ ماما لان میں بیٹھی اون کے گولوں میں ابھی سویٹر میں نیا ڈیزائن ڈال رہی تھیں۔ یہ ان کے فراغت کے کام تھے۔ وہ گاہے بگاہے ایک نگاہ اس پر بھی ڈال لیتی تھیں۔

وہ ملگجے سے گلابی کپڑوں میں بھی گلاب دکھتی تھی۔ سنہرے جھولے کی گلابی کڑیا۔

اس نے آنکھوں کو موند کر خود کو بلند کیا۔ پر اسے مرزا نہ آیا۔ وہ خود کو بے دلی سے ہوا کے سنگ کرتی رہی۔ ڈور نیل ہوئی۔ دو خواتین لان میں داخل ہو گئیں۔ اس کی نگاہ چادر اوڑھی عورت سے ٹکرانی بلندی سے پستی کی جانب آرکی۔

اور چادر والی عورت جسے سب ”آپا“ کے لقب سے

پکارتے ہیں۔ وہ دیا کو دیکھتی ہی رہ گئیں۔ اتنی خوب صورت کوئی لڑکی ان کی برادری میں تھی ہی نہیں۔ وہ جھولے سے اتر کر ان کو سلام کر کے اندر چلی گئی تھی۔ مگر آپا نے ان کی دہلیز پکڑ لی تھی۔

ماما بابا ایک نگاہ صغیر کو دیکھ آئے۔ صغیر ایک ہینڈ سم مرو تھا۔ شان دار گھر گاڑی، تعلیم اور سب چیزیں تو مد نظر رکھی جاتی ہیں رشتے طے کرتے ہوئے اندر سے جھانک کر دیو یوں کو کون دیکھتا ہے۔ اور بابا جو مکیش کمار سے اس حد تک خوف زدہ ہو گئے تھے کہ وہ ان کی بیٹی کو بہلا پھسلا کر اینٹیا نہ لے جائے۔ انہوں نے زیادہ تحقیقات کرنے کی جستجو بھی نہ کی اور سب کچھ تو بہترین تھا سوا انکار کیونکر ہوتا۔

اسے مکیش سے کوئی انسیت ہوئی نہیں تھی۔ جو صغیر سے منسوب ہونے پر کوئی دکھ ہوتا۔ دکھ تو بس خواہشوں کی موت کا تھا ایک شہرت کا ہی تو شوق تھا۔ کوئی گناہ کی خواہش نہیں کی تھی اس نے۔

مکیش کی آخری کل کے ہفتے بعد اس کی انگلی میں صغیر سے نسبت کی انگوٹھی آگئی اور اسے پابند کر دیا گیا کہ بس وہ اس مرد کو سوچے۔

بابا کی فکرات میں کچھ کمی آگئی۔ لینڈ لائن کا کنکشن صرف ایک سیٹ پر کر کے بابا کے کمرے تک محدود ہو گیا۔ بابا کے اس فعل سے اسے دکھ ہوا تھا۔ اسے خون پر ایسی بے اعتباری۔

مگر ان کے نزدیک وہ ایک چھوٹی سی احتیاط تھی۔ بابا اپنا دین خراب نہیں کرنا چاہتے تھے کسی بھی لاپرواہی سے۔ وہ مانتے تھے ان کی بیٹی بہت معصوم اور کم عمر ہے۔ مگر شیطان بیچ میں کود پڑے تو کوئی احتیاط بھی کام نہیں آتی۔ انہیں اپنی بیٹی کو شیطان کے بہکانے سے بچانا تھا۔

اور اس ”بچاؤ“ کو وہ ممکنات سے نہ بچا سکے تھے۔

مگنی کے چھوٹے سے فنکشن کے تیسرے ہی دن آپا اپنی چار عدد بیٹیوں کے ساتھ وہاں موجود تھیں۔

ان کی بیٹیاں نخوت سے اس کی چھوٹی سی جنت کو ترچھی نگاہوں سے ملاحظہ فرما رہی تھیں۔ دیا کو ماما نے کپڑے تبدیل کر کے آنے کو کہا تھا۔ اور جب وہ آئی تو آپا اس کے آگے بچھ بچھ گئی تھیں۔ اسے اپنے پہلو میں بیٹھنے کی جگہ دی گئی۔ وہ سلام کر کے خاموشی سے ان ”شہد سے میٹھی“ عورتوں کے درمیان بیٹھ گئی تھی۔ اسی اثنا میں بابا بھی کمرے میں آگئے تھے۔ کچھ دیر رسی بات چیت کے بعد آپا اپنے مددے پر آگئی تھیں۔

”بھائی صاحب میں آج تاریخ لینے آئی ہوں شادی کی۔“

دیا نے انگلیوں میں انگلیاں پھنسی تھیں۔ دل کہیں بہت اندر ڈوب گیا تھا۔ بابا اور ماما خود سنانے میں آگئے تھے۔

”پر بس! آپ سے بات تو یہ طے ہوئی تھی دیا کے فاسٹل سمسٹر کے بعد ہی شادی ہوگی اور آج تو مگنی کو ہی تیسرا چوتھا دن ہوا ہے اتنی جلدی شادی تو ناممکن ہے۔“ وہ پہلو بدل کر نرم لہجے میں بولے تھے۔ بیچ میں آپا کی سب سے بڑی بیٹی بول پڑی۔

”نکل! پیسہ ہونا چاہیے بس! شادی تو دو دن میں بھی ہو سکتی ہے۔ میری شادی ایک ہفتے کے اندر ہوئی تھی۔ میرے سرال والوں نے بس ایک ہفتے کا نوٹس دیا تھا۔“

”بیٹے! آپ کی بات درست ہے۔ پر مسئلہ تو پڑھائی کا ہے۔“

”ارے چھوڑیں انکل! ماموں نے کون سی ان سے نوکری کروائی ہے۔“

”بیٹے! بات نوکری کی تو نہیں ہوتی۔ ہم یہ سوچ کر تو اپنی بیٹی کو تعلیم نہیں دلا رہے۔“ ماما کالجہ بھی سمجھاتا ہوا تھا۔ آپا کی بیٹی منہ بنا کر بیٹھ گئی۔

”بھائی صاحب! بات یہ ہے کہ میرے والدین صغیر کو باج سال کی عمر میں چھوڑ کر ایک سیلنٹ میں فوت ہو گئے تھے۔ میری شادی جب ہی ہوئی تھی بہت بڑا کاروبار تھا۔ زمینیں تھیں۔ میں نے ہی سب کچھ

دیکھا۔ میں بن کر یتیم بھائی کو پالا۔ اس کو بڑا ہو گیا ہے تو سب ہی کچھ اس کا ہے۔ میں تو بس نگران تھی۔ میرا حصہ تو شادی کے وقت ہی مجھے دے دیا گیا تھا۔ میں نے بھائی کو پڑھایا لکھایا کسی قاتل بنایا۔ اب شادی کر کے اپنی ذمہ داری سے نبھانا چاہتی ہوں جلد از جلد۔ زندگی موت کا کیا بھروسہ۔ بچیاں چھوٹی تھیں تو شوہر داغ مفارقت دے گئے۔ مینا اللہ نے دیا نہیں۔ دل میں اس قدر ارباب ہیں کہ جلد از جلد بھائی کے سر پر سہرا سجاؤں۔ بچیوں کو بھی ماموں کی شادی کے چاؤ چوٹیلے ہیں۔ اور آج جو ہم تاریخ لینے آئے ہیں وہ صفدر کی خواہش پر آئے ہیں۔ وہ شادی کر کے کوئی نئے بزنس کا سیٹ اپ لگائے گا۔ رہا مسئلہ پڑھائی کا صفدر چاہے گا تو بعد میں پڑھ لے گی دیا۔ بلکہ میں اسے کہوں گی اس کے تمام شوق پورے کرے۔ آپ بے فکر رہیں۔ یہ سمجھیں بچی ایک گھر سے دوسرے گھر میں جا رہی ہے۔ اور اب آپ تاریخ دے دیں۔

”ہم آپ کو مشورہ کر کے جواب دیں گے۔ ہماری اکلوتی بیٹی ہے اب یوں ہی تو اٹھا کر رخصت نہیں کر سکتے نا!“

ماما نے کہا تو وہ خوشامدانہ لہجے میں کہنے لگی تھیں۔
”ارے آپ لوگ جینز کے تکلفات میں قطعی مت پڑیے گا۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے ہمارے گھر میں۔ بس اس چاند کو ہمارے آنگن میں اتار دیں آپ کا احسان ہو گا۔“

ماما ان سے معذرت کرتی اٹھیں۔ بازار سے کئی طرح کے کھانے منگوا کر انہیں رات کا کھانا کھلا کر بھیجا۔

اور اسی رات بابا نے ماما کو مشورہ دیا۔
”شادی تو ہمیں سال بعد بھی کرنی تھی۔ اسی ماہ ہی سہی اور تم تو جانتی ہی ہو مجھے کتنی فکر رہنے لگی ہے دیا کی۔ جب سے اس ہندو نے اس کا پیچھا لیا ہے۔ وہ تو انسان کا بچہ تھا جو میرے سمجھانے پر دوبارہ کل نہیں کی اس نے۔ مگر میری تمام فکریں تب ہی دور ہوں گی جب میں بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں گا۔“

اور ملالان کی بابت سن کر ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگی تھیں۔ ان کے پاس اس کے علاوہ تھا ہی کیا۔ وہ فرماں بردار بیوی تھیں اور اس سارے کھیل تماشے میں دیا خاموش تماشا بنی تھی۔ اسے کٹھ پتلیاں بہت پسند تھیں۔ اور وہ اپنے ماں باپ کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی تھی۔



اور پھر وہی تاریخ آگئی۔ پچھلے مہینے کی اسی تاریخ کو اس نے ایک اسٹیج پر سجا بھائی تھی۔ ڈریوں سے بندھی کٹھ پتلیاں مختلف ہاتھوں میں تھما کر ایک ڈراما پیش کیا تھا ”کٹھ پتلی“

تھیک اسی تاریخ کو اس کی شادی طے ہوئی تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ یوں ہاتھوں سے وقت بھی پھسل سکتا ہے۔ جیسے ساحل پر کھڑے شخص کے پیروں تلے سیکنڈز میں ریت پھسل جاتی ہے یوں ہی بس چند لمحوں میں سب کچھ بدل جاتا ہے۔ اور اس کی زندگی میں کم و بیش سب کچھ بدل گیا تھا۔ دیا سے دیا صفدر تک کہ سفر میں چند لمحے ہی تو لگے تھے۔



صفدر نفسیاتی طور پر — ایک ایسا شخص تھا۔ جس کی ساری ڈوریں اس کی بڑی بہن کے ہاتھوں میں تھیں۔ اس نے ہوش سنبھالا تو خود کو آپا کے ساتھ پایا۔ آپا کے تلے اوپر کی بیٹیاں اس کے چند سال ہی چھوٹی تھیں۔ صفدر ان ماں بیٹیوں کے لیے بے حد اہم مرد تھا۔ جس کی دو وجوہات تھیں۔ اول اس گھر میں کوئی اور مرد سراسر موجود نہیں تھا۔ آپا کے شوہر بہت جلد ہی دنیا چھوڑ گئے تھے۔ دوم آپا کے پاس اپنا کچھ بھی باقی نہ تھا۔ وہ اپنا سب سرمایہ خرچ کر کے گن گال ہو چکی تھیں۔ سب زمین و جائیداد صفدر کی تھیں۔ یوں صفدر سے گہری وابستگی کی دوسری اہم وجہ صفدر کی دولت تھی۔ اور بیوی بچے ہونے کی صورت میں انہیں دیوار سے جالگنے کا ڈر تھا۔ اولاد کے بعد کوئی بھائی بہن اہم نہیں رہتا یہ دنیا کا دستور بہت پرانا ہے۔ سو یہی وہ نقطہ تھا۔

جہاں سے انہوں نے صفدر کی نفسیات پر گرفت مضبوط رکھی تھی۔ یہ بات تو انہیں معلوم تھی کہ اگر وہ صفدر کی مندر پسند دہن لے آئیں گی تو بھائی سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

صفدر کی تھوڑی سی دلچسپی زرینہ خالہ کی بیٹی میں تھی۔ آپا کو اندازہ تھا۔ ذرا سی انسیت ان کی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے سو چند ہفتوں میں انہوں نے ایسی لڑکی کو ڈھونڈ لی جو کہ بیوی تو بھائی کی ہو پر زر خرید غلام ان کی ہو۔ آپا بالکل نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی بھانج اس گھر میں قدم جمائے۔ ویسے تو بھائی کی فرماں برداری پر بڑا ناز تھا۔ اور انہیں اپنی صلاحیتوں پر بھی بڑا فخر تھا۔ انہوں نے اس کی تربیت کی ہی اس انداز سے تھی کہ وہ کبھی ان کے سامنے سر نہ اٹھا سکے۔ بس وہ صفدر کی برین واشنگ میں لگی رہیں۔

وہ انہیں بہت زیادہ چالاک نہیں لگی تھی جیسے کہ عمو بھلا کیوں ہوتی ہیں۔

انہیں زرینہ خالہ کی بیٹی پسند نہیں تھی اور ان کے خیال میں وہ صفدر کی بیوی بننے کے قابل نہیں تھی۔ کیونکہ وہ بہت بولڈ تھی۔ دیا سے جلد از جلد صفدر کی شادی کرا کر آپا نے زرینہ خالہ کی بیٹی کا قصہ تو مکا دیا۔ دوسری طرف صفدر نے پہلی رات ہی اسے بری طرح نظر انداز کیا تھا۔ وہ پیا چاہی سا گن نہیں بن پائی تھی۔ اس نے ساری رات آپا کے احسان کا راگ الاپا تھا۔



ولیمہ کے دوسرے دن کھانے پر سب جمع ہوئے تھے۔ دیا اپنے والدین کی طرف ملنے گئی ہوئی تھی۔ صفدر نے سالن کا ڈونگہ آپا کو بڑھاتے کہا تھا۔

”آپا! آپ کی پسند کی داود بخی چاہیے ویسے لڑکی خوب صورت ڈھونڈی ہے آپ نے۔“

آپا جو پلیٹ میں سالن نکال رہی تھیں۔ اپنی منجھلی بیٹی کو بلاوجہ سخت ست ستانے لگیں۔ انہیں اچھے

بھلے سالن میں کیزے نظر آنے لگے تھے۔ صفدر کی

بات انہیں تھری طرح لگی تھی۔ سب خاموش ہو کر کھانے لگے۔ آپا زہر مار دالے انداز میں دوپے کھا کر صفدر کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”تم ہی مرے جارہے تھے زرینہ خالہ کی بیٹی کے لیے۔ دیکھ لیا تا میرا انتخاب۔ پر ایک بات میرے بھائی! کان کھول کر سن لو۔ پیر کی جوتی ہوتی ہے عورت۔ سر پر بٹھایا نہیں جاتا اسے۔ بیوی کے ارد گرد لٹو کی طرح جو مرد شروع میں گھوم جائے تو عورت ساری عمر لٹو کی طرح ہی گھمائی ہے پھر۔ ہم زمینوں کے مالکوں کو زیب نہیں دیتا کہ عورت کی تعریف کر کے اس کے دماغ کو آسمانوں پر چڑھائیں۔ ہر چیز جگہ پر ہی اچھی لگتی ہے۔ اور عورت کی جگہ مرد کے پیر ہوتے ہیں اس کا دل نہیں۔ اللہ بخشنے ابا جی کو اماں کو وہ گالیاں دیتے داخل ہوتے تھے کہ لوگ انگلیاں کانوں میں ڈال لیتے تھے۔ اماں ان کے آگے پیچھے لٹو کی طرح گھوما کرتی تھیں۔ اور اپنے بہنوئی کی مثال لو تمہارے ہوش میں ہی تو انتقال ہوا ہے نا۔ اپنے مرد ہونے کا وہ غرور وہ شہنا تھا کہ میری تو بولتی بندر ہتی تھی۔ اتنا روپیہ پیسہ جینز میں لے کر آئی پر مجال جو مجازی خدا کے سامنے آف بھی کی ہو۔ شکل میں بھی ان سے کہیں خوب صورت پر بھی جوان کانوں نے دوپول تو تعریف کے سنے ہوں۔ اور تم خاندانی روایتوں کو بھول کر صرف دودن میں یوں سب کے سامنے دھڑلے سے اس کے حسن کے گیت گارہے ہو؟“

اور صفدر اپنا سامنہ لے کر کھانے میں مصروف ہو گیا۔ آپا کے لینگچر کے جواب میں بس ایک کھیالی سی ہنسی ہنسا تھا۔ اور کالی دیر تک اپنے ”فعل“ پر نادم ہوتا رہا تھا۔ آپا کا وفادار۔

اور پھر آئندہ دنوں میں اس نے کبھی یہ غلطی دہرائی نہیں۔ وہ آپا کو خوش رکھنا چاہتا تھا اور آپا کی خوشی اسی میں تھی۔ وقت بے وقت بیوی کو بے تکان سنائے۔ بیوی کو پیر کی جوتی بنا کر رکھے۔ دیا کے لیے شہد بھری باتیں بس جب تک ہی تھیں جب وہ میکے میں تھی۔

شادی کے دوسرے دن جب اس نے بڑھائی جاری رکھنے کی بات کی تو صفدر نے دو ٹوک انکار کر کے کہا تھا کہ سارا دھیان گھر میں لگاؤ۔ یہ وعدہ بھی جھوٹا ثابت ہوا کہ اس کو شادی کے بعد مزید پڑھنے کی اجازت دی جائے گی۔

دیا کو آپا کا دو غلا رویہ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ شادی سے پہلے کیا تھیں اور شادی کے بعد وہ وہی روایتی مند نظائیں جو بھابھوں کو دنیا کی حقیر مخلوق سمجھ کر بھائی کی شراکت دار سمجھتی ہیں۔ انہیں تو چاہیے تھا بھائی کو کنوارہ ہی رکھتیں۔ بھائی تو ان کی اولاد کو اپنی اولاد سمجھتا تھا تو اسے بیوی یا ”فیملی“ کی حاجت کیا ہوتی۔

بعض دفعہ تو دیا کو لگتا تھا کہ وہ اس میں تھوڑی سے دلچسپی ظاہر کر لیتا ہے۔ پر دوسرے ہی دن وہ مٹی کی مورت سا ساکن ہو جاتا۔ ہر احساس سے عاری۔ پھر چند مہینوں میں وہ دیا سے بے زار سا رہنے لگا۔ صفدر کو لگتا کہ گھر میں ہونے والی چیقلش کی تمام وجوہات کی وجہ دیا ہے۔ سورنہ دیا کی آمد سے پہلے کم از کم گھر میں بہت سکون تھا۔

آپا کو اس سے بیروں بھی کچھ زیادہ تھا کہ ان کی توقع کے مطابق چیز نہیں لائی تھی۔ لانے یا نہ لانے سے کیا فرق پڑتا ہے سب کچھ تھا تو اسی کا نا! پر موٹی عقل کے لوگوں کا کیا کیا جائے۔

اصل میں بات یہ تھی کہ وہ صفدر کی شادی کے لیے صرف یوں راضی ہوئی تھیں کہ خاندان بھر کے لوگ انہیں یہی طعنے دیتے تھے کہ صفدر کی عمر شادی کی ہو چکی ہے اور وہ اس کی شادی نہیں کرنا چاہتیں کہ ”کماؤ“ لڑکا اور کروڑوں کی جائیداد ہاتھوں سے نہ نکل جائے۔ سو ان طعنوں سے بچنے کے لیے صفدر کی شادی ناگزیر تھی، پر اسکیم یہی تھی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

دیا صفدر کی من چاہی نہیں تھی۔ اور آپا چاہتی تھیں کہ وہ دل سے آتر جائے صفدر کے۔ اپنے منصوبے پر ابتدا سے ہی کام کرنا شروع کر دیا تھا انہوں نے اور یوں رفتہ رفتہ صفدر نے اسے مکمل طور پر مسترد

کر دیا۔

وہ زرینہ خالہ کی چلبلی بیٹی کو بھول نہیں پایا تھا۔ وہ لڑکی سب سے چھپ چھپا کر صفدر سے رابطے میں رہنے لگی تھی۔

آپا اس کو انجام تک پہنچاتے پہنچاتے کچھ ہی دنوں میں خود ہی انجام کو پہنچنے والی تھیں۔ انہیں یہ خبر نہیں تھی کہ ان کے کچے کانوں کے بھائی کی برین واشنگ کوئی اور بھی کرنے لگے گا۔



اسے جس دن یہ احساس ہوا کہ وہ صفدر کو چاہنے لگی ہے تو اسے لگاؤ کسی دن بخ میں نہیں رہ رہی اس کی تشنگی ایسے ہی ختم ہو گئی جیسے ریگستان میں کوئی شفاف پانی کا چشمہ دیکھ لے اور پیاس بجھالے۔

وہ صفدر کا وارڈ روب کھول کر کھڑی ہو جاتی۔ اس کے کپڑوں کو چہرے سے قریب کر کے اس کی خوشبو کو اپنے اندر اتارتی۔ اسے یہ کرنے میں مزا آتا۔ پھر وہ اس کے ہر لباس کو سونگھتی اور مسکراتی۔

”اف میرے اللہ! یہ ہے وہ محبت جس کے بارے میں میں لکھا کرتی تھی۔“ وہ خود سے سوال کرتی اور خود ہی مسکرا دیتی۔ پھر وہ وارڈ روب بند کر کے آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوتی۔ ڈرائنگ ٹیبل پر سجے سارے قیمتی پر فیومز اٹھا اٹھا کر اپنے کپڑوں پر اسپرے کرنے لگتی۔

”یہ ہوتی ہے نا محبت؟“ وہ آئینے میں دیکھنے والے اپنے عکس سے سوال کرنے لگی۔

اور آئینے کی دیا مسکراتی۔ ”ہاں یہی ہے“

”میں اپنے آپ کو صفدر کی پسند میں ڈھال لوں گی۔“ وہ بیڈ پر جا بیٹھی۔ اسے لگا جیسے سارے رنگ جو وقفے وقفے سے مر گئے تھے ایک ہی دم زندہ ہو کر اس کے اطراف میں زندہ ہو کر بکھر گئے۔

اور یہ سب محبت کی معراج تھی۔

محبت ہوتی ہی اتنی خوب صوت شے ہے۔ کسی سے ہو تو جائے بس۔ پھر کیا ہے؟ ہر طرف زندگی اور جئے جانے کا مزا چاہے حالات کیسے بھی ہوں۔

وہ مسکرائی اور اس کی آنکھ کے نیچے بھوری بنا۔
سائیڈ ٹیبل پر ایک فائل رکھی ہوئی تھی۔ صفدر
کے اہم کاغذ تھے۔ وہ فائل اٹھا کر دیکھنے لگی۔ آفیشل
ڈاکومنٹس کے سب سے اوپر ایک خالی صفحہ رکھا تھا ایئر
پیڈ سے نکالا ایک خالی صفحہ اس نے مسکراتے ہونٹوں
سے مین نکالا اور اس پر لکھنا شروع کر دیا۔

مڑتی ہوئی کلیاں چھوڑی ہیں
کھلتی ہوئی کلیاں چھوڑی ہیں
جھولے کی وہ مکھیاں چھوڑی ہیں

ہر طاق میں گڑیاں چھوڑی ہیں
جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے
مت پوچھ کہ کیا کیا چھوڑا ہے

وہ جب دو دن کے لیے اپنے والدین کے ہاں رہے
گئی تو آپا کے داماد نے انکشاف کہ صفدر ماموں نے
پوش علاقے میں ایک فلیٹ خریدا ہے۔ وہ آپا کے داماد
کے دوست کے کسی جاننے والا کا فلیٹ تھا۔ آپا کے تو
آگ ہی لگ گئی۔ صفدر نے چھپا کر کس کے لیے
خریدا۔ ساری ماں بیٹیاں خالوں کے گھوڑے دوڑانے
لگیں۔ یہی وجہ سمجھ میں آئی کہ صفدر بیوی کو لے کر
علیحدہ ہونا چاہتا ہے۔ آپا ڈائریکٹ صفدر سے نہیں پوچھ
سکتی تھیں سو بس اس ”پھانس“ کو گھر سے نکالنے کا
سوچ لیا۔

اور تب ہی زیور کے ڈبے والا واقعہ وقوع پذیر ہوا۔
طے شدہ کھیل۔



اور دو دن میں جو اس کی زندگی بدلی تو واقعی اس کی
زندگی بدل گئی۔

اور وہ جو دن بھر سفید لٹھے کے سوٹ میں ملبوس
”صفدر“ کو سامنے بٹھائے محبت کی ساری داستانیں
سناتی رہتی ہے۔

”رات میں صفدر آئیں گے تو میں کاسہ دل لیے
ان کے روبرو جاؤں گی اور محبت کے چند سکے جو کاسہ

دل میں اچھال دیں گے تو وہ میں کسی درگاہ کے مجاور کی
طرح بس ان کی باندی بن جاؤں گی میں کہوں گی صفدر
آپ مجھے پیروں کی جوتی بچھتے ہیں نا۔ تو بس اسی جوتی
کی دھول ہی بننا ہے مجھے۔ اپنے پیروں سے لپٹا رہنے
دیں۔ آپ مجھے نہیں چاہتے بھلے نہ چاہیں بس
میرے پاس آکر بیٹھ جایا کریں۔

”ف میرے اللہ میں نے کبھی سوچا تھا کہ میں کسی
کو دل کی شدتوں سے اس طرح اچانک چاہنے لگوں
گی؟“

اور محبت دروازہ کو کھٹکٹا کر تو کبھی بھی نہیں آتی۔
یہ تو بدروحوں کی طرح بس گھستی چلی جاتی ہے یو کسی
تکسی دن۔ کسی پہرے۔ سو اس کے ساتھ بھی یہی ماجرا
ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہر ماجرا ہی جدا ہوا تھا۔



”غنی لاڈلی بیوی کی حرکت دیکھ لی تم نے؟“ آپا نے
کڑے تیوروں سے گھورتے دبے دبے لہجے میں اس
سے پوچھا۔

”کیسی حرکت؟“ وہ استعجابیہ انداز میں پوچھنے لگا۔

”زیور کا ڈبا غائب ہے میرا۔ چھوٹی بتا رہی تھی۔ اس
نے تمہاری بیگم کو دبے پایوں میرے کمرے میں داخل
ہوتے دیکھا تھا۔ کان کھول کر سن لو! پولیس میں
رپورٹ کروادوں گی اگر تم نے ایکشن نہ لیا تو۔“

”میں پوچھ لیتا ہوں جا کر۔“ اس کے اندر ابل اٹھا
دیا تھا آپا نے۔

”ارے پوچھنے پر کون سا بتا دے گی وہ جا کر تلاشی لو
کمرے میں۔“ ساری لڑکیاں آنکھوں ہی آنکھوں
میں طنزیہ مسکراہٹ بھر کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگی
تھیں۔

وہ دن بھر کابزنس کی الجھنوں میں پھنسا گھر آیا تو
یہاں سکون ناپید تھا۔ اس نے وہی سنا جو آپا نے بتایا اور
وہی دیکھا جو بھانجیوں نے دکھایا۔

وہ تن فن کرتا کمرے میں جا پہنچا۔ صفدر کو دیکھ کر
مسکرائی۔ وہ بغیر جوابی مسکراہٹ دیے کمرے کی

چیزوں کو الٹ پلٹ کرنے لگا۔ صفدر کو دیکھ کر جتنے
بے اس کی آنکھوں میں جھلملائے تھے ایک دم بجھ
گئے۔ وہ اس کے تیروں سے گھبرانے لگی۔ اس نے
وارڈروب سے سارے کپڑے کھینچ ریڈ پر پھینک
دے۔ شوژ کیبنٹ کھول کر اس کی ساری سینڈل ڈھیر
کر ماریا۔ اور تب ہی ایک کونے میں سے ایک ڈبا ہاتھ
میں لیے اس کے سامنے آن رکھا۔

”یہ کیا ہے؟“

”پتا نہیں۔“

اس نے پوری قوت سے اس کے منہ پر ایک تھپڑ
جڑو یا سوہ بیڈ پر جاگری۔
محبت کے سارے فلسفے انسانی شکل میں بیڈ کے
اطراف آن کھڑے ہوئے۔

”صفدر! میں گے تو میں کاسہ دل لیے ان کے روہرو
جاؤں گی وہ چند سکے۔“

اس کو لگا تھا صفدر نے مٹھی بھر سکے اس کے
اوندھے منہ پر اچھالے ہوں۔

وہ سکے نہیں تھے بلکہ زیورات کا ڈبا تھا کھلتے زیور
اس کے اطراف بڑے تھے۔ وہ جرم سے بے خبر
ہو نقوں کی طرح اٹھ کر اسے حیرانی سے تنکے لگی۔
بکھرے ہوئے زیور اور فلسفہ محبت دونوں تالیاں مار مار
کر اس پر ہنسنے لگے تھے۔

”کیا کیا ہے میں نے؟“ اس نے لاچاری سے

پوچھا۔

”تیرا باپ اٹھا کر لایا ہے ان زیورات کو آپا کے
کمرے سے۔“

وہ اس حد تک بد تمیز تھا۔ اسے آج انکشاف ہوا
تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی اسے کبھی زیورات
کو تک رہی تھی۔

”آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”بکو اس بند کر بیچ عورت! کبھی دیکھے بھی ہیں اتنے
زیورات۔ تیری اوقات تھی کچھ چھوٹے سے
ڈربے نما گھر سے اس محل میں اٹھالائے ہم۔“
اسے لگا جیسے اب سب کچھ ختم ہونے کو ہے تو اسے

بھی چپ نہیں رہنا چاہیے۔

”یہ ساری آگ اس عورت کی لگائی ہوئی ہے جو
”آپا“ نام کا نقاب لگائے بیٹھی ہے آپ کی بد تمذیب
بھانجیوں کی۔“

اس کے منہ سے محض یہی سن کر اس کے سارے
حواس جواب دے گئے۔ وہ پاگلوں کی طرح آگے بڑھا،
اور اسے لاتوں گھونسوں سے پیٹنے لگا۔

”تیری یہ مجال۔ تیرے جیسی گری ہوئی چور
عورت میری ماں بہنوں کو گالیاں بکے۔“ اس نے
اسے قمیص سے پکڑ کر کھینچا تھا اور ایک آواز کے ساتھ
قمیص گریبان سے الگ ہو کر شانے پر جھولنے لگی
تھی۔

وہ آواز سے رونے لگی تھی۔

”صفدر! میں نے کیا سوچا تھا۔ آپ نے کیا کر دیا۔“
”تو نے سوچا ہو گا کہ اس چوری میں میں بھی تیرا
ساتھ دوں گا۔“

”آپ کا گھر کبھی بھی نہیں نے گا جب تک یہ
عورتیں آپ کی زندگی سے نہیں نکلیں گی۔“
”وہ کیوں نکلیں گی تو نکلتے گی۔ ابھی اور اسی وقت۔
جانکل جا میرے گھر سے۔“ وہ سیدھا ہوا تو وہ پتھرائی
ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

”نفرت ہے مجھے تجھ سے۔ تو زبردستی میرے سر پر
مسلط کی گئی۔ جا میں تجھے آزاد کرتا ہوں۔“

وہ تیر کی طرح اٹھی اور اس کے لبوں پر ہاتھ رکھنے
لگی۔ اس نے پھر دھتکار دیا۔ دھکا دے دیا اسے۔

”نہیں صفدر! پلیز نہیں۔“ وہ پیروں میں جا بیٹھی،
مگر اس پر مطلق اثر نہ ہوا۔

”روز روز کی چی چی سے تنگ آ گیا ہوں میں۔ جا
تجھے طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا
ہوں۔“

وہ اسے لاتوں سے روندنا کمرے سے نکل گیا۔

”میں کسی درگاہ کے مجاور کی طرح بس ان کی باندی
بن جاؤں گی۔ میں کہوں گی صفدر! آپ مجھے پیروں کی
جوتی سمجھتے ہیں نا۔ مجھے اپنے پیروں کی دھول ہی رہنے

کرن

ماہنامہ

مارچ 2015 کا شمار "سالگرہ نمبر" شائع ہو گیا

✽ "بھر سالگرہ کی زیت آئی" کرن کی سالگرہ کے موقع پر

قائمن سے دلچسپ سروے

✽ اداکار "یاسر شورو" سے شامین رشید کی ملاقات

✽ اداکار "عشاء آغا" کہتی ہیں "میری بی بی سنئے"

✽ "آواز کی دنیا سے" اس ماہ مہمان ہیں "علینہ جادھری"

✽ اس ماہ "ندا حسنین" کے "مقابلہ ہے آنیہ"

✽ "آگ ساگر ہے زندگی" نقیبہ سعید کا سلسلے وار ناول

✽ "ردائے وفا" فرحین اظفر کا سلسلے وار ناول

✽ "میں گمان نہیں یقین ہوں" کرن کی سالگرہ کے موقع پر

پرنیلا ابرار کی تحریر

✽ "دل تینوں میں بیٹھے" درشن بلال کا مکمل ناول

✽ "میری جستجو کا صلہ ہے یہ" ایشا کرن کا مکمل ناول

✽ "خالا، سالا اور اوپر والا" فاخرہ گل کی دلچسپ مزاحیہ تحریر

✽ "میری تکمیل تم سے ہے" ناراجہ اختر کا ناول

✽ "میری غفلتوں کو خبر نہیں" شبانہ شوکت کا ناول

✽ فوزیہ یاسمین، سعدیہ عزیز آفریدی، اُم شامہ، میرا غزل اور ندا حسنین

کے افسانے اور مستقل سلسلے

ان شمارے کے ساتھ کرن کتاب

کرن کتاب

"بہار کے رنگ"

کرن کے ہر شمارے کے ساتھ طبع و طبعیت کی خدمت پیش خدمت ہے۔

دیں۔

کوئی آواز سے ہنساتھا۔

اس نے کئی دفعہ لکھا تھا زمین کی گردش رک جاتی

ہے۔

اور آج اس نے زمین کی گردش کو رکے دیکھا تھا۔

طوفان کے بعد آنے والا سکوت ہر جگہ پھیلا تھا۔

"میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا مالک! کیا میرا گناہ اتنا بڑا

تھا؟" وہ گھٹنوں میں سر دیے روتی رہی۔ کوئی اس کی داد

رسی کو نہیں آیا۔

اور زخموں کو کسی مرہم کی ضرورت رہی کب تھی۔

یہ تو وہ پھوڑے تھے جن سے تمام عمر دکھوں، پچھتاؤں

اور سوالوں کے مواد کو بہنا تھا۔ ایسے پھوڑوں کو کوئی

مرہم آرام پہنچا سکتا ہے بھلا؟

✽ ✽ ✽

کئی گھنٹے بیت گئے اور رات بھی بہت گہری ہو گئی تو

اسے خیال آیا کہ ان درود یوار سے اب اس کا کوئی رشتہ

نہیں۔ مادی چیزیں بھی نا محرم دکھنے لگیں۔ وہ ہمت

کر کے انھی چادر سے اپنے جسم کو ڈھانپ کر اس قدر

پھیلاوے میں سیل فون ڈھونڈنے لگی۔ اس مار دھاڑ

میں سیل فون پتا نہیں کہاں گم ہو گیا اور اس کی اتنی

ہمت نہیں ہوئی کہ وہ باہر جا کر لینڈ لائن سے اپنے گھر پر

کال کر دے۔ ساری رات وہ گھڑی کی ٹک ٹک سنتی

رہنی سو قفے قفے سے سسکیوں سے کمر اگوں بننے لگتا

تھا۔ ساری رات اس نے یوں ہی گزار دی صبح وہ چادر کو

اچھی طرح جسم پر لپیٹ کر ایک الوداعی نگاہ کرے پر

ڈالتی نکل گئی۔ جاتے وقت بس کچھ پتلیوں سے بھرا بیگ

اٹھایا تھا اس نے۔

اس کا دماغ اتنا یک چکا۔ تھا کہ حال سے بے حال

ہو گئی۔ ماضی اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا۔

کہیں دور سے دادی ماں کی آواز کانوں میں گونج کی

طرح داخل ہوئی۔

"بچیوں کو یہ شوق ابھی سے پڑ گئے تو زندگی بھر یہ

مور تیں ان کا پیچھا نہیں چھوڑیں گی۔"

”حکایت کا فن بس اللہ کے لیے ہے۔ جان ڈالنی پڑے گی ان سورتوں میں۔“
وہ دونوں ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کر کے دھیرے سے بولی۔ ”داوی ہاں۔“ آوازوں کے تلاطم میں خود اسی کی آوازیں گونجنے لگیں۔
”آج صندھ آئیں گے تو میں انہیں بتاؤں گی میں انہیں کتنا۔“

آوازیں رک گئیں اور اسے پھر دھیر سارا رونا آیا۔
کاندھے پر لگے کٹھ پتلیوں کے بیک کا وزن اچانک بڑھ گیا۔ وہ چلتے چلتے گول گھومتی سڑک کے کنارے لگے نیم کے درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ ہر طرف اوس پڑی تھی۔ وہ ہی اوس اس کے اندر کرنے لگی۔ اس دھندلے میں کہیں دور نظر آتی کھڑکی میں اسے ایک ٹمٹما دیا جلتا دکھائی دے رہا تھا آوازیں پھر سے اس کے ارد گرد تلاطم پیدا کرنے لگیں۔

کہیں دور جھاک اڑاتے سمندروں سے پرے کوئی اسے پکارتا ہے۔

”دیا۔ دیا۔ دیا جی آپ کی تلبا کی نے تورات بھر سونے نہیں دیا۔“

”جاتے سے آپ کو دیکھنا تھا۔ سو دیکھ لیا۔“
”میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میرا نکل دل کسی اور دیش کی لڑکی کے لیے چل چل جائے گا۔“

وہ سسکنے لگی تھی۔ ان آوازوں نے تو شاید عمر بھر اس کا پیچھا چھوڑنا ہی نہیں تھا۔ وہ ابھی تک کھڑکی پر نگاہیں جمائے بیٹھی تھی۔ ٹمٹما دیا بجھ گیا تھا۔ اس کے پیروں کے نیچے نیم کے سبز مائل زرد مرہ پتوں کا ڈھیر تھا۔

ہوا کے ہلکے سے تھپڑے سے درخت کے پتے ایک تسلسل سے اس پر گر رہے تھے۔ وہ تو آوازوں کی بستی میں تھی۔ بے حس، بے حرکت۔ اسے لگا تھا وہ مر چکی ہے پر وہ زندہ تھی۔ اس نے زندگی بھر کٹھ پتلیوں سے بہت پیار کیا تھا۔

اور اس کی زندگی کو کٹھ پتلیوں کی ماری پڑی تھی۔ وہ بچپن میں اللہ سے دعا کرتی تھی کہ اس کی کٹھ

پتلیاں ہمیشہ اس کے ساتھ رہیں۔
اس کی دعائیں مستجاب نہری تھیں۔
اس کو ہاتھ سے تراشی ہوئی سورتیں پسند تھیں۔
گڑیاؤں سے عشق تھا اور حقیقی کٹھ پتلی نے اس کی زندگی میں ولن کا کردار ادا کیا تھا۔ وہ جو محبت کے ذائقے سے آشنائی کر بیٹھی تو ہجر کے کڑوے دریا میں پھینک دیا گیا تھا۔

اسے احساس ہوا کہ اس کے کاندھوں پر بہت وزن ہے۔ اس نے بیک کی زپ کھول کر چند کٹھ پتلیاں سبز مائل زرد نیم کے مرہ پتوں پر پھینک دیں۔

پھر بھی وزن کم نہیں ہوا۔ وہ اٹھ کر چند قدم چلی۔ بیک میں ہاتھ گھسا کر کچھ اور کٹھ پتلیوں کو سڑک پر پھینک دیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ سارا بیک خالی کر چکی تھی۔ تارکول کی چمکتی کالی سڑک پر جا بجا کٹھ پتلیوں کی قطار تھی۔

اس کے بیک میں صرف آخری کٹھ پتلی بچی تھی۔ جب وہ پیدل کا سفر طے کر کے اپنے گھر کے مرکزی دروازے پر تھی۔ اس نے بے دردی سے آخری کٹھ پتلی کو کھینچ کر باہر نکالا۔

سفید لٹھے کے سوٹ میں سر پر کھینچی پگ باندھے ”صندھ“ اس کے ہاتھوں میں موجود تھا۔ وہ اسے آنکھوں سے لگا کر رونے لگی۔ آوازوں کے تلاطم میں یونیورسٹی میں پیش کی جانے والے ڈرامے کے آخر میں لگی۔ زنیہ کی آواز میں بڑھی جانے والی نظم اس کے کانوں کے پردے پھاڑنے لگی۔

میں صدف سیپ کا سچا موتی۔
ان انجان رستوں میں یوں بے مول ہوئی۔

میرا نصف بہتر جو محبت کو ایمان کہا کرتا تھا
ایمان محبت سے منکر جو ہوا

تو محبت جرم میرے ایمان کا شہری
محبوب کی گلی کی خاطر

جھاک اڑاتے سمندروں سے پرے
میں نے ہر خون سے بندھے رشتے کو توڑا

میں نے چپ چاپ ہر دکھ سے اور میں بے وفا

ٹھہری۔

اور وہ جو وفاؤں کا سردار بنا پھرتا تھا؟
کیا نکلا۔؟

ڈوروں سے بندھا کٹھ پتلی مرد۔

اس نے صفدر کو دور ہوا میں اچھال کر گھر میں قدم
رکھ دیے۔

وہ بچپن میں دادی سے ضد کر کے اپنی ارد گرد کٹھ
پتلیوں کا ڈھیر لگاتی تھی۔ آج اسے قابل نفرت لگیں
تو اپنی زندگی سے نکال پھینکا تھا انہیں۔

ایک طوفان تھا جو آکر گزر گیا تھا۔

جس رات صفدر نے اسے طلاق دی اسی رات
لان میں نصب جھولے کی کڑیاں نکل گئی تھیں اور
سنہری جھولا کانچ کی کڑیاں کے ٹوٹنے پر خود بھی ٹوٹ کر
ایک بازو پر لٹکا رہ گیا تھا۔

وہ ہر رات شیشے کے سامنے بیٹھ کر اپنے عکس کو
گھورا کرتی اور اپنے عکس سے سوال کرتی۔ ”اس نے
مجھے کیوں چھوڑا؟“

آئینہ خاموش رہتا اور اس کا عکس ادا سے اسے
تکنا۔ وہ اپنی آنکھوں سے پوچھتی۔

”اس نے ایک بار کہا تھا تمہاری آنکھیں بہت
خوب صورت ہیں اور خوب صورت آنکھوں کو بھی
کوئی چھوڑ سکتا ہے۔ اس نے تمہیں کیوں چھوڑا؟“

آنکھیں خاموش رہیں۔ اس نے یہی سوال ہونٹوں
سے کیا۔ ہونٹ بھی خاموش رہے لب اسٹک اٹھا کر
ہونٹوں پر لگائی اور کاجل کی سلائی آنکھوں میں پھیر لی۔
اس کی آواز بھرا گئی۔

”آئینے! مجھے غور سے دیکھو! کیا میں اس قابل تھی
کہ مجھے چھوڑا جاتا؟“

آئینہ ہیبت ناک شکل اختیار کر کے اس پر ہنسنے لگا۔
اس لب اسٹک سے پورا چہرہ رنگ لیا۔

”ہاں ہاں میں اسی قابل تھی کہ وہ مجھے چھوڑ دیتا۔
میں کٹھ پتلیوں سے محبت کرتی تھی نا۔ اس نے ٹھیک

کیا میرے ساتھ۔ کٹھ پتلیاں تو ایسا ہی کرتی ہیں۔
آئینے! تم مجھ پر ہنستے ہو نا۔ سب مجھ پر ہنسیں گے۔
میرے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔“

وہ ڈرنگ ٹیبل پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے
لگی۔

اوائیل دسمبر کی زرد سی بھیگی بھیگی شام تھی۔ وہ
چھت پر بیٹھی طائروں کے غولوں کو گنتی تھی۔ سب
کچھ تو اپنی جگہ پر تھا۔ چاند سورج پرندے نظارے۔
نہیں تھا تو اس کا دل تھا جو صفدر نے بڑی بے دردی

سے توڑا تھا۔ وہ مرے مرے قدموں سے چھت کی
دیواروں تک آئی تھی۔ گلی کے کونے پر بچے آگ
جلائے گول دائروں کی شکل میں بیٹھے ہاتھ سینکتے تھے۔
سر مئی رنگ کا گہرا گاڑھا دھواں فضا میں اڑتا پھر
تحلیل ہو جاتا تھا۔ وہ دھوئیں پر نگاہ جمائے کھڑی رہی۔
طائروں کے غول سوچوں، شکوؤں کی صورت میں
چھت کی منڈیروں پر آکر بیٹھ گئے۔

”صفدر! آپ نے تو مجھے دھواں بنا دیا۔ میں بھی
اس گہرے سر مئی دھوئیں کی مانند فضا میں تحلیل
ہونے کو ہوں۔“

پھر سورج کا ایک پرندہ منڈیر پر سے اڑاں بھر گیا اور
دوسرا سورج کر پرندہ منڈیر پر آن بیٹھا۔ اس نے دونوں
ہاتھوں کی انگلیوں پر نگاہ جمائی اور اس کے لب شکوہ
کنال ہوئے۔

”بہت ہنر تھا ان انگلیوں میں۔ بہت کچھ لکھا ان
انگلیوں نے۔ بہت ہنر کے نمونے تخلیق کیے اور آپ
نے میری انگلیوں کو مار ڈالا۔“

اسے صفدر کا اپنے ہاتھوں کا موڑ نایا آیا اور یاد تو
بہت کچھ آیا۔ سارے ظلم، سارے ستم۔ اس نے
طائروں کو اپنا دکھ سنایا۔

”اے پرندو! تم نے کبھی دونوں ہاتھوں سے بسکٹ
کو توڑا ہے۔“

صفدر نے مجھے بسکٹ کی طرح دو حصوں میں تقسیم

کر دیا۔
سوچوں کے چرند پرند نوحہ کنائی کرتے اپنے
آشیانوں کی طرف چل دیے۔ اس نے ڈوبتے سورج
کو دوست بنالیا۔

”اے سورج تم نے کبھی خالی عورت کو دکھا ہے؟
نہیں نا۔ تو مجھے دکھو۔ اس نے ہر خوشی کو
میرے اندر مار ڈالا۔ اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں
کیا۔ میں تو اس سے محبت کرنے لگی تھی محبت کو
ایسے بھی ٹھکرایا جاتا ہے؟“

اس کے اندر کی عورت ہچکیاں لے رہی تھی۔ پر
اس کی آنکھیں بنجر تھیں۔ ویران تھیں۔ جہاں مائگی
ہو امیں شام غریباں کی طرح حنوے پڑھتی تھیں۔
زرد اداس سورج اسے دکھتا مغرب میں خود کشی کر
بیٹھا۔



ٹھیک چھ ماہ بعد جب اس کے زخم کسی حد تک بھر
گئے تھے اور وہ صغیر کو بھلانے کی کوشش میں کسی حد
تک کامیاب ہو گئی تو اس کا دل چاہا کہ وہ پھر سے اپنے
سنہری جھولے میں بیٹھے اور اسی دن اس کی فرمائش پر
بابا نے جھولے کی مرمت کرا دی۔

اس نے لان سے سارے زرد پھولوں کو توڑ کر لمبے
لمبے دھاگوں میں ان پھولوں کو موٹی سوئی کے ذریعے پرو
لیا پھر ان لڑیوں کو دونوں اطراف سنہری زنجیروں پر
لپیٹ دیا۔ ”سنہری جھولا“ اور بھی حسین دکھنے لگا۔ وہ
جھولے میں بیٹھ کر ہلکے ہلکے جھولنے لیتی تو ماما بابا نے
اسے اطمینان بھری نظروں سے دیکھا تھا۔

جب ہی نسل ہوئی تو بابا نے دروازہ کھولا۔ ارباز کھڑا
تھا اپنے والدین کے ساتھ۔ بابا ارباز سے کئی بار ملے
تھے پر اس کے والدین سے آج پہلی بار مل رہے تھے۔
وہ ان لوگوں کو ڈرائنگ روم میں لے گئے۔

ارباز بابا سے معذرت کرتا اس کے جھولے کے
سامنے آن رکھا۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھنے لگی۔
کل ہی تو زینو نے ارباز کے بارے میں اسے فون پر

بتایا تھا اور آج وہ یہاں آ بھی گیا۔ اسے ارباز سے
جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ ارباز جھولے کی زنجیر تھام
کر کھڑا ہو گیا۔

”مجھے نہیں معلوم دیا! کب اور کیسے مجھے تم سے
محبت ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا تھا فائنل سمسٹر کے
بعد مئی پاپا کو تمہاری طرف بھیجوں گا۔ پر چند ہی روز
میں تمہاری سربراہی شادی ہو گئی اور میں چپ کا
چپ کھڑا رہا۔ میں نے کبھی تمہارے لیے برا نہیں چاہا
تھا۔ پھر بھی تمہارے ساتھ اتنا برا ہو گیا۔ پر شاید
قدرت کو بھی تمہارا اصل جوڑ میرے ساتھ منظور تھا“
جب ہی میں آج تمہارے سامنے کھڑا ہوں تمہارے
جواب کا منتظر۔ تمہارے تو بہت سے خواب تھے نادیا!
وعدہ رہا ہر خواب پورا کروں گا میں۔ ریلی آئی لو یو سو
چک۔ مانا کہ میں لیٹ ہو گیا پر اتنا بھی نہیں۔ مجھ سے
شادی کرو گی؟“

وہ ایک ٹک اس بے حد شان دار انسان کو تکے گئی۔
وہ جانتی تھی ارباز کو بے حد بولنے کی عادت ہے۔ اس
کے گروپ کا وہ شخص اس کے لیے ”محبت“ کے
جذبات رکھتا تھا اور اسے کبھی اندازہ ہی نہیں ہوا تھا۔
کتنی لا پرواہ تھی وہ اسے آج احساس ہو رہا تھا۔ ایک
لمحے کو چپ ہو تا وہ پھر شروع ہو گیا تھا۔

”دیا! تم کتنی بے خبر تھیں۔ تمہیں کبھی احساس
بھی نہ ہوا میں جو تمہیں ہر بات پر ”پلیس باس“ کہا کرتا
تھا جو تمہارے ہر آئیڈیے کو آگے تک لے کر جایا کرتا
تھا۔ تم سے کس قدر ”چاہ“ رکھتا ہوں اور اب عشق کی
کئی منازل طے کرتا تمہارے در پر سوالی بن کر کھڑا
ہوں۔ مجھے دھتکار دیا میرا ہاتھ تھام لو۔ تمہاری مرضی
ہے۔“

اس کے ہونٹوں پر بے حد جان دار مسکراہٹ
تھی۔ اس کے لمبے میں سچائی تھی اور اس کی باتیں
کھری تھیں۔ وہ کسی کی لکھی ہوئی لائن نہیں بولی رہا
تھا۔ اس کی ڈوریں کسی اور کے ہاتھوں میں نہیں تھیں۔
وہ اندر باہر سے ایک جیسا خوب صورت مرد تھا۔
دیا نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام لیا تھا۔

خواہشوں کے سارے جگنوئی سانس لیتے اس کے ارد گرد اڑنے لگے تھے۔ لان میں اڑتی ساری تتلیاں جھولے کی زنجیروں پر لپٹے پھولوں پر آن بیٹھی تھیں۔ اس کی زندگی کا ہر اجڑا ہوا انوکھا تھا۔

اس کے سامنے کھڑے خوب صورت اور کھرے مرد نے اس کی پشت پر آکر اسے ہلکا سا جھولا دیا تھا اور اپنے سچے لبوں کو پھر پھول برسارنے کی اجازت عطا فرمائی تھی۔

”پتا ہے دیا۔ جب کبھی تم بے ساختہ ہنستی تھیں، تمہارے بائیں آنکھ کے نیچے بھنور بنتا تھا۔ اور جس دن پہلی بار میں نے اس بھنور کو دیکھا تھا میں اسی دن اس بھنور میں آگیا تھا۔“

اس کی بات سن کر وہ دل سے مسکرائی تھی اور بائیں آنکھ کے نیچے پڑنے والا بھنور اور بھی گہرا ہوا تھا۔

”مجھے زنیو نے تمہارے ادھورے خوابوں کا بتایا تھا۔ اب سارے خوابوں کو منزل ملنے کا وقت آگیا ہے دیا!“

خواہشوں کے جگنو اس کی گود میں آن بیٹھے۔ اسے نئی منزلوں کے نئے رستوں سے روشناس کرنے کے لیے اور اس کے کان میں کسی نے چپکے سے کہا تھا۔

”اللہ کسی کے ساتھ نا انصافی نہیں کرتا۔ وہ بس آزما تا ہے۔ اور صبر کرنے والوں کو ایسے ہی پھل ملتا ہے۔“

سنہری جھولے کی کانچ کی گڑیا نے پلٹ کر پیچھے کھڑے ارباز کو دیکھا اور مسکرا دی اور پھر جیسے زندگی ہی مسکرا دی۔



زرینہ خالہ اپنی لاڈلی بیٹی کے ساتھ ٹیرس پر کھڑی باہر کے نظاروں سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ نیچے لان میں آٹھ سالہ پوتا لٹو سے کھیل رہا تھا۔ اس نے لٹو پر ڈوری لپیٹ کر ایک جھٹکے سے چکنے فرش پر چھوڑ دیا۔ پھر بڑی سرعت سے اسی ڈوری کی مدد سے چلتے ہوئے لٹو کو ایک ہتھیلی پر رکھ لیا۔ لٹو اسی رفتار سے اس کی

ہتھیلی پر گول گول گھومنے لگا۔ غیر شعوری طور پر دونوں کی نظریں اس منظر میں اٹک گئیں۔

زرینہ خالہ کی بیٹی کے لبوں پر ایک کمینہ سی مسکراہٹ ابھری وہ ماں کو مخاطب کر کے بولی۔

”صفدر کی آیا سمجھتی ہیں کہ ان سے بڑا کوئی طرم خان نہیں۔ قسم کھا کر کہتی ہوں اس بدھو کو زندگی بھر اپنے آگے پیچھے لٹو کی طرح نہ گھمایا تو میرا نام بدل دینا آپ! آپا کی چالاکیاں دھری رہ جائیں گی۔ پہلے مجھے رہجھکٹ کیا پھر اس بے چاری کو گھر سے نکلوا دیا۔ لیکن کب تک؟ انہیں اپنے کیے کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ بہت چالاک سمجھتی ہیں خود کو اب میری باری ہے۔“

زرینہ خالہ کے لبوں پر بھی مسکراہٹ ابھری تھی۔



آپا کی سلطنت میں خامشی بکل مارے بیٹھی تھی۔ انہوں نے ایک پھانس نکال پھینکی تھی اور ان کا لاڈلا اکلوتا فرماں بردار بھائی پوری خاردار جھاڑی گھر میں اٹھا لایا تھا۔ ان ماں بیٹیوں میں سے کسی نے بھی اس کی دوسری شادی میں شرکت نہیں کی تھی۔ البتہ خاندان کے ان لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا جنہیں آپا نے ہمیشہ اپنے ہدف پر رکھا تھا۔

ان کی ناپسندیدہ عورت دیا کی طلاق کے دسویں دن بڑے کروفر سے چلتی آپا کی سلطنت کے سامنے سے گزرتی صفدر کے کمرے میں پہنچی تھی۔ جہاں کی ہر چیز صفدر کی کمائی سے سجائی گئی تھی۔ وہ جینز میں کچھ نہیں لائی تھی۔ وہ پیا بھائی سا گن تھی۔ اس کا شوہر اس کی مٹھی میں تھا۔ اسے زمانے کا ڈر تھا نہ سسرالیوں کا خوف۔

اس کے پہلے قدم نے آپا کے تخت کو ہلایا تھا۔ آپا زلزلوں کے جھٹکوں کی زد میں تھیں صفدر کے کمرے کی ہر چیز اس کی پسند کے مطابق اسی کے ہاتھوں خریدی ہوئی تھی۔ دیا کو طلاق دیتے ہی اس نے علی الاعلان کہہ دیا تھا کہ وہ زرینہ خالہ کی بیٹی سے شادی کر

کر ”آپا نامہ“ شروع کیا تھا۔ آج سب الٹ تھا۔
”آپا ناراض ہیں صفدر! مجھے نہیں لگتا، وہ مجھے کبھی
یہاں بسنے دیں گی۔“

وہ لٹو کی طرح گول گول گھومنے لگا تھا۔
”میں نے ایک پوش علاقے میں فلیٹ خرید رکھا
ہے تمہارے نام پر اگر یہ تمہیں تنگ کریں گی تو ہم
وہاں شفٹ ہو جائیں گے۔“

وہ ایک ادا سے مسکرا کر اس کے ہاتھوں کو آنکھوں
سے لگا کر بولی تھی۔

”تم نے شادی کر لی تھی اور میں کتنا تڑپی تھی۔
میرے صبر کو منزل مل گئی۔ مجھے تم مل گئے۔“
اس کے اظہارِ وابستگی سے وہ شاد ہو گیا۔

اس نے مزید آپا کے قہے چھیڑے تو صفدر نے اس
کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی تھی۔

”چھوڑو نا جان! ہم ان کے پیچھے اپنی رات برباد
کیوں کریں۔“

صفدر کی اس بات پر سامنے بیٹھی اس عورت نے وہ
داؤ بیچ کھیلے کہ صفدر چاروں شانے چت ہو گیا۔

اور اس کا چت ہونا آپا نامی تابوت میں آخری کیل
ٹھونکنے کے مترادف ثابت ہوا تھا۔



آپا نے نئی دلہن کے ساتھ وہی پرانی روش روار کھی
تھی۔ پر یہ دلہن پیا بھائی تھی، سو ان کے سارے
منصوبے وقفے وقفے سے فلاپ ہوتے گئے۔ شادی
کے دوسرے دن سے جو دیوار ان کے درمیان کھڑی
ہوئی، وہ بلند سے بلند ہوتی چلی گئی اور جس دن شادی
کے دوسرے مہینے جھاڑ پر پھول کھلنے کی خبر ملی ان کی
راتوں کی نیندیں اڑ گئیں۔ وہ بے وقوف تھیں۔ بھائی
سمندر میں اتر اتر تھا اور گیلیا بھی نہ ہوتا۔ فطرت سے
بھی کبھی کوئی جیتا ہے کبھی۔

آپا اب بھی صفدر کے کان بھرتیں، پر اس پر مطلق
اثر نہ ہوتا۔ اس کی بیوی وہ کالا جادو تھی جو اس کے سر
چڑھ کر بولنے لگا تھا۔ پھر وہی چیقلش اور ہر وقت کی جج

رہا ہے۔ آپا کے اٹھائے گئے طوفان نے بھی اس کے
ارادے متزلزل نہیں کیے۔ وہ لڑکی اس کی خواہش تھی
اور خواہش کی تکمیل کے لیے اس کے پاس سب کچھ
تھا۔ روپیہ پیسہ گھریا، کاروبار تعلیم۔ اس نے اپنی
خواہش کے چاند کو صرف دس روز میں آنگن میں
اتار لیا تھا۔

آپا کے ہنگامے دم توڑ گئے۔ کبھی کبھی کوئی چنگاری
اڑتی تو صفدر اسے اپنے سرد رویے سے دبا دیتا۔ اس
نے آخری دن بہت کوشش کی کہ وہ لوگ شادی میں
شرکت کر لیں، پر آپا کا انکار پھر پر لکیر ثابت ہوا۔

دوسری طرف اس کی ہونے والی بیوی اس کو اس
حد تک دیوانہ بنائے ہوئے تھی کہ وہ اس کی ہر بات پر
لبیک کہتا اسی کی جانب کھینچتا۔

اور آج شب عروس میں اس کے رویہ بیٹھا قصیدہ
گو رہا تھا۔ وہ سفید پھکی شلجم سی عورت جو اس کے دل
کا قرار تھی۔ اس کی زندگی بن گئی، عزیز ترین گئی۔

اس نے پھونک سے ایک دریا بھجایا تھا۔ اسے تاریکی
کا خوف نہیں تھا نہ اس تاریکی میں ڈوب جانے کی سمجھ
بوجھ۔

وہ تب بھی کٹھ پتلی تھا، جب آپا کے ہاتھوں میں تھا۔
اور اب بھی کٹھ پتلی تھا۔ شوخیاں بوکھاتی اس کی دولت پر
نگاہ جمائے ہوئے عورت کے ہاتھوں۔ کٹھ پتلی، کٹھ پتلی
ہی رہتی ہے ہاتھ بدلنے سے تقدیر بھی بدل سکتی ہے
بھلا۔ اب یہ تو ان ہاتھوں پر ہے کہ وہ کتنی محبت سے
اسے رکھتے ہیں اور کتنی مہارت سے اسے دنیا کے
سامنے قابل ستائش بناتے ہیں۔

دبا آخر کے دنوں میں اسے دل کی شدتوں سے
چاہنے لگی تھی۔ سامنے بیٹھی ہوئی اس عورت کو صفدر
سے زیادہ اس کی دولت میں دلچسپی تھی۔

پر وہ دلوں کا حال تھوڑی جانتا تھا۔ وہ کچے کانوں کا
مرد۔ صرف نام کا مرد تھا۔ اس کی ڈوریں ایک ہاتھ سے
دوسرے ہاتھوں میں پھنسی تھیں۔ اسے بس اداکاری
کرنی تھی۔ آواز اس بار بھی کسی اور کی تھی۔

اس نے بڑے اعتماد سے صفدر کے ہاتھوں کو تھام

سچ سے تنگ آکر صفدر نے اپنے پوش علاقے میں خریدے گئے فلیٹ میں شفٹ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ صفدر کی بیوی زیورات سے لدی پسندی طنز پر مسکراہٹ لبوں پر سجائے یہاں سے وہاں پھدکتی پھرتی اور ان ماں بیٹوں کے سینوں پر سانپ لوٹتے۔

پھر وہ دن بھی آگیا جب صفدر اپنی بیوی کو لے کر فلیٹ میں شفٹ ہو گیا تھا اور آپا فقط درود یوا کے بیچ بغیر کسی مرد کے سہارے کے تنہا رہ گئیں۔ آہستہ آہستہ وہ اپنی ازدواجی زندگی میں مصروف ہو گیا۔ مہینوں پلٹ کر خبر نہ لیتا آیا زیور بیچ بیچ کر اپنا گزارہ کرنے لگیں۔ اور یوں تو خزانے بھی خالی ہو جاتے ہیں اور ان کا انجام بھی افلاس اور زبوں حالی ہی تھا۔ کاروبار اور تک بیلنس کا کنٹرول صفدر کے ہاتھ میں ہی تھا۔



اور پھر چند مہینوں میں صفدر نامی کٹھ پتلی نے فلیٹ سے بنگلے میں شفٹنگ کر لی۔ اس کی بیوی کا کھلا ہاتھ اور بے دریغ روپے پیسے کے خرچ نے کاروبار پر برا اثر ڈالا اور چند سالوں میں اس کے کاروبار کی ساکھ بیٹھ گئی۔ وہ مختلف کمپنیوں کا مقروض ہوتا چلا گیا۔ کٹھ پتلی غلط ہاتھوں میں تھی۔ صحیح ہاتھ کمزور ثابت ہوئے۔ اسے تھام نہ سکے۔ سنبھال نہ سکے۔

صفدر کی ساس، سالوں اور بیوی نے بری طرح اسے اپنے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا اور وہ اب صفر پر آنے کو تھا۔

اور یہ سب اللہ کا انصاف تھا۔ بندہ زمین پر کتنے ہی فساد پھیلائے۔ سزا اور جزا کی چین ایک دوسرے سے یونہی جڑی ہوتی ہے۔



یہ ان کٹھ پتلیوں کی کہانی ہے جن کی سوچ اور عمل ہمیشہ دوسروں کے ہاتھ میں رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی قوت فیصلہ کمزور ہوتی ہے۔ وہ اپنے سوچنے، سمجھنے، پرکھنے کی صلاحیتوں کو استعمال ہی نہیں کرتے۔ ہمیشہ دوسروں کے اشاروں پر چلتے رہتے ہیں۔

یہ صفدر کی کہانی تھی۔

یہ آپا کی کہانی تھی۔

یہ سزا و جزا کی کہانی تھی۔

یہ ایک ٹوٹی ہوئی اندر سے خالی عورت کی کہانی تھی۔ اس عورت کے سوچ کے آئینوں پر کوئی دھند نہیں تھی۔ کوئی میل نہیں تھا۔

یہ دیا کی کہانی تھی جو بچھ جانے کے بعد بھی دیا ہی رہی۔

یہ کھری سوچ رکھنے والے مردار باز کی کہانی تھی جس کے مضبوط بازوؤں میں اتنی قوت تھی کہ جو جھاگ اڑاتے سمندروں سے پرے بھی لوگوں کی مدد کو جاسکتا تھا۔ جو رستوں میں بکھرے ذرے کو یکجا کر کے عمارت بنا سکتا تھا۔ جو دیے کی صورت دوسروں کے رستوں سے تاریکی کو ختم کر سکتا تھا۔



خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

دستِ کدھر

فوزیہ یاسمین



قیمت - 750 روپے

کتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار کراچی - فون نمبر: 32735021

ننگار احمد

الکھڑے ستارے اور گھمبیر

گنیمت نے Pride and Prejudice کو بلا مبالغہ چھٹی بار ختم کر کے اپنے پلنگ پر تکیے کی ایک جانب رکھ دیا اور الزبتھ (Elizabeth) کی جرات اور ڈیری (Darcy) جیسے مکمل انسان کے لیے جو مشکل و صورت میں یکتا اور معاشی لحاظ سے مستحکم ہے اس کی محبت و دل ہی دل میں عشق کرتے دور خلاؤں میں دیکھنے لگی۔ جیسے وہ خود سب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہو بلکہ جیسے وہ خود ہی الزبتھ ہو۔

اسی کہانی کے حصار میں گھری وہ اس تین کمروں پر مشتمل گھر کے چھوٹے سے صحن میں آگئی اور ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی مگر اس کی نظریں اب تاحد نظر آنے والے آسمان کی وسعتوں میں کم تھیں۔ جس پر لاتعداد ستارے ٹمٹما رہے تھے ہر باریہ ناول اسے ایسے ہی مسحور کر دیتا تھا اور اس کا خیال اسے ذہین آنکھوں والی پرکشش سی الزبتھ کے دیس لے جاتا۔

اس وقت ساڑھے دس بجے تھے اب تک اس کے والدین اور اس سے چھوٹی سعیدیہ ناہید اور انعام سوچے تھے لیکن وہ یہ کہانی پڑھ کے گویا اپنی نیند کو ناراض کر چکی تھی۔ ورنہ عموماً کتاب بنی کے دوران ہی اسے میٹھی میٹھی سی نیند آجاتی، بالخصوص جین آسٹن کے اس ناول and prejudice Pride کے بعد تو اسے نیند آنے کا پتا ہی نہ چلتا لیکن آج الزبتھ کے دیس جانا اس کے لیے ممکن نہیں ہو رہا تھا کیونکہ آج!

آج کا دن زیادہ مختلف سا دن نہیں تھا۔ وہی معمول جو پچھلے چار سالوں سے گھر یلو امور کی انجام دہی میں ہوتا تھا۔ روزانہ کی طرح وہ نوبے اٹھی تو سعیدیہ کالج

اور ناہید اور انعام اسکول جا چکے تھے۔ ابو بھی سات بجے اپنے دفتر کے لیے نکل چکے تھے۔ جہاں سے وہ شام میں پارٹ ٹائم جاب پر جاتے اور رات نو بجے واپس آتے۔ ان کی گھر میں دلچسپی بس ضرورت کی حد تک ہی تھی۔ ان کی اولادیں کیا پڑھ رہی ہیں۔ ان کے کیا مشاغل ہیں۔ بیوی مرنے جینے۔ کیسے لین دین کرتی ہے۔ ان کو کوئی غرض نہ تھی۔ ان کے نزدیک مکان کی

قسط ادا کر کے مہینے کے خرچ کی ایک مخصوص رقم بیوی کے ہاتھ پر رکھنا ہی ان کی ذمہ داری تھی اور کسی حد تک یہ ٹھیک بھی تھا۔ بھلا رات کو واپس آکر سندھ مزید کیا کر سکتا ہے۔ سو گزارہ بہت اچھا نہیں تو برا بھی نہیں ہو رہا تھا۔

ای نائٹ کے بعد سارا پھیلاوا سمیٹ رہی تھیں اور ساتھ ساتھ اس کے دیر تک سونے پر ڈانٹ ڈپٹ بھی جاری تھی۔

وہ روز کی اس ”صبح بخیر ٹرانسیشن“ سے مسکراتی منہ ہاتھ دھو کر بچن میں آگئی۔ جلدی جلدی ہاتھ کر کے باقی کام پھرتی سے پنپانے لگی تو ای سلائی مشین پر بیٹھ گئیں۔ سعیدیہ اور گنیمت بھی وقت ملنے پر ان کا ہاتھ بٹا دیتی تھیں۔

نازیہ کی بھو اس سے صرف ایک سال ہی بڑی تھی۔ شادی کے بعد اب وہ ہی گھر میں سب سے بڑی تھی۔ سو اپنی ذمہ داری خوش اسلوبی سے نبھا رہی تھی۔ نازیہ کو پڑھائی میں بالکل بھی دلچسپی نہ تھی۔ وہ بمشکل ہی انٹر کرپائی تھی کہ اس کی پھوپھی نے اسے اپنا ذاتی جنرل اسٹور چلانے والے بیٹے اکرم کے لیے پسند کر لیا اور بیاہ کر لے گئیں۔ رشیدہ اور فیروز نے بساط کے مطابق نازیہ کو اچھا خاصا ہی جینز دے دیا۔ کچھ پچتیں کام آئیں۔ کچھ کیٹیاں اور کچھ ٹرنک میں نازیہ کے لیے جمع شدہ چیزیں۔ یوں فقط اٹھارہ سال میں نازیہ بیاہ دی گئی اور وہ اکرم کے ساتھ معقول زندگی گزارنے لگی۔ مگر

گنیمت کتابوں کی شیدائی تھی۔ اس لیے اس نے بی



اے کیا اور پھر زور زبردستی، روپیٹ اور بھوک ہڑتال کر کے ایم اے انگلش بھی کر لیا، مگر پرائیویٹ۔ کیونکہ فیروز کو لڑکیوں کا یونیورسٹی جانا قطعاً پسند نہیں تھا۔ بلکہ وہ تو ان کا باہر نکلتا بھی ناپسند کرتے تھے۔ ان کے خیال میں میٹرک یا انٹر بہت ہے لڑکیوں کے لیے، لیکن کچھ رشیدہ نے نگینہ کا ساتھ دیا اور کچھ قسمت نے۔ لیکن پھر فیروز نے اسے جاب کی اجازت ہرگز نہ دی اور اب پچھلے چار سالوں سے وہ گھر پر تھی۔

اور رشیدہ کے دل کا سکون غارت تھا۔ نگینہ کی شادی کا مسئلہ ان سے سلجھ کر نہیں دے رہا تھا۔ اس لیے آئے دن کسی نہ کسی وچولن کو فون کھڑکا کر نگینہ کے رشتے کی بابت دریافت کرتی رہتیں۔

درمیانے قد اور قدرے فربہ مائل جسم کے ساتھ وہ کوئی حور پری تو ہرگز نہ تھی، مگر معقول شکل و صورت اور سلیقے کی چادر اوڑھے دیکھنے والوں کا دل ضرور موہ لیتی تھی۔ وچولن اب تک انہیں پنسار اور چھوٹے پیمانے پر مختلف کاروبار کرنے والے کم بڑھے لکھے نوجوانوں کے کئی رشتے دکھا چکی تھی۔ اگر ایک دو جگہ رشیدہ اور فیروز کو تسلی نہ ہوئی تو کتنے ہی رشتے نگینہ نے اپنے ”ڈیرسی“ کے انتظار میں منع کر دیے۔

سیدھے سادھے ماں باپ اس نازک معاملے میں زور زبردستی کے قائل نہ تھے اور پڑھی لکھی بیٹی کا فلسفہ ان کے سر پر سے گزر جاتا، لیکن وہ ریت کی مانند مٹھی سے پھسلتے وقت کی برق رفتاری سے بھی خائف تھے۔

یوں یہ معاملہ اب تک التوا کا شکار تھا مگر اب رشیدہ کو لگتا کہ نگینہ کی طرف داری کر کے اس کو ایم اے کروانا ان کی غلطی تھی۔

قصہ مختصر۔ آج بھی وچولن ایک رشتہ لائی تھی۔ جو نگینہ کے والدین کے لیے تو بہترین تھا۔ مبین نے انٹر کر رکھا تھا۔ سرکاری ملازم۔ گھر ذاتی تھا اور آگے بڑھنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا تھا۔ ماں فوت ہو چکی تھی اور شادی شدہ تینوں بہنیں یہ فرض جلد انجام دینا چاہتی

تھیں۔ اسے رشیدہ اور فیروز کا واضح مثبت رجحان اور کسی حد تک اپنے آپ پر ان کا دباؤ محسوس ہوا۔ ایسا آج سے پہلے ہمیشہ نہیں ہوا تھا۔ سو بس یہ ہی بات نگینہ کی نیند اڑانے کے لیے کافی تھی۔ اسی لیے وہ اب تک جاگ رہی تھی۔

”اب کم از کم لڑکا پڑھا لکھا تو ہو۔“ اس نے دل گرفتگی سے سوچا۔

اس کی سوچوں میں تو ڈیرسی کا الزتھ کے لیے محبت لٹاتا انداز کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ اتنا امیر کبیر بہت ہی خوب صورت ہیرو جو پرکشش اور ذہین لیکن غریب الزتھ کی گہری چمکتی آنکھوں پر مر مٹا تھا۔ نگینہ کے لیے اس کہانی کا وہ مرحلہ بہت ہی پر لطف ہوتا جب الزتھ اپنے بے وقوف کزن کولن کا رشتہ ٹھکراتی ہے۔ وہ ایک چرچ میں Clergyman سے اور اپنی تمام تر حماقتوں کے باوجود اوسط طبقے کی الزتھ جیسی لڑکیوں کو ایک اچھا نہیں تو بہر حال بہتر مستقبل دے سکتا ہے۔ چونکہ الزتھ ذہنی مطابقت اور محبت کو ہر دو سری خوبی پر ترجیح دیتی ہے۔ اس لیے کولن جیسے احمق کو انکار کرنے

اس کی آواز میں آسودگی کی کھنک تھی۔ اس کا ہر ہر انداز اس کی طمانیت کا اعلان کر رہا تھا۔ یوں نوک جھونک میں 'بچوں کو کارٹون میں مصروف کر کے' دونوں نے کھانا تیار کیا اور کھانے کے بعد کپس لڑانے بیٹھ گئیں۔

رشیہ نازیہ کو مخصوص اشارہ کر کے بچوں کو ان کے کپڑے دکھانے کے بہانے دونوں کو اکیلا چھوڑ گئیں۔ تاکہ وہ نگینہ سے اطمینان سے بات کر سکے۔
"بنو جی! اب تم بھی کچھ سیاہ پرویا کرو، کیونکہ اب آپ کی رخصت ہونے کی باری ہے۔" نازیہ نے اسے چھیڑا۔

"ایسے ہی۔ ابھی تو کوئی ایسا سلسلہ نہیں۔" نگینہ نے زور سے سر نفی میں ہلا کر تردید کر ڈالی یا جانے خود کو تسلی دی۔

"اب انجان مت بنو۔ کل رحمت کس کا سند سپہ لائی ہے۔" بڑی بہن نے آنکھیں میٹکا میں تو چھوٹی نے بھی جواباً اسے آنکھیں دکھائیں اور مکھی بھگانے کے انداز میں ہاتھ ہلا کر بولی۔

"جیسے تم مجھے جانتی نہیں ہو نازیہ!" مگر پھر لہجہ دھیمہ ہو گیا خود بخود جیسے خواب میں بول رہی ہو۔

"میں نے تمہیں ڈیر سی اور الزبتھ کی کہانی سنائی تھی نا۔ میں اپنے ڈیر سی کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کروں گی۔ میں شارلٹ تھوڑا ہی ہوں کہ بس ایک چار دیواری اور مرد کے نام کی چھت پر رہ جاؤں۔"

جواباً نازیہ قدرے سنجیدگی سے گویا ہوئی۔ "دیکھو گئی! میں اس کہانی اس سے تمہاری وابستگی سے اچھی طرح واقف ہوں۔ مگر میری پیاری بہن! ان کتابوں سے باہر نکل کر حقیقی دنیا کو دیکھو گی تو جان سکو گی کہ ہر الزبتھ کو ڈیر سی نہیں ملتا اور وہ مجبوراً "شارلٹ بن جاتی ہے۔ ہم جیسے سفید پوش گھرانوں میں متین جیسا رشتہ کسی نیکی کا پھل سمجھا جاتا ہے اور تم پتا نہیں کن پریوں کے دیس کی کہانیاں سن رہی ہو۔"

نازیہ نے حقیقت پسندی سے تجزیہ کیا۔ اس کا مقصد بسن کا دل توڑنا نہیں، بلکہ اسے احمقوں کی جنت

میں سیکنڈ کاؤنڈ بھی نہیں لیتی۔ یوں وہ نگینہ کی آئیڈیل بن جاتی ہے۔ الزبتھ مضبوط دل کی حامل ہے اور اپنے لیے ایک بہترین شریک سفر کو کچھ کٹھنائیوں کے بعد چن لیتی ہے۔ چونکہ صرف اسے کولن کے مقابلے میں ایک شان دار مستقبل دے سکتا ہے، بلکہ اس سے محبت اور اس کی عزت بھی کرتا ہے۔

لیکن اسی کی دوست شارلٹ جو کہ بہت عام سی ایک لڑکی ہے، کولن کا ساتھ قبول کر لیتی ہے اور جو الزبتھ کے لیے باعث حیرانی ہے کہ شارلٹ کیونکر اس بغیر دل کے انسان کے ساتھ گزارا کر سکے گی۔ جو سب کچھ اپنی سرپرست لیڈی کیتھرن کے کہنے پر کرتا ہے۔ حتیٰ کہ شادی بھی۔ مگر شارلٹ کے جواب کا لب لباب یہ ہے کہ وہ اٹھائیس سال کی ہے۔ اس سے چھوٹے بھی بہن بھائی ہیں۔ ان کی معاشی حالت بھی حوصلہ افزا نہیں۔ اس لیے ان حالات میں وہ یہ اعلا ترین رشتہ نہیں ٹھکراسکتی جو اس کے اچھے مستقبل کی ضمانت ہے۔

"واہ بھئی شارلٹ بی بی! کیا نقطہ نظر ہے آپ کا۔ اس گدھے کے ساتھ اچھی زندگی کا خواب۔"

وہ شارلٹ۔ یوں ہنستی جیسے وہ الزبتھ ہے اور اس کا ڈیر سی اپنا دل گے اس کے قدموں میں بچھا ہے۔ ان ہی سوچوں میں غلطیاں کب اسے نیند آئی، معلوم نہیں۔



صبح اس کی آنکھ اپنے آٹھ سالہ بھانجے اور سات سالہ بھانجی کے چمکنے کی آوازوں سے کھلی۔ بہن کے آنے پر حیرت اور خوشی کے جذبات لیے وہ باہر آگئی، جہاں نازیہ امی کے ساتھ دھوپ میں مائلے اڑا رہی تھی اور ساتھ ساتھ کوئی راز و نیاز بھی جاری تھے جو نگینہ کی آمد کی وجہ سے رک گئے۔

"تم اتنی صبح صبح۔" بہن سے گلے ملتے ہوئے نگینہ مسکرائی۔

"جناب آپ کی صبح صبح ہے گیارہ بجے تو میں دن کا کھانا بھی پکا چکی ہوئی ہوں۔" نازیہ نے دھمو کا جڑا۔

سے نکالنا تھا۔ سو ٹکینہ کے چٹکنے کا عمل اسے کڑے گھونٹ کی طرح چبنا تھا۔

”مگر میرے بھی کچھ خواب ہیں۔“ نگلی بد بدائی۔
 ”میں انگریزی ادب میں ماسٹرز ہوں اور ایک انٹریاس سے شاوی کر لوں؟ پھر ساری زندگی اس کے ماتھے کے بل دیکھ دیکھ کر گزاروں؟ اپنا آپ کہیں کھو کر زندگی کی دوڑ میں شامل ہو جاؤں۔ تم سے مجھے یہ توقع نہ تھی نازی!“

اس کی آواز بھرا گئی۔ گوکہ نازیہ اس سے سال بھر ہی بڑی تھی، مگر اس کے مزاج میں ٹھہراؤ تھا، سو رسانی سے بولی۔

”جانتی ہوں۔ اسی لیے اب تک تمہارے انکار پر انکار کرنے کی روش پر تمہیں کچھ نہیں کہا۔ یہ ہی سوچ کر کہ شاید تم ٹھک کہتی ہو۔ لیکن اگر یوں ہی وقت گزرنا گیا تو پھر ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ رشتے بھی ایک وقت تک آتے ہیں۔ جیسے جیسے لڑکی کی عمر گزرتی ہے۔ لوگوں کے مطالبے بڑھتے جاتے ہیں اور لڑکی کے لیے ہر آنے والا نیا رشتہ اس کے لیے کم از کم باعث نہیں ہوتا۔ میں تمہیں اس وقت سے پہچانا چاہتی ہوں نگلی!“

”ایسی بھی کون سی عمر گزر گئی ہے میری۔ ابھی تو وقت ہے نازی! اللہ کا واسطہ! مجھے مت ہلاؤ۔“
 مگر نازیہ کی باتوں میں وزن محسوس ہوا۔ ٹکینہ کو چپ اور لو با گرہ دیکھ کر اس نے پھر سلسلہ کلام جوڑا۔

”ماشاء اللہ ستائیں کی ہو چکی ہو تم۔ میں ایک سال بڑی ہوں تم سے اور دس سالہ ازدواجی زندگی گزار چکی ہوں اور دو بچے پال رہی ہوں۔ امی اور ابو بہت پریشان ہیں تمہارے لیے۔ تمہارے بعد دو اور بھی ہیں جن کو بیاہنا ہے۔ لہذا اشارت کی طرح سب کے بارے میں سوچو تاکہ الزمت کی طرح بس اپنے ہی نقطہ نظر کو زندگی کا محور بنالو۔ اب اگر وقت نکل گیا تو خدا خواستہ یہ نہ ہو کہ تم شارلٹ کی پوزیشن میں بھی نہ رہو۔“

بسن کی باتیں ٹکینہ کو وہ راہ دکھا رہی تھی جس کے بارے میں اس نے سوچا ہی نہ تھا کبھی۔ بس اپنی دنیا

میں گم زندگی گزار رہی تھی وہ سورہا نسی ہو گئی۔
 ”تو کیا فائدہ میری تعلیم کا جب میں نے ایک انٹر پاس کے ساتھ ہی نباہ کرنا ہے۔“

سوں سوں کر لی ٹکینہ یہ نازیہ کو بہت پیار آیا۔ اس کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا اور بالوں کی لٹ کو بہت نرمی سے اس کے کان کے پیچھے اڑسا، پھر اس کا سر سہلانے لگی، جو یقیناً ”نچ رہا تھا، نازیہ کے حساب سے۔“

”تو میری بے وقوف۔ بسن! ابھی تم کون سا پی ایچ ڈی لوگوں میں زندگی بسر کر رہی ہو۔ ابا نے پرانے وقتوں کا میٹرک کیا ہے اور امی بے چاری بمشکل اردو اور کلام پاک پڑھ سکتی ہیں۔ باقی تینوں تو تم سے چھوٹے ہیں اور ابھی پڑھ رہے ہیں۔ یہاں پر بھی تم گھرداری کر رہی ہونا وہاں بھی کرنا۔“

”مگر میری تعلیم۔“ اب کے سوں سوں کرتی ٹکینہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تو نازیہ چپ ہو گئی اور اس کے سنبھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ جب ٹکینہ کا دل کچھ ہلکا ہوا تو نازیہ نے دوبارہ کہا۔

”تعلیم کی قدر تو مجھ سے پوچھو جس نے انٹر بھی مر کے کیا۔ لیکن اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ کم از کم لی اے ہی کر لیتی تو آج میں بھی اپنے بچوں کو بہتر طور پر گائیڈ کر سکتی تھی۔ تمہاری تعلیم تمہارے بچوں کے کام آئے گی۔ ان کے ساتھ تم خوب انگریزی میں گٹ

پٹ کیا کرنا، کیونکہ ایک پڑھی لکھی ماں ہی نسل سنوارتی ہے۔ وہی تو درس گاہ ہوتی ہے بچوں کی۔“
 ٹکینہ۔ سر اٹھا کر اپنی انٹریاس بسن کو دیکھنے لگی، جو تھی تو حکم تعلیم یافتہ، لیکن ذہنی طور پر بہت پختہ اور باشعور تھی۔ وہ ٹکینہ کے سامنے وہ برتیں کھول رہی تھی جو وہ ایم اے پاس ہو کر بھی نہ دیکھ سکی۔

”اب اگر میرا ایکسپریس کر لیا ہے اپنی مینڈک جیسی آنکھوں سے تو امی کو تمہاری ہاں پہنچاؤں؟“

ٹکینہ کی بڑی بڑی آنکھوں پر اسے شرارت سے چھیڑتے ہوئے وہ مخاطب ہوئی تو ٹکینہ کا سر خود بخود ہی اثبات میں ہل گیا اور ٹکینہ خوشی خوشی ماں کو خوش خبری دینے چلائی۔

حکایت

فارس غازی انٹیلی جنس کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔ وہ اپنے سوتیلے بھائی وارث غازی اور اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں چار سال سے جیل میں قید ہے۔ سعدی یوسف اس کا بھانجا ہے جو اس سے جیل میں ہر ہفتے ملنے آتا ہے۔ سعدی یوسف تین بہن بھائی ہیں ان کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ حنین اور اسامہ سعدی سے چھوٹے ہیں۔ ان کی والدہ ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ چلاتی ہیں۔ زمر سعدی کی پھوپھی ہے۔ وہ چار سال قبل فائرنگ کے ایک واقعہ میں زخمی ہو جاتی ہے۔ فائرنگ کا الزام فارس غازی پر ہے۔ فارس غازی کو شک تھا کہ اس کی بیوی اس کے بھائی کے ساتھ انوالو ہے۔ اس نے جب فائرنگ کی تو زمر اس کی بیوی کے ساتھ تھی۔ فائرنگ کے نتیجے میں بیوی مر جاتی ہے اور زمر شدید زخمی ہو جاتی ہے۔ ایک انگریز عورت اپنا گردہ دے کر اس کی جان بچاتی ہے۔ سعدی کو یقین ہے کہ اس کا ماموں بے گناہ ہے۔ اسے پھنسا یا گیا ہے۔ اس لیے وہ اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے جس کی بنا پر زمر اپنے بھتیجے سعدی یوسف سے بدظن ہو جاتی ہے۔ بدظن ہونے کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ زمر جب موت و زندگی کی کشمکش میں ہوتی ہے تو سعدی اس کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی پڑھائی اور امتحان میں مصروف ہوتا ہے۔

جواہرات کے دو بیٹے ہیں۔ ہاشم کاردار اور نوشیرواں۔ ہاشم کاردار بہت بڑا وکیل ہے۔ ہاشم اور اس کی بیوی شہرین کے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے۔ ہاشم کی ایک بیٹی سونیا ہے جس سے وہ بہت محبت کرتا ہے۔ فارس غازی ہاشم کی پھوپھی کا بیٹا ہے۔ جیل جانے سے پہلے وہ ہاشم کے گھر میں جس میں اس کا بھی حصہ ہے رہائش پذیر تھا۔ سعدی کی کوششوں سے فارس رہا ہو جاتا ہے۔ والد کے کہنے پر زمر سعدی کی سالگرہ پر اس کے لیے پھول اور ہاشم کی بیٹی سونیا کی سالگرہ کارڈ لے کر جاتی ہے۔ سعدی ہاشم کی بیوی سے ہاشم کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ مانگتا ہے۔ شہرین اپنے دیور نوشیرواں سے جو اپنی بھابھی میں دلچسپی رکھتا



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



ہے بہانے سے پاس ورڈ حاصل کر کے سعدی کو سونیا سالگرہ میں دے دیتی ہے۔
پاس ورڈ ملنے کے بعد سعدی ہاشم کے کمرے میں جا کر اس کے لیپ ٹاپ پہ فلیش ڈرائیو لگا کر ڈیٹا کاپی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

چیف سیکریٹری آفیسر خاور ہاشم کو اس کے کمرے کی فونیج دکھاتا ہے جس میں سعدی کمرے میں جاتے ہوئے نظر آتا ہے ہاشم خاور کے ساتھ بھاگتا ہوا کمرے میں پہنچتا ہے لیکن سعدی اس سے پہلے ہی وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔
ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمرے میں لیپ ٹاپ سے ڈیٹا کاپی کرنے آیا تھا اور شہرین نے نوشیرواں کو استعمال کر کے پاس ورڈ سعدی کو دیا تھا۔ دوسری جانب بڑے اباز مرکویہ بتا دیتے ہیں کہ زمر کو کسی یورپین خاتون نے نہیں بلکہ سعدی نے گروہ دیا تھا۔ یہ سن کر زمر کو بے حد دکھ ہوتا ہے۔

نوشیرواں ایک بار پھر ڈرگزیلے لگتا ہے اس بات پر جو اہرات فکر مند ہے۔

بعد میں سعدی لیپ ٹاپ پہ فائلز کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فائلز ڈیپج ہو جاتی ہیں۔

سعدی حنین کو بتاتا ہے کہ وہ گیم کے ہائی اسکورز کی فہرست میں پہلے نمبر پر نہیں ہے حنین حیران ہو کر اپنی گیم والی سائٹ کھول کر دیکھتی ہے تو پہلے نمبر ”آمس ایور آفٹر“ لکھا ہوتا ہے۔ وہ علیشا ہے ورجینیا سے۔ حنین کی علیشا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

اب کہانی ماضی میں آگے بڑھ رہی ہے۔ فارس زمر سے لاء کی کچھ کلاسز لیتا ہے۔ ندرت اس سے شادی کا پوچھتی ہیں۔ وہ لا پرواہی سے زمر کا نام لے لیتا ہے۔ ندرت خوش ہو کر اباسے بات کرتی ہیں۔ ان کی ساس فارس کو اجڑا اور بد تمیز سمجھتی ہیں اور اس کے مقابلے میں ندرت سے زمر کی بات طے کر دیتی ہیں۔ وارث غازی ہاشم کے خلاف منی لانڈرنگ کیس پر کام کر رہا ہے۔ اس کے پاس مکمل ثبوت ہیں۔ اس کا لباس فاطمی ہاشم کو خبردار کر دیتا ہے۔ ہاشم خاور کی ڈیوٹی لگاتا ہے کہ وہ وارث کے پاس موجود تمام شواہد ضائع کرے۔ وارث کے ہاسٹل کے کمرے میں خاور اپنا کام کر رہا ہے۔ جب وارث ریڈ سگنلز ملنے پر اپنے کمرے میں جاتا ہے۔ پھر کوئی راستہ نہ ہونے کی صورت میں بہت مجبور ہو کر ہاشم خاور کو وارث کو مار دینے کی اجازت دے دیتا ہے۔ دوسری صورت میں وارث فارس کو وہ سارے شواہد میل کر دیتا۔ وارث کے قتل کا الزام ہاشم فارس پر ڈلواتا ہے۔

زمر تاشہ کو قتل اور زمر کو زخمی کرنا بھی فارس کو وارث کے قتل کے الزام میں پھنسانے کی ہاشم اور خاور کی منصوبہ بندی ہوتی ہے۔ وہ دونوں کامیاب ٹھہرتے ہیں۔ زمر تاشہ مرجاتی ہے۔ زمر زخمی حالت میں فارس کے خلاف بیان دیتی ہے۔ فارس جیل چلا جاتا ہے۔ سعدی زمر کو سمجھاتا ہے کہ فارس ایسا نہیں کر سکتا۔ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ زمر کہتی ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی اور اپنے بیان پر قائم رہتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ زمر کی ناراضی کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی ہے کہ وارث کے قتل کے وقت بھی اس کی شادی لیٹ ہو جاتی ہے اور وہ اپنی شادی روک کر فارس کے لیے مقدمہ لڑتی ہے۔ اب وہی شخص اپنے اس قتل کو چھپانے کے لیے اسے مارنا چاہتا ہے۔ وہ بظاہر اتفاقاً ”بیچ جاتی ہے“ مگر اس کے دونوں گردے ضائع ہو جاتے ہیں۔ اور اس حادثے کی صورت اس کی شادی ٹوٹ جاتی ہے۔ حنین کی نیٹ فرینڈ علیشا دراصل اورنگ زیب کی بیٹی ہے جسے وہ اور ہاشم تسلیم نہیں کرتے۔ وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے حنین سے دوستی کرتی ہے اور پردھانی کے لیے کاردار سے پیسے لینے کے لیے۔ پاکستان آتی ہے۔ مگر ہاشم اس سے بہت برے طریقے سے پیش آتا ہے اور کوئی مدد نہیں کرتا۔ زمر تاشہ اور زمر کے قتل کے وقت فارس اور حنین وارث کیس کی ایلی بائی کے سلسلے میں علیشا کے پاس ہی ہوتے ہیں مگر علیشا ہاشم کی وجہ سے کھل کر ان کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔

آٹھویں قسط

میں غارت گر

تم ملو گے بہت سے زبردست لوگوں سے۔
 بیاہنگ، ناقابل برداشت لوگ،
 جو زور و شور سے تمہاری زندگی میں
 اپنا حق جھاتے ہوئے داخل ہو جاتے ہیں۔
 یہ ہے نشانی ایک غارت گر کی۔
 غارت گر شکار کرتے ہیں نرمی، سکون، امن،
 خوش خلقی، اور ہر اس مثبت چیز کا،
 جو ان کو سونگھنے، کمزوری لگے۔
 ہر خوش باش، پرسکون شے کو وہ
 غلطی سے کمزور سمجھ لیتے ہیں۔
 تمہارا کام ان کو بدلنا نہیں۔
 تمہارا کام ان کو دکھانا ہے کہ
 تمہاری نرمی اور امن پسندی کمزوری نہیں ہے
 میں ہمیشہ نازک اور کمزور لگتا ہوں،
 مگر بات یہ ہے کہ

میں نازک اور کمزور ہوں نہیں۔
 میں نرم ہوں، مگر میں تمہیں دکھا سکتا ہوں کہ
 نرمی میں بھی ایک زہر چھپا ہوتا ہے۔
 میں ریشم کی مانند ہوں۔
 لوگ ریشم کو کمزور سمجھتے ہیں،
 مگر ایک ریشمی رومال پچا لیتا ہے انسان کو
 بندوق کی گولی لگنے سے۔
 بہت سے لوگ تمہیں کمزور سمجھ کر
 تم سے دوستی کے خواہاں ہوں گے
 غارت گروں کو درکار ہوتے ہیں ایسے دوست
 جن پہ وہ حاوی ہو سکیں،
 تاکہ ان کو اپنا آپ مضبوط اور اہم لگے۔
 سچ تو یہ ہے کہ غارت گر میں نہ مضبوطی ہے نہ
 ہمت۔

یہ تم ہو جو مضبوط ہو اور ہمت والے ہو۔

میں نے بہت سے دوست کھوئے،

بوجہ اس کے کہ جب انہوں نے مجھے چیر پھاڑنا

چاہا۔

تو وہ ایسا نہیں کر سکے۔
 اب وہ مجھے الزام دیتے ہیں دھوکا دہنی کا۔
 میں دھوکا نہیں دے رہا۔
 میں تو ہنا ہوں ریشم کا۔

وہی غلطی سے شرافت اور نرمی کو کمزوری گردان
 لیتے ہیں۔

دنیا بھری پڑی ہے غارت گروں سے
 سو میں چاہتا ہوں کہ تم بھی میری طرح
 بن جاؤ ریشم!

(جوائے بیل)

اور وہ سعدی جو ڈیڑھ برس سے ریشم بن چکا تھا اس
 نے اپنے اچھے وقتوں کے غارت گرد دوست کے بڑھے
 ہاتھ پہ چبھتی ہوئی نظر ڈالی اور فیصلہ کر لیا کہ اسے فیصلہ
 کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔
 ”اور میں نے آپ سے کیا چر ایا ہے بھلا؟“
 ”وہی جو تمہارے خیال میں پہلے میں نے تم سے
 چر ایا تھا۔“

سعدی کا جبراً بھیج گیا، آنکھوں میں سختی دور آئی۔
 ”آپ میرے خیالات کو نہیں جانتے، ہم اس
 بارے میں بعد میں بات کریں گے۔“
 کہتے ہوئے وہ مڑنے لگا، پھر ٹھہر گیا۔ دور کار میں
 بیٹھا فارس اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ سعدی نے واپس
 دیکھا۔ ہاشم نے مسکراتے ہوئے ہاتھ بدستور برہار کھا
 تھا۔

”جلد ملتے ہیں۔ آپ کے آفس میں۔“ اس نے
 ہاتھ ملا لیا اور فوراً ”سے واپس کھینچ کر پٹ گیا۔ کار میں
 بیٹھتے ہی فارس نے سوال کیا۔
 ”کیا کہہ رہا تھا ہاشم؟“

اکنیشن میں چابی گھماتے ہوئے اس نے سر
 جھکائے ذرا سے شانے اچکائے۔

”کچھ خاص نہیں۔ آفس کا ایک کام تھا۔ وہی پوچھ
 رہے تھے۔“ کار اشارٹ کر کے سرسید ہا کیا۔ فارس
 تو ”ہوں“ کہہ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا مگر سائیڈ مرر

اس کو دکھانے کے لیے اس نے مجھ سے ہاتھ بھی ملا لیا۔
جواہرات نے موبائل پرے ڈال دیا اور چہرہ اٹھا کر بے چینی سے ہاشم کو دیکھا۔
”تو اب کیا ہو گا؟“

”سعدی کو میں سنبھال لوں گا، وہ ابھی بھی وہی معصوم بچہ ہے، مگر سوال یہ ہے کہ جب اس کے ہاتھ ثبوت نہیں لگا تو اسے کیسے علم ہوا؟“ لکھ کر کہتے ہوئے اس نے ماں کو دیکھا۔ ”میں پچھلے ایک ہفتے سے جب سے وہ میری پارٹی پر میرے کمپیوٹر سے ڈیٹا چرا کر گیا ہے، یہی سوچ رہا ہوں۔ میں نے بنا جھول کے پلان کیا تھا سب ہر شے ٹھیک تھی، چار سال پہلے تک اسے نہیں پتا تھا کچھ۔ پھر دو سال وہ انگلینڈ میں رہا واپس آیا تب بھی اسے کچھ نہیں پتا تھا۔ کتنا عرصہ ہو گیا ڈیڈ کی ڈیٹھ کو؟“

”ایک سال پانچ ماہ۔“ جواہرات بے اختیار بولی کرب ساہر جگہ پھیل گیا۔

”ہوں۔ کل رات جب میں سعدی کی بہن سے بات کر رہا تھا فنکشن پر، تو مجھے احساس ہوا کہ ڈیڈ کی ڈیٹھ کے بعد سے وہ لوگ ہمارے گھر نہیں آئے۔ سونیا کی کچھلی برتھ ڈے پر بھی نہیں آئے تھے۔ اگر میں اس دفعہ زمر سے نہ کہتا تو وہ اب بھی نہ آتے۔“ جواہرات نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

”تمہارے باپ کی ڈیٹھ سے چند دن پہلے سعدی نے فارس کا وکیل بدل دیا تھا اور اس نے تمہارے باز پرس کرنے پر تم سے کافی بد تمیزی بھی کی تھی، یاد ہے؟ ہو سکتا ہے وہ اس رویے پر شرمندگی کی وجہ سے نہ آیا ہو۔“

”یا پھر۔“ ہاشم ایک دم سیدھا ہوا، وہ بری طرح چونکا تھا۔ ”یا پھر اس نے وکیل تب بدلا جب اسے ساری حقیقت کا علم ہو گیا تھا۔ کیا وہ یہ وہ ڈیڈھ سال سے جانتا ہے یہ سب؟“ اسے بے یقینی سی محسوس ہوئی۔

”اگر وہ اتنے عرصے سے جانتا ہے تو اب تک چپ

میں ہاشم دور مسکراتے ہوئے جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا نظر آ رہا تھا۔ اس نے کار کی رفتار تیز کی تو ہاشم پیچھے رہ گیا۔

(وہی جو تمہارے خیال میں، میں نے تم سے چرایا تھا۔ اف! اور یہ بات اسے کس نے بتائی ہو گی؟) ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے اسٹیرنگ پر موبائل رکھا اور شہرین کا نمبر نکالا۔ کچھ غصے بھرا ٹائپ کرنے لگا، پھر ارادہ ترک کر دیا۔ یہ ٹیکسٹ پہ کرنے والی بات نہیں تھی۔

برے موڈ کے ساتھ اس نے رفتار تیز کر دی۔ کار اب دور جا چکی تھی۔ ہاشم آہستہ سے پلٹ آیا۔ لاؤنج میں مرکزی صوفے پر جواہرات ٹانگ پر ٹانگ جمائے بیٹھی، موبائل پر کچھ دیکھ رہی تھی۔ اتوار کے باعث اسے آفس نہیں جانا تھا، مگر وہ پھر بھی ہمیشہ کی طرح تروتازہ اور تیار تھی۔ وہ قریب صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ پیر لمبے کر کے میز پر رکھ لیے اور انگلی سے ٹھوڑی مسلتا، پرسوج نظروں سے سامنے دیکھنے لگا۔ جواہرات نے موبائل سے نگاہ اٹھائی۔

”پریشان لگ رہے ہو۔“

”نہیں تو۔“ وہ چونکا۔

”کچھ تو ہوا ہے۔“ وہ پھر سے موبائل پر انگلی سے صفحہ اوپر کرنے لگی۔

”نہیں بس۔ ابھی سعدی سے ملاقات ہوئی۔ وہ فارس سے ملنے آیا تھا۔“

”اور تمہیں یہ بات ڈسٹرب کر رہی ہے کہ سعدی سب جانتا ہے؟“

”کیا نہیں کرنی چاہیے؟“ اس کا موڈ بگڑا۔

”نہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ سب ہمارا وہم ہو۔ فارس کے لیے کوشش کرنے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ وہ سب جانتا ہو۔“

مگر ہاشم نے سوچتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ”اونہوں۔ وہ جانتا ہے کہ یہ میں نے کیا ہے، مگر چونکہ اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے، اس لیے وہ برملا اظہار نہیں کر پا رہا۔ وہ فارس تک کو کچھ نہیں بتا رہا“

کیوں تھا؟

کرتی ہے۔

”اور اگر نفرت مرگئی تو؟۔۔۔ اگر انہیں ایک دوسرے سے محبت ہو گئی اور وہ مل کر ہمارے خلاف کھڑے ہو گئے تو؟“

جواہرات نے سرد سانس خارج کر کے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”تم بھی جانتے ہو اور میں بھی جانتی ہوں کہ شادیاں محبت سے خالی ہوا کرتی ہیں۔“

ہاشم کی آنکھوں میں چھائی بے چینی، کرب میں بدل گئی۔ تنے اعصاب ڈھیلے پڑے۔ اس نے آہستہ سے سر ہلایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ جواہرات نے اسی جبری مسکراہٹ کے ساتھ اسے سیڑھیوں کی طرف جاتے دیکھا اور پھر ہلکا سا سر جھٹکا۔ آنکھ کا کونا، انگلی کی نوک سے پونچھا۔ موبائل پر ڈال دیا اور گردن موڑ کر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔

وہاں اتوار کی صبح اب باسی ہو کر دوپہر میں بدل رہی تھی۔ سبزہ اور ملازموں کی چہل پھل، سب یہاں سے دکھائی دیتا تھا، مگر وہ یہ سب نہیں دیکھ رہی تھی۔ اسے کچھ اور یاد آ رہا تھا۔

ہاشم نے کہا، ”سعدی ڈیڑھ سال قبل، سونیا کی سالگرہ سے پہلے، صرف آخری دفعہ ان کے گھر آیا تھا۔ ہاشم نہیں جانتا تھا کہ سعدی نے وہاں آنا کیوں چھوڑا تھا۔ مگر وہ جانتی تھی اور یہ بھی کہ وہ ہاشم کو کبھی نہیں بتائے گی۔“

جواہرات نے سر جھٹکا۔

وقت کے کتنے دھاروں سے گزرتا ہے ابھی زندگی ہے تو کئی رنگ سے مرنا ہے ابھی سعدی کے جانے کے بعد سے اتوار کے ناشتے کے برتن یونہی میز پر رکھے تھے۔ صداقت نجانے کن کاموں میں مصروف تھا۔ زمر نے ٹی وی دیکھتے ہوئے اسے آواز دی اور پھر چائے کا کپ اٹھالیا۔ ”دفعنا“ محسوس ہوا، بڑے ابا مسلسل اسے دیکھ رہے ہیں مگر وہ ٹی وی کی طرف دیکھتی رہی۔

”وہ چاہتا تھا پہلے فارس باہر آجائے اور پھر وہ میرے پیچھے آئے۔ مگر۔۔۔ اسے کیسے پتا چلا می؟“ یہاں آکر ہاشم کا سارا دماغ الجھ جاتا۔ وہ چاہ کر بھی اس سوال کا جواب نہیں ڈھونڈ پا رہا تھا۔ کب غلطی ہوئی؟ کدھر غلطی ہوئی اور وہ ریشم بن گیا؟

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ اس نے گہری سانس لے کر شانے اچکائے اور پھر سے موبائل اٹھالیا۔ ”کیا میں نے تمہیں نئی خبر دی کہ زمر فارس کے خلاف کچھ کرنے جا رہی ہے۔“

سوچ میں الجھا ہاشم چونکا۔ ”نئی پٹیشن (مقدمے کی درخواست)؟“

”اونہوں۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔“ وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا۔ ”اس کا دماغ درست ہے؟“

”وہ اس سے انتقام کے لیے شادی کرنا چاہتی ہے۔“

”اور یہ سب اس نے آپ کو کیوں بتایا؟“

”کیونکہ میں ہی اس کی مدد کر سکتی ہوں۔“ جواہرات نے محفوظ انداز میں شانے اچکائے۔ ہاشم کے تاثرات بگڑے۔

”انتقام کے بہت سے طریقے ہوتے ہیں، اسے شادی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”شاید اس کے منصوبے کے مطابق ان کے درمیان میسج کا ٹریکٹ ہونا ضروری ہو۔ خیر میرے لیے یہ بات لاشفی کا باعث ہے۔ اب ہمیں فارس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں، اس کے لیے زمر کافی ہے۔“

”مگر ہاشم بے چینی سے آگے کو ہوا۔“

”اول تو فارس اس سے شادی نہیں کرے گا اور اگر کر لی تو بھی کیا گارنٹی ہے کہ وہ اس سے انتقام لے گی؟ اگر اسے سب حقیقت معلوم ہو گئی اور وہ جان گئی کہ فارس بے گناہ ہے تو؟“

”وہ کبھی نہیں جان پائے گی۔ وہ اس سے نفرت ہے۔“

”کیسی رہی شادی؟“

نگاہیں اسکرین پہ جمائے، زمر نے ہلکے سے شانے اچکائے۔

”یہ تو چند برس بعد بتا چلے گا کہ کیسی رہی شادی!“
”تم ٹھیک ہو؟“ وہ اس کی خوابیدہ آنکھوں کو نظر سے دیکھ رہے تھے۔

”ہمیشہ سے بہتر۔“ آخری گھونٹ کپ اونچا کر کے اندر اٹھایا اور پھر کپ ان کو دکھا کر ہلکا سا مسکرائی۔

”ایک بات پوچھوں ابا؟“

”تم کب سے تمہید باندھنے لگیں؟“

”جب سے یہ معلوم ہوا کہ مجھے بہت کچھ معلوم نہیں تھا۔“ مسکراتی آنکھوں میں کرجیاں سی چبھیں مگر وہ ضبط کر کے ان کی طرف پوری گھوم گئی۔
”ابا! کبھی فارس نے میرا رشتہ مانگا تھا؟“

بڑے ابا کے لیے سوال غیر متوقع تھا۔ وہ چونک گئے، کچھ کہنے کی کوشش کی مگر زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ پراسیکوٹر بھوری آنکھیں سکیڑ کر غور سے ان کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔

”آپ نے انکار کیوں کیا؟“

”بس یہی لگا کہ تمہارا اس کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔“

”کس کو لگا؟ آپ کو یا امی کو؟“

”ہم دونوں کو۔“ احتیاط سے الفاظ کا چناؤ کیا۔

”مجھے کیوں نہیں بتایا؟“ وہ ان کی آنکھوں میں دیکھتی سوال یہ سوال کر رہی تھی۔

”جب رشتہ نہیں کرنا تھا تو بتانے کا فائدہ؟“

”کیا یہ سچ ہے کہ آپ نے فارس کو گھربلا کر انکار کیا تھا اور بے عزتی بھی کی تھی؟“

”ہرگز نہیں فرحانہ نے ندرت کو فون پہ انکار کیا تھا، گھربلانے والی بات کس نے کہی؟“ ان کو شدید حیرت اور صدمے کا جھٹکا لگا۔ زمر کے لبوں پہ زخمی مسکراہٹ آئی۔

”بھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ آپ دونوں نے انکار کیا تھا؟“

بڑے ابا لمحے بھر کو چپ رہ گئے۔ وہ اب ٹھوڑی

ہتھیلی رکھے، دلچسپی سے ان کو دیکھ رہی تھی۔ کتنی دفعہ کی گئی خواہش انہوں نے دل میں دہرائی۔ کاش اس لڑکی کو وکیل نہ بنایا ہوتا۔

”اب دیر ہو گئی ہے، انکار مت کیجئے گا۔ آپ کی مرضی کے برخلاف انکار کیا امی نے، آپ صرف ان کے لیے میرے دل میں کوئی برا خیال نہ لانے کو کہہ رہے تھے۔ کیوں کہ آپ مجھ سے ڈسکس کیے بنا کبھی انکار نہ کرتے۔“

”تمہاری امی نے۔“

”اچھا فیصلہ کیا میرے لیے، مجھے پتا ہے۔ مجھے کوئی شکایت نہیں۔ میں تو بس یہ جانتا چاہ رہی تھی کہ کیا انہوں نے میرا نام لے کر انکار کیا؟“ وہ ریمورٹ اٹھا کر اب بی وی کی طرف رخ کر کے بیٹھ گئی۔ بڑے ابا ہنوز تفکر سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”تمہیں کس نے بتایا؟“

”حنین نے۔ اس کے خیال میں انکار میں نے کیا تھا۔“

”تم نے تصحیح نہیں کی؟“

”جب خیالات ذہن میں اتنے راسخ ہو چکے ہیں تو محض الفاظ سے ان کی نفی کر دینے کا کیا فائدہ؟“ وہ چینل بدلتے ہوئے کھٹکریالی لٹ انگلی پہ لیٹ رہی تھی۔ ”میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ فارس شاید اتنا بھی برا نہیں جتنا میں سمجھتی تھی۔“

بڑے ابا نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”کیا کوئی بات ہوئی ہے؟“

”کوئی خاص نہیں۔ میں فارس کی کیس فائلز پڑھ رہی تھی یہ دیکھنے کے لیے کہ جج نے کیوں اس کو بری کیا؟ مگر جج حق بجانب تھا، کوئی بھی چیز اس کو مجرم ثابت نہیں کرئی۔“ سرسری سے انداز میں کہتی وہ رک کر کوئی ہیڈ لائن پڑھنے لگی۔

”اور تم پھر بھی اس کو مجرم گردانتی ہو؟“

”ہو سکتا ہے میں غلط ہوں۔ یہ سب ایک سیٹ اپ ہو۔ شاید۔“ اس نے ہلکے سے شانے اچکائے۔ بڑے ابا حیرت سے اسے دیکھتے رہ گئے۔

”تمہارے خیالات اتنی جلدی نہیں بدل سکتے۔
کوئی اور بات ہے؟“

”میں نے آگے بڑھنے کا فیصلہ کر لیا ہے اب۔ وہ مجرم ہے یا نہیں، مجھے فرق نہیں پڑتا اب۔ میں مزید اپنے دکھوں اور محرومیوں کا قصور وار اسے نہیں ٹھہراؤں گی۔ میں سعدی سے دوبارہ ملنے لگی ہوں، خاندان کی تقریبات میں جانے لگی ہوں، آپ یہی چاہتے تھے اور اگلا قدم۔“ اس نے گردن پھیر کر ان کو سنجیدگی سے دیکھا۔ ”آپ کہیں گے کہ میں شادی کر لوں۔“

”میں چار سال سے یہ کہہ رہا ہوں۔“

وہ چند لمحے ان کو ٹکٹی رہی، پھر سر اثبات میں ہلادیا۔

نری سے آمن سے۔

”اوکے میں کر لوں گی۔ جب آپ کہیں، جس سے آپ کہیں، لیکن اس دفعہ مجھ سے پوچھتے بغیر آپ کسی کو انکار یا اقرار نہیں کریں گے۔“ اور یہ کہہ کر وہ بر سکون سی اٹھ آئی۔ بڑے اپاشل سے بیٹھے رہ گئے۔ کتنی دیر تو ان کا ضعیف دماغ الجھتا رہا، پھر حیرت کی دھند چھٹی۔ امید کی کرن چھلکی۔

زمر نے بہت لمبے عرصے بعد سہی، ان کی بات مان لی تھی۔ سعدی لوگوں سے ”صلح“ اس کے لیے خوش آمد ثابت ہوئی تھی۔

وہ خوش گوار سی حیرت میں گھرے ہوئے تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اپنی خوشی کس سے شیر کریں۔ پھر جلدی سے فون اٹھایا۔ انہیں ندرت کو بتانا تھا۔

لفظوں کو اس نے جھوٹ سکھایا، کچھ اس طرح ساری علامتوں سے معنی بھی لے گیا۔ اتوار کی دوپہر قطرہ قطرہ پکھل رہی تھی۔ سنہری دھوپ نے ندرت کے ریشٹورنٹ کے شیشے کی دیواروں کو چمکا رکھا تھا۔ ندرت کچن میں، آستین چڑھائے، مصروف سی کھڑی، لڑکوں کو ہدایات دے رہی تھیں۔ ساتھ ہی چولہوں پہ پکتے پکوانوں کو دیکھ لیتیں۔ ان کاموں کے دوران انہوں نے دو فون اٹینڈ کیے تھے۔ ایک سعدی کا کہ وہ فارس کے ساتھ گھر پہنچ چکا ہے، جس پہ ندرت نے کھانا بھجوا دیا، خود وہ کسٹمرز کی

وجہ سے جانے سے قاصر تھیں۔ اور وہ سراپڑے ابا کا۔ وہی پرانی بات۔ زمر کی شادی۔ البتہ اب کے ایک شے کا اضافہ ہوا تھا۔ زمر مان گئی تھی اور اب وہ چاہتے تھے کہ ندرت اس سلسلے میں ان کی مدد کریں۔ ندرت تب سے یہی سوچ رہی تھیں۔ رشتہ داروں میں کون سی جگہ بات چلائی جاسکتی ہے۔

تب ہی کاؤنٹر والا جنید اندر آیا۔

”آئی!“ (وہ سب ندرت کو آئی کہتے تھے) ”کوئی

مسز کاردار آئی ہیں“ آپ کا پوچھ رہی ہیں۔“

”مسز کاردار۔ اوہو۔“ وہ جلدی جلدی ہاتھ دھو کر

کیپ اتارتیں، دو ٹاڈرست کرتیں باہر آئیں تو شیشے

کی دیوار کے ساتھ ایک کرسی پہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے

سیدھے بھورے بالوں والی جواہرات بیٹھی تھی۔ وہ

تیزی سے اس طرف آئیں۔

”سوری میں بس کچن میں لگی تھی، آپ کو انتظار

کرنا پڑا۔“ وہ اس سے مل کر خواہ مخوہ شرمندہ ہو رہی

تھیں۔ جواہرات اسی تمکنت سے بیٹھی مسکراتی

رہی۔ نیوی بلیو لمبی قمیص اور سفید پنٹ پہنے، وہ بغیر

میک اپ کے بھی کافی تروتازہ اور جوان لگتی تھی۔

”کیا آپ گھر گئی تھیں؟ مجھے بتایا ہوتا“ میں ادھر ہی

آجاتی۔“ ندرت سامنے بیٹھتے ہوئے مزید فکر مند

ہوئیں۔ مسز کاردار کی اب وہ کیا خاطر کریں، پہلی دفعہ

جو آئی تھی۔

”مجھے کچھ بات کرنی تھی، اس کے لیے یہی جگہ

درست تھی۔“ کہہ کر وہ پہلے ادھر ادھر کی باتیں کرنے

لگی۔ سعدی کی جاب، ریشٹورنٹ کا نفع نقصان، مالی

مسائل تب ہی جنید جو سزلے آیا۔ جواہرات نے

اسٹرابلوں سے چھو کر گھونٹ بھرا، پھر سیدھی ہو کر

مسکراتے ہوئے ندرت کو دیکھا۔

”فارس ہم سب کی کوششوں سے باہر آچکا ہے،

آپ یقیناً بہت خوش ہوں گی۔“

بات میں صداقت تھی یا نہیں، انداز ایسا تھا کہ

ندرت نے احسان کے بوجھ تلے سر تسلیم خم کیا۔

”آپ کے ساتھ کا شکریہ!“

”اب آپ کو اسے نارمل زندگی کی طرف لانا ہوگا۔ دوبارہ شادی نئی فیملی وغیرہ۔“
 ”بھی تو۔۔۔“ پچلی نہیں۔ ”بھی دو ہفتے تو ہوئے ہیں اسے رہا ہوئے۔“

”ہاں مگر زرتاشہ کی ڈنٹھ کو تو چار سال ہو چکے ہیں۔ فارس مضبوط اعصاب کا مالک ہے، اب تک اس صدمے سے نکل چکا ہوگا۔“
 ”یہ تو ہے۔“

”آپ کو شاید اب سعدی کی شادی کی فکر ہوگی، اودہ! اور ایسا کرتے ہوئے آپ اپنے بھائی کو بھول گئیں۔“ مسکرا کر اسٹراگلاس میں ہلاتے ہوئے وہ نرمی سے ٹوک گئی۔ تو ندرت کو ڈھیروں شرمندگی نے آن گھیرا۔
 ”نہیں نہیں، فارس کی شادی میرے ذہن میں تھی، میں بس چاہتی تھی کہ وہ ذرا سیمٹل ہو جائے اور پھر وہ مان بھی جائے۔“

”وہ تو مان جائے گا، کون اپنی زندگی کی نئی شروعات نہیں کرنا چاہتا؟ اودہ آئی سی۔ آپ کو یقیناً خاندان والوں کی پریشانی ہوگی۔“ سرابسات میں ہلاتے اس نے ایک اور گھونٹ بھرا۔ ندرت کی آنکھیں اچنبھے سے سکر گئیں۔

”خاندان والے؟“

”وہ تو فارس کو قاتل سمجھتے ہیں نا۔ واقف کلر، چیچ چیچ مگر لوگوں کا کیا ہے، وہ تو زمر کی وجہ سے ایسا سمجھتے ہیں۔ زمر کی اہمیت ہے خاندان میں اس نے کہا کہ ایسا ہے تو ایسا ہے۔ مگر آپ فکر نہ کریں، کسی زمر جیسی لڑکی سے ہی فارس کی شادی کروادیں، سارا مسئلہ حل۔“
 نزاکت سے شانے اچکا کر وہ اسٹراگلاس میں گول گول گھما رہی تھی۔ مسکرا لگی مسکراتی آنکھیں ندرت کے اچھے اچھے چہرے پہ جمی تھیں۔

”زمر جیسی لڑکی؟“

”سامنے کی بات ہے ندرت! لوگوں نے زمر کی بات زمر کی کریڈیٹیلٹی کی وجہ سے مانی۔ آپ کوئی اتنی ہی آن بان اور حیثیت والی لڑکی ڈھونڈیں، لوگوں کو فارس کی بے گناہی کا یقین آجائے گا۔ وہ کہیں گے کہ اگر

فارس بُرا تھا تو یہ رشتہ اس کو کیوں ملتا؟ ایسا نہ کیا تو کل رات فنکشن کی طرح آپ کئی سال لوگوں کو صرف جواب ہی دیتی رہیں گی۔“

ندرت کے چہرے پہ اداسی بکھری۔ کل بھی کتنے لوگوں نے سوال کیا تھا۔ فارس کیا کبھی دوبارہ خاندان میں سر اٹھا کر جی سکے گا؟ ٹھوڑی جھکا کر وہ دل گرفتگی سے بولیں۔

”پتا نہیں لوگوں کو کب یقین آئے گا کہ فارس بے گناہ تھا۔“

”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں، اس کی شادی اور اس کی عزت، دونوں کا سوچیں۔“ نرمی سے انگوٹھیوں والا ہاتھ ندرت کے سونے کے کلمائے ہوئے ہاتھ پہ رکھا۔ ندرت نے آنکھیں اٹھا کر تشکر سے اس کو دیکھا۔
 ”میں بالکل ایسا ہی کروں گی۔ موقع دیکھ کر فارس سے بات کرتی ہوں۔“

”اب آپ کو ہی کچھ کر کے اس کو خاندان والوں کی نظر میں دوبارہ سرخرو کرنا ہے، کیوں کہ اب زمر تو ایک ایک سے نہیں کہے گی نا کہ اس کو فارس کی بے گناہی کا یقین آ گیا ہے۔“ سرسری سا کہتے ہوئے وہ موبائل نکال کر مسئلہ کالز چیک کرنے لگی۔ ندرت نے بے حد چونک کر اسے دیکھا۔

”زمر نے۔ ایسا کب کہا؟“

”ایسا کیا مطلب؟“ جواہرات نے التا حیرت سے ان کو دیکھا۔ ”جج نے اس کو بری کر دیا، زمر قانون سے واقف ہے، وہ بھی کنوینس ہو گئی ہے کہ فارس بے گناہ ہے۔ میرے پوچھنے پہ اس نے خود اعتراف کیا تھا۔ اب فارس پہ شک کرنے کی وجہ کیا رہ جاتی ہے۔“

ندرت نے آدمی بات سمجھتے ہوئے بانی آدمی پہ الجھتے سر ہلا دیا۔ ان کا خیال تھا زمر ابھی تک اپنے بیان پہ قائم ہے مگر شاید وہ بدل رہی تھی۔ جواہرات نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی اور مسکراتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مجھے دیر ہو رہی ہے۔“

”ارے، آپ بیٹھیں نا، جنید اسٹیمپس لا ہی رہا

سے نکلے۔

”یار اسٹین! کدھر ہو؟ اچھا سنو! ایک بندے کو چیک کر کے۔“ دروازہ بند ہوا تو آواز کا راستہ رک گیا۔ وہ لاک کر کے واپس آئی اور بھائی کے کمرے کے پاس رکی۔ ذرا ہچکچا کر بند دروازے کو دیکھا پھر دستک دی۔

وہ جو کمپیوٹر چیر پہ بیٹھا موبائل پہ نمبر ملا رہا تھا، چونک کر سر اٹھایا اور پھر موبائل رکھتے ہوئے مسکرایا۔

”او حنہ! میں تمہارے پاس ہی آنے لگا تھا۔“ مجھے آپ کو کچھ بتانا تھا بھائی! انگلیاں مروڑتی حنین نے خشک ہوتے گلے کے ساتھ الفاظ جمع کرنے چاہے۔ کیسا لگے گا کہنا میں چٹنگ کرتے ہوئے پکڑی گئی تھی اور پھر میں نے ہاشم بھائی کو بلا لیا۔ دونوں فقروں میں سے کس فقرے پہ اس کا اعتبار ٹوٹے گا؟ ظاہر ہے پہلے پہ۔ ہاشم کو کسی اور چیز کے لیے بلایا ہوتا تو خیر تھی مگر چٹنگ۔ وہ کیسے بتائے؟

”ہاں بولو۔“ وہ متوجہ ہو کر سن رہا تھا۔ حنین نے لب کھولے پھر ایک دم خیال آیا۔

”آپ میرے پاس کیوں آنے لگے تھے؟“ ”وہ مجھے ایک کام تھا۔“ کہتے ہوئے اس نے لیپ ٹاپ کے ساتھ رکھی فلیش ڈرائیو اٹھائی، لبوں پہ زبان پھیری اور ہمت مجتمع کرتے ہوئے چہرہ اٹھایا، پھیکا سا مسکرایا۔

”یہ کچھ ڈاکومنٹس میں Decrypt کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر۔“ احتیاط سے قول قول کر الفاظ ادا کیے۔ ”یہ میری قابلیت سے اوپر کی چیز تھی۔ میں اس کو ٹھیک سے آپریٹ نہیں کر پایا اور فائل کرپٹ ہو گئی ہے۔ کیا تم کسی طرح اسے ری کور کرنے میں میری مدد کر سکتی ہو؟“

حنین بنا بلک جھکے چند ثانیے فلیش کو دیکھتی رہی، پھر نظریں اٹھائیں۔ آنکھوں میں صدمہ اور خفگی در آئی تھی۔

”حنہ، پلیز، صرف تھوڑی سی ہیلپ کرو۔“ حنین کی گردن نفی میں ہلی، وہ دو قدم پیچھے ہٹی۔ شکوہ

تھا۔ ”وہ جلدی سے مڑ کر جنید کو پکارنے لگیں، مگر جواہرات نے انہیں روک دیا۔“

”میں ڈانٹ رہی ہوں اور ریسٹورٹس کے کھانے میں ویسے بھی نہیں کھاتی۔ ٹکلف نہ کریں۔“

ندرت کا جوش ماند پڑ گیا۔ خاموشی سے سر ہلا دیا۔

”اس بات کو میرے اور آپ کے درمیان رہنا چاہیے۔ اگر فارس کو علم ہوا تو وہ میری ضد میں مانتے مانتے بھی انکار نہ کرے۔“

”جی بالکل!“ ندرت سمجھ گئی تھیں اور اب وہ اسے کار تک چھوڑنے باہر جا رہی تھیں۔ ذہن میں بہت سے سوالیہ نشان ابھرا بھر کر آرہے تھے۔

زمر جیسی لڑکی۔ زمر جیسی لڑکی؟



بچے کی بات بھی منہ سے نکل ہی جاتی ہے کبھی کبھی کوئی جھوٹی خبر سناتے ہوئے دوپہر اب سہ پہر میں بدل رہی تھی۔ چھوٹے باغیچے والے گھر میں کھانا سیر ہو کر کھا جانے کے بعد غنہ فضا اچھائی تھی۔ حنین لاؤنج میں ڈائجسٹ لے کر صوفے پہ پیر اوپر کر کے بیٹھ گئی تھی اور سیم گول میز سے برتن اٹھاتے ہوئے خفگی سے کہہ رہا تھا۔

”کبھی کوئی کام بھی کر لیا کرو کٹو۔“ مگر وہاں سن کون رہا تھا؟ فارس ہاتھ دھو کر ادھر آیا تو حنہ ہنوز رسالہ پڑھنے میں مگن تھی۔

”دروازہ لاک کر لو میں جا رہا ہوں۔ امی کو تارنا پھر آؤں گا۔“ حنہ نے رسالہ رکھتے ہوئے اسے دیکھا۔ پورے آستین کی شرٹ اور جینز میں ملبوس فارس آنکھوں میں کافی اکتاہٹ لیے بات کرنے کے ساتھ کال بھی ملا رہا تھا۔

”بھائی کہاں ہے ماموں؟“

”اپنے کمرے میں۔“ وہ راہداری میں آگے بڑھتے ہوئے موبائل کان سے لگا رہا تھا جس وقت وہ باہر نکلا اور حنین دروازہ بند کرنے لگی فارس کے الفاظ سماعت

خود بھی الجھاتا تھا۔ کچھ کھٹک رہا تھا۔ حنین جھٹکے سے واپس پلٹی۔

”یہ پھپھونے کہا؟“

سعدی نے اثبات میں سر ہلادیا۔ حنین کے لب بھنج گئے۔ آنکھوں میں ناگواری در آئی۔

”تو آپ نے آگے سے کیا کہا؟“

”میں کیا کہتا؟“

”کم از کم اتنا تو پوچھ سکتے تھے کہ وہ جھوٹ کیوں بول رہی ہیں؟“

”جھوٹ؟“ سعدی کا دھچکا لگا۔

”وہ جھوٹ بول رہی ہیں، وہ اتنی جلدی اور اتنے آرام سے اپنا ذہن نہیں بدلتیں، میں ان کو جانتی ہوں۔“

”زمر جھوٹ نہیں بولتیں۔“

”اوکے مگر وہ وکیل ہیں، انہوں نے الفاظ کا محتاط

چناؤ کیا ہو گا یقیناً“ وہ اداکاری کر رہی ہیں۔“

”تم اتنی جلدی ان کے بارے میں اتنی منفی کیوں ہو جاتی ہو حننا، کیا پتا ان کو واقعی۔“ اسے دکھ ہوا تھا۔

”میں ان کو جانتی ہوں۔ وہ بغیر کسی وجہ کے اتنی بڑی بات نہیں کہہ سکتیں۔ پتا نہیں وہ کیا سوچ رہی ہیں۔“

وہ ناگواری اور غصے سے کہتی باہر نکل گئی۔ سعدی نے افسوس سے سر جھٹکا۔ وہ دونوں اس کو جھننی پیاری تھیں، اتنی ہی وہ ایک دوسرے سے دور تھیں۔ وہ بے دلی سے واپس کرسی پہ ڈھے سا گیا۔ دو انگلیوں میں فلیش اٹھا کر دیکھی۔ آج انھوں دن تھانا کا می کا۔ اب وہ کیا کرے؟ کیسے ثبوت لے کر فارس اور زمر کے پاس جائے؟ اس کے پاس انتقام اور انصاف کا ایک منصوبہ تھا، مگر اس کو فارس اور زمر کی مدد چاہیے تھی۔ اکیلی چیونٹی کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

باہر حنین بیڑا تکی ہوئی واپس صوفے پہ ڈھپ آ بیٹھی۔

”ایسے بیٹھتی ہو، لگتا ہے زلزلہ آرہا ہے۔“ قریب بیٹھے سیم نے رسالے سے سر نکال کر ناگواری سے

کنال آنکھیں بدستور سعدی پہ جمی تھیں۔

”کسی کے ڈاکو منش کو آپ کھولنے کی کوشش کر رہے ہیں اس کا تعلق آپ کے آفس سے ہے یا نہیں، مجھے نہیں پتا، مگر یہ غلط ہے۔ غیر قانونی ہے۔ اور میں ایسے کام نہیں کرتی۔“ سعدی نے گہری سانس خارج کر کے آنکھیں بند کیں۔ پھر کھولیں تو وہ چوکھٹ تک پیچھے ہٹ چکی تھی۔

”ہمارا میچا صرف ایک شخص ہوتا ہے اور وہ ہم خود ہوتے ہیں۔ تم کبھی بھی اس فیز سے نہیں نکلو گی۔ اگر تم اپنی خودد نہیں کرو گی۔“

”میں کسی فیز میں نہیں ہوں، میں ٹھیک ہوں، پہلے جیسی۔“

سعدی نے نفی میں سر ہلایا۔ فلیش رکھی۔ اٹھ کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ وہ ابھی تک ابرو جھینچے اسے دیکھ رہی تھی۔

”تم بدل گئی ہو۔ ایک وقت تھا تم ہمارے خاندان کا سب سے رُاعتماد اور بولڈ بچہ تھیں۔ اب تو تم نے خود کو بالکل عام لڑکیوں جیسا بنا لیا ہے۔“ حنین کے چہرے پہ تاریک سایہ لہرایا، مگر وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں نہیں بدلی۔ اور میں اس سب میں آپ کی مدد نہیں کروں گی۔ یہ غیر قانونی ہے۔“

”ہاں، سارے قانون دان میرے ہی خاندان میں پیدا ہونے تھے۔“ وہ سوچ کر رہ گیا، کیوں کہ حننا اب مڑ کر جارہی تھی۔ اس کے کان سرخ تھے اور آنکھوں میں شدید بے بسی بھرا غصہ تھا۔ بھالی جانتا تھا وہ اب کمپیوٹر استعمال نہیں کرتی، اس نے ڈیڑھ سال پہلے لاؤنج کی کمپیوٹر چیئر بھائی کے کمرے میں شفٹ کر دی تھی۔ کمپیوٹر اچھے نہیں ہوتے، اور اس کے لیے تو بالکل بھی نہیں، سو وہ کس طرح ایسی بات کہہ سکتا تھا؟

”پتا ہے آج مجھے زمر نے کیا کہا؟“ وہ جاتے جاتے رکی۔

”یہ کہ انہیں ماموں کی بے گناہی کا یقین آ گیا ہے۔ وہ اپنے تمام الزامات واپس لیتی ہیں۔“ وہ کہتے ہوئے

تبصرہ کیا، مگر اس نے سنے بغیر (ہونہ) سر جھٹکا۔ پھر ذہن کی رو بھٹک گئی۔ غصہ ادا سی میں بدل گیا۔
”سیم! ایک بات بتاؤ۔“ اس نے کھوئے کھوئے لہجے سے پکارا۔

”کیا میں واقعی بدل گئی ہوں؟“

”کب سے؟“ وہ حیران ہوا۔ (ڈیڑھ سال پہلے سے) اس نے سوچا، مگر سیم کو کیا بتائے؟

”جب سے میں نے لی اے میں ایڈمیشن لیا ہے۔“
”آ۔“ وہ سوچنے لگا۔ ”نہیں تو۔ اب بھی تم اتنا ہی کھاتی ہو، ویسے ہی مذاق کرتی ہو، میرے ساتھ اسی طرح لڑتی ہو اور جب میرے دوست مجھے کچھ کہیں تو ان سے لڑنے بھی اسی طرح پہنچ جاتی ہو۔ تم تو ویسی ہی ہو۔“

”اچھا۔“ وہ ہلکا سا ہنس دی۔ سیم پہ تھوڑا سا پیار آیا مگر ظاہر کیے بنا اس نے کشن اٹھا کر گود میں رکھا اور ادھر ادھر ہاتھ مارا۔ رسالہ غائب۔ وہ حیرت اور پریشانی سے اٹھ کر ڈھونڈنے لگی۔ پھر چونک کر سیم کو دیکھا۔
”تم ڈائجسٹ پڑھ رہے ہو؟ کس نے اجازت دی تمہیں ہاں؟“ لپک کر صوفے تلے سے جوتا اٹھایا۔
”آئے دو آج امی کو میں نے تمہارا حشر نہ کروایا تو دیکھنا۔“ اس سے پہلے کہ وہ غصے سے اس پر جھپٹتی، سیم چھلانگ مار کر چوکھٹ تک گیا اور پھر آگے غائب۔
خنین طیش سے لال سرخ ہوتی، جوتا لیے اس کے پیچھے بھاگی۔

”یہ موٹا آؤ آج بچے گا نہیں۔“

لگا ہو دل تو خیالات کب بدلتے ہیں یہ انقلاب تو ایک بے دلی میں پلتے ہیں شام ایک ٹھنڈی سی چھایا کے ساتھ قصر کاردار پہ اتر رہی تھی۔ لاؤنج کی دیوار گیر فرانیسی کھڑکیوں سے باہر کا سبزہ زار جھلک رہا تھا۔ کونے میں دو کرسیاں ساتھ ساتھ رکھی تھیں۔ دونوں کے بازوؤں کے درمیان گلدستے والی چھولی میز تھی۔ ایک کرسی پہ جواہرات

تھی۔ بال جوڑے میں، کہنی کرسی کے ہتھ پہ، اور چہرے پہ مسکراہٹ لیے وہ اپنی مہمان کو دیکھ رہی تھی۔

وہ مہمانوں کو سامنے بٹھانے کے بجائے برابر کرسی بٹھایا کرتی، اسے گردن بائیں طرف موڑ کر مہمان کو دیکھنا زیادہ پسند تھا۔ گئے برسوں میں اس کرسی پہ سعدی اکثر آکر بیٹھتا تھا۔ اب کبھی کبھی ادھر زمر ہوتی، آج بھی وہی تھی۔

کپ کے کناروں پہ انگلی پھیرتی، وہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے، سنجیدگی سے جیشی تھی۔ بنا مسکراہٹ کے بھوری آنکھیں اور کچھو میں ہاف بندھے گھنگریالے بال جو سمیٹ کر ایک طرف کر رہے تھے۔ دوپٹا گردن میں لپیٹ کر دونوں پلو سامنے کر رکھے تھے۔

”کیا تم پچھتا رہی ہو؟“ جواہرات اس کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔

”ہرگز نہیں بلکہ میں ذہنی طور پہ تیار ہوں۔“
”یہ اذیت ناک ہو گا۔ جس سے نفرت کی جائے اس سے شادی!“ جواہرات نے جھرجھری لے کر انگلی سے گال تک آئے بال ہٹائے۔ زمر نے کپ اٹھا کر گھونٹ بھرا۔

”میں بہت اذیت سے گزری ہوں۔ اور سب سے زیادہ تکلیف دہ بے اعتباری تھی۔“ کپ نیچے کر کے وہ کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی۔ یہاں سے سبزہ زار دکھائی دیتا۔ انیکسی عقبی طرف تھی۔ ادھر سے دکھائی نہ دیتی۔

”اس وقت کسی نے بھی میرا اعتبار نہیں کیا، مگر اب کریں گے۔“

”تم اپنے رشتے داروں کے دباؤ کی وجہ سے اس کا کیس لینے سے انکار نہ کرتیں تو آج وہ جیل میں ہوتا۔“

”بات رشتے داروں کی نہیں ہے۔ میں ایک پبلک پراسیکیوٹن میں ذاتی عناد کو نہیں لاسکتی تھی۔ یہ ذاتی جنگ نہیں تھی۔“ وہ کھڑکی سے نظریں ہٹا کر جواہرات کو دیکھتے ہوئے تلخی سے بولی۔ ”وہ ایک وائف کلر تھا“

سیریل کٹر۔ اس نے مجھے استعمال کیا، پہلی دفعہ تب جب مجھ پہ کوئی چلائی، دوسری دفعہ ڈیرھ سال پہلے جب اس نے میرے کندھے پہ پیر رکھ کر رہائی حاصل کرنا چاہی۔ یہ قانونی جنگ تھی۔ صرف ایک سلی تھی مجھے کہ فارس کا میں نے کچھ نہیں بگاڑا تھا، میں بے گناہ تھی، مگر نہیں۔“ آخر تلخ گھونٹ اندر اتار کر اس نے کپ پرچ میں رکھا۔

”وہ مجھ سے انتقام لے رہا تھا۔ یہ آغاز سے ہی ذاتی جنگ تھی۔ شروع اس نے کی، ختم میں کروں گی۔“ اس نے آگے ہو کر بیالی واپس رُالی میں رکھ دی۔ ”مگر تم کرو گی کیا؟ شادی کر کے تمہیں کیا فائدہ ہو گا؟“

”نہیں مسز کاردار!“ زمر نے گہری سانس خارج کی اور نفی میں سر ہلایا۔ ”میں اور آپ محرم راز نہیں ہیں۔ میں نے مدد مانگی تھی، لائحہ عمل بتانے کا وعدہ نہیں کیا تھا۔“ جواہرات نے مسکرا کر سر جھٹکا۔ ”تم یہ کہہ رہی ہو کہ تمہیں مجھ پہ اعتبار نہیں ہے؟“

”مدد کی حد تک؟ جی ہے۔ مگر اپنے پلانز میں خود تک ہی محدود رکھتی ہوں۔“ وہ سرد سا مسکرائی۔ جواہرات نے اثبات میں گردن کو جنبش دی۔ ”تمہاری مرضی۔ بہر حال، میں اپنا وعدہ پورا کروں گی۔ تم نے اس سے شادی کرنی ہے، میں کروادوں گی۔ اور کل میں تمہارے والد سے ملنے آؤں گی۔“

”شیور!“ اس نے کندھے اچکا دیے۔ ”کیا تم جانتا چاہتی ہو کہ میں یہ کیسے کروں گی؟“ ”نہیں۔ میں قدرتی طریقے سے حیران ہونا پسند کروں گی۔“ وہ رکی۔ ”آپ کو اس سے کیا ملے گا؟“ ”کس سے؟“

”ہم دونوں جانتے ہیں کہ آپ میری مدد اپنے فائدے کے لیے کر رہی ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ کبھی میرا ساتھ نہ دیتیں۔“

جواہرات ہلکا سا ہنس دی۔ ”فارس کے قانونی شیبرز ہیں ہماری جائیداد میں۔ جب تک وہ دوسری چیزوں میں

الجبھار ہے، میرا کاروبار محفوظ رہے گا۔ مگر تم یہ جانتی ہو کہ میں تمہیں استعمال کر رہی ہوں، تو میرا ساتھ کیوں دے رہی ہو؟“

”ناکہ آپ کو واپس استعمال کر سکوں!“ وہ مسکرا کر اٹھی، پرس کی اسٹریپ کندھے پہ لٹکائی۔ ”آخری بات جو مجھے کہنی تھی۔ میں تیار ہوں۔“ ”میں بھی!“ ایر رنگ پہ انگلی پھیرتے ہوئے جواہرات مسکرائی۔

اس کے جانے کے بعد اسی کرسی پہ بیٹھے، جواہرات نے موبائل پہ نمبر ڈائل کیا۔ یوسف خان صاحب۔ ”السلام علیکم۔“ وہ کافی دیر بعد فون اٹھلپائے۔ ”وعلیکم السلام یوسف صاحب! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔“

”اللہ کا شکر ہے۔“ وہ چند رسمی فقروں کے بعد کہنے لگے۔

”آپ نے دو ڈھائی ماہ قبل مجھے کال کر کے کہا تھا کہ میں زمر کو سمجھاؤں، نا کہ وہ شادی کر لے۔“ ”جی۔ میں یہ ہر اس شخص سے کہتا ہوں جو زمر کے قریب ہو۔“ وہ سنجیدہ اور قدرے خشک تھے۔ جواہرات کا ٹاپس کو مسلتا ہاتھ رکا، ذرا دیر کو اس نے سوچا۔

”اگر آپ میرے گارڈ کی اس نیکلس کے لیے تلاشی والی بات پہ ہم سے خفا ہیں تو میں معذرت کرتی ہوں۔ وہ سب ایک غلط فہمی تھی۔“ ”نہیں، کوئی بات نہیں۔“

”اوکے۔ تو میں یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ کل رات فنکشن میں میری زمر سے بات ہوئی تھی۔ میں نے اسے بہت سمجھایا ہے۔ امید ہے وہ جلد مان جائے گی۔“

بڑے ابا چونکے۔ ”تو آپ نے بات کی تھی زمر سے؟“

”جی۔ میں نے آپ سے وعدہ کر رکھا تھا۔ بس موقع کل رات ملا۔“

”اچھا۔“ ان کے لمبے کی سرد مہر زائل ہونے

گئی۔ ”زمر نے مجھ سے صحبت کی تھی، وہ شادی کے لیے رضامند ہے۔“
”گڈ۔ مگر مجھے حیرت نہیں ہے۔ میں ناکام نہیں ہوا کرتی۔“

”آپ کا۔ شکر۔ مسز کاردار۔“
”ملی پلیزر۔“ مسکراتے ہوئے بدستور ایر رنگ پہ انگلی پھیرتے وہ کھڑکی کے پار دیکھ رہی تھی۔ ”کوئی رشتہ ڈھونڈا آپ نے؟“

”نہیں، ابھی تو ندرت سے بات کی ہے۔ وہ شاید کوئی بتائے۔“

”اوکے، میں نے بھی چند ایک لوگوں سے کہہ رکھا تھا۔ دور رشتے ہیں جو دلچسپی رکھتے ہیں۔ آپ تفصیلات جاننا چاہیں گے؟“

”جی، بتائیے۔“ بڑے ابا بمشکل اپنی آواز کی ضعیف خوشی چھپا رہے تھے۔

”ایک سیشن کورٹ کے جج صاحب کا رشتہ ہے۔ بیوی سے علیحدگی ہو چکی ہے اور تینوں بچے بورڈنگ میں پڑھتے ہیں۔“ ذرا دیر کو وقفہ دیا۔ بڑے ابا کی لائن خاموش تھی۔ ”دوسرا رشتہ میری کمپنی کے ایک عہدے دار کا ہے۔ پہلی شادی کم عمری میں ہوئی تھی، بیوی اور اس سے ہوئے دونوں بیٹے گاؤں میں رہتے ہیں۔ وہ صاحب خود اسی شہر میں ہیں، کیلا اچھا گھر ہے، عمر ذرا زیادہ ہے، پچاس سے اوپر۔ آپ سن رہے ہیں۔“

”جی ہاں۔“ ان کی آواز بدلت نکلی تھی اور اس میں بھی تکلیف تھی۔

”یوسف صاحب! حقیقت پسندی سے کام لیجئے۔ آپ کی بیٹی تیس بیس سال کی ہے، اس کے گردے ضائع ہو چکے ہیں، بیمار ہے، ایسے میں کسی نوجوان خوب صورت لڑکے کا رشتہ ملنا تو معجزہ ہو گا اور معجزے کم ہی ہوا کرتے ہیں۔“

”میں جانتا ہوں، مگر۔“ وہ رک گئے، کیا کہیں اب؟

”ہاں۔ ایک شخص اور بھی ہے، ہاشم کی عمر کا ہے،

ہینڈ سم بھی ہے، پہلی بیوی مر چکی ہے، مگر۔“
”مگر کیا؟“ بڑے ابا تیزی سے بولے۔ امید کی کرن چمکی تھی۔

”مگر آپ کی کیا گارنٹی، آپ اس سے شاید رشتہ نہ ہی کریں۔“ اس نے ذرا سا وقفہ دیا۔ بڑے ابا بے چینی سے منتظر تھے۔

”میں فارس کی بات کر رہی ہوں۔“
”اور بڑے ابا کو اتوار کے اس گرم دن میں لگنے والا یہ دوسرا جھٹکا تھا۔“

”قالہ رس؟“ وہ اٹکے۔ آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”ندرت آج کل فارس کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی ہے۔ تو آپ اس سے زمر کی بات کیوں نہیں کر لیتے؟ اس سے اچھا آپشن آپ کو نہیں ملنے والا۔“
”مگر فارس کے لیے زمر۔“

”کیا زمر؟ اسے عدالت نے بری کیا ہے، اور اب زمر اس کو مورد الزام ٹھہرانا چھوڑ چکی ہے۔ پرانی باتوں کو بھول جائیے۔“ اس نے خفگی سے ٹوکا۔

”مسز کاردار! آپ سمجھ نہیں رہیں۔ فارس کا۔ وہ ابھی ابھی رہا ہو کر آیا ہے، وہ خود مسئلوں میں گھرا ہے، ایسے میں۔“

”آپ نے پہلے بھی اس کے رشتے سے انکار کر دیا تھا، تب کیا وجہ تھی؟“
وہ چپ سے ہو گئے۔

”آپ شاید اس کو ہمیشہ سے اپنی بیٹی سے کم تر سمجھتے رہے ہیں۔“

”ایسی بات نہیں ہے، مجھے وہ بہت پسند ہے، مگر وہ خود نہیں مانے گا، زمر بھی نہیں مانے گی۔“

”آپ مان جائیں تو وہ بھی مان جائیں گے۔“
”زمر بھی بھی نہیں مانے گی، وہ تو اس کا ہمارے گھر آنا تک برداشت نہیں کر سکتی۔“

”وہ تو شادی کے لیے بھی نہیں مانتی تھی۔ میں نے منالیا تھا۔ بہر حال میں فارس کے ساتھ دو چار روز میں آپ کی طرف چکر لگاؤں گی۔ آپ تینوں رشتوں کے

بارے میں سوچ لیں۔ تین بچوں کا باپ جج، پچپن سالہ کمپنی عہدیدار یا فارس اور اگر تینوں نہیں قبول تو اس دفعہ اپنی بیٹی کے مجرم آپ ہوں گے ٹیک کیر۔“
مسکراتے ہوئے فون رکھ دیا اور بہت طمانیت سے کھڑکی کے باہر سبزہ زار کو دیکھنے لگی، جہاں فینٹونا اپنی نگرانی میں ملازموں سے گلے رکھوا رہی تھی۔
جواہرات کو موسم زیادہ خوش گوار لگنے لگا تھا۔
سب ٹھیک جا رہا تھا۔



خدا یا تیرے دم سے اپنا گھر اب تک سلامت ہے وگرنہ دوست اور دشمن ہمارے ایک جیسے ہیں رات کھانے کے بعد وہ چھوٹے باغچے والے گھر سے باہر نکل آیا۔ سڑک کنارے چلتے کاتوں میں ہینڈ فری لگا کر وہ موبائل کو ہاتھوں میں پکڑے کوئی نمبر مارتا تھا۔

”سعدی۔۔۔ تمہاری ہاشم سے بات ہوئی؟“ شہرین نے کال اٹھاتے ساتھ پوچھا۔ ایرفون میں گو بجتی اس کی آواز میں شدید اضطراب تھا۔

”کیوں نہ پہلے آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کی ہاشم بھائی سے کیا بات ہوئی؟“ وہ سختی اور درشتی سے کہتا قدم قدم چلتا جا رہا تھا۔

”میری بات؟ کیا مطلب؟“
”آپ نے ان کو بتا دیا کہ میں نے ان سے وہ چرایا ہے جو انہوں نے ہم سے چرایا تھا۔“

”میں نے ایسے نہیں۔“ وہ انکی۔ ”وہ مجھ پہ چلا رہا تھا، مجھے دھمکی دے رہا تھا، مجھے معلوم نہیں کہ میں کیا کہتی گئی۔ بلکہ میں نے تو یہ کہا بھی نہیں کہ تم نے۔“

”مگر آپ نے میری بات تو دہرا دی نا ان کے سامنے۔“ طیش سے اس کی آواز بلند تھی۔
”اس سے کیا ہوتا ہے؟“

”اس سے یہ ہوتا ہے کہ میں نے پہلی دفعہ آپ پہ اعتبار کر کے غلطی کی۔ بلکہ نہیں اعتبار تو اس دفعہ بھی

نہیں کیا تھا، بس کام کہہ کر غلطی کی اور اس سے یہ بھی ہوتا ہے کہ شہرین بیگم! آج سے آپ اکیلی ہیں۔ مجھے رتی برابر بھی پروا نہیں ہے کہ سونیا آپ کے ساتھ جائے یا نہیں۔ اس لیے آپ اپنی تمام جنگیں اکیلے لڑیں گی۔“

”تم میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہو؟ تم نے مجھے اس کام میں پھنسا دیا اور۔“

”میں آپ کے اس سے بڑے کام کر چکا ہوں اور یہ کام میں نے آپ کو اس لیے دیا کہ آپ بھی ہاشم بھائی سے انتقام لینا چاہتی تھیں، کم از کم کہتی تو یہ ہی رہی ہیں آپ۔ لیکن آج سے ہم ایک ٹیم نہیں ہیں، اللہ حافظ۔“ زور سے سرخ بٹن دبا کر کل کل۔

آنکھوں میں شدید خفگی اور غصہ لیے وہ واپس گھر کی طرف مڑ گیا۔

شہرین کی تین چار کالز آئیں، اس نے سب کالٹ دیں۔ پھر تنگ آ کر فون سائیلنٹ پہ لگا دیا۔

واپس اندر آیا تو امی خاموش سی لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔ لی وی چل رہا تھا۔ خمین پاؤں اور کر کے بیٹھی، ہتھیلیوں پہ چہرہ گرائے شوق سے ڈراما دیکھ رہی تھی۔ اب وہ صرف وہی ڈرامے دیکھتی تھی جو لی وی پہ لگ جاتے۔

ای البتہ کسی گہری سوچ میں تھیں۔
وہ ایرفونز اتارتے ہوئے ندرت کے ساتھ دھپ سے صوفے پہ گرا۔ وہ پھر بھی نہیں چونکیں۔ سعدی نے پلکیں سکیر کر غور سے ان کو دیکھا۔

”ندرت بہن! پریشان لگ رہی ہیں آپ؟“
معصومیت سے پوچھا۔ انہوں نے خفگی سے اس کو دیکھا۔

”کچھ نہیں۔“

”کچھ تو ہوا ہے۔ بتائیں میں حل کرتا ہوں ابھی آپ کا مسئلہ۔“ وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے سیدھا ہو کر بیٹھا۔

”میں سوچ رہی ہوں، فارس کی شادی کر دینی چاہیے۔“

حنین اور سعدی دونوں نے چونک کر ان کو دیکھا۔ وہ سوچ سوچ کر بول رہی تھیں۔ حنا کے ماتھے پہ بل پڑے۔

”ماموں کی شادی؟ مگر امی! وہ ابھی تو باہر آئے ہیں، ان کو سانس تو لینے دیں۔“

”حنین ٹھیک کہہ رہی ہے امی! وہ پہلے ہی دوسرے چکروں میں ہیں، ان کو ابھی تنگ نہ کریں۔“

”چپ کرو تم دونوں۔ پتا نہیں ہے کسی بات کا اور ماں کو مشورے دے رہے ہو۔“ وہ خفگی سے کہہ کر اٹھ گئیں اور میز پر رکھے برتن اٹھا کر پچن میں لے گئیں۔ جب واپس آئیں تو وہ دونوں بھول بھال کرٹی وی دیکھ رہے تھے۔

”بڑے لاپا کا فون آیا تھا۔ کہہ رہے تھے۔ زمر شادی کے لیے مان گئی ہے۔ فنکشن میں جانے اور رشتے داروں سے ملنے کا اس پہ مثبت اثر ہوا ہے۔“ وہ کشن ٹھیک کر کے رکھتی، سرسری انداز میں بتا رہی تھیں۔ حنین اور سعدی نے ایک دم ایک دوسرے کو دیکھا۔

”اچھی بات ہے نا۔“ ندرت نے فالتو کشن اٹھا کر بیڈ روم کی رف جاتے پوچھا۔

”جی۔“ حنین بے زاری سے کہہ کر واپس ٹی وی دیکھنے لگی۔

”جی۔“ سعدی البتہ دھیماسا بولا۔ چاہنے کے باوجود وہ خوش نہیں ہو سکا۔ کہیں کچھ غلط تھا۔

میں دوستوں کے اک اک امتحان سے گزرا ہوں بکھر گیا ہوں کئی راستے بناتا ہوا

قصر کاردار پہ اگلی صبح پہلے سے بھی گرم طلوع ہوئی تھی۔ ہاتھم برآمدے کی سیڑھیاں اترتا، نیچے کھڑی کار کی طرف جا رہا تھا۔ شو فر کے سلام کا سپاٹ چہرے اور سر کے خم سے جواب دیتا وہ اندر بیٹھا تو شو فر نے دروازہ بند کر دیا۔ جواہرات نے ستون کے ساتھ کھڑے ہو کر یہ دیکھا، یہاں تک کہ اس کی کار روش پہ چلتی گیٹ پار کر گئی۔

”میم! کار تیار ہے۔“ فینونا نے سامنے کھڑی کار

کے بارے میں یاد دہانی کراتے ہوئے اسے پکارا، جو گردن میں موتیوں کی لڑی پہ انگلی پھیر رہی تھی۔ بال جوڑے میں باندھے اور لمبی قمیص پہ سفید فٹل منی کوٹ پہنے، وہ سوچ میں گم کھڑی تھی۔ پھر یکایک زینے اترنے لگی۔ فینونا پیچھے آئی تو جواہرات رکی، گھور کر اسے دیکھا، فینونا کے قدم منجمد ہو گئے، فوراً سر جھکا کر پیچھے ہو گئی۔

جواہرات زینے اتری۔ سبزہ دار عبور کیا۔ گھوم کر گھر کے عقب میں آئی۔ سبز پہاڑی یہاں نشیب میں ڈھل جاتی۔ وہ قدم قدم اترتی نیچے انیکسی تک آئی، دروازہ کھٹکھٹایا۔

چند ہی لمحوں میں وہ کھلا تو فارس نظر آیا۔ وہ ٹراؤزر اور پوری آستین کی ٹی شرٹ میں ملبوس تھا۔ کافی پہلے کا اٹھا ہوا لگتا تھا۔ اسے دیکھ کر آنکھیں سیکڑیں اچکھٹے سے پھر پیچھے ہوا۔ ”آئیے۔“

”صبح بخیر۔“ وہ مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ باریک ہیل سے چلتی، راہ داری عبور کر کے لونگ روم میں آگئی، جس کے ساتھ اوپن کچن تھا۔ گھوم کر اطراف کا جائزہ لیا۔

”گھر کو کافی رینوویشن کی ضرورت ہے اور صفائی کی بھی۔ تم اجازت دو تو میں فینونا کو بھیج دیا کروں؟“ کچن کاؤنٹر کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے اس نے فارس کو مخاطب کیا۔

”ضرورت نہیں۔“ وہ آگے آیا، چائے تلے آنچ بند کی اور اوپر کینسٹ سے شیشے کا گلاس نکالا۔ زرتاشہ کے جینز کے برتن جن میں سے اکثر ڈبا پیک تھے، گلاس ٹل سے دھویا اور الٹا کر اسٹینڈ پر رکھا۔ پھر فریج تک آیا۔ جواہرات سینے پہ بازو لپیٹے، ایک ہاتھ بدستور گردن کے موتیوں پہ پھیرتی مسکرا کر اسے دیکھتی رہی۔

”ایک کام تھا تم سے۔ دوپہر کو مجھے زمر کے گھر لے جاؤ گے؟“

فریج سے جوس کا ڈبا نکالتا فارس لمحے بھر کور کا پھر دروازہ بند کرتا کاؤنٹر تک آیا۔ چہرہ ویسے ہی سپاٹ رہا۔

”کیوں؟ ڈرائیور کہاں گیا آپ کا؟“

”تمہیں میرا ڈرائیور بننے پہ اعتراض ہے کیا؟“
”نہیں“ مجھے کام سے جانا ہے دوپہر میں۔“ وہ شیشے
کے گلاس میں جوس کا ڈبا اٹھیل رہا تھا۔ نارنجی رس
سے گلاس بھرنا گیا۔
”کہہ رہا تھا ہے؟“

”ایک دوست سے ملنے۔“

”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ جاتے ہوئے مجھے
ڈراپ کر دینا اور واپسی پہ پک کر لینا۔“ فارس نے
گلاس اسے پیش کیا تو اس نے پکڑتے ہوئے شانے
اچکا کر گویا بات ختم کر دی۔

”بہت اچھا۔“ وہ مڑ کر چولے تک آیا اور مک میں
اپنی چائے اٹھ لینے لگا۔

”میں نے یوسف صاحب کو بتایا تھا کہ تم میرے
ساتھ آؤ گے۔ وہ چاہتے ہیں تم اور میں کھانا ان کے
ساتھ کھائیں۔ کافی خوش ہوئے تمہارا سن کر۔“

فارس نے چونک کر اسے دیکھا اور کیتلی واپس
چولے پہ رکھی۔ ”آپ یوسف صاحب سے ملنے
جاری ہیں؟“

”ہوں۔“ جوس کا گھونٹ بھر کر مسکرائی۔ ”زمر
کے رشتے کے لیے انہوں نے مجھے کہہ رکھا تھا۔ دو
پروپونل ہیں وہی بتاتے ہیں ان کو۔“

وہ مقابل کلونٹر سے ٹیک لگا کر کھڑا تھا، نظریں چائے
پہ جھکاتے ایک گھونٹ بھرا۔ بولا کچھ نہیں۔ انداز البتہ
ست تھا۔ جواہرات اس کی آنکھوں پہ نگاہیں جمائے
ہوئے تھی۔

”ایک جج کا ہے، عمر پچاس سال سے اوپر، پہلی بیوی
کو طلاق دے چکا ہے، تین بچے بھی ہیں۔ دو سرامیری
کمپنی میں ملازم ہے۔ عمر اس کی بھی اتنی ہی ہے، مگر
پہلی بیوی اور بچے گاؤں میں رہتے ہیں۔“ کہہ کر اس
نے اپنے حلق میں شیریں گھونٹ اٹھایا اور فارس نے
کڑوا گھونٹ۔ دونوں نے اپنے اپنے جام نیچے کیے تو
انیکسی میں خاموشی چھا گئی۔

”تمہیں تو معلوم ہے زمر کے والد بیمار رہتے ہیں“

اپنی بیٹی کی بہت فکر ہے ان کو۔ وہ ہے بھی گردے کی
مروغی۔ جانے کب تک یہ عطیہ شدہ گردہ چل
پائے۔“

فارس نے کچھ نہیں کہا۔ ایک گھونٹ مزید بھرا۔
جواہرات نے قدرے بے چینی سے اس کی آنکھیں
دیکھیں۔

”تمہیں شاید میری بات میں دلچسپی نہیں۔ اہ! یہ
مت کہنا کہ تم ابھی تک زمر سے پرانا بغض پالے
ہوئے ہو۔ اب تو وہ تمہارے خلاف بیان واپس لے
چکی ہے اب تو بھول جاؤ۔“

فارس نے چونک کر اسے دیکھا۔ جواہرات نے
مصنوعی حیرت خود پہ طاری کی۔

”اوہ۔ تمہیں تمہیں معلوم تھا؟ جج نے تمہیں بری
کر دیا تو اس نے بھی تمہارے بارے میں کئی ہر بات
واپس لے لی۔ اس والد، ندرت، سعدی، سب کے
آگے ہی اس نے یہ بات کہی وہ اب تم پہ کوئی الزام نہیں
لگائے گی۔“

”اسی لیے اس نے پچھلے ہفتے مجھے اپنے گھر سے
نکالا تھا؟“ وہ سنجیدہ لہجے سے بولا تو جواہرات لمحے بھر کو
چپ ہو گئی۔ پھر لا پرواہی سے شانے اچکائے۔

”یہ انسانی فطرت ہے۔ یقین کے قریب ہو کر بھی
شک آخری جھٹکا ضرور لگاتا ہے، پوری قوت سے، مگر
اس کے بعد امن ہو جاتا ہے۔“

”واٹ ایور!“
چند لمحے مزید خاموشی سے گزر گئے۔ پھر وہ ذرا سا
کھنکھاری۔

”تمہارا آگے کا کیا ارادہ ہے؟“
”نہیں۔ میں یہ گھر نہیں چھوڑ رہا۔ اگر آپ یہ
پوچھنے آئی ہیں تو۔“

”کیسی باتیں کرتے ہو ہنی! میں تمہیں یہاں دیکھ کر
سب سے زیادہ خوش ہوں۔ تمہیں یہیں رہنا چاہیے،
بلکہ جاب اشارٹ کرو کوئی، شادی کرو، زندگی کو سہیل
کرو۔ وہ ایک طوفان تھا، آیا اور گزر گیا۔ اس سب کو
بھول جاؤ۔“

”سز کاردار! طوفان کے گزر جانے سے جڑ سے اکڑے درخت واپس نہیں لگ جایا کرتے۔“
 ”تو نئے بیج بوقے نئے رشتے بناؤ۔ شادی کرلو فارس! ورنہ کبھی آگے نہیں بڑھ سکو گے۔“
 ”میرے پاس اور بہت کام ہیں۔“ وہ تلخی سے کہتا
 آخری گھونٹ اندر اٹھلتا مڑ گیا۔

جواہرات نے ذرا جوس بچا کر گلاس کاؤنٹر پہ رکھا، اس کا شانہ تھپکا اور ”دوپہر کو ملتے ہیں“ کہہ کر آگے نکل گئی۔ فارس آنکھوں میں ناپسندیدگی لیے اسے جاتے دیکھتا رہا۔

ہر سمت سپیرے ہیں جمائے ہوئے ڈیرے
 اس شہر میں سانپوں کے خریدار بہت ہیں
 دوپہر طلوع ہوئی تو اتنی سنہری کہ ہر چمکتی شے سونا
 دیکھنے لگی۔ یوسف صاحب کا گھر بھی دھوپ میں جھلس
 رہا تھا۔ جب زمر فائلز اور پرس پکڑے اندر داخل
 ہوئی۔ راہ داری سے گزرتے ہوئے وہ ڈرائنگ روم
 کے جالی دار پردے کے پاس رکی۔ جالی کے پار صوفے
 پہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے جواہرات نمکنت سے بیٹھی
 نظر آرہی تھی۔ انگلی پہ مسلسل لاکٹ کی چین لیٹتی وہ
 مسکرا کر ابا کو سن رہی تھی جو مقابل وہیل چیئر پہ بیٹھے
 مدھم آواز میں کچھ کہہ رہے تھے۔ زمر نے سامنے سے
 آتے صداقت کو چیزیں تھما میں اور کھنکھارتے
 ہوئے اندر داخل ہوئی۔ جواہرات نے مسکرا کر گردن
 اٹھاتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہ سنجیدگی سے سلام کر کے
 سنکل صوفے پہ ٹک گئی۔ غموں کے فرق کے باوجود
 دونوں عورتوں میں کچھ بہت مشترک سا تھا۔ شاید تنی
 ہوئی گردن شاید گہری آنکھیں۔

”تمہارے والد نے مجھے اچھی خبر سنائی ہے، تم شادی کے لیے رضامند ہو۔“

زمر نے خاموش نگاہ بڑے ابا پہ ڈالی۔ وہ مطمئن اور خوش نظر آرہے تھے۔

”اگر کوئی مجھ سے شادی پہ رضامند ہوا تو شیور!“

”اور تم یہ فیصلہ اپنے والد پہ چھوڑ چکی ہو؟“

”بالکل!“ اس نے شانے اچکائے۔

”واقعی زمر!“ جواہرات نے تکیہ، مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ”وہ جس سے چاہیں تمہاری شادی کروادیں یہ بات دل سے کہی یا اوپر اوپر سے؟“
 ”جب کہہ دی ہے تو پورا کروں گی۔“ وہ بے تاثر تھی۔

”اور اگر تمہارے والد فارس کو منتخب کر لیں تمہارے لیے؟ کیا کر لو گی اس سے شادی؟“

بڑے ابا نے ایک دم پریشان ہو کر جواہرات کو دیکھا۔ گویا اسے روکنا چاہا، مگر وہ لاکٹ کی چین انگلی پہ لیٹتی زمر کو مسکرا کر دیکھے جارہی تھی۔ بڑے ابا نے بحرمانہ انداز میں گردن موڑی۔ زمر لب بچتے جواہرات کو دیکھ رہی تھی۔ خلاف معمول اس نے اس بات پہ کھڑے کھڑے جواہرات کو گھر سے نہیں نکالا تھا۔

”تمہاری خاموشی سے میں کیا سمجھوں؟ یہ ہی کہ تم نے رضامندی کا اظہار محض اوپر سے کیا تھا؟ درحقیقت تم اپنے والد کو یہ حق نہیں دے رہیں۔ کیا یہ تمہارے والد کے ساتھ وعدہ خلافی نہیں ہے؟“

”ایسا نہیں ہے۔“ وہ تیزی سے بولی پھر چپ ہو گئی۔

”میرا اور تمہارے ابا کا خیال ہے کہ فارس تمہارے لیے بہترین انتخاب ہے۔ پلیز وہ پرانی باتیں مت دہرائو۔ تم خود بھی جانتی ہو کہ وہ سچ نہیں تھا۔ اب بتاؤ اپنی زبان پہ قائم ہو؟“

بڑے ابا بے چارگی سے اسے تک رہے تھے مگر خلاف توقع زمر سپاٹ نظروں سے جواہرات کو دیکھتی رہی۔

”قائم ہوں۔ جانتی ہوں ابا میرے لیے غلط فیصلہ نہیں کریں گے۔“ ضبط سے الفاظ ادا کیے۔

”تم سوچ لو، یہ تو بس ہمیں یوں ہی خیال آیا تو۔“ وہ شرمندہ سے وضاحت کر رہے تھے۔

”سوچ چکی سبب جو مرضی آئے کریں۔“

”اور ہاں! فارس ابھی مجھے یک کرنے آئے گا۔ اگر تمہارا دوبارہ اس کو گھر سے نکلنے کا ارادہ ہے تو ابھی بتا دو، تاکہ میں اسے منع کروں۔“

زمر نے بہت ضبط سے خود کو بھڑکنے سے روکا اور آہستہ سے بولی۔

”میں نے اس دن غلط کیا تھا“ مجھے ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اگلی ایم سوری ابا!“ وہ ایک دم انٹھی اور باہر نکل گئی۔ راہ داری میں آکر گہرے سانس لے کر خود کو تار مل کرنا چاہا، مگر پرانی باتیں، یادیں سب اہل اہل کر جیسے باہر آ رہا تھا۔ وہ دل پہ ہاتھ رکھے، آنکھیں بند کیے، راہ داری کی دیوار کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ اندر جواہرات سہولت سے کہہ رہی تھی۔

”اسے منانا مشکل نہیں تھا۔“

”اسے ماننا نہیں کتے۔ احتجاج کتے ہیں۔“ وہ نفی میں سر ہلاتے افسوس کر رہے تھے۔ جواہرات نے بمشکل ناگواری چہرے سے چھپائی۔

”زمر کو کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔ وہ اپنا اچھا برا سوچ کر ہی جواب دے رہی تھی۔ اسے فارس سے شادی پہ کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔“ (پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے بول بول کر وہ تھک گئی، مگر یہ ابھی وہیں اٹکے تھے۔)

تب ہی اس کا موبائل بجا۔ جواہرات نے نہیں اٹھایا، اسی طرح بیٹھی رہی۔

”فارس باہر لینے آیا ہے مجھے۔ آپ یوں کیوں نہیں کرتے کہ باہر دروازے تک چلے جائیں اور اسے اندر لے آئیں۔ میرے کہنے پہ تو وہ کبھی نہیں آئے گا۔“

بڑے ابا نے اثبات میں سر ہلایا اور وہیل چیئر کے پے چلاتے مڑ گئے۔ ساتھ میں صداقت کو آواز بھی دی۔ جب وہ واپس آئے تو فارس ان کے ساتھ تھا۔ زمر اس دوران اندر جا چکی تھی۔ وہ آرام نہ نہیں تھا، مگر مجبور تھا۔ خاموشی سے اس سنگل صوفے پہ بیٹھ گیا۔ جہاں سے ابھی زمر اٹھ کر گئی تھی۔

”طبیعت کیسی ہے آپ کی؟“ وہ مدھم آواز میں پوچھ رہا تھا۔ دائیں ٹانگ بائیں گھٹنے پہ رکھے، کہنی صوفے کے ہتھ پہ۔ بس جلدی سے وہ یہاں سے نکل جائے۔

”اچھا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ تم آئے تمہارا

بہت شکریہ فارس!“

وہ دونوں چند رسمی کلمات کا تبادلہ کر رہے تھے۔ جواہرات نے بوری ہو کر آنکھیں گھمائیں۔ چند ثانیے مزید سر کے صداقت چائے سرو کر کے جا چکا تو جواہرات ذرا سا کھنکھاری۔ دونوں نے اسے دیکھا۔

”میرا خیال ہے کہ یہ ایک اچھا موقع ہے، تم سے بات کرنے کا فارس!“

بڑے ابا بری طرح چونکے۔ فارس بھی دھیان سے سننے لگا۔

”یوسف صاحب کا تم کتنا احترام کرتے ہو، ان کے تم پہ کتنے احساسات ہیں، کتنے برے وقتوں انہوں نے تمہاری مدد کی، ہم سب اس سے واقف ہیں۔“

زمر پھر سے راہ داری میں آکر کھڑی ہوئی۔ دھڑکتے دل سے وہ دیوار سے لگی بن رہی تھی۔

”جی!“ فارس نے اچھٹے سے جواہرات کو دیکھتے سر ہلایا۔

”ایسے میں یوسف صاحب کا حق ہے کہ وہ اپنے بیٹے کی طرح سمجھ کر تم سے ایک سوال کر سکیں۔“ بڑے ابا نے بے چینی سے جواہرات کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ باز رہنے، خاموش رہنے کا اشارہ، یہ سب بہت جلدی ہو رہا تھا، مگر وہ ان کو دیکھے بنا، مسکراتے ہوئے فارس سے کہے جا رہی تھی۔

”میں سن رہا ہوں، آپ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔“ ”میں تو۔“ وہ جلدی سے کوئی بات بنانا چاہتے تھے۔ مگر۔

”وہ چاہتے ہیں کہ زمر کا جو رشتہ تم نے چند برس قبل مانگا تھا، اس کا جواب وہ آج دیں، کیونکہ اس وقت کا جواب ان سے پوچھے بنا دیا گیا تھا، اگر ان سے پوچھا جاتا تو ان کا جواب مختلف ہوتا۔“

فارس بالکل رک کر انہیں دیکھنے لگا، جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو۔

”یوسف صاحب یہ چاہتے ہیں کہ تمہاری اور زمر کی شادی ہو جائے۔“

اس کا سانس واقعتاً ”تھم گیا۔ بے اختیار ابا کو

دیکھا۔ انہوں نے چارگی سے چہرہ جھکا لیا۔
 ”کوئی جلدی نہیں ہے، تم سوچ سمجھ کر جواب
 دینا۔“ جواہرات نے تیزی سے کہا، مبادا وہ انکار ہی نہ
 کر دے، بڑے ابا نے سر اٹھایا۔

”اور کوئی زبردستی بھی نہیں ہے بیٹا! بس ایک خیال
 تھا کہہ دیا۔ تم نہ کہہ دو تب بھی ہمارے تعلقات ویسے
 ہی رہیں گے۔“

فارس نے بمشکل سر اثبات میں ہلایا۔ وہ کچھ بولنے
 کے قابل نہیں رہا تھا۔

”یوسف صاحب بہت پریشان رہتے ہیں زمر کے
 لیے، ان کو اپنی زندگی کا بھی کوئی بھروسہ نہیں، وہ اپنے
 سامنے اپنی بیٹی کو کسی ایسے شخص کو سونپ کر جانا چاہتے
 ہیں جس پر وہ اعتبار کرتے ہوں اور تم وہ واحد شخص ہو
 فارس!“ جواہرات نرمی سے سمجھا رہی تھی۔

”میں۔۔۔ مجھے کچھ وقت دیں۔“ بدقت وہ کہہ پایا
 پھر ایک سلگتی نظر جواہرات پر ڈالی۔

”میں باہر انتظار کر رہا ہوں آپ کا۔“ اور اٹھ کھڑا
 ہوا، جیسے مزید وہاں بیٹھنا دو بھر ہو۔ بڑے ابا نے یاسیت
 سے اسے جاتے دیکھا۔ وہ ان سے نگاہ ملائے بغیر دھیمہ
 سا سلام کہہ کر باہر نکل آیا۔

راہ داری میں وہ ٹھٹکا۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ
 زمر کھڑی تھی۔ ساکت، زرد سفید چہرہ لیے، ضبط کی
 انتہا پر۔ بس ایک لمحے کو رک کر اس نے زمر کو دیکھا،
 مگر وہ منہ پھیر گئی، وہ بھی نہیں رکا۔ تیز تیز قدموں سے
 چلتا دھنپار کر گیا۔

جواہرات چند ثانیے مزید ابا کو تسلی دیتی رہی اور
 جب نکلی تو زمر ہنوز کھڑی تھی۔ اس کا سفید چہرہ اب
 اہانت سے گلایا پڑتا جا رہا تھا۔

”یہ کیا تھا؟“ وہ بلی بلی سی غرائی تھی۔ آواز بہت
 دھیمی رکھی۔ ابا نہیں سن سکتے تھے۔

”تمہارا پچاس فیصد کام ہو گیا۔“

”مگر اسے میرا رشتہ لے کر آنا چاہیے تھا، نہ کہ میرا
 باپ اس کی منت کرتا۔“ وہ ضبط کے مارے پھٹ بھی
 نہیں سکتی تھی۔ ”یہ پلان کا حصہ نہیں تھا۔“

”تم نے پلان سنا ہی کب تھا؟“ وہ شانے اچکا کر
 موبائل پر بٹن دبانے لگی۔ زمر آنکھوں میں تپش لیے
 اسے گھور رہی تھی۔ جواہرات نے تھکی ہوئی سانس
 اندر کھینچی۔

”تم کیوں فکر کرتی ہو؟ شادی کرنی ہے نا، ہو جائے
 گی۔ چاہے جیسے بھی ہو۔ دیکھو! میں زیادہ قرآن نہیں
 پڑھتی، مگر ایک آیت میں بہت خوشی سے ہر جگہ کوڈ
 کرتی ہوں۔“ ذرا سا مسکرائی۔ ”اور وہ یہ کہ، عورتوں
 کی چالیں بہت عظیم ہوتی ہیں۔“ اس کے گال کو
 ہولے سے چھو کر وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔ زمر ان
 ہی سلگتی نظروں سے اسے جاتے دیکھتی رہی۔

فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر جیسے ہی جواہرات نے دروازہ
 بند کیا، فارس نے تیزی سے کار پیچھے کی گیٹ سے نکالی
 اور سڑک پر ڈال دی۔ اس کا جبراً بھنچا ہوا تھا۔ وقفے
 وقفے سے ایک قہر بار نظر جواہرات پر ڈال دیتا۔

”یہ سب کیا تھا مسز کاردار؟“
 ”ایک معذور اور بے بس آدمی تم سے درخواست
 کر رہا تھا اپنی بیٹی کے لیے۔“

”میں بچہ نہیں ہوں۔ آپ ان کے منہ میں الفاظ
 ڈال رہی تھیں۔“ اکتاہٹ سے اس نے سر جھٹکا۔
 ”صبح آپ میرے پاس آئیں اور آپ کو میری شادی کی
 فکر ہونے لگی اور اتفاق سے آج ہی یوسف صاحب
 نے یہ بات کہہ دی۔“

”سامنے کی بات ہے، تم سے بہتر داماد ان کو نہیں
 ملے گا۔“

”یہ خیال بھی آپ نے ہی ڈالا ہو گا ان کے ذہن
 میں۔ میں تو جیسے آپ کو جانتا ہی نہیں ہوں۔“ غصے
 سے بولتا وہ ایکسپلنر پر دباؤ بڑھا رہا تھا۔ کار کی رفتار
 تیز ہوتی گئی۔

”مجھے تمہاری فکر ہے فارس!“
 ”پہلے تو ساری زندگی آپ کو میری فکر نہیں
 ہوئی۔“

”یہ ہی تو پوائنٹ ہے فارس! میں نے یا اورنگ
 زیب نے ساری زندگی تمہاری فکر نہیں کی، مگر جس

فہم نے کی، تم پہ اتنے احسان کیے۔ جو تمہیں اچھی نوکری دلوانے میں مدد نہ کرتا تو آج تم سڑکوں پہ آوارہ پھر رہے ہوتے، اب وہ شخص معذور ہے۔ اس کی بیٹی بیمار ہے اور وہ تم سے صرف ایک چیز مانگ رہا ہے کہ اس کی بیٹی سے شادی کرلو، تو تم اسے بھی انکار کر دو گے۔ کیا یہ ہوتا ہے احسان کا بدلہ؟“ تلخی سے اسے دیکھ کر وہ کہہ رہی تھی۔

فارس اسی طرح تیز ڈرائیو کیے گیا۔ البتہ خاموشی کا لمبا وقفہ دونوں کے بیچ حاصل ہو گیا۔
”ان کی بیٹی کبھی نہیں مانے گی۔“ بہت دیر بعد وہ بولا۔

”مان جائے گی۔“
”کبھی نہیں۔“

”وہ مان چکی ہے یار۔“ جواہرات نے بے زاری سے سر جھٹکا اور کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ اسے دیر ہو رہی تھی۔

اور فارس غازی نے ایک دم چونک کر اسے دیکھا، پھر سامنے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے کا غصہ ایک نئی سوچ میں ڈھلتا گیا۔ لب کاٹتے، آنکھیں سکیڑے وہ چند منٹ خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔

”آپ ان سے کہیے، میں سوچ کر بتاؤں گا۔“
اب کے وہ بولا تو آواز مدھم تھی۔ جواہرات نے گہری مطمئن سی سانس خارج کی، کام تقریباً ہو گیا تھا۔

فارس نے اسے گھراتا اور خود کار سے نکل کر انیکسی کی طرف ہولیا۔ قصر کی عقبی سمت میں فہنوٹا ٹرے میں کچھ چیزیں لادے ہاسم کی بالکونی کے بیرونی زینے سے نیچے اتر رہی تھی۔ فارس کار سے اترے اور وہیں کھڑا رہا۔ جب وہ قریب سے گزرنے لگی تو اسے روکا۔

”اے۔ بات سنو!“ انگلی سے اشارہ کیا۔ وہ موڈب، مگر پر اعتماد سی چلتی قریب آئی۔

”نہیں سر؟“

”تمہاری اتنی ہمت کب سے ہوئی کہ تم میری اجازت کے بغیر میرے گھر میں داخل ہو؟“

فہنوٹا کا منہ مارے شاک کے کھل گیا۔
”میں تو کبھی بھی نہیں۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“
”کیا جب پراسیکیوٹر زمر آئی تھی تو تم اسے میرے گھر نہیں لائی تھیں؟ ہاں؟“ عصبی آنکھوں سے وہ اسے گھور رہا تھا۔

”کل شام؟ نہیں تو پراسیکیوٹر تو آدھے گھنٹے کے لیے آئی تھیں، سارا وقت وہ مسز کاردار کے پاس بیٹھی رہیں اور پھر واپس چلی گئیں۔ وہ تو اس طرف آئیں بھی نہیں۔“ وہ حیران پریشان سی صفائی دے رہی تھی۔

”سچ کہہ رہی ہو؟“

فہنوٹا نے جلدی سے سر اثبات میں ہلایا۔
”ہوں ٹھیک ہے۔ مجھے غلط فہمی ہوئی تھی۔“ وہ مڑنے لگا، پھر رکا۔ ”یہاں پہ میری اینجیو ہوا کرتی تھی کہ ہر گئی؟“

”وہ۔۔۔ اس نے مسز کاردار کا نیکلس چرایا تھا، سو اسے نکال دیا۔“

”اور تم نے اس کی جگہ لے لی۔ ہوں؟“
”جی، میں اب یہاں کی ہیڈ اسٹاف ہوں۔“ گردن ذرا کڑا کر بولی۔

”ٹھیک ہے۔ آئندہ میرے گھر کے قریب مت پھٹکنا۔“ انگلی اٹھا کر تنبیہ کرتا وہ آگے بڑھ گیا۔
چہرے کے تاثرات میں پھر سے غصہ چھلکنے لگا۔
جواگلو انا تھا فہنوٹا سے وہ اگلو الیا تھا۔

”تو میڈم پراسیکیوٹر ادھر آئی تھیں اور سارا وقت جواہرات سے باتیں کرتی رہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ فارس اور زمر کی شادی کا خیال کس نے کس کے ذہن میں ڈالا؟ جواہرات نے؟ یا زمر نے؟ یہ کھڑی کس نے پکائی ہوں؟“ اس نے سبزہ زار پہ چلتے ہوئے تنفر سے جھٹکا۔ ”کیا یہ دونوں عورتیں مجھے بے وقوف سمجھتی ہیں؟“

اسنے دروازے پہ رک کر اس نے موبائل نکالا اور کال ملا کر کان سے لگایا۔

”جی فرمائیے۔“ سعدی کی مصروف آواز گونجی۔

پانچ سال پہلے۔ جب وہ خوشی سے ایک دوسرے
پہ عنایات کیا کرتے تھے۔
چار سال پہلے۔ جب ان کے خاندانوں میں خونی
لیکیر آکھنچی تھی۔

مگر ماضی کے ابواب کا آخری حصہ ابھی رہتا تھا اور
جواہرات کاردار کے لیے یہی سب سے تکلیف دہ تھا۔
ڈیڑھ سال پہلے کیا ہوا تھا، سعدی اب ان کے گھر
کیوں نہیں آتا تھا، اور وہ تمام مسئلے جو ہاشم نہیں
سنہال سکا تھا۔

وہ نہ چاہنے کے باوجود بھی یاد کرنے لگی۔
اس کی نم آنکھیں کھڑکی پہ جمی تھیں اور اس کے
شیشے پہ پرانی کہانیاں ابھر ابھر کر ڈوبنے لگیں۔



کوئی ہے رنگ، کوئی روشنی، کوئی خوشبو
جدا جدا ہے تاثر ہر اک لمحے کا

موجودہ دن سے ڈیڑھ سال قبل۔

قصر کاردار میں وہ شام بہت سے رنگوں، تمقوں اور
چمک پل کے ساتھ اتر رہی تھی۔ میری اینچیوٹرے
اٹھائے، مسکراتی ہوئے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اس
کے عقب میں نیچے کافی آوازیں آرہی تھیں، جیسے
مہمان آئے ہوں۔ وہ اوپر آئی اور ہاشم کے کمرے کے
سامنے رکی۔ دروازہ ادھ کھلا تھا۔ ڈرینگ مرر کے
سامنے کھڑے سعدی اور ہاشم کی پشت جھلک رہی
تھی۔ سعدی کچھ کہہ رہا تھا، اور ہاشم مسکرا کر سنتا، کف
لنکس پہن رہا تھا۔

میری نے دروازہ بجایا۔ وہ دونوں مڑے۔ اس نے
ذرا سا سر اندر کیا۔

”سر! آپ کو کاردار صاحب نیچے بلارہے ہیں۔“
”میں بس تیار ہوں۔“ اس نے دو سرا کف لنک
اٹھا کر لگاتے ہوئے خود کو آئینے میں دیکھا۔ وہ مسکرا کر
سر ہلاتی واپس مڑ گئی۔

سعدی نے واپس اسے دیکھا، وہ آفس سے ابھی آیا
تھا اور چونکہ سعدی کی پوری فیملی ڈنر پہ مدعو تھی، اس

”کدھر ہو تم؟“
”عموماً اس وقت شریف لوگ اپنے آفس میں
ہوتے ہیں، مگر اوہ سوری، آپ کی چونکہ اپنی کوئی جاب
ہے نہیں اور چار سال سے آپ بیکار ہیں، تو آپ کو کیا
معلوم۔“

”بک مت کرو۔ فوراً اپنے دادا کے گھر جاؤ۔“
”جی بالکل، میں تو بیٹھا ہی فارغ ہوں، اور آفس بھی
میرے مرحوم ابا جان کا ہے، تا جو میں جب چاہے منہ
اٹھا کر نکل جاؤں۔“ وہ جلا بھنا بیٹھا تھا۔ آگے پیچھے
کاغذوں، فائلوں کا ڈھیر۔ کمپیوٹر پہ کھلے ڈھیروں کام۔
اوپر سے تازہ تازہ پڑی باس سے ڈانٹ۔
”تم جارہے ہو یا نہیں؟“

”ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے نکلا تو دوبارہ یہ لوگ داخل
نہیں ہونے دیں گے، اور جو میری باس ہیں تا، وہ پہلے
ہی۔“

”تمہارے دادا نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہاری
زمر پھپھو سے شادی کر لوں۔ کیوں ہو گئی زبان بند؟
اب امی کو لے کر ان کی طرف جاؤ اور جو بھی مناسب
لگے کرو۔“ اور دوسری طرف سعدی کی زبان واقعی بند
ہو گئی تھی۔ فارس نے فون رکھا اور اندر چلا گیا۔



قدرے فاصلے پہ واقع کاردار قصر کے لاؤنج میں تھکی
تھکی سی جواہرات اپنی مخصوص اونچی کرسی پہ بیٹھی
تھی۔ ٹھوڑی تلے ہتھیلی جمائے، وہ کھڑکی سے باہر دیکھ
رہی تھی۔ سہ پہر میں آس پاس سناٹا سا تھا۔ ہاشم،
نو شیرواں، سونیا، کوئی بھی گھر پہ نہ تھا۔ وہ بہت عرصے
بعد اس وقت گھر پہ تھی اور یہ سناٹا کٹ کھانے کو دوڑ رہا
تھا۔ بجائے آفس واپس جانے کے، وہ ادھر ہی بیٹھی
رہی۔ آج کی کارروائی نے اسے تھکا دیا تھا۔

پچھلے ایک ہفتے میں اس نے بارہا ماضی کے کئی ادوار
کو ذہن میں دہرایا تھا۔

سات سال پہلے۔ جب وہ سب پہلی دفعہ ملے

تھے۔

لیے وہ آتے ساتھ ہی جلدی جلدی ڈنر کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ نیچے سب کھانا شروع کرنے کے لیے اس کے منتظر تھے۔ سعدی بلائے آیا اور پھر وہیں کھڑا ہو گیا، یہاں تک کہ میری کو بھیجا گیا۔

”مجھے ڈنر کا پتا ہوتا تو میں جلدی آجاتا۔ شہری بتانا بھول گئی تھی۔“ اس نے پرفیوم اٹھا کر کیپ اتارتے آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سو تمہاری بہن نے بورڈ ٹاپ کیا ہے، ہوں؟“ اس نے ڈنر کی وجہ پھر سے پوچھی۔

”جی، مگر وہ تو پرانی بات ہو گئی، اب تو انٹری ٹیسٹ کا رزلٹ بھی آ گیا ہے، اور جب انکل کو اس کے انجینئرنگ میں ایڈمیشن کا علم ہوا تو انہوں نے ہمیں ڈنر پر مدعو کر لیا۔“ پرفیوم کا اس پرے کرتے ہاشم نے مسکرا کر سعدی کو دیکھا۔ وہ سیاہ کوٹ اور سفید شرٹ میں ملبوس تھا، بال پہلے سے چھوٹے تھے اور چہرے کی متانت و سنجیدگی بڑھ چکی تھی۔ انداز ابھی بھی معصوم تھا۔

بولتے بولتے سعدی رکا، سانس اندر کو کھینچا، پھر ستائشی انداز میں ہاشم کو دیکھا۔

”کتنا اچھا پرفیوم ہے۔“

”سو تو ہے۔“ ہاشم نے مسکرا کر آئینے میں خود کو دیکھتے گردن پہ ایک اور اس پرے کیا، پھر کیپ اٹھایا، شیشی پہ چڑھایا۔ شیشی کو ڈبی میں ڈالا اور سعدی کی طرف بڑھایا۔

”اب یہ تمہارا ہے۔“

وہ ایک دم بدک کے پیچھے ہوا۔ ہاتھ اٹھا کر جلدی سے نفی میں سر ہلانے لگا۔ ”نہیں نہیں ہاشم بھائی! میں اس لیے تو نہیں کہہ رہا تھا۔“

”رکھ لو یا ر!“

”نہیں، پلیز، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ وہ اتنا شرمندہ تھا کہ حد نہیں۔ ”اگر آپ اس طرح کریں گے تو میں دوبارہ کبھی آپ کی کسی چیز کی تعریف بھی نہیں کر سکوں گا۔“

ہاشم نے اس کی پوری بات تسلی سے سنی، پھر سر

ہلایا، اور پرفیوم کی ڈبی اس کے کوٹ کی جیب میں ڈال دی۔

”مجھ سے بحث میں تم کبھی نہیں جیت سکتے، سو کوشش کیوں کرتے ہو؟ چلو نیچے سب انتظار کر رہے ہوں گے۔“ اس کا کندھا تھپتھا کر وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ بے حد خفت سے کھڑے سعدی نے خود کو دس دفعہ کوسا، مگر اب وہ تحفہ واپس نہیں کر سکتا تھا، اور پھر کمرے پہ ایک سرسری نظر ڈالتا واپس پلٹا۔ ان چند منٹوں میں بھی اس نے محسوس کر لیا تھا کہ وہاں شہرین کی کوئی چیز نہیں رکھی تھی۔ وہ غالباً ”مختلف کمروں میں رہ رہے تھے۔ شہرین بتانا نہیں بھولی تھی، وہ ایک دوسرے سے بات تک نہیں کرتے تھے اور یہ سب کو بتا تھا۔

وہ دونوں اکٹھے بیڑھیاں اتر رہے تھے، جب ہاشم نے سرسری سا سوال کیا۔ ”فارس کیسا ہے۔ ملاقات ہوئی؟“

”جی، بس ایک دوبارہی ملنے جیل جاسکا ہوں آپ کو تو پتا ہے انگلینڈ سے واپس آنے کے بعد ان تین چار ماہ میں میں جاب وغیرہ میں بہت مصروف تھا۔“

”ہوں۔ اس کا کیس کیسا جا رہا ہے؟“

”وکیل سے ملا تھا، وہ تو امید دلا رہا ہے کہ چند ماہ میں ان کو بری کروالے گا، ہے نا؟“ قدرے امید سے ہاشم کو دیکھا۔ وہ زبردستی مسکرا دیا۔

”بالکل۔“ اور دونوں آگے بڑھتے آئے۔

ڈرائنگ روم میں روشنیوں کی برسات تھی گویا۔ فانوس، میز کی موم بتیاں، سب جل رہا تھا۔ سربراہی کرسی پہ اورنگ زیب کاردار بر اجمان تھیں، دائیں ہاتھ پہ جواہرات تھی، اور بائیں ہاتھ کی پہلی کرسی خالی تھی۔ ہاشم نے وہی کرسی سنبھالتے ہوئے اورنگ

زیب کی سیدھ میں دوسری سربراہی کرسی پہ بیٹھی، حنین کو دیکھا، جس کو وہ زمر کے حادثے کے بعد، یعنی ڈھائی سال بعد اب دیکھ رہا تھا۔ اس کی عینک ماتھے پہ کٹے اور بالی ہیر بینڈ لگے کھلے بال ویسے ہی تھے، البتہ قد کافی لمبا ہو گیا تھا اور اعتماد پہلے سے بڑھ گیا تھا۔

”مبارک ہو حنین!“ مسکرا کر کہتے ہوئے وہ فوراً
نیمکین پھیلانے لگا۔ اسے معلوم تھا حنین کڑوے منہ
سے ”تھینکس“ کہہ کر رخ پھیر لے گی اور ایسا ہی
ہوا۔ وہ علیشاد والا بغض ابھی تک دل میں رکھے ہوئے
تھی۔

”آپ اپنے چھوٹے بیٹے کو نہیں لائیں؟“ سعدی
بھی بیٹھ گیا تو جواہرات گردن موڑ کر ساتھ بیٹھی ندرت
سے پوچھنے لگی۔

”اس کے دوست کی سالگرہ تھی، اس کو وہاں
ڈراپ کر کے ہم آئے ہیں۔“ ندرت پھیکا سا مسکرا
دیں۔ ان کے مقابل بیٹھی شہین سب سے بے نیاز
موبائل پہ بٹن دبا رہی تھی۔ ساتھ موجود نوشیرواں بے
زار لگ رہا تھا گویا زبردستی بٹھایا گیا ہو۔

”تم باہر بڑھنے کیوں نہیں جاتیں ہوں؟“ اورنگ
زیب نے اپنی سیدھ میں بیٹھی حنین کو مخاطب کیا۔
ملازم اب آخری لوازمات میز پر رکھ رہے تھے۔
”ماسٹرز کے لیے باہر جاؤں گی۔“ وہ اشتہا انگیز
چیزوں کو نہ دیکھنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔

”اوکے! کھانا شروع کرتے ہیں۔ حنین تم شروع
کرو۔“ اورنگ زیب نے اسے اشارہ کیا۔ وہ لمحے بھر کو
رکی۔ امریکی ڈرامے یاد کرنے کی کوشش کی۔ یہ گورا
ٹائپ لوگ کھانے کے شروع میں کیا کرتے ہیں؟
ٹوسٹ؟ گریس؟

”حنین کو بہت اچھا قرآن آتا ہے۔ ترجمے کے
ساتھ۔“ سعدی نے کھنکار کر اسے دیکھا، وہ چونک کر
اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”حنہ! تم تھوڑا سا قرآن سناؤ اور پھر کھانا شروع
کرو۔“

حنین نے پہلے سعدی کو دیکھا، پھر اورنگ زیب
سمیت منتظر نظروں سے اسے تکتے لوگوں کو۔

”آہم۔ اوکے۔ ایک آیت پڑھ دیتی ہوں۔“ اس
نے دوپٹا سر پہ جمایا، ایک خفا نظر بھائی پہ ڈالی اور بظاہر
مسکرا کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔

”اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے سورۃ المرسلات میں“

کلوا وشربو حنیاء بما کنتم تعملون۔“ (کھاؤ اور پیو
خوب مزے سے بوجہ اس کے جو اعمال تم نے کیے
ہیں۔) صدق اللہ العظیم۔“ چہرے پہ دونوں ہاتھ
پھیرے۔ اورنگ زیب کو ترجمہ معلوم نہ تھا، بس سر ہلا
کر ”ہوں گڈ“ کہا اور کھانے کا آغاز کرنے لگے۔

حنین نے مسکراتی آنکھیں گھما کر بھائی کو دیکھا، جو
ضبط سے اف کر کے رہ گیا۔ (آیات بھی اپنے مطلب
کی یاد تھیں کٹو پیگم کو!) مگر اس کے اف سے بے نیاز وہ
ڈیشنز میں سے چن کر چیزیں اپنی پلیٹ میں بھر رہی
تھی۔

کھانے کے درمیان میں ہی شیرو کرسی دھکیل کر
اٹھ کھڑا ہوا۔ اورنگ زیب نے سوالیہ نظروں سے
اسے دیکھا تو وہ ”میں سیر ہو چکا ہوں“ کہہ کر لاؤنج کی
طرف چلا گیا۔ سعدی نے رگ کر اسے دیکھا۔ اس
نے جاتے جاتے بھی ایک اکتائی ہوئی نظر سعدی پہ ڈالی
تھی۔ سعدی کی نظریں جھکیں۔ شیرو کی پلیٹ میں ذرا
سا سلاد تھا وہ بھی اس نے آدھا کھایا تھا۔ ان دونوں کی
آخری دفعہ بات کب ہوئی تھی۔ اسے یاد بھی نہ تھا۔
”اور آج کل تم کیا دیکھ رہی ہو؟“

اورنگ زیب کے سوال پہ سعدی نے بے اختیار
جیب میں ہاتھ ڈالا، شاید روٹی کا کوئی گولامل جائے جسے
وہ کان میں ٹھونس سکے۔ کیونکہ ابھی کوریا نامہ شروع
ہونا تھا۔ حنین نے تسلی سے منہ میں موجود نوالہ ختم کیا
اور پھر وہ شروع ہوئی۔

”میرے نزدیک دنیا کا بہترین ڈراما ساؤتھ کوریا میں
بنتا ہے، کورین فلمیں بھی زبردست ہیں مگر کورین
ڈرامے اور ان کے اداکار ان کی کہانیاں گہلیا بات ہے۔
پچھلے ایک سال میں، میں نے ایک سو گیارہ کورین
ڈرامے اور فلمیں دیکھی ہیں، پچاس فلمیں اور اکٹھ
ڈرامے۔ Lee Min Ho میرا فیورٹ ہے، اور
اس کا ڈرامہ شی ہنٹر۔“ میری اینجیو لا کر میز کے
وسط میں croquemouche رکھ رہی تھی۔ گول
گول بانز کا مینار۔ حنہ کا دل چاہا، جلدی سے چند
گیندیں توڑ لے مگر۔ اخلاقیات! اونہ۔

”ایک سو گیارہ فلمیں اور ڈرامے دیکھنے کے باوجود تم نے بورڈ کیسے ٹاپ کیا؟“ ایک ٹکڑا توڑتے ہاشم نے یونہی پوچھا تو حنین نے چونک کر اسے دیکھا، پھر جرے پہ نالیندیدی پھیل گئی۔

”میں بہت کچھ ایک ساتھ کرنے میں ماہر ہوں ہاشم بھائی!“

ہاشم کندھے اچکا کر کھاتا رہا۔ شہرین بس پلیٹ کو دیکھتی کھا رہی تھی۔ جواہرات مضطرب مگر مسکراتی نظموں سے بار بار لاؤنج کی سمت دیکھتی جہاں شیرو غائب ہوا تھا۔ سوائے سعدی کے وہ کسی کی بات کا اچھے دل سے جواب نہیں دے رہی تھی۔ شیرو اور نگ زیب کا کسی نہ کسی بات یہ روز جھگڑا ہونا معمول بن گیا تھا۔ صبح بھی نئی گاڑی لینے کی فرمائش پہ اسے جھاڑ پڑی تھی۔ اور پھر سعدی کو برداشت کرنا۔ اس کا جینا محال ہو چکا تھا۔

کھانے کے بعد سب لاؤنج میں آ بیٹھے تو وہ وہاں سے بھی اٹھ گیا۔ ٹی وی چلتا رہا، آوازیں باتیں۔ اور نگ زیب صاحب کی کوئی کال آگئی وہ اٹھ کر باہر گئے تو سعدی کے ساتھ صوفے پہ بیٹھی ندرت نے آہستہ سے سرگوشی کی۔

”کیا تم نے ہاشم سے فارس کے کیس کی بات کی؟“
 ”ان کا وکیل کر تو رہا ہے نا امی! اب اور کیا کرے۔“
 ”کیا کر رہا ہے وکیل؟ ڈھائی سال سے چند ماہ چند ماہ کی برٹ لگار رکھی ہے ایسے تو اگلے پانچ سال گزر جائیں گے اور فارس باہر نہیں آئے گا۔“ وہ اس کو شکوہ کنناں، نم آنکھوں سے دیکھ کر بولیں تو سعدی نے خفگی سے ان کو دیکھا۔

”تو میں کیا کروں امی! ہاشم بھائی وکیل کو پیسے دے رہے ہیں، اب تاریخ نہیں ملتی اگلی پیشی کی تو ہم کیا کریں۔“

”تم سعدی اپنے ماموں کو بھولتے جا رہے ہو۔ تم سب اپنی زندگی میں مگن ہو کر اس کو اس کے حال پہ چھوڑ چکے ہو۔“

”امی!“ اس کا دل دکھ گیا۔ ”ایسا نہیں ہے۔ میں

نے جاب شروع کی ہے، کچھ بجے تو گھر آتا ہوں اتنے کام ہیں، میں پھر کر بھی کیا سکتا ہوں؟“

ندرت نے جواب نہیں دیا۔ آنکھ کا کنارہ پونچھتی، خاموش ہو کر بیٹھ گئیں۔ سعدی نے بھی سرخ پھیر لیا۔ (اب وہ اور کیا کرے؟ وہ وکیل تو نہیں ہے نا، رانی کو سمجھ ہی نہیں آتی۔) اس نے چڑ کر سوچا۔ (امی کو تو ہر وقت ایک ہی سوچ پریشان کیے رکھتی ہے کہ۔۔) اسی وقت ندرت بڑبڑا میں۔

”پتا نہیں وہ اس وقت کس حال میں ہوگا؟ کھانا بھی کھایا ہو گا یا نہیں؟ نہ جانے کتنے ظلم کر رہے ہوں گے پولیس والے اس پر۔“

(بالکل! یہی سوچ!) وہ تنک کر سرخ پھیر گیا۔ شہرین اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس نے دیکھا تو وہ کسی اور جانب دیکھنے لگی۔ ندرت ہنوز وہی سوچ رہی تھیں فارس۔ اس مظلوم کا اس وقت کیا حال ہوگا؟



قصر عمر گواہی دے گا کیسے کیسے کرب سے کیسی کیسی رت گزری ہے ہم پر اتنے سالوں میں جیل کے برآمدے میں بدھم بتیاں جل رہی تھیں، پہرے دار اسی حوالاتی کو بھڑکے باہر جمع تھے، اور وہ اندر کھڑا سفید کرتے کی آستین موڑے، سلاخیں پکڑے، غصے سے اونچا اونچا کہہ رہا تھا۔

”اے سنگھل پسلی! بات دماغ میں فٹ کر لو، آئندہ اس طرف سے۔“ (کنارے والے کمروں کی طرف اشارہ کیا) ”اشرف چیمہ کا کوئی بندہ ادھر آیا نا تو اپنے قدموں پہ واپس نہیں جائے گا۔“ جواب میں اس سیل سے موچھوں والے اشرف چیمہ نے چلا کر کچھ کہا تو وہ اور بھی بھڑک گیا۔

”اس کو چپ کرالو محمد دین! ورنہ آج یہ میرے ہاتھوں نہیں بچے گا۔“

”اچھا بس کر دے تو ہی چپ ہو جا۔“
 ”میرے گروپ کے بندے اس کے باپ کے ملازم نہیں ہیں جو اس کے حصے کی مشقت کریں اس کو

آخری دفعہ سمجھاؤ ورنہ۔۔۔“ شور اب بلند ہوتا جا رہا تھا، پھر بمشکل سپاہیوں نے آکر معاملہ رفع دفع کرایا۔ فارس ہونہ کرنا سر جھٹکتا واپس زمین پہ آ بیٹھا۔ اس تاریک کمرے میں۔

دوسرے کونے میں کوئی اور بھی بیٹھا تھا۔
”فارس بھائی! یہ سپاہی آپ لوگوں سے ڈرتے کیوں ہیں؟“
”ہم چھوٹ کر چلے جائیں گے، یہ ہمیں ڈیوٹی دیتے رہیں گے، اصل قیدی تو یہی ہیں۔“ وہ بے زاری سے بولا، پھر تیکھی نظروں سے اس لڑکے کو دیکھا جس کا چہرہ تاریکی میں تھا۔

”اپنے حصے کا کام وقت پہ ختم کیا کرو، تمہارے باپ کی جیل نہیں ہے یہ۔“

”یو نو! میرے ایک قیدی کی حیثیت سے بھی بہت رائٹس ہیں جن کی وائیلیشن کے جرم میں میں گورنمنٹ آف پاکستان کو Sue کر سکتا ہوں اور جب سے میں ادھر آیا ہوں، میرا ایک بھی رائٹ پورا نہیں کیا گیا۔“ وہ بہت سنجیدگی سے کہتے ہوئے آگے کو ہوا تو چہرہ دشمنی میں آیا۔ وہ خوش شکل نوجوان تھا۔ بال نو عمر لڑکوں کی طرح ماتھے پہ کٹے تھے اور آنکھوں میں لاپرواہی تھی۔

”جاگ جاؤ۔ بیٹا! یہ پاکستان ہے!“
”ہوتا ہے۔ مگر جتنا وقت آپ جیل میں جھگڑوں اور گروہ بندی پہ لگاتے ہیں نا، اگر اتنا اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھانے پہ لگا دیتے تو۔“ وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔

”اپنے کام سے کام رکھو۔ زیادہ اسٹپنی نہ ہو۔“ وہ جڑ کر سرخ چھیر گیا۔

”دیے آپ نے یہ دونوں قتل کیے تھے؟“ کچھ دیر بعد وہ دلچسپی سے پوچھنے لگا۔ فارس نے مڑ کر ترشی سے اسے گھورا۔

”پچھلے چھ گھنٹے سے کتنی دفعہ پوچھ چکے ہو، میں بار بار بتانے کا پابند نہیں ہوں۔ تم بتاؤ، کس جرم میں آئے ہو؟“ کڑے انداز میں نئے سیل میٹ کی تعینش

شروع کی، جو آج کے جھگڑے کے باعث ابھی تک ہو نہیں سکی تھی۔

”میں۔۔۔“ اس نے بے پرواہی سے سامنے کے بال ہٹائے۔ ”کریڈٹ کارڈ فراڈ کے جرم میں۔ حوالاتی قیدی ہوں۔ کیس عدالت میں چل رہا ہے۔“

”تو تم نے جرم کیا تھا؟“
”کیا تو تھا۔“ وہ چڑانے والے انداز میں مسکرایا۔
”لگ بھی رہا ہے۔ پراسیکیوٹ کون کر رہا ہے؟“ یہ سوال وہ اکثر پوچھا کرتا تھا۔

”وہ جو پورے کورٹ میں سب سے سر می ہوئی پراسیکیوٹر ہے۔ زمر یوسف۔“ اس نے منہ بتایا۔
فارس خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

”تمہارا وکیل اس کے مقابلے میں کیس جیت جائے گا؟“

”ہا۔ ایسا ویسا۔ ہاشم کاردار ہے میرا وکیل۔“ اس نے کالر جھاڑے۔ فارس چونکا۔

”اس کو دینے کا پیسہ کہاں سے آیا؟ شکل سے تو تم یتیم خانے سے بھاگے لگتے ہو۔“

”وہ میں اصل میں اورنگ زیب کاردار کا کیمپین منیجر رہا ہوں، اس لیے انہوں نے زبردستی ہاشم کو میرا وکیل مقرر کر دیا ہے۔“ احمر شفیع ہنس کر بولا۔ فارس نے چونک کر اسے دیکھا۔

”تو تم اورنگ زیب کاردار کے لیے کام کرتے تھے؟“

”جی۔ آپ کے ماموں کے لیے اور نہیں، میں اتفاق سے آپ کے سیل میں نہیں آیا۔ ہاشم نے مجھے ادھر بھجوا دیا ہے، تاکہ میں آپ کا خیال رکھ سکوں۔“
فارس نے جواباً ”تیز نظروں سے اسے گھورا۔
”خیال رکھ سکویا نظر؟“

”ظاہر ہے نظر۔“ وہ لاپرواہی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ باہر اندھیرے میں مدھم جلتی بتیوں میں پرے دار شعلے نظر آ رہے تھے۔

”کیا کرتے تھے ماموں کے لیے؟“ وہ اس لڑکے کو مسلسل چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”ایکشن اسٹریٹیجی“ کہہ کر ”ہیمنٹ“ پبلک ایج
کنسلٹی ”دیو“

”یعنی ان کو ایڈوائز کرتے تھے۔ کبھی جیل میں
سڑتے بھانجے کو نکلوانے کا مشورہ نہیں دیا؟“

”ہب“ ”احمر نے کھسیانے انداز میں ٹھوڑی
کھجائی۔“ ”وہ تو مدد کرنا چاہ رہے تھے آپ کی مگر۔“
”مگر؟“ ”وہ چونکا۔“

”دیکھیں ان کے ایکشن کے لیے یہ اچھا نہیں تھا“
سو میں نے مشورہ دیا کہ وہ خود کو لا تعلق کر لیں آپ
سے۔ ”بھئی وہ میرے کلائنٹ تھے“ مجھے ان ہی کا فائدہ
دیکھنا تھا۔ ”وہ جلدی جلدی وضاحت دے رہا تھا اور
فارس ایک دم سے اٹھ کر بیٹھا“ بس نہیں چلتا تھا کہ
اس کی گردن موڑ دے۔

”تو یہ نیک مشورے دینے والے تم تھے؟“ ضبط
بھری کڑی نظروں سے اسے گھورا۔ ”نیوں کرو“ اپنا
سامان سمیٹ لو“ اور صبح کسی اور سیل میں اپنی شکل گم
کر لیتا۔ یہاں نہیں رہو گے تم۔“ درستی سے کہتے
ہوئے وہ اٹھ کر دوڑ چلا گیا۔

احمر نے معصومیت سے گردن سینے پہ گرا دی۔
”سچ بولنے کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔“



سب خن“ اس لب خن کے امیر
سارے موسم گلاب ہیں جیسے
اورنگ زیب کال سن کر آگئے تھے لاؤنج میں
سوائے خاموش بیٹھی ندرت کے سب باتیں کر رہے
تھے۔ حنین اور سعدی، ہاشم کی سیاست کے موضوع پر
کی گئی کسی بات پر بحث کر رہے تھے اورنگ زیب
اگر بیٹھے تو حنین پوچھنے لگی۔

”کیا آپ نے وہ تمام ڈرامے دیکھے جن کے لنکس
میں نے آپ کو میل کیے تھے؟“

”اتنا وقت نہیں ہوتا میرے پاس۔ ہاں دس پندرہ
سال بعد کبھی فرصت ملی تو دیکھوں گا۔“
”ویسے اگر آپ نے ”کے“ ڈرامے (کورین

ڈرامے) نہیں دیکھے۔ کے پوپ نہیں سنا تو کچھ دیکھا
سنا نہیں ہے۔“

”کیا تمہیں سارے کورین ایک جیسے نہیں لگتے؟
ایک ہی چائنیز شکل والے؟“ ”اور ان کے اس سوال پر
حنین حسب معمول جذباتی ہو گئی۔“

”ہم ساری قوموں کا یہی مسئلہ ہے، ہمیں وہ سری
قوم والے ایک جیسے لگتے ہیں۔ سیاہ فام بھی ایک سے
اور چائیز بھی ایک سے۔ ورنہ وہ بھی اتنے ہی مختلف
ہوتے ہیں جتنے ہم۔ اور خوب صورت بھی بہت ہوتے
ہیں۔“

حنین بولے جارہی تھی ہاشم آہستہ سے اٹھ کر کچن
کی طرف آگیا۔ کچن گھر کے آخری کونے میں تھا۔ وہاں
سینٹر ٹیبل پر نوشیرواں کھانا کھا رہا تھا۔ میری اینجیو
قریب کھڑی تھی۔ ہاشم نے چوکھٹ میں کھڑے تنکی
ہولی سانس بھری۔ سیرو نے چونک کر اسے دیکھا پھر
شرمندگی سے پلیٹ پرے کی۔

”کھاؤ، شاہاش“ میں منع تو نہیں کرنے آیا۔ ”مگر وہ ٹشو
سے ہاتھ صاف کرتے بدیادیا۔“

”میں نہیں کر سکتا اس کو برداشت۔ اور آپ لوگ
اس کو فیملی سمیت مدعو کر لیتے ہیں۔“

ہاشم نے میری کو اشارہ کیا۔ وہ باہر نکل گئی۔ پھر وہ
قدم قدم چلتا اس کے قریب آگھڑا ہوا۔

”تمہیں ابھی تک یہی غصہ ہے کہ اتنے سال پہلے
اس نے تمہاری شکایت می کو کیوں لگائی؟“

”کیا نہیں ہونا چاہیے؟“ ”وہ بگڑا۔“
”کیا تم نے پھر ڈر گز لیں؟“

”نہیں تو۔“

”گورڈر گزنہ لینے سے تمہاری تعلیم پر اچھا اثر پڑا“
آج تم ایک کامیاب انسان بن چکے ہو۔ اس نے
تمہارے لیے ایک اچھا کام کیا گور تم ناراض ہو؟“

نوشیرواں کے تے اعصاب ذرا ڈھیلے پڑے۔ ”وہ تو
ٹھیک ہے مگر۔“

”مگر یہ کہ شیرو! کیا یہ وہی سعدی نہیں ہے جس نے
تمہاری جان بچائی تھی“ ”تمہیں بروقت اسپتال لے

جا کر؟

نو شیرواں چپ ہو گیا۔

”اب اس ناراضی کو بھول جاؤ۔“

”کیسے بھول جاؤں؟ پانچ سال اس ٹینشن میں گزارے کہ میری ہر موومنٹ کو وہ مانیٹر کر رہا ہے۔ جو می نے میری بے عزتی کی۔ اس کے بعد کتنا عرصہ وہ مجھ سے مجرموں کی طرح سوال جواب کرتی رہیں اور۔“

”تمہارا اس سے کسی لڑکی پہ جھگڑا تو نہیں ہے؟“
ہاشم نے مسکراہٹ دبا کے پوچھا۔ اس کا موڈ مزید بگڑ گیا۔

”اتنا لوزر لگتا ہوں میں آپ کو؟“ (اور یہ شکر تھا کہ گئے برسوں میں ایک لڑکی کے منگیتر سے پڑنے والی مار کی بھٹک ہاشم کو نہیں پڑی تھی۔ جب وہ مار پڑی تھی تو سعدی سامنے بیٹھا کیفے میں کافی پی رہا تھا۔ اف!)

”چلو پھر موڈ ٹھیک کر لو۔ لاؤنج میں اس کی وہ تیز طرار بہن پھر سے بولنا شروع ہو چکی ہے۔ اس کو برداشت کرنے کے لیے مجھے تمہاری مدد چاہیے۔“

نو شیرواں سر جھٹک کر ہنسا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں باہر نکلے تو راہداری میں میری کھڑی ایک فلیمنو لڑکی کو کچھ سمجھا رہی تھی۔ وہ نیرس، مگر ذہین سی لگتی لڑکی تیز تیز سر ہلائے جا رہی تھی۔ ہاشم نے سوالیہ نظروں سے میری کو دیکھا۔

”سرا یہ فینو نا ہے۔ فی۔ او۔ نا۔“ توڑ توڑ کر اس کا نام ادا کیا۔ ”یہ نئی ملازمہ ہے۔ مسز جواہرات نے رکھی ہے۔ آج سے جوائن کیا ہے اس نے۔“
”ہوں۔“ وہ ایک اچھٹی نظر اس پر ڈالتا آگے نکل گیا۔ شیرو نے تو اسے دیکھا بھی نہیں۔

اندر جب حنین اور نگ زیب سے بات کر رہی تھی تو شہرین مسلسل سعدی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر جواہرات سامنے بیٹھی تھی اور اس کے سامنے شہرین خود کو سعدی سے لا تعلق ظاہر کرتی تھی، سو خاموش رہی۔

ہاشم اور نو شیرواں واپس آئے تو حنین کا ڈرامہ نامہ

ابھی تک جاری تھا۔

”بیٹا! آپ کو پتا ہے، شیرو کل تائیوان جا رہا ہے۔ ابھی آپ کسی تائیوانی ڈرامے کی بات کر رہی تھیں نا۔“ ہاشم نے مسکراتے ہوئے اسے ٹوکا اور سامنے صوفے پہ بیٹھا۔ حنین کی چلتی زبان رکی، سر گھما کر شیرو کو دیکھا۔

”تائیوان میں کیا رکھا ہے؟ جانا ہے تو ساؤتھ کوریا جائیں۔“

”آفس کے کام سے جا رہا ہوں۔“ شکایتی نظریاں پہ ڈالی۔ ”کوریا کئی دفعہ جا چکا ہوں پہلے۔“

”تو دوبارہ چلے جائیں۔ میرے لیے Kimchi لے آئیے گا۔“ وہ پرجوش سی ہو کر کہنے لگی۔ سعدی نے تنبیہی نظروں سے اسے گھورا مگر وہ متوجہ نہیں تھی۔ اکھڑے اکھڑے سے بیٹھے شیرو نے کندھے اچکائے۔

”ہاں وہاں بھی ایک دو دن کے لیے چلا جاؤں شاید لے آؤں گا۔“

”واؤ۔ یو آر کلی۔“ آگے پیچھے نو شیرواں جیسے لوزر کو لفٹ نہ کرانے والی حنین بے اختیار ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

ندرت ہنوز خاموش بیٹھی تھیں۔ ان کو اس ڈنر میں کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔



کچھ بھی کہو، سب اپنی اناؤں پر اڑے ہیں سب لوگ یہاں صورت احنام کھڑے ہیں اس سردی رات جب فارس اپنے نئے ساتھی قیدی کو سخت ست سنا کر پرے لیٹ چکا تھا اور ندرت قصر کاردار میں عدم دلچسپی سے بیٹھی تھیں۔ ان سب سے دور، یوسف صاحب کے گھر میں صداقت بھاپ اڑاتی کافی زمر کے سامنے رکھ رہا تھا۔

دفعتا ”سربراہی جگہ پہ بیٹھے بڑے ابا ذرا کھنکھارے۔ وہ باسی اخبار دیکھتے ہوئے چونکی، نظر اٹھا کر ان کو دیکھا۔

”کس بات کی تمہید باندھنا چاہ رہے ہیں؟“
 ”وہ۔ فارس کے کیس کی سماعت اس مہینے ہے نا؟“
 اس ذکر پہ اس کے ابو تن گئے۔ واپس اخبار دیکھنے لگی۔

”آپ یہ ظاہر کرنا چاہ رہے ہیں کہ لاؤنج کی میز پر رکھا سمن آپ نے نہیں دیکھا جس میں مجھے پیش ہونے کے لیے کہا گیا ہے؟“
 ”زمر!“ وہ بے بسی سے آگے کو ہوئے۔ ”کیا تم اس کے خلاف گواہی دو گی؟“

”جو سچ ہے وہی کہوں گی۔“ وہ اخبار پڑھتی رہی۔
 ”ڈھالی سال ہو گئے اس بات کو، تم ایک دفعہ بھی اس سے نہیں ملیں۔ اس کی بات تو سن لو۔“
 ”میں جج ہوں نہ پراسیکیوٹر“ نہ ڈیفینڈر۔ میں صرف ایک گواہ ہوں۔ اپنی بات وہ عدالت میں کہے مجھ سے کیوں امید رکھتا ہے؟“

”سعدی سے تو مل لیا کرو۔“ انہوں نے ایک اور کوشش کی۔
 ”وہ میری موجودگی میں گھر آتا تو مل لیتی۔ نہیں آتا تو میں کیا کروں؟“
 ”وہ تو تمہارا سعدی ہے ہمارا سعدی۔ اس کا کیا قصور ہے؟“

”جب مجھے اس کی ضرورت تھی وہ میرے ساتھ نہیں کھڑا تھا۔ اسپتال میں رشتہ داروں کی لعن طعن کے وہ تکلیف دہ دن وہ راتیں جب میں درد کی شدت سے بیدار ہو جاتی تھی میں نے کسے گزارے مجھے یاد ہے۔ اب مجھے اس کی ضرورت نہیں رہی۔ میں اکیلی ٹھیک ہوں۔“ صفحہ پلٹ کر اندرونی طرف سامنے کی چہرے پر سنجیدگی اور سپاٹ پن تھا۔ وہ افسوس سے اسے دیکھے گئے۔

”کیا تمہیں اپنی گواہی پہ خود یقین ہے؟“
 ”نہ ہوتا تو کبھی گواہی نہ دیتی۔ اور رہی گواہی تو وہ میں پچھلی پیشی پہ دے چکی ہوں۔ اس دفعہ مجھے صرف کہ اس ایگزامن کرنے کے لیے بلایا جا رہا ہے۔“

ساتھ ہی مک اٹھا کر گھونٹ بھرا۔
 ”تندرست کو ٹریل وہسل (دل کی تالیوں کی) بیماری ہو گئی ہے۔ اس کا دل ٹھیک کام نہیں کرتا۔ اگر فارس کو سزا ہو گئی تو وہ صدمے سے مر جائے گی۔“

”یہ فارس کو مجھ پہ گولی چلانے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔“ دوسرا گھونٹ بھر کر مک واپس رکھا۔
 نگاہیں اختیار پہ نیچے کی سمت دوڑائی گئی۔ ناک کی لونگ دمک رہی تھی۔

”سعدی کے گھر ہی چلی جایا کرو۔“
 ”ضروری کام ہوا تو چلی جاؤں گی۔ ناراض تھوڑی ہوں میں اس سے۔“ ساتھ ہی اس کا فون بجا۔ وہ بات کرنے میں مصروف ہو گئی اور بڑے ابا اپنی ادھوری چائے کو دیکھے گئے۔
 آج تو چائے کے ساتھ بات بھی ادھوری رہ گئی تھی۔



ہم نہ کہتے گھر جاؤ گے
 کس جگہ پہنچے ہو آخر دیکھو
 (یہ خین کو دیے جانے والے ڈنر سے چار روز بعد کا ذکر ہے)

رات کا اندھیرا ہر سو پھیلا تھا۔ سردی مزید بڑھ گئی تھی۔ چھوٹے باغیچے والے گھر میں سعدی کے کمرے میں اندھیرا تھا۔ وہ کمبل تانے گہری نیند سو رہا تھا۔ یکایک وہ ذرا سا ہلا۔ پھر کمبل ہٹایا تو بکھرے بال اور چہرہ واضح ہوا۔ وہ اچھٹے سے اوہرا دھردیکھ رہا تھا۔ داغ اتنا سویا ہوا تھا کہ فوری طور پر سمجھ میں نہ آیا کہ یہ آواز کدھر سے آرہی تھی زوں زوں۔

اس نے تکیہ ہٹایا۔ نیچے دبامو باکل بچ رہا تھا۔ آہ۔ وہ نیند سے کراہا۔ مو باکل اٹھایا۔ رات کے ڈیڑھ بجے اور انجان نمبر۔ اکٹا کر اس نے فون کان سے لگایا۔ ”ہیلو؟“ آواز بھاری اور نیند میں ڈوبی نکلی۔

”سعدی! ابھی اسی وقت میرے گھر آسکتے ہو؟“
 اس کی نیند میں ڈوبی آنکھیں ذرا سی کھلیں۔ ”کو کون ہے؟“

”سعدی! اٹھو اور میری بات سنو۔“ ذرا زور سے کہا گیا تو وہ چونک کر اٹھا۔
 ”ہاشم بھائی! خیریت؟“ حیرت سے آنکھیں ملیں۔
 نیبل کیپ جلایا۔ گھڑی روشن ہوئی۔ ڈیڑھ بجے۔
 ”۳ بجے اسی وقت میرے گھر آواہنی بہن کو لے کر۔
 شرفک نہیں ہوگا، بیس منٹ لگیں گے۔ تم دونوں آؤ
 اور سنو! کیسواں منٹ نہیں ہونا چاہیے۔“ اس کا
 لہجہ انداز۔ سعدی فکر مند ہو گیا۔
 ”مگر ہوا کیا ہے؟“

”تم ابھی تک بستر سے نہیں نکلے کیا؟ جلدی کرو
 یار! میں انتظار کر رہا ہوں۔“ اور فون بند ہو گیا۔ وہ
 حیران و پریشان سا بیٹھا رہ گیا، پھر تیزی سے بستر سے
 نکلا۔ دو تین منٹ بعد وہ منہ پہ چھینٹے مار، کپڑے بدل کر
 جیکٹ پہنے، کار کی چابی اٹھائے باہر آیا تو لاؤنج سے
 آوازیں آرہی تھیں۔ معلوم تھا وہ جاگی ہوئی ہوگی۔
 کمپیوٹر کے سامنے کرسی پہ پیر اور کر کے بیٹھی ہیڈ
 فون چڑھائے ہنستے ہوئے اسکرین کو دیکھتی، ساتھ
 پیالے سے پاپ کارن اٹھا کر منہ میں رکھتی، حنین روز
 رات گئے تک یوں ہی پائی جاتی تھی۔ آہٹ پہ وہ
 چونکی، پھر بھائی کو آتے دیکھ کر رُجوشی بتانے لگی۔
 ”پتا ہے سوپر جوئیئر (کوریو کا ایک بینڈ) ایک شو میں
 آئے ہوئے ہیں اور ان کے لوگ اپنے مسئلے بتا رہے
 ہیں، جیسے ایک لڑکے کا دوست سانپ اور بچھو کھانے
 لگ گیا ہے تو وہ۔“ سعدی نے آگے آکر کمپیوٹر کی تار
 کھینچی۔

”سویٹر پہنو اور باہر آؤ، میں کار میں انتظار کر رہا
 ہوں۔“

”ہا۔“ وہ ہکا بکا رہ گئی۔ پھر غصے سے ہیڈ فون
 اتارے۔ ”اتنی مشکل سے ویڈیو ڈاؤن لوڈ کی تھی
 اور۔“

”حنین! جلدی کرو، کوئی وجہ ہے تو کہہ رہا ہوں نا۔“
 سختی سے کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ کار اشارت کی تو وہ بھی آ
 ہی گئی۔ گرین لمبا اور کوٹ پہنے۔ (جو تھا تو ایل شاپ
 کا، مگر ای کی تاکید تھی کہ ہر ایک کو کہنا ہے، سارہ لندن

سے لائی ہے) اندر سویٹر۔ گردن کے گرد دھپٹا اور
 بال ہیر بینڈ لگا کر کھلے چھوڑے، چہرے پہ ڈیڑھوں
 ناراضی کیسے۔ چپ چاپ فرنٹ سیٹ پہ آ بیٹھی۔
 سعدی خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ پھر حنین نے اپنے
 اور امی کے مشترکہ موبائل پہ گانا آن کر لیا۔
 ساتھ میں سر دھننے لگی۔

”بند کرو اس سوپر جوئیئر کے ماماشیتا کو۔“
 ”یہ ماماشیتا نہیں ہے، سٹی ہنٹر کا گانا ہے۔ اس میں
 Lee Min Ho آتا ہے۔ پتا ہے، اس کے
 پاپ کو گورنمنٹ نے مار دیا ہوتا ہے تو وہ کئی سال بعد
 انتقام لینے کوریا کے صدر کا سیکورٹی آفیسر تعینات
 ہو جاتا ہے۔ اور۔“

پھر رکی۔ ”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“
 ”ہاشم بھائی نے بلایا ہے، کوئی مسئلہ ہے۔“
 وہ حیران رہ گئی۔ ”تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟ کیا ہاشم بھائی
 خود ہر مسئلہ سنبھال نہیں لیا کرتے؟“ اس کی نقل اتار
 کر سر جھٹکا۔

”میرا خیال ہے دنیا میں ابھی کچھ ایسے بھی مسئلے
 ہیں جنہیں وہ نہیں سنبھال سکتے۔“ سعدی نے گہری
 سانس بھر کر شانے اچکائے۔

جب وہ کاردار قصر کے اندرونی دروازے میں داخل
 ہوئے تو ہاشم سامنے ہی کھڑا تھا۔ سیاہ ٹراؤزر پہ گرے لی
 شرٹ پہنے وہ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ انہوں نے شاید
 پہلی دفعہ اسے نی شرٹ میں دیکھا تھا۔

”اوپر میرے کمرے میں جاؤ، میں آ رہا ہوں۔“ اس
 نے سعدی کو اشارہ کیا۔ اس کا حلیہ، ساتھ ہی مصروف
 مگر پریشان انداز۔ اور پھر پلٹ کر لاؤنج میں پریشانی
 سے کھینکتی، کچھ بولتی، جواہرات۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا تم اتنی دیر کیوں کر رہے
 ہو ہاشم! ان کو پیسے دو اور میرے بیٹے کو واپس لاؤ۔“ دبا
 دبا غرائی وہ رکی۔ دونوں بہن، بھائی کو دیکھ کر جھٹکا لگا۔
 ”ان کو بلانے کی کیا ضرورت تھی؟“

سعدی، حنین کا ہاتھ تھامے فوراً اوپر لے آیا۔
 ہاشم کے کمرے کا دروازہ کھولنے سے قبل انہوں نے

نیچے ہاشم کو کہتے سنا۔
سعدی نے چونک کر اسے دیکھا۔ نوشیرواں اغوا ہو گیا

تھا اور ہاشم نے انہیں بلایا تھا؟

وہ اب ویڈیو کھول رہا تھا۔ اسکرین پر ایک کمرہ تھا۔
لکڑی کا فرش، پیچھے سلائڈنگ ڈور، کاؤچ، الماری،
چھت، پیچھے نظر آتا ایک سوچ بورڈ، وسط میں رکھی
کرسی جس پر نوشیرواں بیٹھا تھا ہاتھ پیچھے بندھے
تھے۔ بکھرے بال، ردی، ردی آنکھیں۔ گردن جھکی
ہوئی۔ کیمرا آن ہوا۔ تو اس نے چہرہ اٹھایا۔ وہ شدید
تکلیف میں لگ رہا تھا۔

”ڈیڈ۔ بھائی۔ یہ لوگ آپ کو ایک اکاؤنٹ نمبر
اور ایک رقم ای میل کر رہے ہیں اور۔“ وہ رک کر
کیمرے کی سمت دیکھنے لگا، جہاں سے اسے ہدایات مل
رہی تھیں۔ یقیناً ”اغوا کار وہیں کھڑے اسے متنبہ
کر رہے تھے۔ چہرے پر خوف لیے شیرو تھوک نکلتا پھر
سے کہنے لگا۔“ آپ چار گھنٹے کے اندر اندر یہ رقم بھجوا
دیں، ورنہ یہ مجھے مار دیں گے۔ میں کوریا میں ہوں۔ اگر
آپ میں سے کوئی گھر سے بھی نکلا یا یہاں آنے کی
کوشش کی یا کسی کو کال کرنے کی تو یہ مجھے مار دیں
گے۔“ آنسو خوف زدہ ہراساں شیرو کی آنکھوں سے
بننے لگے۔ سدا کا ڈر پوک شیرو ملی کا بچہ لگ رہا تھا۔

”بھائی پلیز۔ مجھے یہاں سے نکال لو اور کسی کو فون
مت کرنا۔ یہ لوگ بہت خطرناک ہیں۔ مجھے مار دیں
گے۔ ان کے پاس آپ کے تمام نمبرز ہیں، یہ ہر چیز تاثیر
کر رہے ہیں۔“ اور اسکرین سیاہ ہو گئی۔

سعدی نے بے یقینی کے عالم میں سراٹھایا۔ ہاشم
تھکا تھا اور پریشان نظر آ رہا تھا۔

”کیا آپ نے پولیس کو کال کی؟ آپ کے تو کتنے ہی
کانٹیکٹس ہیں، ہوں گے ایجنسیز میں۔“

”کی گئی۔ میرے لوگ کورین پولیس سے بات
کر رہے تھے، جب یہ دوسری ویڈیو موصول ہوئی۔
تمہیں کال کرنے کے دس منٹ بعد۔“ چند منٹ دبائے
اور پیغام کھولا۔

وہی کمرہ اور ویسے ہی نڈھال، بندھا ہوا شیرو۔ البتہ
اب اس کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔

”ممی! آپ آرام سے بیٹھ جائیں، میں کر رہا ہوں
نا۔“ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے وہ سمجھا رہا تھا۔
دروازہ بند ہوا تو آوازوں کا رستہ رک گیا۔

اندر کمرے کی ساری بتیاں خود بخود جل اٹھیں۔ وہ
دونوں خاموش اور غیر آرام دہ سے کاؤچ پر جا بیٹھے۔ میز
پر ہاشم کا لیپ ٹاپ رکھا تھا۔ وہ آن تھا، مگر اسکرین
اسٹینڈ بائی پر تھی۔ سیاہ تاریک۔
”یہ کیا ہو رہا ہے بھائی؟“

”کوئی مسئلہ ہے ان کے گھر میں۔“ اور تب ہی وہ
عجلت سے دروازہ کھولتا اندر آیا۔ سامنے میز کے
کنارے آ بیٹھا۔ حنین کے بالکل سامنے۔ سعدی کو
دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔

”حنین، بچے! اب جو میں پوچھوں مجھے سچ سچ
بتانا۔“

حنین نے نا سمجھی سے اسے دیکھا اور پھر سعدی کو۔
”جی؟“

”کیا تمہارا اعلیٰ شاہ کوئی کانٹیکٹ ہے؟“
”نہیں۔“

”تم سچ کہہ رہی ہو؟“ ہاشم نے اس کو غور سے دیکھتے
پوچھا تو حنین کے ابرو تن گئے۔

”میں آپ سے ڈرتی نہیں ہوں، جو جھوٹ بولوں
گی۔ نہ اس سے رابطہ رکھنے کے لیے مجھے آپ کی
اجازت چاہیے۔“

”حنین۔“ سعدی نے اسے تادیبی انداز میں پکارا۔
”مگر وہاں کہاں اثر ہونا تھا۔“

”اوکے۔ مگر کیا تم جانتی ہو وہ ابھی کہاں ہے؟ یا
معلوم کر کے بتا سکتی ہو؟“

”مگر ہوا کیا ہے؟“
ہاشم نے گہری سانس لی، ترچھے ہو کر لیپ ٹاپ کی
کیز کو چھوا۔ اسکرین روشن ہوئی۔

”شیرو تائیوان سے کوریا گیا تھا۔ واپس نہیں آیا۔
ڈیڑھ گھنٹہ پہلے مجھے فیس بک پر کسی انجان آئی ڈی کی
جانب سے ویڈیو ملی ہے تاوان کے لیے۔“ حنین اور

ہمیں کے کلچر پسند ہے، میری بھی پروفائل یہ ہے یہ سب ہے اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں کوریا میں ہوں اس وقت۔“

”مگر اس واقعے کی مجھے تصدیق کرنی ہے۔ اگر خاور ہوتا تو وہ یہ سب کر لیتا، مگر وہ دو روز قبل ہی اپنے کسی کام سے ملک سے باہر گیا ہے۔ میں اس کے بغیر بالکل مفلوج ہوں۔“ میز کے کنارے پہ بیٹھا قدرے بے بسی سے کہتے ہاشم۔ سعدی کو ترس سا آیا۔

”ہاشم بھائی! ہم آپ کی ہر ممکن مدد کریں گے۔ آپ بتائیں کیا کرنا ہے۔“

اس بات پہ حنا نے گھور کر سعدی کو دیکھا اور پھر ہاشم کو۔ وہ ابھی تک ناگواری محسوس کر رہی تھی۔

”اوکے، حنین سنو! تم ہیکنگ جانتی ہو، تم نے ڈیڈ کو کئی دفعہ بتاتا تھا۔ سو تم علیشا کی لوکیشن ٹریس کرو۔ ساتھ میں تم اس ویڈیو بھیجنے والے کی لوکیشن بھی ٹریس کرو۔ پھر اس فارن بینک اکاؤنٹ کو ٹریس کرو کہ یہ کس کے نام ہے اور اس شخص کی تمام تفصیلات مجھے دو۔ ساتھ ہی شیرو کے موبائل کو ٹریس کرنے کی کوشش کرو کہ آخری دفعہ وہ کب اور کہاں استعمال ہوا تھا۔ فی الحال وہ بند ہے۔ کتنی دیر میں تم یہ سب کر سکتی ہو؟“ وہ سنجیدہ تھا اور حنین نے اتنی ہی سنجیدگی سے سر ہلایا۔

”دس سے بارہ منٹ میں۔“

”واقعی؟“ ہاشم تو ہاشم۔ سعدی کو بھی جھٹکا لگا۔

”شیوور۔ یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ مگر آپ نے سیٹ نہیں لگایا ابھی تک۔“ معصومیت سے ادھر ادھر دیکھا۔

”کیا؟“ ہاشم سمجھا نہیں۔

”ہم ہالی ووڈ کے کسی سیٹ پہ ہیں نا اور میں تو ہوں ہی Nolan Ross جو کھٹ کھٹ کر کے سب کچھ فٹافٹ ہیک کر لوں گی اور دس منٹ میں مسئلہ حل ہو جائے گا۔“

”حنین! سعدی نے اس کے جوتے پہ جوتا رکھ کر دیا۔“

”سوری ہاشم بھائی! مگر نولن اور ہک جیسے

”بھائی! انہوں نے منع کیا تھا کسی کو کال کرنے سے، آپ لوگ کیوں ایسا کر رہے ہیں؟ مجھ سے کوئی محبت نہیں ہے آپ کو؟ ایک مانیٹر کو بھی اپنے بچے سے محبت ہوتی ہے۔ پلیز ان کو رقم دیں اور مجھے یہاں سے نکالیں۔ ورنہ یہ پہلے میرے کان کاٹیں گے، پھر انگلیاں۔“

ویڈیو ختم ہوئی اور ہاشم کے چہرے کی تکلیف بڑھ گئی۔ شیرو کا خون نکلتے دیکھنا بہت اذیت ناک تھا۔ حنین خاموش تھی اور سعدی ہکا بکا۔

”کیا وہ لوگ آپ کے فونز بگ کر رہے ہیں؟“

”میں نہیں جانتا۔ مگر اب ہم کسی سے رابطہ نہیں کر رہے۔ میں نے سب کو منع کر دیا ہے۔“

”مگر“ سعدی بے چینی سے آگے ہوا۔ ”یہ خالی خولی دھمکی بھی تو ہو سکتی ہے۔ آپ خفیہ طور پہ کسی سے رابطہ کرنے کی کوشش۔“

”وہ میرا بھائی ہے، میں اس کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔“

”اور۔ اس سارے معاملے میں ہم کیا کر سکتے ہیں؟“ حنین پہلی دفعہ بولی۔ دیکھ وہ ابھی تک اسکرین کو رہی تھی۔ (اس لوڈر کے کان کی جگہ بال کلاڈ دیں تو کتنا اچھا ہو۔ اونٹنوں نہیں۔ یہ تو آئینہ دیکھتے ہی مر جائے گا۔)

”مجھے شک ہے کہ اس میں علیشا ملوث ہو سکتی ہے۔“

”کبھی نہیں۔“ حنا نے ناگواری سے اسے ٹوکا۔

”وہ کمزور اور بزنل سی ہے۔ آپ کے بھائی کو اغوا نا ممکن؟“

”وہ کسی کے ساتھ مل کر یہ کر سکتی ہے۔ میں نے اس کی فیس بک پروفائل چیک کی تھی۔ دیکھو، اس نے کور فوٹو سینٹول (کوریا کا ایک شہر) کی لگا رکھی ہے۔“ اس نے اسکرین پہ علیشا کی پروفائل کھول کر دکھائی۔

”یہ اس نے کوئی چھ ماہ پہلے لگائی تھی اور وہ اس لیے کہ ہم کے ڈرامے اور کے پوپ کے شوقین ہیں۔“

صرف ہلی ووڈ میں ہوتے ہیں۔ میں انٹرنیٹ سے کسی بینک کا مین فریم ہیک نہیں کر سکتی۔ نہ ہی ہم فیس بک مہیج سے کسی کا آئی لی ایڈریس یا لوکیشن معلوم کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں فیس بک کمپنی سے رابطہ کرنا ہوگا اور اس میں دو ماہ لگیں گے۔

ہاشم لب بھینچے مسکتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ (بد تمیز لڑکی۔)

”تو تم کیا کر سکتی ہو؟“

”ایسے مت دیکھیں مجھے۔ خاور بھی یہ نہیں کر سکتا۔ کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ کو ایک کیک چاہیے اور میں دیوار پر لگے بیکری کے اشتہار کو پھاڑ کر اندر سے کیک نکال لوں مگر اشتہار کے کاغذ کے پیچھے دیوار ہوتی ہے، بیکری نہیں۔ کیک نکالنے کے لیے ہمیں بیکری کا ٹالا توڑنا پڑے گا اور گھر بیٹھے یہ سب نہیں ہو سکتا۔“

”یعنی کہ تم کچھ بھی نہیں کر سکتیں۔“

”خیر اب یہ بھی نہیں کہا میں نے۔ میں یہ کر سکتی ہوں کہ علیشا کو ای میل کرتی ہوں اس کے جواب سے اس کی لوکیشن ڈھونڈتی ہوں۔ ساتھ اس ویڈیو بھیجنے والے کا اکاؤنٹ ہیک کرتی ہوں شاید اس کے اپنے ان بوکس سے کوئی سراغ مل جائے۔ کوئی فون نمبر کوئی دو سر ای میل ایڈریس۔“

ہاشم خوش نہیں تھا مگر اٹھ کھڑا ہوا۔

”اوکے! تم کام شروع کرو۔“

”پ بھی نہیں کر سکتی میں کچھ۔“ وہ اس کی بات پہ جاتے جاتے پلٹا۔ سعدی نے بھی حیرت سے اسے دیکھا۔ خنین نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔

”صل میں خالی معدے کے ساتھ میرا دماغ کام نہیں کرتا۔ بلکہ مجھے تو لگ رہا ہے کہ میرا شوگر لیول بھی لوہو رہا ہے۔“

ہاشم نے گویا جھپٹ کر انٹرکام اٹھایا اور ضبط کرتے ہوئے چبا چبا کر بولا۔ ”میری! اوپر آو اور میڈم جو کہیں ان کو پانچ منٹ میں بنا کر لاؤ ہری اپ۔“ اور دھاڑ

سے دروازہ بند کر تا باہر نکل گیا۔

”تم کچھ زیادہ ہی بد تمیز ہوتی جا رہی ہو۔“ سعدی نے واقعی غصے سے اس کا بازو جھجھوڑا۔ ”ابھی پاپ کارن نہیں کھا کر آرہی ہو کیا؟“

”ایک تو اچھا بھلا سوپر جو نیئر دیکھ رہی تھی اوپر سے سردی۔ خوا مخواہ مجھے اٹھایا وہ بھی اس انوکھے لاڈلے کے لیے اب بھگتیں۔“ وہ دھٹالی سے شانے اچکاتی لیپ ٹاپ قریب کرنے لگی۔

چند منٹ بعد لیپ ٹاپ گود میں تھا۔ ایک ہاتھ میں جوس کا گلاس، سامنے پین پڑا، کٹلسس، ساس، فریج فراز، منہ مسلسل چلاتے ہوئے وہ کیز دبا رہی تھی۔ سعدی چپ چاپ اسے دیکھتا رہا تو اس نے فریج فراز کی پلیٹ برہمالی۔

”کھائیں گے؟“

”ان کا بھائی اغوا ہو گیا ہے، سارا گھر پریشان ہے، اغوا کار پچاس کروڑ مانگ رہے ہیں اور تم کھا رہی ہو؟“ خنین نے جوس کا گھونٹ بھرا اور سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ ”پچاس کروڑ میں کتنے زیرو ہوتے ہیں؟“

”اف۔“ وہ کراہ کراٹھا اور باہر نکل آیا۔ سیڑھیوں کے اوپر ریلنگ سے جھانکا۔ اور نگ زیب پریشانی سے ماتھا مسلتے بیٹھے تھے۔

ہاشم ادھر ادھر چکر کاٹ رہا تھا اور جواہرات ہدیائی انداز میں چلا رہی تھی۔ ”تم لوگ میسے کیوں نہیں دے رہے؟ وہ شیرو کو مار دیں گے ہاشم! آنسو اس کی آنکھوں سے ابلنے کو تیار تھے۔“

”ہم پیسے دے دیں گے بات پیسوں کی نہیں ہے می! مگر شیرو نے ان کی شکلیں دیکھ رکھی ہوں گی۔ کیا گارنٹی ہے کہ وہ پیسے لے کر اس کو چھوڑ دیں گے۔ ایسے لوگ تاوان لے کر مغوی کو مار دیا کرتے ہیں۔“

”تو تم کس چیز کا انتظار کر رہے ہو؟“ اور نگ زیب بھی غصے سے بولے تھے۔

”ان کی لوکیشن یا ان کے بارے میں کوئی معلومات۔ کوئی لیوریج ہونا چاہیے ہمارے پاس جس کے اوپر ہم ان سے شیرو کو زندہ سلامت واپس لیں۔“

جواہرات نفی میں سرہلاتی بندھال سی بیٹھ گئی۔ ہاشم موبائل پہ نمبر ملانے لگا۔ سعدی افسوس سے واپس پلٹ آیا۔ اندر وہ صوفے پہ بیٹھی، ہاشم کے ہیڈ فون چڑھائے چپس کھاتے ہوئے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

”کیا کوئی نئی ویڈیو آئی ہے؟“ وہ تیزی سے لپکا۔
 ”اوسوں۔ میں اس کے اکاؤنٹ کو ہیک کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ چند گھنٹے لگیں گے۔ تب تک میں اس ڈرامے کی آخری دو قسطیں دیکھ لوں۔“ بڑے غور سے اسکرین کو دیکھتی کہہ رہی تھی۔ وہ جو جوش سے لپکا تھا بھالک کی طرح بیٹھ گیا۔

”جہاں بھائی! اتنا مزے کا ڈراما ہے۔ Days

49 اس میں جو ہیروئن ہے۔“

”یا اللہ۔ کب شملی کو ریا ایٹم بم بنائے گا اور کب اسے جنہلی کو ریا پہ گرائے گا۔ کب جان چھوٹے گی اس کے“ پھر۔“

وہ کراہ کر پیچھے کو ہو گیا۔ حنین کے ڈرامے سر چکرا دیتے تھے وہ منہ بنا کر (ہونسا) پھر سے دیکھنے لگی۔



دوران سرائے کا دیا ہے
 جو کون و مکاں میں جل رہا ہے
 اس رات بھی حوالاتی کو ٹھڑی کی سلاخوں کا صرف
 کنارہ روشن تھا۔ باقی سب تاریکی میں ڈوبا تھا۔ ایک
 کونے میں فارس اور دوسرے میں احمر۔ دور دور چت
 لیٹے چھت کو دیکھ رہے تھے۔ فارس روشنی والے
 کونے میں تھا۔ ٹوب لائٹ کی مدد سے ہم ہی کرن اس کی
 تاریک دنیا کو روشن کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس کی
 کوشش کے باوجود احمر اس سیل سے نہیں گیا تھا۔ اب
 اس نے کوشش بھی ترک کر دی تھی۔

”فارس بھائی!“ اس نے ہلکے سے پکارا۔ چت
 لیٹے چھت کو تکتے فارس کی پیشانی پہ بل پڑے۔
 ”کیا تمہیں کسی نے خاموش رہنا نہیں سکھایا؟“
 ”میں نے سیکھا ہی نہیں۔ ویسے کوئی سکھانے والا

تھا بھی نہیں۔“ قدرے توقف کیا۔ ”آپ نماز پڑھتے
 ہیں؟“
 ”ہوں۔“

”وہ تو میں نے دیکھا ہی تھا۔ نماز میں بھی ساتھ والی
 کو ٹھڑی سے کیا آوازیں آرہی ہیں سب خبر ہوتی ہے
 آپ کو۔“

”سب کو ہوتی ہے اب سو جاؤ۔“ وہ بے زار ہوا۔
 ”سین بنا۔ کیا ہمیشہ سے بڑھتے تھے؟“
 ”نہیں جیل میں آنے کے بعد شروع کی۔“
 ”تو اب کیوں بڑھتے ہیں نماز اپنے کے بھائی کے
 قتل کے الزام۔“

”وہ میرا سوتلا بھائی تھا“ اپنے لمکشیں درست
 رکھو۔“

احمر نے بہت حیرت سے اسے دیکھا۔ ”مطلب وہ
 آپ کو پسند نہیں تھا؟“
 ”صرف تمہاری غلطی درست کر رہا ہوں زیادہ
 اسٹین نہ بنو۔“ (زیادہ چپکو نہیں۔)
 ”تو کیوں بڑھتے ہیں آپ نماز؟“

”مجھے خود نہیں تھا۔“ وہ بہت دیر بعد بولا۔ ”کچھ دن
 پڑھتا ہوں جوش سے پھر ڈھیلا پڑ جاتا ہوں اور کئی دن
 یوں گزر جاتے ہیں جیسے اندھیری سرنگ میں ہوں۔ پھر
 کچھ دن پڑھتا ہوں۔ تب اپنا آپ بہت نیک لگتا ہے۔
 ہلکا اور پارسا۔ مگر پھر ڈھیلا ہو جاتا ہوں اور یہ پڑھنے نہ
 پڑھنے کا چکر کبھی ختم ہی نہیں ہوتا۔ چاہوں تو ہر وقت
 بڑھوں، میرے اندر بہت اسٹیجنا ہے۔ مگر میری نماز
 تجھ پہ کوئی فرق نہیں ڈالتی۔ شاید میرا دل سخت ہو گیا
 ہے۔“

”اس نے بھی یہ ہی کہا تھا۔“ چت لیٹے احمر نے
 ہولے سے کہا تو فارس چونکا۔
 ”کس نے؟“

”چڑیل نے۔ پچھلے سال آیا تھا میں اور نگ زیب
 صاحب کے کہنے پہ آپ کی پیشی دیکھنے۔ تب جب
 انہوں نے چڑیل کو گواہی کے لیے بلایا تو اس نے بھی یہ
 ہی کہا۔“

”کون چڑیل؟“

”لو ہو۔ پراسکیوٹرز مرے۔ گھنگریالے بالوں والی چڑیل۔“ فارس کے ابو تن گئے۔ ناپسندیدگی سے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

”بکو مست۔“ مگر اس نے نہیں سنا۔ وہ چھت کو دیکھتا کہ رہا تھا۔

”جب استغاثہ نے اس سے اس کی حالت کا پوچھا تو اس نے کہا میرے پاس کھونے کو کچھ نہیں بچا، میری نماز بھی نہیں۔ کیونکہ اب میں نماز کے آخر میں دعا نہیں مانگتی۔ میرے حادثے نے میرا دل، میری زندگی، میری نماز، ہر شے کو مردہ کر دیا۔“

فارس چپ رہا۔ چہرہ واپس پھیر لیا۔ نگاہیں چھت پہ جا نکلیں۔

”میں بھی پانچ وقت کی نماز پڑھنا چاہتا ہوں۔ اچھی اور لمبی نماز، زندہ نماز، مگر مجھ سے یہ نہیں ہوتا، کیا کروں؟“

”پراسکیوٹرز سے پوچھو۔“ اس بات پہ احمر ہنسا۔ باہر پھیلی سرد رات ہر گزرتے بل سیاہ پڑتی گئی۔

”اچھا سنیں۔ آپ کا کیس کیسا جا رہا ہے؟“ احمر نے اس سب کوٹ بدلی۔ وہ اس سے کافی فاصلے پہ کمر کے بل لیٹا چھت کو دیکھ رہا تھا۔ سفید کرتا اندھیرے میں بھی دمک رہا تھا۔

”ڈھائی سال میں تین پیشیاں ہوئی ہیں، کیسا جا رہا ہو گا؟“

”اوہ۔ میری تو چند دن میں چار ہو چکی ہیں۔“

”کیونکہ تم اور نگ زیب کاردار کے آدمی ہو۔“

اس کے اندر تک کڑواہٹ پھیل گئی۔

”نہ کریں یا۔ کیوں ان سے اتنے خفا ہیں؟ وہ بُرے نہیں ہیں، بس اپنا فائدہ اوپر رکھا انہوں نے۔“

”اور وہ بھی تمہارے کہنے پہ۔“ تلخی سے نگاہ پھیر کر دور لیٹے احمر کو دیکھا۔ ”ویسے اب تک کیا، کیا رپورٹنگ کر چکے ہو میرے بارے میں؟“

”ہاشم سے ملاقات ہی نہیں ہوئی دوبارہ، نہ کسی اور نے کچھ پوچھا۔ اگر پوچھے گا تو بتا دوں گا۔“

”کیا؟“

”اتنا ہی جتنا آپ کے بارے میں سارے جیل کو معلوم ہے۔ جھگڑے، پھڈے وغیرہ۔“ وہ لاپرواہی سے ہنسا۔

”اور اگر میں کہوں کہ مجھے اس کیس میں بھی تمہارے سابقہ پاس نے پھنسا یا ہے تو ان کو بتا دو گے؟“

احمر ایک دم کہنی کے بل اٹھ کر بیٹھا، حیرت اور اچنبھے سے اس کا چہرہ دیکھا۔ ”کاردار صاحب نے؟ وہ کیوں پھنسا میں گئے آپ کو؟“

”وہ نہیں۔ ہاشم۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ اس نے ہی یہ دونوں قتل کروائے ہیں، بس اتنا کہہ رہا ہوں کہ اگر وہ چاہتا تو آج میں باہر ہوتا۔“

احمر کچھ دیر سوچتا رہتا۔ پھر نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں، فارس بھائی! جن دنوں آپ گرفتار ہوئے تھے، میں دن رات کاردار صاحب کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ واقعی آپ کے لیے پریشان تھے، مگر کچھ میری حکمت عملی اور کچھ ان کی اپنی سوچ تھی کہ انہوں نے آپ کے اوپر سے ہاتھ کھینچ لیا۔“

”الیکشن جیتنے کے بعد تو وہ میری مدد کر سکتے تھے نا۔“

”میرا خیال ہے ان کی نظر میں آپ قصور وار تھے۔ ہاں مگر ہاشم نے تو آپ کے لیے بہت بھاگ دوڑ کی۔ میں ان دنوں وہیں تھا۔ ہاشم نے بارہا آپ کو بے قصور کہا اور ان دنوں وہ آفس، جیل، پکھری کے چکر لگا لگا کر ٹکان کا شکار لگتا تھا، مگر اس نے آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ٹھیک ہے، آپ اس کو پسند نہیں کرتے، مگر اس کے بارے میں اتنا غلط مت سوچیں۔“

فارس کافی دیر خاموشی سے چھت کو دیکھتا رہا۔

”شاید تم درست کہہ رہے ہو۔ شروع میں اس پہ شک تھا، مگر پھر اتنے سال اس بارے میں سوچا۔ ہمارے جائیداد کے جھگڑے اتنے بڑے نہیں تھے کہ وہ مجھے اندر کرواتے، جبکہ میں ان سے کچھ مانگ بھی نہیں رہا تھا۔ دوسرا ان کی میرے بھائی سے بیوی سے کوئی دشمنی بھی نہیں تھی۔ کوئی بھی چیز ان کی طرف اشارہ نہیں کرتی، مگر۔“

وہ لعل طے بھر کو ٹھہرا۔ احمد دھیان سے اسے سن رہا تھا۔

”مگر آخری فتویٰ دل سے لیا جاتا ہے اور میرا دل ہاشم کے لیے کبھی اچھا نہیں سوچ سکتا۔“

”آپ کو ان کے بارے میں نہیں یہاں سے نکلنے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔“

”تو کیا کروں؟ جیل توڑ دوں؟“ وہ کوفت زدہ ہوا۔

”اچھا ایک بات تو بتائیں۔“ وہ پھر بولا۔ مگر فارس کو اب احساس ہوا کہ وہ کچھ زیادہ ہی بول گیا ہے۔ فوراً

کروٹ بدل لی۔

”چپ کر کے سو جاؤ زیادہ اسٹپنی نہ ہو۔“

اس کے انداز پر احمد نے منہ بتایا۔ (ہونہ) اور برے دل کے ساتھ واپس لیٹ گیا۔

”یونہی۔ میرے بھی کچھ پریزن رائٹس ہیں اور ان میں سب سے پہلی چیز صاف ستھری فضا کا ہونا ہائی جین والی ڈائٹ کا ہونا اور۔“

تھوڑی دیر بعد ”اسٹپنی“ پھر شروع ہو چکا تھا۔



مگر یہ قتل کی سازش کہاں سے آنکلی وہ لوگ تو تھے میرے خاندان کے ہی

ہاشم کے کمرے میں سینٹرل ہسٹنگ سے کافی گرماش تھی۔ حنین چپس کھاتے کمپیوٹر پر کام کر رہی تھی۔ صوفے پر پیچھے کوٹیک لگائے سعدی کو نیند آنے لگی مگر حنین کی آواز نے جگا دیا۔ وہ چونک کر سیدھا

ہوا۔

”آئیں ان کی فوٹوز دیکھتے ہیں۔“ وہ لچپی سی کہتی ہاشم کے لیپ ٹاپ پر فولڈرز کھولے جا رہی تھی۔

سعدی نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ ”بریں بات ہے حنہ! کسی کی ذاتی چیزیں نہیں دیکھتے۔“

”اوکے۔ آپ آنکھیں بند کر لیں۔“ اس نے پرانی تصویریں کھولیں لیں۔ ہاشم کی اسٹین فورڈ کے دنوں کی۔ تب بھی وہ ایسا ہی تھا مگر ذرا بگڑا۔ شہرین بھی ان میں تھی۔ کلاس فیلو بھی شاید یا جو نیئر۔

”یہ آج کہاں ہے؟“

”پنی امی کے گھر ہاشم بھائی نے بتایا ہے۔“ سعدی نے لبوں پر منٹھی رکھ کر جمالی روکی۔ حنین تیز تیز

تصویریں آگے کرتی جا رہی تھی۔ پھر وہ اس سے بھی بور ہو گئی اور واپس ڈراما لگا لیا۔ دھعتا ”ہاشم کمرے میں

داخل ہوا تو حنین نے جھٹ اسکرین پر اصل کام والی ونڈو سامنے کر لی۔

”علیشا کا ابھی تک کوئی جواب نہیں آیا۔ اغوا کار کا اکاؤنٹ ہیک کرنے میں ابھی کچھ اور گھنٹے لگیں گے۔“

اس نے اطلاع دی۔ ہاشم نے بس سر ہلایا اور الماری کی طرف آیا۔ سعدی یوں ہی گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ الماری سعدی کی پشت پر تھی۔ ہاشم

نے دروازہ کھولا تو خاٹے سامنے آئے تیسرے خاٹے میں ایک ڈیجیٹل لاک والا سیف نصب تھا۔ ہاشم نے

چند نمبر دیا کر سیف کا دروازہ کھولا۔ اندر کاغذات چیک بکس، نوٹ، بہت کچھ نظر آیا۔ وہ چیزیں الٹ پلٹ

کر کے کچھ ڈھونڈنے لگا۔ سعدی نیند میں ڈوبی آنکھوں سے اسے ہمدردی سے دیکھنے لگا۔

اس نے چیک بک نکالی اور کچھ پیروز۔ اندر سیف میں ہر چیز بکھر چکی تھی اور سعدی واپس گردن موڑنے ہی لگا تھا کہ نگاہ میں کچھ اٹکا۔ جیسے سیاہ رات میں کوئی

انکارہ نظر آئے۔ مگر وہ بلاشبہ ایک دکھتا ہوا انکارہ تھا۔

سیف کی دیوار کے ساتھ ایک لفافے سے کچھ جھلک رہا تھا۔ ایک تصویر کی سفید پشت جس پر سرخ

اور نیلے ننھے ننھے انگوٹھوں کے نشان تھے۔ جیسے پینٹ میں ڈبو کر لگائے گئے ہوں۔ بس ایک جھلک دکھائی دی

اور ہاشم نے سیف بند کر دیا۔ پاس ورڈ دبا کر لاک کیا اور باہر نکل گیا۔

اور سعدی یوسف کی ساری دنیا وہیں ٹھہر گئی۔ نیند کھل چکی تھی۔ وہ سالوں بعد اب جاگا تھا۔

”حنہ۔“ اس کو اپنی آواز کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔ ”تمہیں یاد ہے جب میں دادی کی ڈھتھ پہ آیا تھا

پاکستان۔ وارث ماموں کی ڈھتھ سے چھ ماہ پہلے شاید۔“

تب میں ان کی بیٹیوں کی ایک تصویر لایا تھا جس کی بیک پر پینٹ میں ڈبو کر ان دونوں کے انگوٹھوں کے نشان ثبت کیے تھے؟

”جی۔ وہ آپ نے وارث ماموں کو دے دی تھی اور انہوں نے اسے اپنے لپ ٹاپ کی الٹی طرف کارڈ ہولڈر میں ڈال دیا تھا تاکہ ان کے پاس رہے ہر وقت۔“ حنین مصروف سی کیز دیا تی کے جاری تھی۔ اس کو لگا وہ سانس نہیں لے پائے گا۔

”وہ تصویر اب کہاں ہوگی؟“
”کیا ہو گیا ہے بھائی؟“ وہ کھٹ کھٹ ٹاپ کرتی بولی۔ ”ماموں کے قاتل ان کا لپ ٹاپ لے گئے تھے اب تک تو انہوں نے وہ سب تباہ بھی کر دیا ہوگا“ سنبھل کر تھوڑی رکھی ہوگی۔

سعدی کی مری مری نگاہیں بند الماری پر مرکوز ہوئیں۔ چہرہ سفید پڑ رہا تھا۔

”ہاشم اور میرے لیے کوشش کرے؟ ناممکن!“
کہیں باغی سے فارس کی جھنجھلائی ہوئی آواز گونجی۔
”مجھے ہاشم پر شک ہے۔ اسی کا ہاتھ ہوگا اس میں۔“

”ہاشم چاہتا تو میں باہر ہوتا۔ میں باہر اس لیے نہیں ہوں کیونکہ اس نے چاہا ہی نہیں۔“

”ماموں کہہ رہے تھے انہیں ہاشم بھائی پر شک ہے۔ ماموں کو ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔“

”میں فارس کی وجہ سے اپنی بیوی اور بچی کو وقت نہیں دے پا رہا۔“

”ہاشم کو میرے ایئر کے بارے میں پتا چل گیا دیکھو کیا کیا اس نے میرے ساتھ۔“

اس کو لگا اس کے ہاتھ کپکپا رہے ہیں۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ وہ بالکل سن سا بیٹھا تھا۔ پلکیں بھی نہیں جھپک رہا تھا۔

”وہ تصویر تمہیں واقعی یاد ہے حنا! کہ ماموں کے لپ ٹاپ کے کارڈ ہولڈر میں ہی تھی؟“

”جی۔ مگر آپ کو کیوں خیال آیا اچانک؟“ وہ ایک دم چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ سنبھل کر پھیکا سا

سکرایا۔

”میں ہی۔ تمہارا کام کہاں تک پہنچا؟“

”ہو رہا ہے۔ ویسے آپ کو یہ بات عجیب نہیں لگی کہ نوشیرواں بھائی کا اغوا ان ہی دنوں میں کیا گیا جب خاور یہاں نہیں تھا۔ اورنگ زیب انکل نے بتایا تھا مجھے کہ خاور ان کے آفس اور گھر کا کمپیوٹر جھنسن ہے۔ ویسے یہ کاردارز کا کاروبار کیا ہے؟“

”یہ ایک کارٹیل کو ہیڈ کرتے ہیں۔“

”کارٹیل کیا ہوتا ہے؟“

”مفضل سوال مت پوچھو۔ تمہیں پتا ہونا چاہیے کیا ہوتا ہے۔“ وہ ایک دم چڑ کر بولا۔ دماغ اتنا الجھا ہوا تھا کہ حنین کی باتیں بے زار کر رہی تھیں۔ اس نے جواب میں زور سے ہونہ کہہ کر سرخ پھیرا۔

”میری توجہ جواب آپ سے کچھ پوچھوں یا بتاؤں۔ ہونہ!“

ہاشم کے قدموں کی آواز آئی تو وہ ذرا سنبھل کر بیٹھا۔ ہاشم اندر آیا۔ وہی پریشان، تناؤ زدہ چہرہ لیے۔ سعدی کے پیچھے آکر الماری کھولی۔ سعدی نے اب کے گردن نہیں موڑی۔ سامنے ڈرنگ مرر لگا تھا۔ وہ آئینے میں ہاشم کو دیکھتا رہا۔ اس نے سیف کا کوڈ دیا۔ چار ہند سے۔ سعدی نے دماغ میں فیڈ کیے۔ سیف کھلا تو اس نے کاغذات واپس رکھے اور اسے بند کیا۔ پھر سے کوڈ دیا۔ سعدی نے اب کے پکایا کر لیا۔ وہ اس کی تارخ پیدائش تھی۔

وہ چلا گیا اور سعدی کتنی ہی دیر حنین کے ساتھ خاموش بیٹھا رہا۔ اس کا کام جاری تھا۔ وہ بھائی کے چہرے کو دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ وہ بس چپ چاپ بیٹھا رہا۔ کتنی ہی پرانی باتیں یاد آئیں۔

ای کہتی تھیں ہاشم کا وکیل کیوں ان کو ہر دفعہ ٹال دیتا ہے کیوں وہ کچھ ٹھوس اقدام نہیں کر رہا اور وہ ہر بات عدالتی نظام پر رکھ دیتا۔ تب آنکھوں پر اعتماد کی پٹی بندھی تھی۔ اب اس میں سوراخ ہو رہے تھے۔

کیا پتا ہاشم نے وہ لپ ٹاپ وارث کے قاتلوں سے حاصل کر لیا ہو اور وہ تصویر رکھ لی ہو مگر انہوں نے

ہمیں کیوں نہیں بتایا۔ کیا جتا اس میں کچھ ایسا ہو جو فارس کے لیے نقصان دہ ہو۔ مگر انہوں نے ہمیں کیوں نہیں بتایا۔ ہر تو جیہ کے آخر میں وہ الجھ جاتا۔ ہاشم نے کچھ سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہو شاید کچھ تو سوچا ہو گا۔ کیا بتایہ کوئی اور تصویر ہو ان کی اپنی بیٹی کی، مگر نہیں اس کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ یہ وہی فوٹو تھی۔

”میں ابھی آئی۔“ حنین ایک دم اٹھی اور باہر چلی گئی۔ اس نے کچھ نہیں پوچھا۔ بس یوں ہی چپ سا بیٹھا رہا۔ پھر ایک دم چونک کر سر اٹھایا۔

وہ کمرے میں اکیلا تھا۔ گردن اوہرا دھر موڑی۔ پھر آہستہ سے اٹھا اور الماری کی طرف آیا۔

اس کی تربیت اس کا ایمان سب کہہ رہے تھے کہ کسی کالا کر کھولنا گناہ ہے، مگر اس کا دل کہہ رہا تھا کہ آخری فتویٰ مجھ سے لو، میں کہتا ہوں، ایسا کر ڈالو تو کر ڈالو۔ اور دل سے بحث کا وقت ہی نہیں تھا۔ اس نے جلدی جلدی کوڈ ڈالا۔ لا کر کھولا۔ تصویر والا لفافہ سامنے تھا۔ سعدی نے کپکپاتے ہاتھوں سے فوٹو نکالی اور الثانی۔

اٹل اور نور۔ اس کے دل کو دھکا لگا۔ یہ وہی فوٹو تھی۔ ہاشم کو نیچے پسند تھے۔ وہ بچیوں کی تصویر تباہ نہ کر سکا تھا۔

وہ جواب تک بے یقینی کے عالم میں تھا، ایک دم سے اس کی آنکھوں میں سرخی اترنے لگی۔ لب بھنج گئے۔ مڑ کر دروازے کو دیکھا جس کے پار نیچے لاؤنج میں ہاشم بیٹھا تھا۔ ایک لمحے کو اس کا دل چاہا ابھی جا کر اس کو گریبان سے پکڑے اور پوچھے کہ اس نے کیوں کیا ان کے ساتھ ایسا؟ اس کا اس سب میں ہاتھ تھا۔ فارس ٹھیک کہتا تھا، کیونکہ فارس اس کو جانتا تھا اور سعدی اس کو بالکل نہیں جانتا تھا۔

مگر وہ فارس نہیں تھا۔ اس کو غصے سے بے قابو ہو کر ہاشم کا گریبان نہیں پکڑتا تھا۔ اس کو کچھ اور کرنا تھا۔ اس نے وہ لفافہ نکالا۔ اس میں مزید بھی کچھ

تصویریں تھیں۔ وہ ان کو دیکھا گیا اور دل ہر ایک پہ ڈوتا گیا۔

وہ اس ریسٹورنٹ میں فائرنگ کے فوراً بعد کی تھیں۔ خون میں لت پت زمر۔ ابھی لوگ بھی اکٹھے ہونا شروع نہیں ہوئے تھے۔ اور وہ اوپر سے لی گئی تھیں۔ اوپر ہوٹل کے کمرے کی کھڑکی سے۔

سعدی کی آنکھوں سے نیند اب بالکل غائب ہو چکی تھی۔ وہ ساکت، سانس روکے ایک کے بعد ایک تصویر دیکھ رہا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ پیشہ ور قاتل اپنے شکار، اپنی مہارت کی تصاویر اپنے پاس سنبھال کر رکھتے ہیں اور پھر سے اپنا بے عیب کام دیکھا کرتے ہیں۔ مگر اسے یقین آج آیا تھا۔

لفافے کی آخری چیز ایک فلیش ڈرائیو تھی۔ سعدی نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس پہ کوئی ٹیک نہیں لگا تھا۔

باہر نکل کر حنین نے ریٹنگ کے اوپر سے جھانکا۔ ہاشم نیچے صوفے پہ بیٹھا انگلیوں سے پیشانی مسل رہا تھا۔ سر اٹھایا تو چند منے اشارہ کیا۔ جواہرات مسلسل کچھ بول رہی تھی۔ اورنگ زیب فون پہ بات کر رہے تھے۔ ہاشم اس کے اشارہ کرنے پہ اٹھ کر اوپر آیا۔ جس وقت سعدی لا کر کا پاس ورڈ دیا رہا تھا وہ دونوں بند دروازے کے آگے کھڑے تھے۔

”تو شیرواں بھائی کا کمر کون سا ہے؟ مجھے چیک کرنا ہے کہ ان کا کمپیوٹر ہیک تو نہیں کیا گیا؟“

”لیپ ٹاپ تو وہ ساتھ لے کر گیا تھا، مگر وہ زیادہ ڈیسک ٹاپ استعمال کرتا ہے۔“ ہاشم ساتھ والے کمرے میں داخل ہوا تو وہ پیچھے آئی۔ اس نے جی جلائی اور کمپیوٹر میبل کی طرف اشارہ کیا۔ عین اس وقت سعدی دیوار کے پار لا کر میں سے تصویریں نکال کر دیکھ رہا تھا۔

”دیکھ لو جو دیکھنا ہے۔“ تکان سے اشارہ کیا۔ وہ فوراً آگے جا کر کرسی پہ بیٹھی اسے آن کیا۔

”آخری دفعہ آپ کی کب بات ہوئی تھی ان سے؟“

”غوا سے پہلے؟“

”غوا سے شاید چھ سات گھنٹے پہلے بات ہوئی تھی۔ وہ سینٹرل میں تھا اور شاپنگ کر رہا تھا، خوش

”میں نے جو بھی کہا، پریشانی میں کہا۔ میں اپ سیٹ ہوں۔ میرا بھائی مجھے بہت عزیز ہے۔“
اب وہ پھر سے بند آنکھوں کو مسل رہا تھا۔ حنین دم سادھے اسے تک رہی تھی۔ پھر ہاشم نے آنکھیں کھولیں۔ بہت امید، بے بسی اور آس سے اسے دیکھا۔

”اگر خاور ہوتا تو میں کبھی ایک چھوٹی بچی سے درخواست نہ کر رہا ہوتا، مگر میں اس وقت بالکل مفلوج ہوں۔ حنین۔“ ”مدھم“ تھکی آواز میں وہ کہتا گیا اور وہ سانس روکے سنے گئی۔ ”تم کچھ بھی کرو، بس میرے بھائی کو اذیت دینے والوں کا پتا کرو مجھے۔ کرو گی نا؟“
اس نے ہاشم کو پہلی دفعہ اتنا کمزور دیکھا تھا۔ اس نے شاید ہاشم کو دیکھا بھی پہلی بار تھا۔ اس طرح۔ اس نظر سے۔ اور یہ وہ لمحہ تھا جب ہاشم کے لیے حنین ذوالفقار یوسف خان کا دل پلٹ گیا تھا۔

اور یہ وہ لمحہ تھا جب متصل کمرے میں کھڑے کلا کر میں سے تصویریں نکال کر دیکھتے سعدی ذوالفقار یوسف خان کا ذہن ہاشم کے لیے پلٹ گیا تھا۔

ان دونوں کے احساسات سے بے خبر ہاشم اپنی کمزوری، اپنے بھائی کو کسی دوسرے کے ہاتھ پا کر، خود کو بہت بے بس محسوس کرتے ہوئے شیرو کے کمرے کے کاؤچ پہ بڑھال بیٹھا تھا۔

حنین نے آہستگی سے رخ پھیر لیا۔ اس کے اپنے ہاتھ ذرا سے کپکپائے تھے۔ پھر اس نے کچھ پیپرز پرنٹ کیے، کمپیوٹر آف کیا، اور صوفے کی طرف گھومی۔

”آپ پریشان مت ہوں۔ وہ علیشا نہیں ہے، علیشا ایسا کبھی نہیں کر سکتی۔ وہ ایک کمزور لڑکی ہے۔ میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ آپ مجھ سے الیکسکیوز کریں، آپ بڑے ہیں، آپ نے وہ ہی کیا جو آپ کو ٹھیک لگا۔ مگر ایک دفعہ آپ کو علیشا کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ اس کو پیسے دینے سے آپ کی دولت کم نہ ہو جاتی، جیسے اغوا کاروں کو دینے سے کم نہیں ہوگی۔“

تھا۔ ”وہ اداسی سے مسکرایا۔“
”ہوں۔ اچھا اس کمپیوٹر کا پاس ورڈ کیا ہے؟“
”پتا نہیں۔“ ہاشم نے شانے اچکائے۔ تھکا تھکا سا وہ صوفے پر گر سا گیا۔ دروازہ پورا کھلا تھا۔ نیچے سے جواہرات گے بولنے کی آواز ہنوز آرہی تھی۔

”لو کے جو بھی ہے، اڑا دیتی ہوں۔“ ایڈمنسٹریٹر پاس ورڈ نہیں تھا۔ سو اس نے آسانی سے کمپیوٹر کھول لیا۔ اب وہ خاموشی سے کیڑبائی کام کرنے لگی۔

”کیا آپ لوگ پیسے دے رہے ہیں؟ میرا مطلب ہے ابھی آپ اپنے لاگرسے کچھ نکال رہے تھے۔“
”ڈیڈ دے رہے ہیں پیسے، شیرو سے بڑھ کر نہیں ہیں۔“ وہ بند آنکھوں کو مسل رہا تھا۔

”آپ کسی اور سے رابطہ کرنے کی کوشش تو کریں۔ کیا معلوم، وہ آپ کے کمپیوٹرز اور فون ٹیپ نہ کر رہے ہوں۔ یہ صرف ایک خالی خولی دھمکی ہو۔ آپ کے تو اتنے کانٹیکٹس ہوں گے۔“

”اؤنہوں۔ میں اپنے بھائی کی زندگی پہ رسک نہیں لوں گا۔“

”آپ لکٹی ہیں۔ آپ کو اپنے بھائی کو بچانے کا موقع مل گیا۔ کاش ہمیں بھی ملتا، ماموں کو بچانے کا، تو ہم بھی ہر رقم دے دیتے۔“ وہ ٹائپ کرتی کہہ رہی تھی۔
دوسری طرف خاموشی رہی تو حنین نے گردن موڑ کر دیکھا۔

وہ صوفے پہ بیٹھا، اسے دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں اتنی بے بسی اور گرب تھا کہ حنین کے دل کو کچھ ہوا۔

”سوری، میرا مطلب آپ کو دکھی کرنا نہیں تھا۔“
مگر ہاشم نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا۔

”آئی ایم سوری نیچے۔ میری ہر اس چیز کے لیے جس نے تمہیں دکھ دیا ہو۔“ وہ ایک دم بہت ڈسٹرب نظر آنے لگا تھا۔ ”علیشا کا معاملہ میں نے غلط طریقے سے ہینڈل کیا۔ پھر ابھی بھی میں تم پہ غصہ کر گیا۔ مجھے تمہارے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آئی ایم سوری بیٹا۔“ آنکھیں بند کیں، انگلیوں سے پیشانی مسلاتا رہا۔ حنین ہاتھ روک کر اسے دیکھے گئی۔

ہم سا کہہ کر وہ باہر نکل آئی۔ ہاشم نے معلوم نہیں سنا بھی تھا یا نہیں۔
وہ واپس کمرے میں داخل ہوئی تو سعدی نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ ہاشم کا لا کر کھولے کھڑا تھا۔ حنین کو پہلے تو جھٹکا لگا، پھر کڑبڑا کر جلدی سے دروازہ بند کرتی قریب آئی۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“
”یہ فلیش چاہیے تھی مجھے۔“ جلدی سے وہ لفافہ جس میں وہ تصاویر ڈال چکا تھا واپس رکھا، لا کر بند کیا اور اس کی طرف گھوما۔
”مجھے اس کو کاپی کرنا ہے۔ مت پوچھو یہ کیا ہے بس میرے آفس کی چیز ہے۔ مجھے پتا ہے یہ غلط ہے مگر تمہارے پاس کوئی ڈیوائس ہے جس پہ میں یہ کاپی کر سکوں؟“

حنین نے سر جھٹکا، اس ایک رفسوس لمحے کا اثر زائل کیا اور گہری سانس لے کر مشکوک نظروں سے بھائی کو دیکھتی آگے آئی۔ ہاشم کی اسٹڈی ٹیبل کی دراز کھولی، اوپر ادھر ہاتھ مارا اور واپس مڑی تو ہاتھ میں یو ایس بی تھی۔

”کیا یاد کریں گے، کسی سخی سے پالا پڑا تھا۔ کاپی کر لیں، کچھ دن بعد آکر چپ چاپ رکھ دیتا۔“
عام حالات میں اس چوری پہ ڈانٹ دینے والے سعدی نے چپ چاپ اسے لپ ٹاپ میں لگا لیا۔
”اس میں ان کا رٹیل کے کچھ ڈاکو منٹس ہیں۔ میرے پروجیکٹ کے لیے فائدہ مند ہیں۔“

”کارٹیل کیا ہوتا ہے؟“ وہ چپس اٹھا کر کھانے لگی تھی، رکی۔ پھر سر جھٹکا۔ ”خیر، نہیں بتانا بالکل بھی اب آپ مجھے کچھ نہ بتایا کریں، میں بھی نہیں بتاؤں گی کچھ۔“

”سر نہ کھاؤ میرا۔ باہر جا کر مسز کاردار کے پاس بیٹھو۔“ وہ اس فلیش کو کاپی کر رہا تھا، جیسے ہی کام ختم ہوا، اس نے اصلی فلیش نکالی اور اٹھ کر اسے واپس لا کر میں رکھ دیا۔ جب پلٹا تو وہ ہنوز بیٹھی تھی۔ چپس اٹھا کر منہ میں رکھتی ہوئی۔

”تم جاؤ بھی، اچھا نہیں لگتا، جب سے آئے ہیں، ان کو ایک لفظ سلی کا نہیں بولا۔“
”اوکے!“ وہ مشکوک نظروں سے اسے دیکھتی انٹھی اور باہر آگئی۔

ہاشم اب سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ حنین نے دروازہ بند کر دیا، اور اس کے ساتھ نیچے اتر آئی۔ جواہرات اور اورنگ زیب مخالف صوفوں پہ فکر مند سے بیٹھے تھے۔ پوری رات کی ذہنی اذیت نے تھکا دیا تھا۔

”ڈونٹ وری انکل! ایک دفعہ نوشیرواں بھائی، بخیریت گھر پہنچ جائیں تو میں رقم کو ٹریس کر لوں گی۔“
جواہرات نے تیز نظروں سے اسے گھورا۔ ”اور کیا اس میں اس لڑکی کا ہاتھ ہے؟“

”نہیں، اس کے ہاتھ اتنے لمبے نہیں ہیں۔“ اس نے شانے اچکا دیے۔ پھر قریب سے گزرتی میری انجیو کو روکا۔ ”سنو، تمہارے فش فنگر ز تیار نہیں ہوئے ابھی تک؟“

”بس میں لائی رہی تھی۔“

”ویسے آج کل میں ایک کورین ڈرامہ دیکھ رہی تھی 49 Days۔ اس کا ایک فلپائی ورژن بھی عنقریب بننے لگا ہے، کیا تمہارے ملک میں بھی کے کلچر مشہور ہے؟“

”بہت زیادہ۔“ میری نے اس کو دیکھا، پھر سلگتی نظروں سے خود کو گھورتی جواہرات کو اور جلدی سے وہاں سے کھسکی۔

اندر بیٹھا سعدی اب ہاشم کے لپ ٹاپ کو کھنگال رہا تھا۔ کچھ تو ملے گا۔ سرسری سا ایک ایک فائل کھولتا، وہ مایوس ہونے لگا تھا جب بالآخر چند ڈاکو منٹس ملے جن کے نام نہیں تھے، صرف نمبرز تھے اور وہ لاکڈ تھے۔ انہی میں کچھ تھا۔ اس نے ان کو کاپی کرنے کی کوشش کی مگر یہ ناممکن تھا۔ اب کیا کرے؟ اور شب ہی اغوا کاروں کا اگلا پیغام آیا۔ پیغام پڑھ کر سعدی تیزی سے باہر رینگ پہ آیا۔ نیچے سب بیٹھے تھے۔ حنین بھی ٹانگ پہ ٹانگ رکھے، پاؤں ہلاتی، موبائل پہ بن دبا رہی تھی۔

”ان لوگوں کا نیا پیغام آیا ہے۔ پیسے مل گئے ہیں، نوشیرواں چار سے پانچ گھنٹے تک پہنچ جائے گا مگر اس کے پہنچنے تک وہ نہیں چاہتے کہ ہم کسی کو خبر کریں۔“ وہ لیپ ٹاپ لیے نیچے اترتے ہوئے بتا رہا تھا۔ فلیش جیب میں تھی اور چہرے پہ گہری سنجیدگی تھی۔ ذہن ابھی الجھا تھا۔

سب خاموش رہے۔ سعدی، حنا کے ساتھ آکر بیٹھ گیا۔ وہ لیپ ٹاپ گھنٹوں پہ رکھے، پھر سے کام کرنے لگی۔ چونکہ اسکرین حنین کی اپنی طرف تھی تو کانوں میں ایئر فونز لگا دیے اور ڈرامے کی قسط چلا دی۔ ”اور شیرو کے آنے تک وہ لوگ بہت دور جا چکے ہوں گے۔“ اور نگ زیب بے بسی بھرے غصے سے بدبلائے۔ جواب میں جوہرات اور ہاشم ایک ساتھ بولنے لگے۔ سعدی نے ہاشم کو دیکھا تو دل نرم پڑنے لگا۔ وہ اتنا پریشان اتنا ٹوٹا ہوا لگ رہا تھا اور وہ اس کے بارے میں کیا سوچ رہا تھا؟ کیسے اس کے لاکر سے کچھ چرا کر لے آیا؟ کیسے کر لیا اس نے یہ سب؟ تب ہی اسکرین پہ نظر پڑی۔

”میں بھی تو تم کوئی اور ڈراما دیکھ رہی تھیں۔“ سعدی نے ملے سے سرگوشی کی۔ حنین ایک لمحے کو گڑبڑائی۔ ”وہ۔ یہ بھی میرا فورٹ ہے، پونہ دو بارہ دیکھ رہی ہوں۔“ وہ خاموش رہا۔ ابھی ہوئی نگاہیں اسکرین پہ رہیں جہاں حنین مناظر آگے آگے کر کے دیکھ رہی تھی۔

”آ۔ ہاشم بھائی۔“ کوئی گھنٹے بعد سعدی نے اسے پکارا۔ وہ جو درمیان میں اٹھ کر باہر چلا گیا تھا، شیرو کے آنے کی تیاری وغیرہ، ایئر پورٹ، فلائٹس ٹائمنگ چیک کرنے، اب آکر بیٹھا تھا، ذرا چونک کر اسے دیکھا۔

”ہاں بولو۔“

”فارس ماموں کا وکیل کہہ رہا تھا کہ ہمیں اگر وارنٹ ماموں کی فائلز مل جائیں تو کسی نہ کسی طرح ہم ان کے اصل قائلوں تک پہنچ سکتے ہیں؟“

ہاشم ابھی تک شدید پریشانی کا شکار تھا اس نے ذرا

سے شائے اچکائے۔

”مشکل ہے، اب کہاں ملیں گی اس کی فائلز۔ اتنا عرصہ گزر گیا۔ تم کوشش کر لو مگر مشکل لگتا ہے۔ سمجھ رہے ہوتا؟“

”جی بالکل، سمجھ رہا ہوں اب۔“ ذرا اثبات میں سر ہلایا، ہاتھ سے نا محسوس انداز میں جینز کی جیب کو چھوا جہاں فلیش موجود تھی۔ ہاشم اب موبائل دیکھنے لگا۔ اور سعدی گاہے بگاہے ایک سنجیدہ نظر اس کے چہرے پہ ڈال لیتا۔

بار بار وہ دل میں ہاشم کی طرف صفائی پیش کرتا تھا۔ وہ ساری صفائیاں دم توڑنے لگیں۔ رات کی تاریکی میں اس کے اعتماد کا خون بھی آہستہ آہستہ رسنے لگا اور رس رس کر بالآخر اس نے اعتماد کے لاشے کو ادھ موا کر دیا۔



اس کے اپنے گھر کا صفایا دن کو کیسے ہو پایا وہ جو شب بھر شہر کی خود مگرانی کرتا رہتا ہے صبح سورج نکلنے اور ہر سورتی پھیلنے تک وہ لوگ وہیں لاؤنج میں بیٹھے رہے۔ ناشتے کی ٹرالیز اب میری اور فیوٹالے کر جا رہی تھیں، جب بیرونی دروازے پہ ہلچل مچی۔ ہاشم شیرو کو ایر پورٹ سے لے کر آیا تھا۔ جوہرات اور اورنگ زیب تیزی سے اس کی طرف لپکے۔ سعدی، ہنوز خاموش سوچ میں ڈوبا بیٹھا تھا اور حنین، وہ جوس کے گھونٹ گھونٹ پتی، تیکسی نظروں سے دونوں ماں باپ کو اپنے بیٹے کو گلے لگاتے دیکھتی رہی۔ وہ واقعی تکان کا مارا لگ رہا تھا، ماتھے کے زخم پہ بند باندج لگی تھی۔ آنکھیں روئی ہوئی تھیں۔ زبردستی مسکراتا، ماں سے گلے لگ کر الگ ہوا تو ان دونوں بہن بھائی کو بیٹھے دیکھ کر چوٹا، پھر فوراً ”ہاشم کی طرف دیکھا۔“ حنین کیپیوٹرز میں اچھی ہے، ہم ان لوگوں کو ٹریس کرنے کے لیے اس کی خدمات لے رہے تھے۔“ اس نے وضاحت دی۔

”تو کیا آپ نے پیسے واپس حاصل کر لیے؟“ وہ

حیرت سے پوچھتا صوفے پر بیٹھا۔ اور نگ زیب ایک طرف اور جواہرات دوسری طرف بار بار نم آنکھوں کو بوچھتی۔ اور نگ زیب گو کہ اپنے تاثرات کو سخت رکھ کر ہی بیٹھے تھے مگر اندر سے وہ نرم پڑ چکے تھے۔

”نہیں! ہاشم مسکراتے ہوئے (بالاخر) واپس آتے اعتماد کے ساتھ سامنے والے صوفے پر بیٹھا۔
”ہم تمہارے آنے سے پہلے ان کا تعاقب کر کے تمہاری جان خطرے میں نہیں ڈال سکتے تھے۔ مگر حنین کہہ رہی ہے کہ وہ ان لوگوں کو ٹریس کر سکتی ہے۔“

”تو کیا ان دونوں کو کال کرنے پر انہوں نے مجھے یہ زخم دیا؟“ بگڑ کر کہتے اس نے پیشانی کے زخم کی جانب اشارہ کیا۔ اسے سعدی کا یہاں ہونا سخت ناگوار گزر رہا تھا۔ جواہرات نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دیا۔
”ہاشم نے تو بس یونہی ان کو بلا لیا۔“ ساتھ ہی جتنی نظر حنین پر ڈالی اور پھر شیرو کے ماتھے کے پال ہٹا کر بینڈیج ٹھیک کرنے لگی۔ وہ ایک دم بہت خفا نظر آنے لگا تھا۔

”آپ لوگوں نے مجھے بچانے میں اتنی دیر کیوں لگائی؟ جانتے ہیں میرا کیا حال تھا ادھر؟ کتنا خوف میں نے محسوس کیا؟ کیا پیسے مجھ سے زیادہ اہم تھے؟“
”ایسا نہیں ہے شیرو!“ اور نگ زیب نے بھی ہولے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ مگر اس نے کندھا جھٹک دیا۔ حنین نے جوس کا گلاس رکھا اور کہنا کھاری۔

”آپ نے ان کی شکلیں تو دیکھی ہوں گی نوشیرواں بھائی؟“
”ہاں!“

”چلیں یہ اچھا ہوا کیونکہ ویسے ان لوگوں کو ٹریس کرنا مشکل ہے۔ اصل میں میری کوریا کے ایک پولیس چیف سے بات ہوئی ہے۔“ سعدی نے چونک کر حنہ کو دیکھا جو پورے اعتماد سے نوشیرواں کو دیکھتی کہہ رہی تھی۔ ”ان دو لوگوں پر شک ہے۔ یہ دونوں نامور مجرم ہیں اور دونوں کل رات امریکا منتقل ہو گئے

ہیں افسوس کہ اب نہ ہم ان سے رقم واپس لے سکتے ہیں نہ ہی ان کو پکڑ سکتے ہیں۔ آپ بس ان دونوں کی تصویریں دیکھ کر کنفرم کر دیں کہ آپ کو پکڑنے والے گروہ کا سرغنہ کون تھا۔ حیران مت ہوں ہاشم بھائی! مجھ سے زیادہ کورین لوگوں کو کون جانتا ہے؟“

اس نے دو پرنٹ آؤٹ سامنے کیے۔ دو کورین مردوں کے کلوز اپ سب کے سامنے ہوئے۔
ہاشم بے چینی سے آگے ہوا۔ ”مجھے بتائے بغیر تم کیسے کسی سے بات کر سکتی ہو؟ اگر وہ شیرو کو نقصان پہنچاتے تو؟“

سعدی نے ایک چبھتی ہوئی نظر ہاشم پر ڈالی مگر بولا کچھ نہیں۔ کیا صرف شیرو کی جان اہم تھی؟ اور اہل اور نور کے لیے کوئی اہم نہیں تھا؟
”بتاتی ہوں پہلے شیرو بھائی کنفرم تو کر دیں کہ ان میں سے کون تھا وہ۔“ نوشیرواں نے باری باری دونوں کے چہرے دیکھے پھر دائیں والے پر ٹھہرا آنکھیں سکیڑیں۔

”یہی تھا بالکل یہی تھا۔“
”شیرو!“ حنین نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”سو فیصد۔ مگر اب یہ کہاں ہوگا؟“
حنین نے گہری سانس لی جیسے کندھوں سے کوئی بوجھ اتر گیا ہو۔ اور پھر مسکرائی۔ شرارت سے معصومیت سے۔

”یہ آج کل امریکا میں ہے فلم کی شوٹنگ کے لیے۔ اوہ سوری شیرو بھائی! مگر یہ لیسن ہو ہے۔ کوریا کا دو سرا بڑا ایکٹر۔ یہ پہلی تصویر اس کی پلاسٹک سرجری سے پہلے کی ہے دوسری سرجری کے بعد کی۔“

کمرے میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔ کسی کو اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ نوشیرواں کا رنگ سفید پڑنے لگا۔

”نوشیرواں بھائی! آپ خود بتائیں گے یا میں بتاؤں کہ اپنے آپ کو آپ نے خود ہی اغوا کیا تھا۔ اور وہ

تاوان کی رقم وہ بھی آپ کے ہی اکاؤنٹ میں ہے۔“
جواہرات کا شیرو کا کندھا مسلتا ہاتھ رک گیا۔ اورنگ
زیب بے اختیار آگے کو ہوئے اور ہاشم بالکل ساکت
بیٹھا رہ گیا۔

”کیا بکد واس ہے؟“ شیرو ہکھلایا۔ بے یقینی سی
بے یقینی تھی۔

”سارے ذہن لوگوں کا ایک مسئلہ ہوتا ہے۔
انہیں لگتا ہے کوئی ان کو بے وقوف نہیں بنا سکتا۔ اسی
لیے میں نے اپنے شک کی تصدیق کا انتظار کیا۔ جو کہ
اب ہو گیا۔“ تصویریں لہرائیں۔

”اب یہ مت کہیے گا کہ سارے کورین ایک سے
لگتے ہیں تو آپ نے غلط بندے کی تصویر کی تصدیق
کر دی۔ کورین بھی اتنے ہی مختلف ہوتے ہیں جتنے کہ
ہم۔“

”تم کیا کہہ رہی ہو تمہیں خود بھی علم ہے؟“
جواہرات دانت بیستی غرائی۔ سعدی بالکل چپ بیٹھا
تھا۔

”مجھے ہی تو علم ہے مسز کاردار! شیرو بھائی کبھی بھی
اچھے کرمینل نہیں بن سکتے کیونکہ انہوں نے چند
غلطیاں کر دیں۔ جو پہلی ویڈیو بھیجی، تاوان کی رقم کے
لیے اور دوسری جس میں ماتھے پر زخم تھا، دونوں میں
ان کا رونا مجھے سوری! مگر اداکاری لگتا تھا اور یونو! میں
اتنے ملکوں اور کلچرز کے ڈرامے دیکھ چکی ہوں کہ
اداکاری کو مجھ سے بہتر جج نہیں کر سکتے آپ لوگ۔ سو
میں نے ویڈیوز کی تاریخ چیک کی۔ وہ دونوں تین دن
پرانی تھیں، زخم والی بھی۔ شیرو بھائی کو اندازہ تھا کہ ہاشم
بھائی اپنے جاننے والوں کو فون ضرور کریں گے اس لیے
انہوں نے دو ویڈیوز تیار کر لیں۔ اغوا سے چند گھنٹے پہلے
اگر ان کی ہاشم بھائی سے بات ہوئی تھی تو یہ ویڈیوز تو
اس سے بھی پہلے کی تھیں۔ سو ظاہر ہوا کہ جعلی
تھیں۔ مگر آپ کو یہ ویڈیوز کوریا میں تیار کرنی چاہیے
تھیں، کیونکہ۔“ ایک اور پرنٹ شدہ صفحہ لہرایا۔ جس
میں شیرو کی ویڈیو کا اسٹل امیج تھا۔ ”یہ جو آپ کے پیچھے
دیوار پر سوچ نظر آ رہا ہے، یہ عام پاکستانی سوچ جیسا ہے“

جبکہ کوریا میں سوچ کھوکھلے ہوتے ہیں، انڈے کے
آٹھے چھلکے کی طرح، پلگ ان کے اندر ڈالا جاتا ہے۔
یہ کورین سوچ نہیں ہے۔ اور۔“ ویڈیو کا ایک اور اسٹل
امیج مسکراتے ہوئے سامنے لائی۔

”چھت پہ کوئی فائر الارم نہیں ہے، جبکہ کورین
گھروں میں چھت پہ فائر الارم ضرور ہوتا ہے۔ آپ
نے لکڑی کا فرش، سلائیڈنگ ڈور، ہر چیز بریکٹ
رکھی مگر۔ ایک سو گیارہ کورین ڈرامے اور فلمیں دیکھنا
کوئی مذاق نہیں ہے۔ سو میں نے آپ کے کمپیوٹر کی
ہسٹری چیک کی۔“ ایک اور کاغذ ان کے سامنے میز پر
رکھا۔ اب وہ کھڑے کھڑے، باقی کاغذ ہاتھ میں پکڑے
بول رہی تھی اور سب اس کو سن رہے تھے۔ ہکا بکا۔

”بچھلے ہفتے میں یہ وہ تمام ویب سائٹس ہیں جو
آپ نے کھولیں۔“ فیک اغوا کرنے کے طریقے،
وغیرہ وغیرہ۔ اور آپ نے وہ فیک کڈنیپ والے بہت
سے امریکی ڈرامے اور فلمیں بھی دیکھیں، کیونکہ آج
کل یہ امریکا باپ کے بگڑے بچے کا خود کو اغوا کر لیتا ہر
دوسرے امریکی ڈرامے میں ہو رہا ہوتا ہے، یہ رہے ان
تمام ڈراموں اور فلموں کی لسٹ جو آپ نے ڈاؤن لوڈ
کر رکھے تھے۔ اوہ ہاں! اور وہ اپنا کان کٹ کر بھیجنے والا
آئیڈیا۔ وہ ”اسکینڈل“ سے تھا نا، اس میں ڈو ٹیل کی
بیٹی نے تو واقعی اپنا کان بھیج دیا تھا، مگر مجھے معلوم تھا،
اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ مگر آپ نے صرف وہ قسط
”دیکھی“ تھی، مجھے تو وہ ”ایک۔“ مونسٹر بھی اپنی اولاد
سے محبت کرتا ہے۔“ والا ڈانہ لاگ بھی یاد تھا۔

نو شیرواں دھواں دھواں ہوتے چہرے کے ساتھ
بیٹھا تھا، جیسے کوئی زہریلا جانور ڈس گیا ہو اسے۔ اورنگ
زیب کے لب بھینچ چکے تھے، کپٹی کی نیس ابھر آئیں،
سرخ ہوتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ہاشم ابھی تک
سن تھا۔

”ایسا کچھ نہیں ہے۔ جھوٹ بولنا بند کرو۔ میرے
ہی گھر میں تم میرے بیٹے کے بارے میں کیا بولے
جاری ہو۔“ جواہرات غصے سے کانپتی آواز میں بولنے
لگی۔ ”اگر ایسا کچھ تھا تو تم اسی وقت بتائیں۔“

”اگر میں یہ سب آپ لوگوں کو بتا دیتی تو آپ فوراً“
شیر و بھائی کو فون کر کے کتفرم کرنا شروع کر دیتے اور یہ
واپس ہی نہ آتے اور ممکن تھا کہ میں ہی غلط ہوتی تو
مجھے تصدیق تو کرنی تھی نا۔ کیوں بھائی؟“ ملاحظہ ہونے
والے انداز میں آنکھیں گھما کر سعدی کو دیکھا۔ وہ ہر
شے سے بے نیاز، چپ چاپ بیٹھا تھا۔ اسے کچھ بھی
مزید حیران نہیں کر سکتا تھا۔

باقی سب بھی خاموش تھے۔ ہاشم بالکل شل،
اورنگ زیب ضبط کیے، اور جواہرات بے چین، کبھی
اُدھر دیکھتی، کبھی اُدھر۔ نوشیرواں کا چہرہ دھواں دھواں
ہو رہا تھا۔ مکروہ شاگ سے نکل آیا تھا۔ بدقت کھڑے
ہوتے اس نے چلانے کی سعی کی۔

”میں۔۔۔ میں تمہارا منہ نوچ لوں گا“ تمہاری ہمت
کیسے ہوئی مجھ پہ اتنا گھٹیا الزام لگانے کی۔“

”تمیز سے بات کرو میری بہن سے۔“ سعدی ایک
دم تیزی سے اٹھا۔ سلگتی نظروں سے شیر و کو دیکھا اور
پھر حنہ کو۔ ”چلو“

”ابھی کیوں؟ ابھی تو شیر و بھائی کی کلاس شروع
ہوئی ہے۔“ حنین نے منہ بنایا مگر سعدی دروازے کی
طرف بڑھ چکا تھا۔ سو اس نے شانے اچکائے
نوشیرواں کو مسکرا کر دیکھتے بال جھٹکے اور سعدی کے
پیچھے ہوئی۔

”آپ لوگ چپ کیوں بیٹھے ہیں۔ اس پاگل کو کسی
نے ٹوکا کیوں نہیں؟ میں اتنی تکلیف سے گزر کر آ رہا
ہوں اور۔“ نکلتے ہوئے انہوں نے نوشیرواں کو پھر کر
چلاتے سنا۔ مگر کسی اور کی آواز نہیں آئی۔ سب
خاموش تھے۔

برآمدے میں آکر سعدی نیچے چلا گیا تاکہ کار ادھر
لے آئے۔ حنین ستون کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ باہر
صبح تازہ دم سی اتر رہی تھی۔ ہوا ٹھنڈی تھی اور دھند
بھی پھیلی تھی۔ حنین نے کوٹ کی ہڈ سر پہ گرا دی۔
تب ہی عقب میں دروازہ کھلا۔ وہ چونک کر مڑی۔ ایک
لنچے کو دل دھڑکا کہ کہیں شیر و واقعی منہ نوچنے نہ آ گیا
ہو۔ مگر۔

ہاشم آہستہ سے دروازہ بند کرتا باہر آیا۔ اس نے
سوٹر تک نہیں پہنچا تھا، باہر آنے کے باوجود اس کو
سردی نہیں لگ رہی تھی۔ چہرہ سفید اور تکان زدہ تھا۔
”تھینک یو بیٹا! تم دونوں کا کہ تم لوگ پوری رات
ہمارے ساتھ رہے۔“ وہ کس وقت سے بول پارہا تھا۔
حنین کو اندازہ تھا۔ اس کے دل کو کچھ ہوا۔

”کوئی بات نہیں ہاشم بھائی!“ شیر و سے آنکھیں
گھما گھما کر بات کرتی وہ کوئی اور تھی اور یہ اتنی نرم کوئی
اور تھی۔

”مجھے بتاؤ کس طرح تمہارے اس فیور کا بدلہ دے
سکتا ہوں۔“ کوئی چیز کوئی کام کچھ چاہیے تمہیں؟“
اپنے گرد بازو لپیٹے ہڈ سر پہ گرائے حنہ نے نرمی
سے مسکراتے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں“ کچھ بھی
نہیں۔ میں اپنے سارے مسئلے خود حل کر سکتی ہوں یا
اپنے بھائی کو کہہ دیتی ہوں۔“

”کبھی کبھی انسان اپنے بھائی کو بھی اعتماد میں نہیں
لیتا“ مجھے آج اندازہ ہوا ہے، اگر کبھی کوئی ایسا مسئلہ ہو
جو تم سعدی کو بھی نہ بتانا چاہو، تو مجھے کال کر لیتا۔ جیسے
تم لوگ میری ایک کال پہ آئے ہو، میں بھی آؤں گا،
اوکے؟“ دھند آلود صبح میں پھر سے وہی فسوں چھانے
لگا۔ دور کہیں کسی نے موسیقی کی تال چھیڑی تھی۔
بدقت وہ ہاشم پہ نگاہیں جمائے مسکرایا۔

”اوکے، لیکن اگر میرے کال کرنے پہ آپ نے
پوچھا کہ کون حنین؟ تو؟“

”ایسا نہیں ہو گا۔“ پھر وہ ٹھہرا۔ ”سنو! علیشا سے
کہنا، مجھے کال کر لے۔ میں اس کی فیس کی رقم اسے
بھجوا دوں گا۔“

وہ ایک دم چونکی۔ ”آپ۔ آپ اس کی فیس بھریں
گے؟“ خوشی سے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔
”میں اتنا برا بھی نہیں ہوں، جتنا تم مجھے سمجھتی
ہو۔“ سستے ہوئے چہرے سے وہ مسکرایا۔

سعدی ہارن دے رہا تھا، وہ ہاشم کو خدا حافظ کہہ کر
زینے اترتی نیچے آئی۔ فرنٹ سیٹ پہ بیٹھی۔ اپنی
پر فامنس یاد کر کے خود ہی ہنسی۔

”کیا آپ نے دیکھا، میں کس طرح بولی۔ تھوڑا سا دل دھڑکا تھا میرا، ہاتھ بھی کانپے مگر جب میں بولی تو واؤ۔ بالکل ہیروئن لگ رہی تھی میں۔ اور پتا ہے ہاشم بھائی کہہ رہے ہیں کہ وہ علیشا کی فیس۔“ سعدی خاموشی سے ڈرائیو کرنا کار آگے لے گیا۔

ہاشم برآمدے میں کھڑا انہیں دیکھتا رہا، سخت سردی اور دھند میں یہاں تک کہ کار رو رہی تھی۔ پھر وہ واپس اندر آیا۔

”کیا یہ سب سچ تھا؟ تم نے اپنے باپ کو بے وقوف بنایا؟“ اورنگ زیب کھڑے چلا رہے تھے، جواہرات ہنوز پریشان، مضطرب بیٹھی تھی اور نوشیرواں ان کے مقابل کھڑا تھا۔

”آپ لوگوں کو اس پامگل لڑکی کی بات پہ اعتبار ہے، وہ اور سعدی۔ یہ لوگ ہمیشہ میرے گھر میں فساد کرتے ہیں، وہ سعدی تو۔ ہاشم بھائی! آپ نے اس کو وہ پھپھر کیوں نہیں لگائے جب وہ یہ ساری بکو اس کر رہی تھی؟“ ہاشم کو آتے دیکھ کر وہ طیش سے چیخا تھا۔

”کاش! میں تمہارا نہیں، سعدی کا بھائی ہوتا۔“ نہ غصہ، نہ ناراضی، صرف دکھ سے ایک ایک حرف ادا کیا، پیر سے میز کو ٹھوکر ماری، حنین کے پرنٹ کردہ کاغذات بکھر کر زمین پر گر گئے اور آگے بڑھ گیا۔ نوشیرواں منہ پہ ہاتھ رکھے، بے یقینی سے اس کو سیڑھیوں پہ اوپر جانے دیکھنے لگا۔ پھر رخ موڑا۔ اورنگ زیب سرخ چہرہ لیے اسے گھور رہے تھے۔

”ہاں کیا ہے میں نے یہ سب۔“ ہاتھ ہٹا کر وہ غصے سے چلایا۔ ”یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔ ایسے ہاتھ روک کر پیسے دیتے ہیں مجھے جیسے میں سوئلی اولاد ہوں، ہاں! آپ کا بھی دل چاہتا ہے کہ میری جگہ یہ۔“ ”دروازے کی طرف اشارہ کیا جہاں سے حنین نکلی تھی۔“ ”یہ لڑکی آپ کی بیٹی ہوتی۔ ان ہی لوگوں کی باتوں پہ زیادہ یقین ہے نا آپ کو؟ یہ سعدی زیادہ پسند ہے نا آپ تینوں کو؟“ لال بھبھو کا ہوتا بولتا وہ دو قدم پیچھے ہٹا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

”دفع ہو جاؤ میرے سامنے سے۔“ وہ بھی طیش

سے چلائے تھے۔ ہاشم نے گویا کان بند کیے اور اپنے کمرے میں قدم رکھا اور دروازہ بند کر لیا۔ شیرو نے بے بسی سے اس کے بند دروازے کو دیکھا، آنسو بہنا تیز ہو گئے۔ وہ مڑا اور کف سے آنکھیں رگڑتا سیڑھیاں چڑھتا گیا۔ اپنے کمرے میں آکر دروازہ دھاڑ سے بند کر کے وہ کمپیوٹر ٹیبل کے سامنے آیا تو اسکرین کو دیکھ کر رکا۔ بند اسکرین پہ ایک Sticky نوٹ چپکا تھا، جس پہ حنین نے لکھا تھا۔

”نقل کے لیے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔“

ہاشم اور شیرو بھائی۔ ”ساتھ میں زبان چڑاتا فیس بنا تھا۔“

اس نے نوٹ جھپٹ کر مٹھی میں مروڑا۔ کف سے دوبارہ آنکھیں رگڑیں۔ اب ان میں خون اتر رہا تھا۔ اتنا لمبا ڈرامہ اور سب برباد کیا تھا۔

”آج پھر اسی سعدی نے اپنی بہن کے ذریعے میرے گھر میں فساد ڈالا۔ میں قسم کھاتا ہوں، ایک دن میں سعدی یوسف کو اپنے ہاتھوں سے گولی ماروں گا۔“ اور ڈیڑھ سال گزر جانے کے بعد بھی نوشیرواں کو اپنی قسم یاد تھی۔

باہر اورنگ زیب، جواہرات پہ چلا رہے تھے۔ ”ایک لفظ بھی اس کی حمایت میں بولا تو میں سمجھوں گا تم بھی اس کے ساتھ ملی ہوئی تھیں۔ اپنے بیٹے سے کہو، صبح دس بجے تک میری ساری رقم میرے اکاؤنٹ میں واپس پہنچا دے ورنہ۔“

باہر سورج کی کرنوں نے دھند میں سے راستہ بنانا شروع کر دیا تھا۔ یہاں سے دور، اس چھوٹے باغیچے والے گھر میں حنین سونے جا چکی تھی اور سعدی اپنے کمرے میں بیٹھالیپ ٹاپ پہ وہ فلیش لگا کر دیکھ رہا تھا۔ اس میں وہی تصاویر تھیں، مجن کی پرنٹ شدہ شکل وہ لاکر میں دیکھ چکا تھا۔ اور وہ آڈیو فائلز تھیں۔ ایک میں فارس کہہ رہا تھا کہ اب زمر ہو نکل کے بجائے ریسٹورنٹ آئے۔ دوسری آڈیو طویل تھی۔

سعدی نے پلے کی۔ پہلی دفعہ سنا تو وہ سن رہ گیا۔

زمر ٹھیک کہہ رہی تھی۔ فارس نے اس سے واقعی یہ

سب کہا تھا۔ تو کیا ہاشم کی طرح فارس بھی اس سے جھوٹ بولتا آیا تھا؟

دوسری دفعہ اسے سنا تو مزید صدمہ لگا۔ فارس یہ سب کیسے اور۔ کیوں؟

تیسری دفعہ سنا تو بے یقینی گھبراہٹ میں بدلتے لگی۔ کیا اس کے گرد سب جھوٹ بولنے والے موجود تھے؟ پھر سچا کون تھا؟

چوتھی دفعہ یہ کوئی عجیب سا احساس ہونے لگا۔ کچھ غلط تھا۔ چند الفاظ فارس اس طرح نہیں بولتا تھا۔ وہ بار بار آڈیو دہرانے لگا۔ اتنی دفعہ کہ اسے کتنی بھول گئی۔ چہرے پہ بس ایک چونک جانے کا احساس نظر آ رہا تھا۔ وہ فارس نہیں تھا۔ بہت غور کرنے پہ اسے احساس ہوا تھا کہ کبجے میں ہلکا سا فرق تھا۔ پہلی دفعہ سننے میں اسے بھی وہ فارس لگا تھا۔

اور زیم۔ وہ چونکا۔ زمر نے تو وہ آڈیو بس ایک ہی دفعہ سنی تھی۔ اوہ!

ڈھالی سال سے بکھرے ٹکڑے اب پزل میں جڑنے لگے تھے۔ اور جو شکل سامنے آرہی تھی وہ بہت ہیوانک تھی۔ وہ ہاشم کی شکل تھی۔



آج دوپہر کے سورج نے دھند کو بہت ہلکا کر دیا تھا۔ روشن دان سے روشنی جھلک کر کمرے کے وسط میں رکھی میز پہ گر رہی تھی جس کے ایک طرف فارس بیٹھا تھا اور دوسری جانب سعدی۔ ساتھ میں فارس کا وکیل۔ وہاں اداس کر دینے والی خاموشی تھی جس میں پچھتاوے اور تاسف کی سی ویرانی بسی تھی۔ سعدی نے بہت دیر بعد جھکا سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی اور بہت ساری شرمندگی۔

”آئی ایم سوری!“

”کس بات کے لیے؟“ غور سے اس کی آنکھوں کو دیکھتے فارس کو اچنبھا ہوا۔

”آپ کو اتنا کم ہوزٹ کرنے کے لیے۔“

”کوئی بات نہیں، تم جاب کر رہے ہو، مجھے پتا ہے۔“ اس نے سمجھنے والے انداز میں ہلکے سے کندھے جھٹکے۔ سعدی اسی طرح اسے دیکھتا رہا۔

فارس سفید کرتے شلوار میں ملبوس تھا۔ ایک زمانے میں چھوٹے کٹے بال اب برہ چکے تھے، اتنے کہ انہیں کس کرپونی میں باندھ رکھا تھا۔ شیو ہلکی ہلکی بڑھی تھی، مگر دوسرے قیدیوں کی نسبت وہ کافی صاف ستھرا سا لگتا تھا۔

”آپ اس آڈیو کا کیا کرنا ہے؟“ فارس نے وکیل کے موبائل کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ میری آواز نہیں ہے، مگر مشابہت بہت زیادہ ہے۔ اگر میڈم نے یہی سنی ہے تو ان کو اب میں اپنی بے گناہی کا یقین کبھی نہیں دلا سکتا۔“

وکیل صاحب کھنکھارے۔

”ہم نے اسے ایک ایکسپٹ کو دکھایا ہے، اس نے یہ ثابت کر کے بتایا ہے کہ یہ یہ Converted دوائس ہے۔ جعلی ہے۔“

”ہم نے نہیں، میں نے۔“ سعدی نے تلخی سے ان کو دیکھا۔ ”آپ تو اس کے پاس چلنے تک کو راضی نہیں تھے۔“

”میں ایک اور کیس کے سلسلے میں مصروف تھا۔ اور تمام قانونی پیچیدگیاں آپ کو سمجھا چکا ہوں۔“ اس سے پہلے کہ سعدی مزید تلخی سے جواب میں کچھ کہتا، فارس نے بے چینی سے اسے ٹوکا۔

”کیا ہم کورٹ میں یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ یہ میری آواز نہیں ہے؟“

”نہیں، جب تک کہ سعدی اس کا سورس ظاہر نہیں کرتا، کورٹ اس کو کیسے قبول کرے گا۔“

”محمود صاحب! میں آپ کو کتنی دفعہ بتا چکا ہوں، یہ آڈیو مجھے میری پھپھو نے نکلوا کر دی ہے اور میں ان کا نام لے کر ان کو Incriminate نہیں کر سکتا۔“

اور میری اجازت کے بغیر آپ بھی یہ نہیں کر سکتے۔“

”بھئی پھر تو مسئلہ بن جائے گا۔ یہ ہمارے حق سے زیادہ خلاف جائے گی۔ میں اسے کورٹ میں پیش

کرنے کی نصیحت کبھی نہیں کروں گا۔“ محمود صاحب ہاتھ جھاڑ کر پیچھے کو ہویٹھے۔ سعدی نے ایک تیکھی نظر ان پہ ڈالی پھر واپس فارس کو دیکھا۔
”ماموں! اگر میں آپ کے لیے کوئی فیصلہ لوں تو مجھے اپنی زبان دیں کہ آپ اعتراض نہیں کریں گے۔“

”نہیں کروں گا، لیکن۔“ وہ اچنبھے سے بولنا چاہ رہا تھا مگر سعدی فوراً ”محمود صاحب کی طرف گھوما۔
”آپ کو میں فارس غازی کے وکیل کے منصب سے ہٹاتا ہوں۔“

وہ ایک دم سیدھے ہوئے حیرت سے اسے اور پھر فارس کو دیکھا۔
”آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ ناگواری سے ماتھے پہ شکنیں ابھریں۔

”یہی کہ آپ یہاں سے جاسکتے ہیں۔“
”میں فارس غازی کا وکیل ہوں، آپ کا نہیں!“ وہ ایک دم چمک کر بولے۔ فارس چند لمحے چپ رہا۔ باری باری دونوں کے چہرے دیکھے۔

”میں سعدی کی تائید کرتا ہوں۔ آپ جاسکتے ہیں۔“ سعدی کے لبوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ اس کا مان نہیں ٹوٹا۔ ابھی دنیا سے اس کے اپنے ختم نہیں ہوئے تھے۔

وہ جیسے بہت ضبط کر کے اٹھے۔
”انتہائی بچکانہ رویہ ہے یہ۔ پیشی سے چند دن پہلے آپ وکیل کو فارغ کر رہے ہیں۔ مجھے ہاشم کا رد دار نے ان کا وکیل مقرر کیا تھا۔“

”اور ان ہی سے وصول کیجئے گا اپنے بقایا واجبات کیونکہ میں تو آپ کو اپنے حلال رزق سے ایک پائی بھی نہیں دینے لگا۔“ بے نیازی سے انہیں باہر جانے کا رستہ دکھایا۔ وہ اپنی چیزیں سمیٹتے کوٹ کا مٹن بند کرتے منہ میں بڑبڑاتے باہر نکل گئے۔

”یہ سب کیا تھا؟“ فارس غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔
”کیا؟“

”سعدی! تم مجھے پریشان کر رہے ہو!“ وہ فکر مندی

سے کہتا آگے ہوا۔ ”یہ آڈیو سن کر بھی زیادہ ری ایکٹ نہیں کیا میں نے، کیونکہ میرے لیے کچھ بھی پریشان کن نہیں ہے سوائے تمہاری شکل کے۔ ہوا کیا ہے تمہارے ساتھ؟“

جینز اور ہائی نیک کے اوپر جیکٹ پہنے بیٹھا لڑکا اداسی سے مسکرایا۔ ”میں ریشم کا بن چکا ہوں اور ریشم اتنی آسانی سے ہاتھ نہیں آتی۔ مجھ سے آپ کچھ بھی نہیں اگلو پائیں گے۔ اس وقت میرا کام آپ کو یہاں سے نکلوانا ہے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایسا کروں گا۔ سوال مت کریں، وہ بتائیں جو میں نے پوچھا تھا۔“ اس نے یاد دلایا۔ ”جن لوگوں پہ آپ کو شک ہے، ان کی فہرست بنائی آپ نے؟“

”ہاں لکھو۔“ وہ بتانے لگا اور سعدی پین نکال کر لکھنے لگا۔ کو لیگز، وہ چند لوگ جن کے خلاف اس نے کھسڑ تیار کیے تھے۔ وارث کا باس۔ اور بس۔ سعدی نے بے چینی سے نظریں اٹھائیں۔

”ہاشم بھائی کا نام نہیں لکھوایا آپ نے؟“
فارس کچھ دیر سوچتا رہا، پھر نفی میں سر ہلایا۔
”اونہوں۔ اس کا تعلق نہیں ہے اس سب سے۔“
”مگر آپ نے خود کہا تھا کہ۔“

”میں نے ڈھائی سال اس بارے میں سوچا ہے، پہلے گرم دماغ سے، پھر ٹھنڈے دل سے، مگر ہاشم کے پاس یہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اور اس نے میرے لیے بھاگ دوڑ بھی کی ہے کافی، سو میں بے شک اسے شدید ناپسند کرتا ہوں، مگر اس کو اس سب میں نہیں گھسیٹوں گا۔ یہ غلط ہے۔“

سعدی نے گہری سانس لے کر اس فہرست کو دیکھا اور پھر نفی میں سر ہلایا۔

”بھول جائیں اس بات کو۔“ کاغذ مروڑ کر مٹھی میں ڈالیا۔ ”آپ کا اے ٹی ایم، کریڈٹ کارڈز اور چیک بکس ہاشم بھائی نے اسی کو بہت پہلے دے دیے تھے۔“

جیوری وغیرہ انہی کے پاس ہے۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ نئے وکیل کے لیے آپ کے اکاؤنٹ کی رقم کافی ہوگی۔“

”جب اتنے سال میں کتنا رہا کہ ہاشم سے پیسے مت لو میرے وکیل کے لیے تب تم نے یہ نہیں کہا۔ اب کیا ہوا ہے؟“ وہ ابھی تک آنکھیں سکیڑ کر اس کو دیکھ رہا تھا۔

”مجھے ان پہ اعتبار نہیں رہا۔“ اس کی آواز میں تکلیف تھی۔

”سعدی! کیا چھپا رہے ہو؟“

”سوال مت کریں۔ انتظار کریں۔“ اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ فارس متفکر نظروں سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔

باہر دھوپ اب تیز ہو چکی تھی۔ سڑک پہ معمول کی ٹریفک بہہ رہی تھی۔ کارڈرائیو کرتے سعدی نے ہینڈز فری کانوں میں لگائے اور موبائل پہ نمبر ڈائل کیا۔ چند منٹوں بعد ہاشم نے فون اٹھالیا۔

”ہاں بیٹا خیریت؟“ وہ مصروف لگ رہا تھا۔

”جی ایک کام تھا آپ سے۔“ اس کے بعد آج ہاشم سے بات ہو رہی تھی۔

”ہوں بولو۔“

”میں نے محمود صاحب کو فائر کر دیا ہے۔ اب مجھے ماموں کے لیے ایک ہسٹروکیل کی تلاش ہے۔“

”کیوں؟ فائر کیوں کیا؟“ وہ چونکا تھا۔

”کیونکہ مجھے وہ ست اور نا اہل لگتے ہیں۔ خیر! آپ مجھے پانچ چھ بہترین وکیلوں کے نام ٹیکسٹ کر دیں جن کو مجھے ہائر کرنا چاہیے۔“

ہاشم چند لمحے کو خاموش ہو گیا۔ پھر بولا تو کافی سوچتے ہوئے ”اوکے“ کرتا ہوں۔ میرے ریفرنس سے ان سے مل لیتا۔ کام ہو جائے گا۔ ویسے سماعت کے اتنے نزدیک اگر وکیل کو فائر کرنا بے وقوفی ہوتی ہے سعدی!“

”اور یہ تو میں جان گیا ہوں کہ میں کتنا بے وقوف ہوں۔“

”کوئی مسئلہ ہے تو میں محمود صاحب سے بات کر لیتا ہوں، مفاہمت تو ہر ایشیہ ہو سکتی ہے۔“

”مفاہمت کی ہی تو گنجائش نہیں رہی۔ آپ ٹیکسٹ کر دیجئے بس ابھی۔“

اور موبائل فرنٹ سیٹ پر ڈال دیا۔ چہرے پر چھائی تلخی میں اضافہ ہو گیا۔ لب بچھنج گئے۔ آنکھوں میں غصہ ابھرا۔ کتنے دن اس کے دل و دماغ میں جنگ جاری رہی تھی۔ ہاشم کے لیے کئی دلیلیں اکٹھی کیں مگر سب بے کار تھا۔ جب آنکھوں سے اندھے اعتماد کی پٹی اتری تو ہر شے کو نئے زاویے سے دیکھنا شروع کیا۔ پہلے لگا وہ صرف قاتل کو جانتا ہے، مگر اب آہستہ آہستہ احساس ہوا کہ وہی ہے جو فارس کو باہر نہیں آنے دے رہا۔ اگر ہاشم چاہتا تو فارس باہر ہوتا۔ فارس اور ندرت نے کتنی دفعہ یہ بات اس سے کہی مگر تب سمجھ میں کیوں نہیں آتا تھا؟ یہ اعتماد کتنی بھیانک شے ہے۔ اندھا کر دیتا ہے۔ ہرا، لنگڑا کر دیتا ہے۔

تب ہی موبائل بجلا۔ ہاشم نے چند نام اسے ٹیکسٹ کر دیے تھے۔ سعدی نے ان کو خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔ یہ وہ وکیل تھے جن کو ہاشم چاہتا تھا وہ ہائر کرے۔ یعنی یہ وہ تھے جن کو ہاشم خرید سکتا تھا۔ اسے اب معلوم ہو گیا تھا کہ اس فرست کے وکیل اسے بالکل نہیں ہائر کرنے گڈا!

وہ جب زمر کے گھر کے گیٹ تک آیا تو وہ پورچ میں کار سے اتر رہی تھی۔ دروازہ بند کرتے وہ مڑی تو دیکھا، سعدی نے کار باہر روک دی تھی اور اب قدم قدم چلتا اس کی جانب آ رہا تھا۔ جینز پہ جیکٹ پہنے چہرے پہ چھائی سنجیدگی وہ قریب آیا تو احساس ہوا کہ وہ اس سے لبا ہو گیا تھا پتا نہیں کب سے۔

”کیسے ہو؟“ اس نے سیاٹ آنکھوں اور بے تاثر لہجے میں پوچھا۔ وہ ”ٹھیک“ کہتا اس کے ہمراہ لان میں پچھی کر سیوں کی طرف آیا۔

”کچھ کہنے آیا ہوں آپ سے۔“

”مجھے فارس سے نہیں ملنا، نہ ہی اس کی صفائی سنی ہے۔“ وہ کرسی پہ بیٹھی ”ٹانگ پہ ٹانگ جمائی۔ بازو سینے پہ لپیٹے۔ بال ہاف کچھو میں بندھے تھے اور دھوپ کے باعث بے زاریت بھری آنکھوں کو سکیڑ رکھا تھا۔

”پچھو۔ ایک دفعہ دوسری طرف کی کہانی سن لیں۔“ وہ آگے کو ہو کر اس کے مقابل بیٹھا۔

”میں جج نہیں ہوں۔ نہ ہی اس کو سزا دے سکتی ہوں۔“ اس نے ذرا سے شانے اچکائے۔ ”میرے سننے کا فائدہ؟“

”اگر۔۔۔ مجھ سے کوئی گلہ ہے تو کہہ دیں۔“ وہ ڈھائی سال سے بتانا چاہتا تھا، ایک دفعہ وہ گلہ کر دے، کہہ دے کہ اس سے بد تمیزی سے بات کرنے کے بعد وہ اس کو چھوڑ کر کیوں چلا گیا؟ سوری کیوں نہیں کہا؟ اس کے آریشن کے وقت وہ کہاں تھا؟ کیوں اس کی ری کوری کے ان تکلیف دہ دنوں میں وہ اس کے پاس نہیں تھا؟ واپس کیوں نہیں آیا؟ مگر وہ کہتی ہی نہیں تھی۔ اب بھی نظر انداز کر گئی۔

”تم کیا کہنے آئے ہو؟“

”آپ سچ کہہ رہی تھیں۔ واقعی آپ کو کال کی گئی تھی۔ آپ نے جو بتایا واقعی ایسا ہوا تھا۔“

”جھا! ڈھائی سال بعد یقین آگیا تمہیں سعدی؟“ وہ سنتی گئی۔ آنکھوں کی پتلیاں سکڑ کر اسے دیکھتی۔ بازو ہنوز سینے پر لیٹے۔

”مگر وہ کنور ڈوڈا اس تھی۔ جعلی آواز۔ یہ سنیں۔“ اس نے موبائل نکال کر یہ چند من دبائے۔ آوازیں ابھرنے لگیں۔ زمر سپدھی ہوئی، آنکھوں میں تکلیف ابھری۔ بس چند فقرے وہ سن پائی۔

”بند کرو اسے۔“ اور ناگواری سے چہرہ پھیر لیا۔

”کیا یہ سب اسی طرح ہوا تھا؟“

”میرے ہاں یا ناں کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ ڈھائی سال پہلے تم لوگوں نے کہا کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں، آج کہہ رہے ہو میں سچ بول رہی تھی۔ پانچ سال بعد کہو گے یہ واقعی فارس کی ہی آواز تھی۔“

”آئی ایم سوری۔ جیسے آپ نے ہماری بات نہیں سنی، ویسے ہی ہم نے بھی آپ کی بات نہیں سنی۔ میں سمجھا آپ کسی کو کور کر رہی ہیں، مگر ایسا نہیں تھا۔“

”ڈھائی سال بعد میرا یقین کرنے کا شکریہ۔“ وہ سارا کرب ضبط کر چکی تھی۔

”لیکن آپ تیسری بات کا امکان ذہن میں رکھ کر سوچیں پھپھو! یہ کال جعلی تھی۔ ہم کورٹ میں یہ

ثابت کر سکتے ہیں۔“

”اور یہ تمہیں کیسے ملی؟“

”میں جواب دینے سے انکار کرتا ہوں۔“ وہ بے اختیار ہنسنے لگا۔

”اس صورت میں یہ میرے لیے قابل قبول نہیں ہے۔“

”اگر آپ اس میں لہجے پہ غور کریں تو محسوس ہوگا کہ۔“

”جب یہ کال مجھے موصول ہوئی، میں ایک Sniper کے نشانے پہ تھی، مجھے لہجے اور آواز کے pitch پہ غور کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس آواز کے ساتھ میری زندگی کی سب سے تکلیف دہ یاد جڑی ہے۔ اس لیے کوئی آج اگر کہہ دے کہ یہ جعلی ہے، تو میں کیسے مان لوں؟“ تیز لہجے میں کہتی وہ اس کو شاکی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”ایک دفعہ سوچ کر دیکھیں۔ کوئی تیسرا آدمی بھی اس میں ملوث ہو سکتا ہے۔“

”مثلاً کون؟“ سعدی نے جواب میں تھوک نکلا۔

”مثلاً۔۔۔ مثلاً“ ہاشم کاردار۔“ ہمت کر کے اس نے کہہ ڈالا۔ زمر سن سی ہو گئی۔

(بانی آئندہ ماہ انشاء اللہ)

سچی بات



مشرعہ بخاری

قیمت - 300/- روپے

تتلیہ ریاض



نور محمد برطانیہ میں رہائش پذیر ہے اور لوٹن کی جامع مسجد میں موزن ہے۔ پیسے والا اور خوب دل والا ہے۔ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا ہے۔ جس کا ایک کمرہ ایک عربی طالب علم اپنے دوست کے ساتھ شیئر کرتا ہے جبکہ دوسرے کمرے میں اس کے ساتھ ایرانی زین العابدین رہتا ہے۔ اسے اپنے ایرانی ہونے پر فخر ہے۔ وہ برطانیہ میں اسٹڈی ویزے پر جاب کرتا ہے۔ سخت محنت سے مگر پاکستان میں موجود بارہ افراد کے کنبے کی کفالت خوش اسلوبی سے نہیں کر پا رہا۔

عمر شہروز کا گزن ہے جو اپنی فیملی کے ساتھ انگلینڈ میں مقیم ہے۔ وہ لوگ تین چار سال میں پاکستان آتے رہتے ہیں۔ عمر اکثر اکیلا بھی پاکستان آ جاتا ہے۔ وہ کافی منہ پھٹ ہے۔ اسے شہروز کی دوست امانہ اچھی لگتی ہے۔ شہروز کی کوششوں سے ان دونوں کی منگنی ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر زارا شہروز کی سادہ مزاج منگیتر ہے۔ ان کی منگنی بڑوں کے فیصلے کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان محبت ہے لیکن شہروز کے کھلنڈرے انداز کی بنا پر زارا کو اس کی محبت کا یقین نہیں ہے۔

اس کے والد نے اسے گھر پر پڑھایا ہے اور اب وہ اسے بڑی کلاس میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔ سر شعیب انہیں منع کرتے ہیں کہ ان کا بچہ بہت چھوٹا ہے۔ اسے چھوٹی کلاس میں ہی داخل کروائیں مگر وہ مصر رہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بچے پر بہت محنت کی ہے۔ وہ بڑی کلاس میں داخلے کا مستحق ہے۔ سر شعیب اسے بچہ پر ظلم سمجھتے ہیں مگر اس کے باپ کے

مکمل ناول





Copyright Reserved www.paksociety.com

اصرار پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ بچہ بڑی کلاس اور بڑے بچوں میں ایڈجسٹ نہیں ہو پاتا۔ اسکا لرشپ حاصل کرنے والے اس بچے سے حیرت انگیز طور پر پیچرز اور فیلوز میں سے بیشتر ناواقف ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ اس کے باپ کی طرف سے غیر انصافی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر سخت مخالفت ہے۔

وہ خواب میں ڈر جاتا ہے۔

73ء کا زمانہ تھا اور روپ نگر کا علاقہ۔

بلی انڈیا میں اپنے گریڈ پیرس کے ساتھ آیا تھا۔ اس کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ برطانیہ کے رہنے والے تھے۔ گریڈ پیرس کسی پروجیکٹ کے سلسلے میں آئے تھے۔ گرینی نے یہاں کوچنگ سینٹر کھول لیا تھا۔ جتا راؤ اس کے ہاں پڑھنے آئی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ماس مجھے کھانے والے کسی کے دوست نہیں بن سکتے۔ وہ وفادار نہیں ہو سکتے۔ گریڈ پیرس کو بتایا، وہ اسے سمجھاتے ہیں کہ قدرت نے ہمیں بہت محبت سے تخلیق کیا ہے اور ہماری فطرت میں صرف محبت رکھی ہے۔ انسان کا اپنی ذات سے اخلاص ہی اس کی سب سے بڑی وفاداری ہے۔

امائے کے کسی رویے پر ناراض ہو کر عمر اس سے انگوٹھی واپس مانگ لیتا ہے۔ زارا شروز کو بتاتی ہے۔ شروز اور عمر کا جھگڑا ہو جاتا ہے۔

اس کی کلاس میں سلیمان حیدر سے دوستی ہو جاتی ہے۔ سلیمان حیدر بہت اچھا اور زندہ دل لڑکا ہے۔ سلیمان کے کہنے پر پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیل میں بھی دلچسپی لینے لگتا۔ وہ اپنے گھر جا کر ای سے بیٹ کی فرمائش کرتا ہے تو اس کے والد یہ سن گیتے ہیں وہ اس کی بری طرح پٹائی کر دیتے ہیں۔ ماں بے بسی سے دیکھتی رہ جاتی ہیں۔ پھر اس کے والد اسکول جا کر منع کر دیتے ہیں کہ سلیمان حیدر کے ساتھ نہ بٹھایا جائے۔ سلیمان حیدر اس سے ناراض ہو جاتا ہے اور اسے اینار مل کہتا ہے۔ جس سے اس کو بہت دکھ ہوتا ہے۔

کلاس میں سلیمان حیدر پہلی پوزیشن لیتا ہے۔ پانچ نمبروں کے فرق سے اس کی سیکنڈ پوزیشن آتی ہے۔ یہ دیکھ کر اس کے والد غصے سے پاگل ہو جاتے ہیں اور کمرابند کر کے اسے بری طرح مارتے ہیں۔ وہ وعدہ کرتا ہے کہ آئندہ پینٹنگ نہیں کرے گا۔ صرف پڑھائی کرے گا۔

اس کے والد شہر کے سب سے خراب کالج میں اس کا ایڈمیشن کراتے ہیں۔ تاکہ کالج میں اس کی غیر حاضری پر کوئی کچھ نہ کہہ سکے اور اس سے کہتے ہیں کہ وہ گھر بیٹھ کر پڑھائی کرے۔ باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ نہ ہو۔ اس کا کوئی دوست نہیں ہے۔

امائے کی والدہ شروز کو فون کرتی ہیں۔ شروز کے سمجھانے پر عمر کو عقل آ جاتی ہے اور وہ اپنے والد کو فون کرتا ہے جس کے بعد عمر کے والد امائے کے والد کو فون کر کے کہتے ہیں کہ بچوں کا نکاح کر دیا جائے۔ دونوں کے والدین کی رضامندی سے عمر اور امائے کا نکاح ہو جاتا ہے۔ نکاح کے چند دن بعد عمر لندن چلا جاتا ہے۔

نکاح کے تین سال بعد امائے عمر کے اصرار پر اکیلے ہی رخصت ہو کر لندن چلی جاتی ہے۔ لندن پہنچنے پر عمر اور اس کے والدین امائے کا خوشی خوشی استقبال کرتے ہیں۔

امائے عمر کے ساتھ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں آ جاتی ہے جبکہ عمر کے والدین اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ امائے عمر اتنے چھوٹے فلیٹ میں رہنے سے گھبراتی ہے اور عمر سے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے عمر کے والدین کے گھر رہنے کو کہتی ہے جسے عمر یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ وہ اپنے والدین پر مزید بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔

اس شخص کے شدید اصرار پر نور محمد اس سے ملنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ وہ اس سے دوستی کی فرمائش کرتا ہے۔ نور محمد انکار کر دیتا ہے، لیکن وہ نور محمد کا پیچھا نہیں چھوڑتا ہے۔ وہ نور محمد کی قرأت کی تعریف کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے نماز پڑھنا نور محمد سے سیکھا ہے۔ پھر وہ بتاتا ہے کہ اسے نور محمد کے پاس کسی نے بھیجا ہے۔ نور محمد کے پوچھنے پر کہتا ہے۔ حضراتی نے بھیجا ہے۔

روپ نگر سے واپس برطانیہ آنے پر گریڈ پیرس کا انتقال ہو جاتا ہے اور گرینی مسٹر ایرک کی دوستی بڑھنے لگتی ہے۔ وہ بلی سے

کہتی ہیں کہ وہ اپنی مٹی سے رابطہ کرے۔ وہ اسے اس کی مٹی کے ساتھ بھجوانا چاہتی ہیں۔ بلی انکار کے باوجود وہ کوہو کو بلواتی ہیں اور اسے ان کے ساتھ روانہ کر دیتی ہیں۔
میری کالج میں طلحہ اور راشد سے واقفیت ہو جاتی ہے۔

عمر نے اسے پبلک لائبریری کا راستہ بتا دیا ہے۔ عمر کو آرٹ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن وہ امانہ کی خاطر دلچسپی لیتا۔
دونوں بہت خوش ہیں۔ لیکن امانہ وہاں کی معاشرت کو قبول نہیں کر پا رہی۔ عمر کی دوست مار تھا کے شوہر نے امانہ کو گلے لگا کر مبارکباد دی تو اسے یہ بات بہت ناگوار گزری گھر جا کر دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔

گرینی کے انتقال کے بعد بلی کوہو کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا۔ کوہو پہلے بھی گرینی سے اچھا خاصا معاوضہ وصول کرتی رہی تھی۔ بلی کو اپنے پاس رکھنے کے معاملے پر کوہو نے مسٹر ایرک سے جھگڑا کیا کیونکہ گرینی نے انہیں بلی کا ٹکراں مقرر کیا تھا۔
پھر دونوں نے جھجھکا کر لیا اور کوہو نے مسٹر ایرک سے شادی کر لی۔

نور محمد احمد معروف کو اپنے ساتھ گھر لے آیا تھا۔ احمد معروف کے اچھے اطوار، عمدہ خوشبو، نفیس گفتگو، اعلیٰ لباس کے باعث وہ سب اسے پسند کرنے لگے تھے۔ نور محمد بھی اس سے کھل مل گیا تھا۔ احمد نے کہا تھا کہ وہ جہاں رہتا ہے وہاں سے مسجد کافی دور ہے اس لیے وہ اس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ نور محمد بھی اس سے کھل مل گیا تھا۔ احمد نے کہا تھا کہ وہ جہاں رہتا ہے وہاں سے مسجد کافی دور ہے اس لیے وہ اس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ نور محمد اس سے کہتا ہے اسے دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اس کے لیے اللہ کا دین کافی ہے۔ احمد معروف کہتا ہے۔ ”اللہ کا دین تو کیا دنیا اللہ کی نہیں ہے۔“ اسلام کی سب سے اچھی بات یہی ہے اس میں دنیا کا انکار نہیں ہے۔ آپ دنیا کے ساتھ وہ مت کریں جو انہیں نے آپ کے ساتھ کیا تھا۔

صانورین کالج کی ذہن طالبہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت چالاک بھی تھی۔ مہانے اس سے صرف نوٹس حاصل کرنے کے لیے دوستی کی تھی۔ اکیڈمی کے لڑکوں طلحہ اور راشد نے اسے دس سرانگہ دے کر اس کا مذاق بنالیا۔ اس مسئلہ پر لڑائی ہوئی اور نوٹس مار پیٹ تک آگئی۔

امانہ اور عمر میں دوستی ہو گئی لیکن دونوں کو احساس ہو گیا تھا کہ ان کے خیالات بہت مختلف تھے۔
کوہو کیساتھ رہتے ہوئے بھی زندگی کا محور صرف کتابیں اور اسکول تھا۔ ایک دوست کے ہاں پارٹی میں ایک عرصے بعد اس کی ملاقات جتاراؤ سے ہوئی۔ وہ اب ٹیٹا کھلاتی تھی۔ اس کا تعلق ہندوستان کے ایک بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا۔ وہ رقص کے طور پر اپنے آپ کو منوانا چاہتی تھی اس لیے گھروالوں کی مرضی کے خلاف یہاں چلی آئی تھی۔
احمد معروف کی باتوں سے نور محمد عجیب الجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنے ذہن میں اچھے والے سوالوں سے گھبرا کر احمد معروف کو سوتے میں سے جگا دیتا ہے۔ نور محمد معروف کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے اور اسے اپنے ماضی کے بارے میں بتانے لگتا ہے۔

اکیڈمی میں ہونے والی لڑائی کے بعد جنید اور طلحہ کے والدین کے ساتھ نور محمد کے والد کو بھی بلوایا گیا تھا۔ طلحہ اور جنید کے والدین اپنے بیٹوں کی غلطی ماننے کے بجائے نور محمد کو قصور وار ٹھراتے ہیں جبکہ نور محمد کے والد اس کو مورد الزام ٹھہرا کر لا تعلقی ظاہر کرتے ہیں۔ اکیڈمی کے چیئر پرسن حمید کا دوانی جنید اور طلحہ کے ساتھ نور محمد کو بھی اکیڈمی سے فارغ کر دیتے ہیں۔ نور محمد اکیڈمی سے نکالے جانے سے زیادہ اپنے والد کے رویے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ اسٹیشن کی طرف نکل جاتا ہے۔ ٹرین میں سفر کے دوران نور محمد کی ملاقات سلیم نامی جیب کترے سے ہو جاتی ہے۔ سلیم کو پکڑنے کے لیے پولیس چھاپہ مارتی ہے تو سلیم بھاگنے میں کامیاب ہو جاتا ہے جبکہ نور محمد کو پکڑ کر پولیس تھانے لے آتی ہے اور پھر نور محمد کے والد پولیس کو رشوت دے کر اسے چھڑا کر گھر لے آتے ہیں۔

بھالی پھیسو سے لاہور تک کے پورے راستے میں نور محمد سے اس کے والد کوئی بات نہیں کرتے۔ لیکن گھر آکر وہ اونچی آواز میں چلا کر غصے کا اظہار کرتے ہوئے اس سے کہتے ہیں کہ ”وہ آج سے اس کے لیے مرچکے ہیں اور اس سے ان کا کوئی

تعلق نہیں ہے۔ پہلی بار اس کی ماں بھی کہہ اٹھتی ہیں کہ اس سے بہتر تھا کہ وہ مر جاتا۔ نور محمد احمد معروف کو اپنے بارے میں سب بتاتا ہے۔ جسے سن کر احمد معروف کا دل بو بھل ہو جاتا ہے اور اسے نور محمد کو سنبھالنا مشکل لگتا ہے۔

بلی ٹیا کو بے حد چاہتا ہے، لیکن وہ انتہائی خود غرض، مطلب پرست اور چالاک لڑکی ہے۔ بلی ٹیا کو گھر کی بلی فریڈ عوف بن سلمان آتا ہے۔ جس کا تعلق سعودی عرب سے ہے۔ عوف کو نوٹو گرائی کا جنون کی حد تک شوق ہوتا ہے۔ بلی عوف سے ٹیا کو ملواتا ہے۔ ٹیا، عوف سے مل کر بہت خوش ہوتی ہے۔ عوف اپنے گھر سے رقص کرتی ٹیا کی بہت سی خوب صورت تصویریں کھینچ لیتا ہے۔ عوف اور ٹیا تصویروں کو فرانس میں ہونے والی کسی تصویری مقابلے میں بھیج رہے تھے۔ بلی ٹیا کو ایسا کرنے سے روکنا چاہتا ہے۔ لیکن ٹیا اس بات پہ بلی سے ناراض ہو جاتی ہے۔ عوف بتاتا ہے کہ وہ ٹیا جیسی ہنوائی خود پسند لڑکی کو بالکل پسند نہیں کرتا۔

بلی کو پتا چلتا ہے کہ اس کی ماں کو ہو کے عوف سے تعلقات ہیں، زارا کے والدین زارا اور شہروز کی شادی جلد از جلد کرنا چاہتے ہیں، جبکہ شہروز ایک ڈیڑھ سال تک شادی نہیں کرنا چاہتا ہے، کیونکہ اس نے ایک مشہور اخبار کا چینل جوائن کر لیا ہے اور اسے اپنی حاب کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہیں رہا ہے۔ شہروز، زارا سے کہتا ہے کہ جب تک وہ اسے شادی کرنے کے لیے گرین سگنل نہیں دیتا اس وقت تک وہ پھپھو (یعنی اپنی والدہ) کو اس کے ڈیڈی سے شادی کی بات کرنے سے روک کر رکھے۔ زارا کے لیے یہ ساری صورت حال سخت اذیت کا باعث بن رہی ہے۔

امامہ نور محمد کی بہن ہے۔ امامہ کی ماں نے اس کی شادی عمر سے اسی لیے کی تھی کہ وہ لندن جا کر بھائی کو ڈھونڈے۔ وہ عمر کے علم میں لائے بغیر بھائی کو ڈھونڈنے کی کوششیں کرتی ہے، مگر عمر کو پتا چل جاتا ہے۔ امامہ یہ جان کر حیران رہ جاتی ہے کہ عمر نور محمد کو جانتا ہے۔ وہ اس کا ساتھ دیتا ہے۔ ٹیا رقصہ بن چکی ہے مگر غلط ہاتھوں میں چلی جاتی ہے اور اپنا بہت نقصان کر کے بلی کو ملتی ہے۔ بلی اس وقت تک ایک کامیاب ناول نگار بن چکا ہے۔ وہ دونوں شادی کر لیتے ہیں۔ ٹیا کو بچوں کی خواہش ہوتی ہے۔ کافی علاج کے بعد انہیں خوش خبری ملتی ہے، مگر ٹیا کے مس کیرج ہو جاتا ہے۔ ٹیا خود کشی کر لیتی ہے۔ بلی کو کچھ لوگ مجبور کرتے ہیں کہ مسلمان دہشت گردوں کے خلاف ناول لکھے۔ وہ لوٹن کی مسجد کے موزن کے خلاف بات کرتے ہیں کہ وہ مسلمان دہشت گرد ہے۔ بلی اس موضوع پر ناول لکھنے کی تیاری کرتا ہے اور اس سلسلے میں نور محمد سے ملتا ہے۔ نور محمد سے احمد معروف کے نام سے ملنے والا شخص بلس گرانٹ ہی ہے، مگر نور محمد سے مل کر اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے خلاف کی گئیں ساری باتیں غلط ہیں۔ وہ نور محمد سے متاثر ہونے لگتا ہے۔ کیونکہ وہ اسے اپنے سارے حالات بتا چکا ہوتا ہے کہ کس طرح اس کا باپ اس پر پردھائی کے معاملے میں سختی کرتا تھا۔ کس طرح اکیڈمی سے نکالنے پر وہ دلبرداشتہ ہوا، پاگل ہوا۔ پھر اس کے ماموں اپنے ساتھ لندن لے آئے۔ وہاں انہوں نے اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھایا اور اپنی بگڑی ہوئی بیٹی گڑیا سے شادی کر دی، جو پانچ ماہ بعد ہی ماں بن گئی۔ نور محمد نے سب کچھ سمجھنے کے باوجود اس بچی سے محبت کی۔ اسے پالنے لگا۔ مگر جب گڑیا نے بخار کی وجہ سے بچی کو براغڈی پلانے کی کوشش کی اور نور محمد کے منع کرنے کے باوجود باز نہ آئی تو تھپڑ مار دیا۔ جس پر ماموں نے اسے خوب لعن طعن کی اور وہ ان کا گھر چھوڑ کر ہاں آگیا۔ ماموں نے اس کے گھر والوں کو کہہ دیا کہ نور محمد ان کے گھر سے چوری کر کے بھاگ گیا ہے۔ تب سے نور محمد اور امامہ کی ماں پریشان ہیں اپنے

شوہر سے بھی بائیکاٹ کر چکی ہیں۔ زارا کی زندگی میں اتفاق سے نیپونامی لڑکا آتا ہے۔ وہ بہت اچھا ہے۔ زارا اس پر بہت بھروسہ کرتی ہے۔ شہروز خوب ترقی کر رہا ہے۔ اس کی ملاقات عوف بن سلمان سے ہوتی ہے۔ وہ شہروز کو اپنے ساتھ کام کرنے کی آفر دیتے ہیں۔ شہروز بہت خوش ہوتا ہے۔

تیرہویں قسط

وہ اپنی جیب سے موبائل اور والٹ نکال کر میز پر رکھتے ہوئے بولا تھا۔ وہ سیڑھی پر چڑھا تھا۔ زارا سیڑھی کے قریب آگئی تھی۔ ٹیوب لائٹ کی پٹی فٹنگ تبدیل کرنی تھی۔ اسے وقتاً فوقتاً اوزاروں کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ زارا اسے مہارت سے کام کرتا دیکھنے لگی تھی۔ وہ بیچ کس سے پرانی والی پٹی کے بیچ کھول رہا تھا۔ اسی دوران اس کے موبائل کی بھپ بچی تھی جو میز پر رکھا تھا۔ بھپ بجنے پر زارا نے غور کیا تھا۔ اس کے پاس جدید طرز کا اسمارٹ فون تھا۔

”اوہو۔ لوگ نیکی کا کام بھی اطمینان سے نہیں کرتے دیتے۔ ذرا دیکھیں تو کون ٹیپو صاحب کو فون کر رہا ہے۔“ اس نے زارا سے فون اٹھانے کے لیے کہا تھا۔ زارا نے جھجکتے ہوئے فون اٹھا کر اسے تھماتا چاہا۔

”کال ریسیو کر کے اسپیکر آن کرو۔“ اس نے وہیں اوپر سے حکم جاری کیا تھا۔ زارا نے ایسا ہی کیا تھا اور فون دوبارہ میز پر رکھ دیا تھا۔

”ہیلو۔ کیا میں سلمان حیدر سے بات کر سکتا ہوں۔“ کسی نے انگلش میں پوچھا تھا۔

”جی۔ کیا میں جان سکتا ہوں۔ آپ کون ہیں۔“ ٹیپو نے کچھ حیرانی سے اپنا منہ نیچے کی جانب کر کے سوال کیا تھا۔ وہ بھی روانی سے پوچھ رہا تھا۔ زارا کو بڑا شدید جھٹکا لگا۔ اس کی وجہ ٹیپو نہیں تھا بلکہ دوسری جانب سے آنے والی آواز تھی۔

”نہیں نور محمد ہوں۔“ دوسری جانب سے کہا گیا تھا۔

”میں تمہیں کب سے فون کرنے کی کوشش کر رہا تھا، کیا تم فارغ ہو۔ اطمینان سے میری بات سن سکتے ہو؟“ دوسری جانب سے پوچھا جا رہا تھا۔ ٹیپو اضطراب کے عالم میں نیچے اترتا تھا۔ اس نے فون اٹھا کر غجلت بھرے انداز میں اسپیکر آف کیا اور فون کلن سے لگالیا تھا۔

”ہاں نور محمد! تم کہاں تھے؟ میں بہت دن سے منتظر تھا۔ تم ٹھیک ہونا۔ سب کچھ کیسا چل رہا ہے؟“

وہ رواں انگلش میں پوچھ رہا تھا پھر اس نے زارا کو اشارہ کیا تھا کہ وہ ابھی آتا ہے۔ چند لمحوں بعد زارا نے اسے کمرے سے باہر جاتے دیکھا۔ وہ حیرانی سے آنٹی رافعہ کی جانب مڑی تھی، لیکن وہ اماں صفری سے بات کرنے میں مصروف تھیں۔ ان کے لیے یہ عام سی بات تھی جبکہ زارا حق و حق رہ گئی تھی۔

اس نے ٹیپو کو کبھی اتنے شستہ مہذب انداز میں بات کرتے نہیں سنا تھا۔ وہ بہت روانی سے انگلش میں بات کر رہا تھا۔ وہ شخص جو اس کے لیے ایک عام سا ایف اے پاس انیان تھا۔ جس کے صحیح نام سے بھی اسے آگاہی نہیں تھی۔ وہ یقیناً ”اتنا عام سا نہیں تھا۔“ شیروز نے ٹھیک کہا تھا۔ اسے انسانوں کی پرکھ نہیں تھی۔



”نور محمد کا عہد الست اور عہد الست کا نور محمد۔“ سلمان حیدر نے ان باکس میں سبجیکٹ دیکھ کر نہایت پر جوش انداز میں ای میل کھولی تھی۔

یہ آخری باب تھا جس پر کام کرنا باقی رہ گیا تھا۔ لیپ ٹاپ کی نیلگوں روشنی میں وہ سب واضح ہونے لگا تھا جو اب تک چھپا ہوا رہ گیا تھا۔ وہ کب سے منتظر تھا کہ اسے کب اشارہ کیا جائے اور کب وہ اس کو مکمل کر کے سرخرو ہو سکے۔

نور محمد نے اسے چھ سال کے بعد! بازت دے دی تھی کہ وہ بل گرانٹ کے آخری ”ناول“ کو پبلک

کرنے کی تیاری کر لے جواب تک نہیں ہو سکا تھا اور اس کی تاخیر کی وجہ سے صرف سلمان حیدر واقف تھا یا نور محمد۔

نور محمد سلمان حیدر کا کلاس فیلو تھا۔ اس سے اس کی دوستی گریڈ سیون میں ہوئی تھی۔ اس کے ابو چونکہ آرمی میں تھے اس لیے کسی بھی جگہ ان کا قیام چند مہینوں سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے اسکول میں بھی ایڈمیشن کا دورانیہ عموماً ”بہت طویل نہیں ہوتا“

تھا۔ یہ تب کی بات تھی جب اس کے ابو کالاہور ٹرانسفر ہوا۔ ہر چیز وقت پر اور ٹھیک ٹھاک ہو گئی، لیکن کچھ ناگزیر وجوہات کی بنا پر تب اس کا ایڈمیشن آرمی پبلک میں نہیں ہو سکا تھا، سو اس کے ابو نے اس کا ایڈمیشن گورنمنٹ اسلامیہ اسکول میں کروا دیا۔

نور محمد کو پہلی مرتبہ اس نے گورنمنٹ اسلامیہ اسکول میں دیکھا تھا۔ وہ بہت عام سا ساادہ صاحب چپ رہنے والا بچہ تھا۔ سلمان حیدر کے اندر پیدا گئی ایک موروٹی جڑو مہ تھا۔ اسے انسان کی پرکھ تھی۔ وہ جو گلے سے بھگ کر دوڑ جا رہے ہوتے تھے وہ اسے فوراً نظر آ جاتے تھے۔ اس کی جڑواں فطرت برداشت نہیں کرتی تھی کہ کوئی گلے کو چھوڑ کر جائے۔

اس نے اسے پہلی نظر میں پہچان لیا تھا۔ ہیرے کی قدر اگر جوہری کو ہو تو سنہریا بھیڑ بھی صرف جڑواں ہی پہچان سکتا ہے۔ اسے اس چمپے ہوئے دبے ہوئے نور محمد میں وہ ہیرا نظر آنے لگا جو نیچے بہت نیچے دبا ہوا ہوتا ہے، لیکن جس کی ٹھنڈی چمک آنکھوں کو تراوت بخشتی ہے۔ اصل ہیرا کبھی آنکھوں کو چکا چوند نہیں کرتا، بلکہ وہ دیکھنے والوں کے لیے راحت ہوتا ہے۔ ایسا ہی بچہ تھا نور محمد۔ انتہائی ذہین۔ اور صرف ذہین۔ وہ کچھ نہیں کرتا تھا۔ صرف کتابیں اس کی دنیا تھیں۔

سلمان حیدر نے اس کے ساتھ دوستی کر لی۔ وہ اسے اچھا لگتا تھا۔ وہ دونوں دوست بن گئے۔ نور محمد ایک ایسی کتاب کی طرح تھا جسے جلدی جلدی نہیں بڑھا جاتا، بلکہ رات کو بستر لیٹ کر سکون سے تھوڑا تھوڑا سمجھ کر پڑھنے میں مزا آتا ہے۔ سو نور محمد سلمان

حیدر کے لیے ایک ایسی ہی کتاب کی مانند تھا۔ وہ دونوں اکٹھے کھیلتے تھے، پڑھتے تھے، گورنر حل کرتے تھے، بچوں کے میگزینز پڑھتے تھے۔ وہ اسے کرکٹ کھیلنا سکھانے لگا اور اس سے ڈائیگرامز بنانا سکھنے لگا۔ وہ اس کے ساتھ خوش رہتا تھا۔ ان کے ٹیچرز بھی اس کی طبیعت میں آنے والی تبدیلیوں کو نوٹ کر رہے تھے اور خوش تھے۔

سلمان حیدر کو کبھی ایسا نہیں لگا کہ وہ اسے تکلیف دے رہا ہے یا اس کے لیے پریشانی کا باعث بن رہا ہے، لیکن ایک دن اس کے ابو اسکول میں شکایت لے کر آ گئے۔ انہوں نے اسکول کے ایڈمن سے سلمان حیدر کی شکایتوں میں بہت کچھ کہا۔ انہوں نے بالخصوص اس بات کا تذکرہ کیا کہ سلمان ان کے بیٹے کو کھیل کود میں لگائے رکھتا ہے اور اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے گھر سے کرکٹ بیٹ لائے تاکہ وہ اسکول میں کھیل سکیں۔

سلمان حیدر کے لیے یہ بہت تکلیف دہ باتیں تھیں۔ وہ تیرہ سال کا ایک بچہ ہی تو تھا۔ نور محمد کے ابو نے یہاں تک کہا کہ سلمان حیدر کی وجہ سے ان کے بیٹے کے رزلٹ خراب ہو رہے ہیں اور وہ اسے نا صرف اسکول میں پڑھنے سے روکتا ہے بلکہ گھر جا کر بھی کھیلنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔

سر شعیب نے اسے بلا کر سب کچھ بتایا اور صرف اتنا کہا کہ انہیں اس سے شکایت نہیں ہے، لیکن بہتر ہے کہ نور محمد سے دور رہے۔ اسے بے پناہ دکھ ہوا۔

اس دن کے بعد سے وہ نور محمد سے دور رہنے لگا۔ وہ اس کی طرف دیکھتا بھی نہیں تھا اور کبھی دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد ابو کا ٹرانسفر سالہ ہو گیا۔ وہ سالہ چلے گئے اور سلمان حیدر سب بھول بھال گیا۔ ان ہی دنوں اس کے ابو کا انتقال ہو گیا۔ زندگی میں ترجیحات بدل گئیں۔ وہ اپنی زندگی میں گم ہو گیا۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ نور محمد سے پھر کبھی سامنا بھی ہو گا۔ جب میٹرک کا رزلٹ اناؤنس ہوا تو نور محمد کی ایک چھوٹی سی تصویر اخبار میں

دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس نے بورڈ میں فرسٹ پوزیشن لی تھی، لیکن تب بھی وہ چونکا نہیں تھا۔ وہ اس کے لیے ایک بھولی بھری یاد کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

یہ سن دو ہزار دو کی بات تھی۔ وہ ماس کیونی کیشن میں ماسٹرز کر رہا تھا۔ ابو کے انتقال کے بعد وہ چھوٹی مونی پارٹ ٹائم جابز کرتا رہتا تھا۔ ان دنوں ڈیپارٹمنٹ کے

چڑھائی تھی۔
 ”اللہ کو مانو لڑکی۔ تمہیں کیا پتا کہ وہ کتنے قیمتی ہیں
 میرے لیے۔ میں ان کے ساتھ کیا کرنا چاہتا ہوں۔“
 زارا نے اس کی بات کالی۔

”یہی تو پتا کرنا چاہ رہی تھی کہ آپ کیا کرتے ہیں۔
 کون ہیں، کہاں کام کرتے ہیں؟“ یہ تمہیں وہ باتیں جو
 زارا واقعی اب جاننا چاہتی تھی۔ ایک فون کال نے اس
 کے دل میں وہ خدشات جگا دیے تھے جن کا اظہار شہروز
 نے اس سے کیا تھا۔

”گڈ مارنگ ڈاکٹر زارا۔ آپ کو لمبی نیند سے بیدار
 ہونے پر میں صبح بخیر کہتا ہوں۔“ وہ اسے چڑا رہا تھا۔ وہ
 نجانے کیا کھاتا تھا۔ اسے بات ٹالنے کا ہنر آتا تھا۔
 ”آپ جب اس طرح میری باتوں کو بھکانہ سمجھتے
 ہوئے مجھے ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں تا تو مجھے بالکل
 اچھے نہیں لگتے۔“ اس نے اسی کے انداز میں کہا تھا۔
 ”تمہیں شہروز کے علاوہ آج تک کوئی اچھا لگا بھی
 ہے؟“ وہ ترنت بولا تھا۔ زارا کے چہرے پر مسکراہٹ
 چمکی پھر وہ اس کا چہرہ دیکھ کر ہنسی تھی۔
 ”نہیں۔“ وہ دو ٹوک انداز میں بولی تھی۔ ٹیپو نے
 قہقہہ لگایا تھا۔

”مجھے ایک گانا یاد آ گیا ہے۔ عرض کیا ہے منڈا
 شہر لاہور دا میرے دل تے تیر چلاوے۔“ اس نے
 گانے کو پڑھنے کے انداز میں گاتے ہوئے آنکھیں بھی
 مٹکائی تھیں۔ زارا نے قہقہہ لگایا۔
 ”واہ واہ۔ مکرر مکرر۔“ وہ بولی تھی۔ اسے اب یاد
 رہا تھا تو شہروز باقی سب جیسے کہیں غائب ہو گیا تھا۔ ٹیپو
 واقعی بات ٹالنے میں ماہر تھا۔



ایک پروفیسر نے اسے ایک این جی او کے بارے میں
 بتایا جو فریش ایر زہار کرنا چاہتی تھی۔ وہ ان طالبعلموں
 کو رجسٹر کر رہے تھے جو مستقبل میں برطانیہ یا یورپ
 میں کام کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ کالی اچھا
 معروضہ دے رہے تھے اور کام بھی زیادہ نہیں تھا۔ ڈیٹا
 انٹری کا کام تھا۔ وہ آرام سے اپنے ہاسٹل کے کمرے
 میں رات کے وقت یہ کام کر سکتا تھا سو اس نے بھی
 رجسٹریشن کروالی۔

یہ اتفاق کے سوا کچھ نہیں تھا کہ اس این جی او کے
 لیے ڈیٹا انٹر کرتے ہوئے اسے نور محمد کے کوائف
 دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ اسے شاید نہ پہچان پاتا لیکن اس
 کے بارے میں ہر چھوٹی چھوٹی تفصیل دی ہوئی تھی۔
 اس کے ویرا باؤٹس، اس کے رزلٹس، اس کی وہ تصویر
 جو میٹرک کے رزلٹ پر اخبار میں چھپی تھی۔ وہ چونکا
 تب جب اس نے اس کا پولیس ریکارڈ دیکھا۔ بھائی
 پھیسو کے کسی پولیس اسٹیشن میں اس کی تفصیلات
 موجود تھیں جس کا کافی تفصیل سے ذکر تھا۔

یہ اتنے سالوں بعد پہلی دفعہ تھا کہ سلمان کو دوبارہ
 اپنے اسے بھولے بسرے کلاس فیلو میں دلچسپی محسوس
 ہوئی۔

وہ لاہور میں ہاسٹل میں رہ رہا تھا۔ ماس کمیونٹی کیشن
 بڑھ رہا تھا، اخبار والوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا۔ ایک
 محوور نمٹ کالج کے پروفیسر کے بیٹے کے بارے میں
 معلومات اکٹھا کرنا اس کے لیے حلوے جیسا کام ثابت
 ہوا۔ اسے پتا چلا کہ نور محمد دو سال پہلے یو کے گیا تھا۔
 سلمان نے وہ سب پتا لگایا جو یو کے جانے سے پہلے نور
 محمد پر بیٹا تھا۔ اس رپورٹ میں بھی یہی لکھا تھا کہ اس
 کے والد کی سختی جو انہوں نے اپنے بیٹے پر اس کا کسی
 کاموقع ملنا چاہیے۔ غصہ نہیں کیا تھا میں نے۔ اتنا
 ہی کہا تھا کہ یہ کلغذات واپس رکھ دو۔ بہت اہم
 ہیں۔“ ٹیپو ہنستے ہوئے بولا۔

”واپس رکھنے کے لیے نہیں کہا تھا، بلکہ میرے
 ہاتھ سے لے کر رکھ دیے تھے جیسے میں آپ کے وہ
 دس روپے کے پیپر ز کھا جاؤں گی۔“ زارا نے ناک

یہ لندن میں اس کی پہلی صبح تھی۔
 وہ آیا تو دس دن پہلے تھا لیکن جس روز آیا اسی شام کو
 برمنگھم چلا گیا تھا۔ رضوان اکرم لندن میں تھے اور وہ
 مزید چند صحافیوں کے ساتھ برمنگھم جارہے تھے۔ وہاں
 سے ان لوگوں نے تفریحی ٹور کے لیے اسکاٹ لینڈ جانا

تھا۔ شہوز کا یہ شیڈول طے شدہ تھا سو وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ چلا گیا تھا اسے مزا بھی آیا تھا لیکن لندن میں اپنے چاچو کے گھر کا سکون اسے زیادہ پسند آ رہا تھا۔

آنکھ کھلی تو روشنی کمرے کی واحد کھڑکی سے چھن چھن کر اندر بستر تک آرہی تھی۔ اس کو پہلی ہی صبح بہت بھلی لگی۔ جاتی گرمیوں کے دن تھے پاکستان میں موسم ابھی بھی گرم تھا لیکن یہاں اسے موسم خوشگوار لگ رہا تھا۔ کمرے میں پنکھا تو تھا ہی نہیں، لیکن اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی وہ کروٹ بدل کر کچھ دیر ایسے ہی لیٹا رہا۔ ابھی مزید سونے کی طلب تھی لیکن آنکھ کھل گئی تھی سو دوبارہ نیند آنا مشکل بات تھی۔

اس کی توقع کے برعکس نیند اچھی آگئی تھی۔ اسے جو کمرہ دیا گیا تھا وہ چھوٹا لیکن بے حد پرسکون تھا۔ آرام وہ بیڈ کے علاوہ لکھنے پڑھنے کے لیے میز جس پر ڈیسک ٹاپ بھی تھا اور کرسی بھی تھی۔ ایک طرف لی وی تھا۔ جس کے سامنے دو موڑھوں کی طرح کے فلور کشن تھے۔ کمرے میں ہلکے ہرے رنگ کا پینٹ تھا جبکہ بیڈ کور اور کمرے کی واحد کھڑکی پر جھولتا پردہ سفید اور ہرے پھولوں والا تھا۔ رنگوں کا بڑا مناسب سا امتزاج تھا۔ اسے سب کچھ بڑا بھلا لگا تھا۔

اس نے بستر سے نکل جانا ہی مناسب سمجھا۔ ہاتھ روم سے فراغت کے بعد وہ کھڑکی کے پاس آکھڑا ہوا تھا اور باہر دیکھنے لگا تھا۔ آس پاس شاید کوئی اسکول تھا، کیونکہ یونیفارم میں ملبوس مختلف عمروں کے بچے آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑا بلاوجہ باہر دیکھتا رہا۔ اسے سگریٹ پینے کی طلب ہو رہی تھی اور وہ یہاں سگریٹ پینا نہیں چاہ رہا تھا۔ کیونکہ وہ لاہور اپنے گھر میں بھی کبھی سگریٹ نہیں پیتا تھا۔

لڑکی کے ساتھ افیر ہونے پر روار کھی تھی کی وجہ سے وہ ذہنی طور پر اب سیٹ رہتا تھا۔ اس کے متعلق سب جان کر جہاں وہ دکھی ہوا وہاں حیرانی بھی ہوئی۔ ایک این جی او ان سب معلومات کو کیوں اکٹھا کر رہی تھی۔ یہ وہ

پہلا سوال تھا جو اس کے ذہن میں پیدا ہوا تھا۔ یہ ایک برٹش این جی او کھی اور اسے بتایا گیا کہ ٹائن الیون والے واقعے کے بعد یا اس سے کچھ عرصہ پہلے یو کے جانے والے ان تمام لوگوں کا ڈیٹا اکٹھا کیا جا رہا تھا جو برطانیہ کسی بھی مقصد کے لیے جارہے تھے اور ان کا چھوٹا موٹا کوئی بھی پولیس ریکارڈ رہا تھا۔

اسے یقین دلایا گیا کہ یہ روٹین کی سرگرمی ہے۔ دہشت گردی کے بدھتے واقعات کے باعث آج کل ایسا ریکارڈ رکھا جاتا تھا۔ اس نے کام مکمل کر کے دے دیا تھا لیکن بنا کسی وجہ کے نور محمد کا ریکارڈ اپنے پاس محفوظ کر لیا۔ ماسٹرز کے بعد اس نے کچھ عرصہ ایک مشہور اخبار میں ملازمت کر لی، لیکن کچھ عرصہ بعد اس کا دل اچاٹ ہونے لگا۔ وہ ہاتھ باندھ کر جی جناب حاضر جناب کہنے والی مشین نہیں تھا۔ اس لیے وہ لگی بندھی جاب سے کتراتا بہت تھا۔

”میں بھیڑ نہیں ہوں۔ چرہا ہوں۔ میں گلے کا وہ حصہ ہوں جو گلے کے باہر رہ کر اپنا فرض ادا کرتا ہے۔“ یہ اس کا پسندیدہ ڈائیلاگ تھا جو وہ ان لوگوں سے کہتا تھا جو اس سے نوکری چھوڑنے کے متعلق پوچھا کرتے تھے۔ وہ فری لانسنگ کرنے لگا اور ساتھ ہی مزید پڑھائی شروع کر دی۔ اسے اس میں مزا آتا تھا۔ وہ پابندیاں قبول کرنے سے نہیں ہچکچاتا تھا، وہ صرف پالیسیز پر معترض رہتا تھا جو اسے ہمیشہ ہی ملک و قوم کے مفاد میں نظر نہیں آتی تھیں۔ وہ ایسا ہی تھا۔ محب وطن، پر جوش مگر لا پرواہ اور چھپا رستم۔ اسے اپنے کام سے دو سروں کو چونکانے کی عادت تھی۔ وہ انوکھے موضوعات پر رپورٹس تیار کرتا تھا جن کے ہر شعبے میں اس کی محنت صاف نظر آتی تھی۔

اسی لیے اسے فری لانس صحافی کے طور پر شہرت ملنے لگی تھی۔ اس کا نام پہچان بنانے لگا تھا۔ یہ انہی

دنوں کا قصہ تھا۔ سال 2006 شروع ہوا تھا۔ اس نے ایم فل کو بھی اوروں پر چھوڑ دیا تھا۔ جب اسے اسی این جی او سے کال موصول ہوئی، جس کے ساتھ وہ

بہت پہلے ڈیٹا انٹری کی پارٹ ٹائم جاب کر چکا تھا۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ کام کرنے کی آفر دی۔ اس این جی او کارپن برطانیہ کا تھا اور ان کا بنیادی مقصد بھی پاکستانی نژاد برطانوی مسلمانوں کے حقوق کے لیے کام کرنا تھا۔ وہ ایک اچھی پیشکش تھی جس میں مالی منفعت بھی تھی اور نئی راہیں تسخیر کرنے کا انوکھا موقع بھی۔

اس این جی او کے ساتھ کام کر کے ہی اسے ان کے پراپیکٹس کی صحیح سمجھ آئی تھی۔ وہ ان لوگوں کی ذہنی و جسمانی بحالی کے لیے کام کرتے تھے جو مسلمان تھے اور برطانیہ یا یورپ کے اور چھوٹے بڑے ملکوں میں رہ رہے تھے اور مختلف مسائل کا شکار تھے۔ ایسے لوگوں کی ایک لمبی لسٹ تھی جنہیں انتہنک بنیادوں پر استحصال کا سامنا تھا۔ ان میں زیادہ تر لوگ اٹھارہ سے چوبیس سال کی عمر کے تھے، جو پاکستانی ماں باپ کے ساتھ رہ رہے تھے، لیکن برطانیہ میں پیدا ہوئے تھے اور وہاں کی معاشرت کو ذہنی طور پر قبول کر چکے ہوئے تھے۔

سلمان حیدر جلد ہی اس این جی او سے بھی اکٹا گیا تھا۔

اور تب ایک بار پھر نور محمد اس کے سامنے آکر اٹھا ہوا۔ اس تنظیم کے پاس لاتعداد پاکستانیوں کا ریکارڈ تھا جو وہاں ملازمت اور تعلیم کے سلسلے میں گزشتہ پانچ چھ سالوں سے مقیم تھے۔ نور محمد کا شمار بھی ایسے لوگوں میں ہوتا تھا لیکن اب اس کے متعلق جو کچھ بتا چلا وہ کافی درد ناک اور تشویشناک تھا۔ وہ ذہنی طور پر بیمار رہتا تھا اور ایک دہشت گرد تنظیم المہاجرین میں شامل ہو چکا تھا۔ وہ اس گروپ کا آلہ کار تھا جو اپنے قول و فعل کے ذریعے اپنے ارد گرد اشتعال پھیلانے کا باعث بن رہے تھے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ تفصیلات تھیں جو اس کی مجرمانہ ذہنیت ظاہر کرتی تھیں۔ سلمان حیدر اس جاب

سے بھی جلدی اکٹا گیا تھا کیونکہ وہ این جی او صرف ان مسائل کے تدارک کے لیے کام کر رہی تھی جو

برطانوی معاشرے کے لیے قاتل قبول تھیں جبکہ اسلامی اقدار سے متصادم تھیں۔ ہم جنس پرستی، اٹھارہ سال کے بعد نوجوان نسل کی آزادانہ روش، مسلمان لڑکیوں کی عیسائیوں سے شادیاں۔

اس نے آٹھ مہینے بعد ہی استعفیٰ دے دیا تھا اور اس بار اس نے دانستہ طور پر نور محمد سے متعلق سارا ڈیٹا اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔ اس وقت تک اس کا حلقہ احباب بھی کافی بڑھ چکا تھا۔ صحافیوں، سیاست دانوں، وکیلوں اور اداکاروں میں بھی وہ ایک سچا صحافی ہونے کی وجہ سے اچھا مقام حاصل کر چکا تھا۔ نور محمد کے متعلق ملنے والی نئی معلومات نے اس کی صحافیانہ فطرت کو اکسایا تھا کہ وہ اس سارے قصے کی تہ تک پہنچے۔

سو وہ ایک دن پروفیسر آفاق علی سے ملنے ان کے گھر پہنچ گیا تھا۔ وہ اپنی ایک بیٹی اور اہلیہ کے ساتھ اقبال ٹاؤن میں رہائش پذیر تھے۔ اس وقت بھی اس نے یہی سوچا تھا کہ دیکھتے ہیں اصل معاملہ کیا ہے۔



”نور محمد کی ناکامی فرد واحد کی ناکامی نہیں تھی۔ یہ میری ناکامی تھی۔ یہ اس نظام کی ناکامی تھی جس کا میں حصہ تھا۔ یہ اس کوشش کی، اس امید کی ناکامی تھی جو میں نور محمد کے سراپے میں دیکھتا تھا، ڈھونڈتا تھا تلاش کرتا تھا۔“

جھریوں بھرا چہرہ جس پر سفید داڑھی تھی اور حوادث زمانہ کے رنگ تجربہ بن کر بکھرے تھے، لیکن ان کی آنکھیں تھیں جو نرم نہ ہونے کے باوجود گیلی محسوس ہوتی تھیں۔ سلمان حیدر کو ان پر بے پناہ ترس آیا۔ وہ انہیں ایک سخت گیر شخص کے طور پر جانتا تھا، جو ایک کرکٹ بیٹ کی خاطر اپنی اولاد کو روٹی کی طرح دھنک سکتے تھے۔ اس کے علاوہ اس کے ذہن میں ان کا کوئی خاکہ نہیں تھا۔ اس نے انہیں شاید ہی کبھی

ایک آدھ بار اسکول میں دیکھا تھا۔ لیکن یہ اتنی پرانی بات تھی کہ اس کے ذہن سے ایسا ہر خاکہ مٹ چکا

تھا۔ اس لیے اس نے یہ بہتر سمجھا کہ پرانا کوئی حوالہ دیے بغیر ان سے ملا جائے۔

سو اس نے اپنے ایک اور پروفیسر صاحب کے ذریعے اس ملاقات کا اہتمام کیا تھا اور چونکہ وہ ان ہی کے حوالے سے ملا تھا اس لیے سر آفاق بہت اچھے طریقے سے ملے تھے۔ انہیں اپنے مضمون پر تا صرف بھرپور عبور تھا بلکہ وہ ادب اور سیاست میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ملکی و غیر ملکی حالات حاضرہ پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ انہیں بھی سلمان حیدر سے مل کر کافی خوشی ہوئی۔

”کتنے مہنگے ہوتے ہیں بیٹے۔ کتنی قیمتی ہوتی ہے اولاد۔“

پروفیسر آفاق علی نے ایک جملے میں اسے سراہ کر ظاہر کر دیا تھا کہ وہ اندر سے اس پہاڑ کی طرح نہیں ہیں جو جھڑپا بن کر پھوٹ جاتا ہے بلکہ وہ اس میدان کی طرح ہیں جہاں سے پانی تب ہی ابلتا ہے جب اس پر ایڑیاں رکڑی جاتی ہیں۔ وہ اتنا سپاٹ چہرے لے کر دنیا کے سامنے آتے تھے کہ کوئی ان کے اندر جھانکنے کی جرات بھی نہیں کرتا تھا۔

تب سلمان حیدر نے فیصلہ کیا کہ وہ انہیں اعتماد میں لے گا۔ وہ انہیں سمجھائے گا کہ نور محمد سے قطع تعلقی انہیں اس مرحلے پر بھاری پڑ سکتی ہے۔ ایک بین الاقوامی اس جی او کے ریکارڈ میں اس کے متعلق جو معلومات تھیں وہ کسی اچھی خبر کی طرف اشارہ نہیں کر رہی تھیں۔ سلمان حیدر کو انہیں ٹٹولنے میں مشکل ہوئی، لیکن وہ جب اپنی بات بتانے پر آئے تو پھر بتاتے چلے گئے۔

”میں خود چاہتے ہوئے بھی میڈیسن نہیں پڑھ سکا تھا۔ لیکن یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ ہزاروں لاکھوں بچے میرٹ پر نہ آنے کی وجہ سے ہر سال میڈیکل میں ایڈمیشن نہ ملنے کے باعث اپنے ماں باپ کے خواب پورے نہیں کر پاتے، لیکن میرٹ پر پوڑا اترنے کے باوجود میڈیکل کالج میں سیٹ نہ ملنے کا دکھ

میرے لیے بہت بڑا تھا۔

میں بہت غریب خاندان سے آیا تھا۔ میرے ماں باپ پیسہ پیسہ جوڑ کر مجھے تعلیم دلوا رہے تھے۔ میں ڈاکٹر تو نہ بن سکا لیکن بی ایس سی اور پھر ایم ایس سی کر کے میں ایک اسکول میں پڑھانے لگا۔ میں نے سوچا تھا کہ ایم بی بی ایس نہیں کیا تو کیا ہوا ایم ایس سی کیا ہے۔ لیکچرر شپ ضرور مل جائے گی، لیکن یہ بھی میرے جیسے عام آدمی کے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف تھا، میرے پاس سفارش کروانے کے لیے کوئی بڑا رشتہ دار تھا نہ رشوت دینے کے لیے ٹکڑی رقم۔ میں نے لیکچرر شپ حاصل کرنے کے لیے بڑے پاپڑ نیلے۔ رشوت اور سفارش کے بغیر میں نے جن دفتروں سے لیکچرر کی جاب حاصل کی۔ یہ میرا دل ہی جانتا تھا لیکن تدریس کے شعبے نے مجھے سکھایا کہ دراصل ہمارا نظام تعلیم بے حد تعفن زدہ ہے۔ اساتذہ چھوٹے چھوٹے تحائف کے بدلے نالائق طالب علموں کو زائد نمبرز دلواتے تھے۔ رشوت لے کر کمرہ امتحان میں نقلیں کروائی جاتی تھیں اور عملی امتحانوں کے دوران معاونت فراہم کی جاتی تھی۔ پریکٹیکل کروائے جاتے تھے، انٹرویو میں مدد کی جاتی تھی۔ اپنے پسندیدہ چیتے طالب علموں کو کامیاب کروانے کے لیے ناجائز کوششیں کی جاتی تھیں۔ میں نے خود اپنے بہت سے انتہائی ذہین اور قابل طالب علموں کو اس چکر میں ناکام ہوتے اور رشوت کی بنا پر بہت سے نالائق طلبا کو کامیاب ہوتے دیکھا۔ مجھے اس نظام سے نفرت تھی جو اخلاقیات کا درس دیتا تھا جو بچوں کو سچائی اور ایمان داری کے سبق سکھاتا تھا۔ لیکن خود ایسی کالی بھیڑوں کے ہاتھوں پر غمال بنا ہوا تھا۔ میں اپنے دوستوں اور کولیگز میں بر ملا اس نفرت کا اظہار کرتا تھا اور وہ مجھ پر ہنسا کرتے تھے کہ یہ حربے ہیں، ہتھکنڈے ہیں اور ان کے بغیر کامیابی کا ملنا آسان نہیں ہے۔ اگر تمہیں اس نظام سے نفرت ہے یا اس کے خلاف ہو تو اپنی اولاد کو اس کے بغیر کامیاب ہونا سکھانا۔ ہمیں ہمارے حال

برطانیہ میں مقیم سات شعری مجموعوں کے خالق محبتوں کے خوش نوا شاعر



سویہ راقی

کے اندر کئی دہائیوں کا تجربہ اور محنت کا ثمر ہے۔

سویہ راقی اپنے گیتوں میں نرم اور کول شبدوں میں اس پر کار پر دتا ہے کہ وہ اپنا مضمون اور بحالی پن ساتھ لیے دل میں اتر جاتے ہیں۔

(چندر بلو)

سویہ راقی کے گیتوں کا یہ مجموعہ اس لیے تادیر دندہ رہے گا کہ اس میں پریم، پریت، محبت، عشق کے حوالے سے صنم پرستی پوجا کی حدود کو چھوٹی ہے۔ (ڈاکٹر سنجے پال آنند)

سویہ راقی کے سارے گیت دل کو موہ لینے والے لطیف غنائیت کے پیکر ہیں۔

(اکبر حیدر آبادی)

بذریعہ اکبر مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار کراچی۔ فون: 32216361

Idara-e-Adab London

63 - Hamilton Avenue Surbiton,
Surrey, KT67PW. U.K.

Phone: 0044-0208-397-0974

پر چھوڑ دو۔ ان ہی دنوں میری شادی ہوئی تھی۔ میں اللہ سے بس یہی دعا کرتا تھا کہ مجھے اولاد نہ دے۔ میں بیٹا چاہتا تھا اور بیٹا بھی وہ جو نہایت ذہین و فطین ہو۔

وہ چپ ہوئے تھے۔ ساتویں بار ایڑی کی رگڑنے اندر کہیں دور تک ہلچل مچادی تھی۔ سلمان نے ان کی آنکھ سے آنسو ٹپکتے دیکھا۔

”تم نے ایسی ماؤں کے بارے میں سنا ہو گا جو اولاد نہ دینے کے لیے وظیفے کرتی ہیں۔ دعائیں کرتی ہیں۔ اللہ کے حضور گڑگڑاتی ہیں۔ لیکن میں وہ باپ تھا جو اولاد نہ دینے کے لیے رات رات بھر جاگ کر دعا میں کیا کرتا تھا۔ میں نہ صرف بیٹا چاہتا تھا بلکہ یہ بھی چاہتا تھا کہ وہ انتہائی ذہین بھی ہو۔“

وہ پھر تجھ بھر کے لیے رکے تھے۔ ان کی آواز کی ٹون بدل رہی تھی۔ جذبات کا غلبہ ان کی آواز کو کپکپانے لگا تھا۔ ”نور محمد بہت ذہین بچہ تھا۔ پہلا لفظ سات مہینے کی عمر میں بولنا سیکھا۔ دو سال کا ہوا تو سارے حروف تہجی کی پہچان کرنا سیکھ چکا تھا۔ ہم سڑک پر کبھی جاتے تو بورڈز پر لکھے لفظ پہچان لیتا۔ اولاد بہت بڑا فخر کا حوالہ ہوتی ہے۔ میرے لیے بھی میری اولاد میرا فخر تھی، لیکن میں نے اولاد کے سامنے کبھی اس فخر کو ظاہر نہیں کیا۔ لیکن یہ میری غلطی تھی۔ میرا گناہ نہیں تھا۔ میں اپنے جذبات کو چھپا کر رکھتا تھا۔ میری طبیعت ہی اس قسم کی تھی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ مجھے نور محمد سے محبت نہیں تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی باپ کو بیٹے سے محبت نہ ہو۔ محبت تو تھی لیکن میں نے اپنی اولاد کو نظام کے خلاف لڑنے کے لیے اپنا ہتھیار سمجھ لیا تھا۔ میں اس کے ذریعے اس نظام تعلیم کو شکست دینا چاہتا تھا۔ جو بے ایمانی اور رشوت کی بنا پر قابل بچوں کا حق مار رہا تھا۔ میں نے اس پر بہت محنت کی۔ بے حد بے حساب محنت کی۔ میں اسے کہیں کمزور پڑتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ لوگ سمجھتے تھے مجھے اپنی اولاد کی کامیابی سے خوشی نہیں ہوتی تھی۔ ایسا کیسے ممکن ہے۔“

انہوں نے بات ادھوری چھوڑی پھر وہ بدقت اٹھ کر ایک چیسٹ دراز کی طرف چلے آگئے وہ ہاتھ میں کچھ لے کر واپس آئے تھے۔

”یہ دیکھو میرے پاس اس کی ایک ایک کامیالی کا ریکارڈ ہے۔“ انہوں نے سلمان کے آگے ایک ڈائری رکھی تھی۔ اس پر کافی چیزیں درج تھیں۔ وہ صفحات پلٹنے لگے۔

”یہ دیکھو اس کا پہلا ٹیسٹ بارہ مارچ انیس چوراسی کو ہوا تھا۔ یہ دوسرا ٹیسٹ جو اس کے کچھ دن بعد ہوا۔ یہ دیکھو یہ ٹیسٹ۔ یہ دیکھو وہ ٹیسٹ۔“

وہ اپنی لے میں بول رہے تھے انہیں شاید بہت عرصے بعد اپنے بیٹے کے بارے میں باتیں کرنے کے لیے کوئی ملا تھا۔ سلمان کو بے پناہ دکھ ہوا۔ وہ ایک باپ کی ذات کے نیچے ادھیڑنے نہیں آیا تھا جبکہ وہ اپنے حال سے بے خبر بول رہے تھے۔

”یہ دیکھو ایک ایک چیز کو میں سنبھال کر رکھتا تھا۔ لوگ نجانے کیوں سمجھتے ہیں کہ مجھے اس سے محبت نہیں ہے۔ ایسا ممکن ہے بھلا۔ مجھ سے بس یہ غلطی ہوئی کہ مجھے ظاہر نہیں کرنا آیا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔“

وہ اب چپ ہوئے تھے۔ سلمان نے انہیں سسکتے ہوئے سنا۔ اس کی اپنی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ یہ کوئی قابل دید منظر نہیں تھا۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ انہوں نے اپنی آنکھیں صاف کی تھیں۔

”میں سمجھ سکتا ہوں سر! میں شرمندہ ہوں کہ میں آپ کو تکلیف دینے کا باعث بن رہا ہوں، لیکن یہ سب جاننا بہت ضروری ہے۔ بہت سی باتیں ہیں جو میں جاننا چاہتا ہوں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ پھر نور محمد کے ساتھ ایسا کیا ہوا کہ اس کی دماغی حالت اتنی بگڑ گئی کہ اسے پردھالی چھوڑنا پڑی۔ اس کا پولیس ریکارڈ کیسے بنا۔ اس نے ایسی کون سے غلطی کی تھی آخر اور پھر وہ لندن کیسے گیا۔ کس کے ذریعہ گیا۔ اور آخری سوال کہ اب وہ کہاں ہے؟“

اس نے بوجھا تھا۔ انہوں نے حیرانی سے اس کے سوالات کو سنا پھر سختی سے تردید کی۔

”نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس کا کوئی پولیس ریکارڈ نہیں تھا۔ وہ ایک بار پولیس کی گرفت میں آیا ضرور تھا، لیکن وہ بھی میری غلطی کی وجہ سے ہوا تھا۔ میں نے زندگی کے ہر معاملے میں اس پر بے جا سختی کی۔ میں سوچتا رہا کہ مشکل جنگ جیتی ہو تو ٹریننگ سخت کرنی چاہیے۔ میں سمجھتا رہا کہ میں نرم پڑوں گا یا نرمی برتوں گا تو میرا بیٹا ناکام ہو جائے گا۔ میں کیسے ثابت کر پاؤں گا کہ کسی رشوت، معاونت کے بغیر بھی بچے پوزیشن لے سکتے ہیں۔ مجھ سے غلطیاں ہوئیں لیکن نور محمد کے ذہن پر میرے رویے کا اتنا برا اثر پڑا ہے یہ میرے دہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ سولہ سال کا بھی نہیں تھا جب کالج میں آگیا تھا۔ لیکن وہ اپنی عمر کے باقی بچوں کی نسبت بہت معصوم تھا۔ اکیڈمی میں لڑکے اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ حالانکہ وہ اس لڑکی کو نوٹس وغیرہ دیتا کرتا تھا، لیکن چند شریں سند طبیعت کے حامل لڑکوں نے اسے اس بات کے لیے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اسی بات کی وجہ سے اکیڈمی میں اس کے ساتھ ان کا جھگڑا ہوا اور وہ میری زندگی کی سب سے بڑی خطا تھی کہ میں نے اسے ایک ناکردہ گناہ کی سخت سزا دی۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مجھے اپنی تربیت پر بھروسہ ہونا چاہیے تھا۔ مجھے اپنے بیٹے پر یقین کرنا چاہیے تھا لیکن میں نے اسے جھٹلایا اور تب یہ چیز اس کے اعصاب کے لیے بہت بھاری ثابت ہوئی۔“

انہوں نے اسے وہ تمام تفصیلات بتائی شروع کیں۔ اس کا گھر سے چلے جانا پھر ایک دور افتادہ پولیس اسٹیشن سے بازیاب ہونا۔ اس کی ذہنی حالت بگڑنے کا قصہ پھر انٹری ٹیسٹ میں ناکام ہو جانے کا دکھ۔

”میں نے اس پر پردھالی کا اتنا دباؤ ڈالے رکھا کہ اس کے اعصاب کمزور سے کمزور ہوتے چلے گئے، لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی اس حالت نے میرے اعصاب پر کیا اثر ڈالا۔ میں ایک سڑا ہوا درخت

ہوں۔ جسے کیڑا لگ چکا ہے۔ اولاد کے دکھ کھو کھلا کر دیتے ہیں اور کھو کھلے وجود لے کر اس دنیا کا سامنا نہیں کیا جاتا۔ میں دنیا کے سامنے اس کے وجود سے منکر ہونے لگا۔ اس کے علاوہ میرے پاس کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ میری خاموشی کو میرے اپنے گھر والے بھی میری سنگ دلی سمجھتے ہیں، لیکن میں پھر بھی اپنے بیٹے کے بارے میں زبان نہیں کھولتا جس دن زبان کھولوں گا ڈھمے کر کر جاؤں گا۔ اتنا کھو کھلا ہو چکا ہوں۔ اتنا حوصلہ نہیں ہے میرا کہ دنیا کے سامنے اعتراف کر سکوں کہ اللہ نے مجھے جو ہیرا دیا تھا وہ خاک بنا دیا میں نے۔“

سلمان نے ان کے چہرے کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ درختوں سے جھڑتے تے بھلے اچھے لگتے ہوں۔ بوڑھے باپ جوان اولادوں کے دکھ روتے کبھی اچھے نہیں لگتے۔ اس کا دل بہت بو جھل ہو چکا تھا۔

”میں آپ کے دکھ کو محسوس کر سکتا ہوں سر۔ میں شرمندہ ہوں کہ آپ کو پرانی باتیں یاد دلا کر آپ کے دکھ میں اضافے کا باعث بن رہا ہوں، لیکن معافی چاہتا ہوں یہ بہت ضروری ہے۔ میں سب جانتا چاہتا ہوں۔ نور محمد یو کے کیوں گیا۔ اسے کون لے گیا، وہ وہاں کیا کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر وہ کس علاقے میں رہ رہا ہے۔ یہ سب باتیں انتہائی ضروری ہیں۔“

اس نے ایک بار پھر درخواست دہرائی تھی۔ سر آفاق علی نے آنکھیں صاف کیں۔

”وہ سن دو ہزار کے بالکل آخر میں یو کے گیا تھا اور اس کے کاموں اسے لے گئے تھے۔“

وہ بتا رہے تھے پھر انہوں نے مزید تفصیلات بھی بتائی تھیں۔ یہ بہت حیران کن باتیں تھیں۔ یو کے جانے کے بعد نور محمد پر جو جیتی وہ مزید تکلیف دہ تھی۔ ان ہی کی زبانی سلمان کو پتا چلا کہ نور محمد کے ماموں جو اسے اپنے ساتھ لے گئے تھے، نے اپنی بیٹی کی شادی نور محمد سے کروادی تھی، لیکن یہ شادی زیادہ نہیں چلی تھی، کیونکہ اس کی داغی حالت صحیح نہیں رہتی تھی۔ یہاں سے اس کے ماموں نے اسے بلیک برن بھجوا دیا،

جہاں سے وہ آخری اطلاع کے مطابق لوٹن چلا گیا تھا۔“ سلمان کو اس مقام پر اس کہانی میں ابہام محسوس ہوا۔ وہ سر آفاق کو مزید کریدنا بھی نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس طرح وہ مشکوک بھی ہو سکتے تھے۔

آفاق صاحب سے ملنے کے بعد اس کو نور محمد کے بارے میں مزید تفصیلات تو پتا چلیں، لیکن یہ ابھی بھی واضح نہیں تھا کہ نور محمد کے متعلق ایک اس جی او اتنی حساس نوعیت کی معلومات کا ریکارڈ کیوں رکھ رہی ہے اور اب نور محمد کہاں تھا۔ یہ سوال سب سے زیادہ حیران کن تھا۔ اس کا جواب کھوجنے کے لیے سلمان حیدر نے مزید محنت کا ارادہ کیا۔ سر آفاق علی سے ملنے اور ان کی حالت دیکھ کر اس نے انگلیٹنڈ جانے کا پلان بنایا تھا۔



”میں انگلیٹنڈ جانا چاہتا ہوں۔“ اس نے رضوان اکرم صاحب سے کہا تھا۔ جن کے ساتھ ان کے چھینل پر وہ پہلے ایک مرتبہ کام کر چکا تھا۔ وہ اسے کافی سراہتے تھے اور پسند بھی کرتے تھے۔ وہ اتنا با اختیار بھی نہیں تھا کہ کسی اور ملک میں جانے کا سوچتا اور سب وسائل اس کی دہلیز پر آ موجود ہوتے۔ اس کے لیے اسے کسی ایسے شخص یا پلیٹ فارم کی ضرورت تھی جو اسے وسائل اور اختیار دلا سکتا۔ اس لیے وہ ان کے پاس آیا تھا۔

”اجازت ہے۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ہنگامی بنیادوں پر ویزا دلوائیے۔“ اس نے فوراً ”فرمائش داغی۔“

”اپلائی کر دو۔“ نکل آئے گا ویزا۔“ انہوں نے مشورہ دیا تھا۔

”سادہ ویزا نہیں چاہیے۔ اختیارات بھی چاہیے ورنہ عمارتیں دیکھنے اتنی دور جانے کا مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔ میں جو کرنا چاہتا ہوں اس کے لیے مجھے آپ کی ضرورت ہے۔“ اس نے مدعا بیان کیا تھا۔

”میں جان سکتا ہوں کہ جناب کرنا کیا چاہتے ہیں؟“ وہ بھی ایک زیرک انسان تھے۔ انہیں اندازہ ہو گیا

ضائع نہیں کرو۔ مجھے سچ بتاؤ۔ کیا چل رہا ہے تمہارے دماغ میں؟“ انہوں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھا تھا اور تب سلمان نے ان کو مختصراً ”چیدہ چیدہ باتیں بتادی تھیں۔“

”ہم۔“ انہوں نے ہنکارا بھرا۔
”کام تو ہو جائے گا۔ دیش ناث اے بگ ڈیل، لیکن یہ اسٹوری اگر جان دار نکلی تو پھر میرے پروگرام سے بریک ہوگی۔“

انہوں نے یقین دہانی چاہی تھی۔ سلمان کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس طرح ضروری کارروائیوں سے گزرنے کے بعد اسے ویرا مل گیا تھا۔ اس نے سر اتفاق سے وہ تمام ایڈریس لے لیے تھے جو ان کے پاس موجود تھے۔ یو کے پہنچ کر وہ سب سے پہلے روچڈیل گیا تھا جہاں نور محمد کے ماموں کی رہائش تھی۔ وہ وہاں سے جا چکے تھے، لیکن ان کا چھوٹا بیٹا ابھی بھی روچڈیل میں ہی رہتا تھا اور اپنے باپ کی دکان کی دیکھ رکھتا تھا۔

اس سے تو زیادہ معلومات نہیں ملی تھیں، لیکن اسی دکان کے ساتھ والی دکان پر موجود ایک پاکستانی کاریگر نے سلمان کو وہ سب کہانیاں بتائیں جو پاکستان میں نور محمد کے گھر والوں کو بھی تفصیل سے نہیں پتا تھیں۔ ماموں کی زیادتیاں، ان کی بیٹی کا چال چلن، بیٹوں کی آوارگیاں اور نور محمد کی ساوکی۔

وہیں سے سلمان کو مزید تفصیلات پتا چلیں کہ نور محمد شیزوفرینک ہو گیا تھا، اس کو الوٹنز ہوتے تھے اور وہ ارد گرد والے لوگوں سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑتا تھا، اس ری بیلی ٹیشن سنٹر کا پتا بھی اسی کاریگر نے سلمان کو دوڑدھوپ کر کے دیا تھا۔



”نور محمد!“ وہ باریش داڑھی والے شخص کے سامنے بیٹھا اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ ان کا نام سیف اللہ نیازی تھا اور وہ ساٹھ کے پیٹے میں ہونے کے باوجود بہت چاق و چوند قسم کے انسان تھے۔ انہیں

تھا کہ سلمان کے عزائم کچھ اور ہیں۔
”کچھ خاص نہیں۔ سیرپاٹا کروں گا۔ پاکستانی کیونٹی سے ملوں گا۔ ان کے مسائل پر باتیں کروں گا۔ رپورٹس تیار کروں گا، لیکن اس کے لیے مجھے اختیارات چاہیں۔ آپ کی معاونت چاہیے، ورنہ اسکاٹ لینڈ یا رڈ والے مجھے پکڑ کر لے جائیں گے کہ تم کس خوشی میں معلومات اکٹھی کرتے پھرتے ہو۔“

”میں۔ سی ای او کا برابر سببیت نہیں ہوں۔ اس زمانے میں ملک میں جنرل مشرف کی حکومت تھی (میری نرسویز میں مال و اسباب سے لدی کشتیاں بھی نہیں چلتیں۔ میں ہالی ووڈ کی فلموں میں چھوٹے چھوٹے کپڑے پہن کر فلمیں بھی شوٹ نہیں کرواتا۔ یعنی نہ کسی سیاست دان کا رشتے دار ہوں نہ مال دار ارب پتی شیخ ہوں، نہ ہی ہالی ووڈ کی چمکیلی لچکتی مقلدی ہیروئن ہوں۔ میں تو بہت عام سا انسان ہوں۔ میری اتنی پہنچ کہاں کہ کسی کو ویزا بمع اختیارات دلوا سکوں“ انہوں نے طنزیہ انداز میں کہا تھا۔

”آپ چاہیں تو کیا نہیں ہو سکتا سر۔ آپ میری خاطر اتنا بھی نہیں کر سکتے۔“ اس نے مزاحیہ انداز میں کہا تھا۔

”تم نے میری خاطر آج تک کیا کیا ہے برخوردار۔ میرے چینل کو چھوڑ کر چلے گئے۔ ہمارے اخبار کی ملازمت کو الوداع کہہ دیا۔ کبھی میل ملاقات کے لیے بھی نہیں آئے۔ ایک فون کال کے روادار نہیں اور اب کہہ رہے ہو کہ تمہاری خاطر میں ویزا ارنج کروں“ وہ سابقہ انداز میں کہہ رہے تھے۔

”سر! اتنی بے مروتی کی توقع آپ سے نہیں تھی۔ میں نے گزشتہ بقرعید پر آپ کو کال کی تھی۔“ وہ مزاحیہ انداز میں بولا تھا۔

”وہ ایک پانچ منٹ والی سادہ فون کال۔“ انہوں نے طنز آمیز نگاہیں اس پر مرکوز کی تھیں۔

”تو آپ کو کیا ساتھ بکرے کا گوشت بھی چاہیے تھا؟“ اس کا وہی انداز تھا۔

”سلمان! یہ باتیں کسی اور کو سنانا۔ میرا وقت

فورا" یاد آگیا تھا کہ وہ کس کا ذکر کر رہا ہے۔

"جی ہاں۔ میں جانتا ہوں نور محمد کو۔" انہوں نے سلمان کے سوال کا اتنا ہی جواب دیا۔

"میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے اس کا کچھ اتا پتا دے سکتے ہیں؟" وہ مؤدب انداز میں پوچھنے لگا۔

"جی نہیں۔ میں ایسے کسی کے متعلق آپ کو نہیں بتا سکتا، جب تک کہ مجھے یہ نہ پتا لگ جائے، آپ کون ہیں اور نور محمد کے بارے میں کیوں جانتا چاہتے ہیں۔؟" ان کا موقف دو ٹوک تھا۔

"میں اس کا کزن ہوں اور پاکستان سے اس سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔" سلمان نے مبالغہ آرائی سے کام لیا تھا۔ ان کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بہت جلدی نیند سے جاگے آپ۔ اتنے مہینے وہ یہاں اکیلا رہا۔ اپنے آپ سے بے خبر تنہا۔ تب تو آپ کو اس کی یاد نہیں آئی، اب جبکہ وہ ٹھیک ہو چکا ہے، ایک نارمل زندگی گزارنے لگا ہے تو آپ اسے ڈھونڈتے ہوئے آگئے ہیں۔"

"ہم سب اس کی حالت سے باخبر نہیں تھے۔ وہ یہاں اپنے ماموں کے ہمراہ رہا تھا۔ انہوں نے ہمیں ہمیشہ لا علم رکھا اور نور محمد کے بارے میں جھوٹی سچی باتیں گھڑ کے بتاتے رہے۔ اس کے والدین بہت ریشمن ہیں سر۔! وہ اپنے بیٹے سے ملنا چاہتے ہیں، لیکن ہمیں صرف اتنا پتا ہے کہ وہ چند سال پہلے یہاں تھا۔ اس کے بعد وہ یہاں سے فرار ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سے اس کی کوئی خبر نہیں ہے۔ ایک بار اس کے متعلق کوئی مثبت رپورٹ مل جاتی تو میں اس کے والد محترم کو بتا کر سرخ رو ہو سکوں گا۔ آپ کو اگر اس کی اطلاع ہے تو پلیز مجھے بتائیے۔ اس کی ماں کے بے چین دل کو قرار آجائے گا سر!"

اس نے ان بزرگ کو جذباتی انداز میں ٹریپ کرنا چاہا تھا۔ اس مقام پر اس کے دل میں یقین تھا کہ نور محمد کسی نہ کسی غلط سرگرمی میں ملوث ضرور ہو گا اور اسے یہ خدشہ بھی تھا کہ یہ بزرگ بھی اس کے معاون ہو

سکتے ہیں۔

"اس کے والد اب تک کہاں تھے؟ جنہیں ہیرے جیسا بچہ پہلے یاد ہی نہیں آیا۔" وہ کافی رعب اور ہڈیے والے انسان تھے۔ سلمان کی ہمت ہی نہیں پڑی تھی کہ وہ کوئی وضاحت دے پاتا۔

"لوٹن میں رہتا ہے آج کل۔ مؤذن بھی ہے اور امامت بھی کرواتا ہے ماشا اللہ۔" وہ پر جلال انداز میں بولے تھے۔ سلمان نے سر ہلایا، پھر شکل پر مصنوعی رقت طاری کر کے بولا۔

"آپ برا نہ مانیں تو میں ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ وہ یہاں سے لوٹن کیوں اور کیسے چلا گیا؟ اور پھر اس نے اپنے ماموں کے پاس واپس جانا کیوں مناسب نہیں سمجھا۔؟ اس کے والد تو وہاں پاکستان میں یہی جانتے ہیں کہ وہ یہاں سے فرار ہو کر لوٹن گیا تھا۔"

"سب بے کار کی باتیں ہیں۔ جھوٹ کا پلندہ ہیں۔ وہ جب یہاں آیا تو ذہنی حالت ایسی تھی کہ ہر دوسرے روز دورہ پڑنے لگتا تھا۔ ڈوپا مان لیول برہ گیا تھا۔ اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا تھا، کسی کو پہچانتا بھی نہیں تھا۔ اتنی خراب حالت میں بھی اس کے ماموں کو کبھی توفیق نہ ہوئی کہ اگر اس کی خبر لیتے اس کی وجہ یہ بھی کہ وہ اس پر کوئی رقم نہیں خرچ کرنا چاہتے تھے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ اگر پوچھیں گے تو اس کے اخراجات کے لیے رقم کا مطالبہ کیا جائے گا، سو انہوں نے اس سے لا تعلقی اختیار کر لی۔ جبکہ ہم نے اسے اپنے خرچے پر دوائیں استعمال کروائیں۔ اس کی کاؤنسلنگ کی، وہ بہت جلدی صحت یاب ہو گیا تھا۔ اس کو دورے پڑنا بھی بند ہو گئے تھے اور پھر میں نے اسے قرآن پڑھانا شروع کیا۔ آپ یقین نہیں کرو گے برخوردار! وہ اتنا ذہین بچہ تھا کہ ایسی دماغی حالت کے باوجود اس نے نو مہینے میں قرآن پاک حفظ کر لیا۔ اسے اللہ سبحان تعالیٰ نے ایک حیرت انگیز دماغ دیا تھا۔ دو سال لگا تارےاں ہماری مسجد میں نماز تراویح کی امامت کرواتا رہا۔ پھر اسی لیے میں نے اسے لوٹن بھیجا دیا، وہاں جامع مسجد کا ملازم ہے۔ ہفتہ وار تنخواہ کماتا ہے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

اچھی بھلی زندگی گزار رہا ہے اور وہ بھاگ کر کہیں نہیں گیا تھا۔ میں نے خود اسے وہاں بھرتی کروایا تھا۔ جب صحت مند ہو چکا تھا تو کیوں مفت کی روٹیاں تڑواتے اس سے۔ اپنا کھانا ہے، کھانا ہے ماشاء اللہ۔“ وہ تنک کر بولے تھے۔

”آپ مجھے اس کا کوئی اتنا پتا دے دیں۔ میں اس سے ایک دفعہ ملنا چاہتا ہوں۔“ اس نے کہا تھا۔

”دے دوں گا“ اگر تم یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟“ انہوں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ سلمان گڑبڑا سا گیا۔ وہ صحافی تھا، بھانت بھانت کے لوگوں سے ملتا رہتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا وہ سب کو آرام سے جل دے سکتا ہے، لیکن سامنے بیٹھے بزرگوار نے چند منٹ میں اس کے اس غرور کا تیا نچا کر ڈالا تھا۔

”میں۔۔۔ اس کا کزن ہوں میں نے آپ کو بتایا تو تھا۔“ وہ بات بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ انہوں نے اسے گھور کر دیکھا۔

”مجھ سے جھوٹ مت بولو۔ یہ جو کزن، رشتہ دار، دوست احباب ہوتے ہیں نا ان کی آنکھوں میں ایسی کھوج نہیں ہوتی، جیسی تمہاری آنکھوں میں ہے۔“ انہوں نے صاف گوئی سے کہا تھا۔

سلمان نے ایک لمحہ ہی سوچا تھا پھر کسی انجانے جذبے سے مغلوب ہو کر اس نے اللہ کو یاد کرتے ہوئے انہیں کچھ نہ کچھ بتا دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے انہیں مختصراً بتایا تھا کہ نور محمد کا تعلق کس طرح ایک جملوی تنظیم سے جوڑا جا رہا ہے۔ وہ چونکہ سلاہ لوح انسان ہے اور شریعہ کی پاسداری ہے تو اس سے ملنا ضروری ہے۔ سیف اللہ نیازی اس کی باتوں کو غور سے سنتے رہے تھے۔

”آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ میں نور محمد کو دوست کی حیثیت سے تلاش نہیں کر رہا، لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ میں اس کا خیر خواہ ہوں میری دلی خواہش ہے کہ میں نور محمد کو اس کے والدین سے ملوا سکوں، میرا مقصد صرف اتنا ہی ہے۔“ اس نے انہیں یقین دلایا تھا۔

”تم ایڈریس لے لو لیکن ایک بات یاد رکھو، اس سے ایسی کوئی بات مت کرنا جس سے اسے کوئی تکلیف ہو، وہ دماغی طور پر صحت مند ہے، لیکن ابھی بھی اس کے اعصاب بہت مضبوط نہیں ہیں۔ اس کی ذہنی رو بھٹک بھی سکتی ہے۔ سوا لزام تراشی سے پرہیز کرنا اور اس کے ماں باپ سے ملو تو ایک بار میری طرف سے ضرور کہنا کہ انہوں نے چاہے اسے دنیا میں چھوڑ دیا ہو۔ لیکن وہ اتنے کرموں والا بچہ ہے کہ جنت میں بھی انہیں اکیلا نہیں چھوڑے گا ساتھ لے جائے گا، انہوں نے جتا کر کہا تھا۔ سلمان چپ رہ گیا۔



اس کے بعد وہ لوٹن پہنچا تھا لیکن یہاں پہنچنے سے پہلے اس نے لوٹن کے متعلق کافی معلومات اکٹھی کی تھیں۔ انٹرنیٹ پر بھی اور اخبارات کے ذریعے بھی اور وہاں مقیم مسلم آبادی سے بھی ملاقاتیں کر کے اس نے کافی مواد اکٹھا کیا تھا۔ لوٹن کے بارے میں اسے پتا چلا تھا کہ یہاں مسلم کمیونٹی زیادہ تھی۔ یہاں کافی جگہوں پر مسلم روایات کی پاس داری بھی کی جاتی تھی۔ جس کی بنا پر مقامی آبادی ناخوش رہتی تھی اور مسائل بھی لا تعداد تھے۔ جھڑپیں اور فسادات بھی ہوتے رہتے تھے۔ مقامی سفید فام اکثریت نے ایک تنظیم یو پی ایل بنا رکھی تھی، جو بظاہر غیر فعال نظر آتی تھی۔ لیکن پھر بھی سفید فام آبادی کی جانب سے بھوری رنگت کے حامل بالعموم کسی اور بالخصوص ریڈیکلز کہلائے جانے والے لوگ عتاب کا نشانہ بنتے تھے۔

مسلمانوں کی ایک نمائندہ جماعت الہا جرون تھی۔ جس کے متعلق سوالات اٹھتے رہتے تھے اور زیادہ تر مسلمان آبادی بھی اس تنظیم سے ناخوش تھی۔ یہ لوگ شریعت کے نفاذ کی بات کرتے تھے۔ جبکہ یو پی ایل کے نمائندگان شریعت کے خلاف زہر اگلنے لگے تھے اور مسلمانوں اور ان کی روایات کا کھلے عام مذاق اڑاتے تھے۔ قرآن کے اوراق کی بے حرمتی، مسجد میں آنے والے نمازیوں پر آوازیں گھسنے کے

واقعات اور خنزیر کا گوشت یا کچرا مسجد کے احاطے میں پھینکنے کی باتیں بھی سننے میں آتی تھیں۔ سلمان نے ایک دن جامع مسجد میں ایک وقت کی نماز بھی ادا کی۔ اس نے وہاں نور محمد کو بھی دیکھا۔ اسے پہچاننے میں اسے زیادہ مشکل نہیں ہوئی تھی، کیونکہ سر اتفاق نے اسے اس کی ایک دو تصویریں دکھائی تھیں۔

سلمان کو اس سے زیادہ حیرانی اس کے ساتھ موجود سفید فارم کو دیکھ کر ہوئی۔ وہ دونوں زیادہ تر وقت ایک ساتھ ہی نظر آتے تھے جبکہ ان کی عمروں میں تقریباً دگنا فرق تھا۔ نور محمد تیس بیس سال کا تھا، جب کہ وہ سفید فارم پچاس پچپن کے مٹے مٹے میں لگتا تھا۔ سلمان کو بعد میں پتا چلا کہ وہ ایک نو مسلم ہے اور اس کا نام احمد معروف ہے۔ اس نے احمد معروف کے متعلق پوچھ کچھ کی تو اس شخص کی شناخت ”بل گرانٹ“ کے نام سے ہوئی جو ناول نگار بھی تھا۔

بل گرانٹ کے متعلق اس نے سب سے پہلے انٹرنیٹ پر سرچ کی تھی۔ جہاں سچ اس کی تصویر کے اس کے متعلق کافی معلومات مل گئی تھیں۔ دوسری اہم بات جو اس کے متعلق اسے پتا چلی وہ اس کی شہرت تھی، وہ کوئی عام ناول نگار نہیں بلکہ کافی مشہور لکھنے والا ادیب تھا۔ سلمان نے یہاں بھی رضوان اکرم سے مدد لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے انہیں کال کی تھی اور اس شخص کے متعلق کچھ معلومات فراہم کرنے کے لیے کہا تھا۔ اس کے ناولز اور ان کی تھیمز کے بارے میں اسے رضوان اکرم سے پتا چلا تھا اور یہ بات بھی انہوں نے ہی بتائی تھی کہ وہ اپنی ہندو بیوی کی خودکشی کے بعد سے گمناہی کی زندگی گزار رہا ہے اور اس کا آخری ناول جس پر وہ کام کر رہا تھا بھی مکمل نہ ہو سکا تھا۔ احمد معروف عرف بل گرانٹ کے متعلق مزید معلومات اسے سیف اللہ نیازی سے بھی ملی تھیں۔

سیف اللہ نیازی دراصل وہی شخص تھے جنہوں نے بل گرانٹ کو نور محمد کے متعلق بتایا تھا۔ وہ بل گرانٹ کے متعلق بھی کافی باتیں جانتے تھے جو انہیں خود بل گرانٹ نے بتائی تھیں۔ سلمان نے دوبارہ جا کر

ان سے ملاقات کی تھی کیونکہ جامع مسجد سے اسے پتا تھا کہ بل گرانٹ نے بلیک برن کی جامع مسجد کے امام سیف اللہ خان نیازی کے سامنے اسلام قبول کیا تھا، جبکہ وہ اس بات کی شہادت سے انکاری ہو گئے تھے کہ بل گرانٹ نے ان کے سامنے کلمہ پڑھا تھا، لیکن انہوں نے بل گرانٹ کی تعریف کی تھی اور اس بات کا اعتراف بھی کیا تھا کہ انہوں نے بل گرانٹ سے کہا تھا کہ وہ کسی ”مومن“ بندے سے ملنا چاہتا ہے تو ایک بار ”نور محمد“ سے ضرور ملے۔

اب کی بار سلمان نے انہیں سب کچھ سچ بتا دیا تھا کہ کیسے وہ نور محمد کے بارے میں جاننے کے لیے یہاں آیا ہے اور کس طرح پاکستان میں کام کرتی ایک این جی او کے پاس اس کا ریکارڈ ہے، جو یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ دہشت گرد تنظیم کے ساتھ وابستہ ہے۔ سیف اللہ خان نیازی نے ہی سلمان کو بتایا تھا کہ بل گرانٹ اچھا انسان ہے، لیکن وہ اس بات کی سو فیصد گواہی نہیں دے سکتے کہ وہ مسلمان ہو چکا ہے یا نہیں۔ اس طرح سلمان نے خاطر خواہ ہوم ورک کر کے ایک دن ان دونوں کو پوسٹ آفس میں جالیا تھا اور ایسے ظاہر کیا جیسے وہ اتفاقاً نور محمد سے آ ملا ہے۔ یہاں تک سب دیکھا ہی ہوا تھا، جیسا اس نے سوچا تھا لیکن وہ وہاں چوک گیا تھا جب اس نے بل گرانٹ عرف احمد معروف سے ساری باتیں کھل کر کرنی شروع کی تھیں۔ نور محمد اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلا گیا تھا۔

سلمان کو ان دونوں کی نیت پر جو شک تھا وہ کافی حد تک ختم ہو گیا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ یہ دونوں ہی جھوٹ نہیں بول رہے، لیکن وہ لہجے کو نرم رکھ کر معاملہ نہیں بگاڑنا چاہتا تھا۔ اس نے احمد معروف سے اپنے مخصوص انداز میں ہی بات کی تھی، جو وہ صحافی بن جانے کے بعد اپنا لیا کرتا تھا۔ لیکن اس مقام پر سارا معاملہ الٹا ہو گیا تھا۔ وہ احمد معروف کی گفتگو سے متاثر ہوا تھا۔ تب ہی انہوں نے اسے اپنے ساتھ آنے کے لیے کہا تھا۔ وہ اٹھ کر ان کے ہمراہ دوسرے کمرے تک گیا تھا لیکن تب ہی کسی نے عقب سے اس کے سر پر

کسی اونٹنی چیز سے وار کیا تھا۔ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر نیچے گر گیا تھا۔



”آپ کا نام سلمان حیدر ہے۔“ وہ پوچھ رہی تھی۔ گاڑی رائے ونڈ سے لاہور کی جانب گامزن تھی۔ وہ زارا کو لینے بھی خود آیا تھا اور اب ڈراپ بھی خود کرنے جا رہا تھا۔ زارا کو پہلی بار اس سے عجیب سا خوف لاحق ہوا تھا۔ وہ کافی دیر تک اس سے اس بارے میں کوئی سوال نہیں کر پائی تھی۔ وہ فون کال کے آنے کے بعد سب کام ادا ہو کر اچھوڑ کر نجانے کہاں چلا گیا تھا اور وہ ڈھائی گھنٹے بعد واپس آیا تھا۔ اس کے چہرے پر سوچوں کا جال بنا تھا اور اپنے مخصوص باتونی انداز میں باتیں کرنے کے بجائے کافی خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔

”ہاں۔۔۔ کیوں اچھا نام نہیں ہے کیا۔“ وہ اسی انداز میں پوچھ رہا تھا جو اس کا خاصا تھا۔ زارا نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

”آپ نے مجھے کبھی بتایا نہیں۔“ وہ ابھی بھی مناسب الفاظ جمع نہیں کر پائی تھی۔

”کیا۔۔۔؟“ اس نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ ”آپ کو اپنا صحیح نام مجھے بتانا چاہیے تھا۔“ وہ لہجے میں زور دے کر بولی تھی۔ اس کی خفگی بھی اب لہجے سے عیاں ہونے لگی تھی۔

”ٹیپو بھی غلط نام نہیں ہے۔“ اس نے بھی اسی کے انداز میں کہا تھا پھر موڑ کاتے ہوئے مزید بولا۔ ”یہ نام میرے ابو نے رکھا تھا اور مجھے یہ نام بہت عزیز ہے اور یہ نام صرف ان لوگوں کو بتانا ہوں میں جو مجھے بہت عزیز ہیں۔ کوئی اعتراض؟“

وہ اس سے سوال کر رہا تھا۔ زارا چند لمبے سوچتی رہی کہ مزید کیا پوچھے۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ میں تمہیں عام سا ٹکم پڑھا لکھا انسان سمجھتی تھی جو کہیں ڈسپنریا کیپاؤنڈر کی جاب کرتا تھا۔ یہ کہنا بہت بڑی بد اخلاقی ہوتا۔

”اب مراقبے میں کیوں چلی گئی ہو۔ اس میں اتنا

برامانے والی کیا بات ہے کہ اگر ٹیپو کا نام سلمان حیدر ہے تو۔۔۔ لوگ مالٹے کو کبھی تو کیوں کہتے ہی ہیں۔ اور شائع کو گوگلگو بھی۔ اس پر تو کبھی کسی نے ایسے منہ نہیں بگاڑا ہو گا جیسے تم نے بگاڑ لیا ہے۔“

وہ اتنے عام سے انداز میں مثالیں دے رہا تھا کہ نا چاہتے ہوئے بھی زارا کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”آپ نے کبھی اپنے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں۔ میں آپ کے گھر جاتی ہوں۔ آپ کی امی کو آنٹی کہتی ہوں، آپ لوگوں کے گھر کھانے کھاتی ہوں، آپ سے اپنے مسئلے ڈسکس کرتی ہوں، اس کے باوجود میں آپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔“ اس نے گود میں رکھے ہاتھوں کو بلاوجہ مسلاتھا۔

”اس کی وجہ بھی میں ہوں کیا؟“ وہ پوچھ رہا تھا پھر اسے خاموش دیکھ کر بولا۔

”تمہیں اپنے اور اپنے شہروز صاحب کے بارے میں بات کرنے سے فرصت ملے تو کبھی کسی اور کے متعلق بات ہونا۔ اچھا اب خفاست ہو، پوچھو کیا پوچھنا چاہتی ہو۔ اب خدا را میری امی کی طرح یہ مت پوچھنا کہ آمنہ کون ہے؟“

”آمنہ کے بارے میں بات کیوں نہیں کرنا چاہتے آپ؟“ وہ چڑ کر بولی تھی۔

”ارے میں نے کب کہا کہ مجھے آمنہ کے بارے میں بات نہیں کرنی۔ تم تو بلاوجہ خفا ہو رہی ہو۔ کہیں بھوک تو نہیں لگی۔ آج میں چاکلیٹ لایا ہوں تمہارے لیے۔ یہ چیمبر کھول کر نکال لو۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔ زارا نے چیمبر کھولنے کے لیے ہاتھ آگے نہیں کیا تھا۔

”مجھے چاکلیٹ لینی ہے نہ چیمبر کھولنا ہے، پھر آپ کے کوئی ضروری کاغذات میرے ہاتھ لگ جائیں گے اور آپ غصہ کریں گے۔“ وہ پھلی بار کا واقعہ یاد کرتے ہوئے بولی تھی، جب ٹیپو نے اپنے کچھ کاغذات اس کے ہاتھ لگنے پر چھیننے کے انداز میں لے لیے تھے۔

”زارا! تمہیں تو معصوم انسانوں سے بدگمان ہونے

لیکن کراچی اسے کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں تھا۔ اس لیے صبح بیدار ہونے کے بعد سگریٹ پینے کی لت سی لگتی جا رہی تھی۔ اپنی طلب سے لڑتے ہوئے وہ صرف وقت گزاری کے لیے باہر دیکھنے لگا تھا۔

بیرونی بڑی سڑک پر ایک بزرگ سفید فام ہاتھ میں ایک بورڈ لے کر بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ اس نے دیکھا تین بچوں کا گروپ جیسے ہی سڑک پار کرنے کے لیے اس سمت آیا۔ اس بزرگ شخص نے اپنا بورڈ والا ہاتھ ہوا میں بلند کر دیا تھا جس پر اتنی دور سے لکھا ہوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن شہوز نے دیکھا وہ گاڑیوں نے جو تیزی سے آرہی تھیں اس بورڈ کو دیکھ کر رفتار آہستہ کر لی تھی۔ اس بوڑھے شخص نے اس کے بعد بچوں کو اشارہ کیا تھا۔ وہ تینوں بچے اطمینان سے بزرگ کی طرف مسکراہٹ اچھالتے ہوئے سڑک پار کر کے آگے بڑھ گئے تھے۔ شہوز کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسے یہ سب اچھا لگا۔ لندن کا پہلا تاثر ہی بہت گہرا تھا۔ دروازے پر ہلکی سی دستک دی گئی تھی۔ اس نے سڑک دیکھا تھا پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا۔ دروازہ کھل گیا تھا۔ سامنے عمر کھڑا تھا۔ نہایا دھویا ترو تازہ نکھرا نکھرا سا۔

”اسلام و علیکم۔ گذارنگ میرے ابو کے گھر میں پہلی صبح مبارک ہو۔“ وہ اندر داخل ہوتا ہوا بشارت سے لیکن عجلت بھرے انداز میں بولا تھا۔

”میں آفس کے لیے نکل رہا تھا۔ سوچا تم سے مل کر جاؤں پھر واپسی پر تو میں لیٹ ہو جاتا ہوں آج کل۔ ذرا یہاں آؤ کچھ چیزیں سمجھانی ہیں۔“ وہ بیڈ پر بیٹھ کر اپنا لیپ ٹاپ والا بیگ کھول رہا تھا۔

”امامہ بھی آئی ہے؟“ شہوز نے بیڈ کی سمت آتے ہوئے پوچھا تھا۔

”نہیں۔۔۔ وہ شام کو آئے گی۔ میں تو تمہیں کچھ چیزیں دینے آیا تھا۔ یہ ووڈافون کی انٹریشٹل سم ہے اسے اپنے فون میں انسٹ کر لو۔ تمہیں ہم سے رابطہ کرنے میں آسانی رہے گی۔ یہ جو بیک اسٹریٹ ہے نا۔ اس کے دائیں طرف پوسٹ آفس ہے۔

وہاں سے تم ڈے کارڈ لے لیتا، لیکن دس بجے کے بعد جانا۔ پہلے جاؤ گے تو کارڈ منگا ہو گا۔ دس بجے کے بعد رش کم ہو جاتا ہے تو ریٹ کم ہو جائے گا۔ لندن دیکھنا ہے تو گھوم پھر کر ہی دیکھنا پڑے گا، اس لیے ضروری ہے کہ تم یہاں کارڈ سسٹم سمجھ لو۔ یہ میپ ہے۔ اس کے مطابق چلو گے تو آسانی سے سب سمجھ میں آجائے گا۔ میرا مشورہ ہے پہلے دن تم سنٹرل لائن سے جوئی لائن تک کا کارڈ لیتا اس میں چار اسٹیشن آجائیں گے۔ میں ابو اور عمیر تینوں شام کو ہی آئیں گے۔ تم اکیلے ہو گے سارا دن، لیکن ایسے گھر بیٹھے رہے تو بہت جلد آکتا جاؤ گے اس لیے بہتر ہے ذرا باہر چلے جانا۔“ وہ جلدی جلدی بول رہا تھا۔

”بہت خوب۔۔۔ تم پاکستان آتے ہو تو ہم تمہیں اکیلے گھرن گھیریاں کھانے بھیجتے ہیں کیا۔۔۔ میرے ساتھ چلنا میں اکیلا کہیں نہیں گھوم سکتا۔“ شہوز مصنوعی ناراضی سے بولا تھا۔

”میں ویک اینڈ پر جوائن کروں گا نا تمہیں۔ اس سے پہلے بہتر ہے تم خود بھی کہیں نکلو ورنہ تم پورا لندن نہیں دیکھ پاؤ گے۔ گھر میں صرف ممی ہوں گی، لنگ کے بعد امامہ بھی آجائے گی لیکن یہ دونوں خواتین تمہیں بور کر دیں گی اس لیے بہتر ہے دو تین گھنٹے ذرا باہر نکل جانا۔“ وہ وضاحت دے رہا تھا۔ شہوز کچھ نہیں بولا۔

”یہ کچھ کیش ہے۔۔۔ پچاس پاؤنڈز ہیں اور یہ میرا اے لی ایم ہے اس کا پن کوڈ میرا ڈیٹ آف برتھ ہے، مجھے پتا ہے تمہارے پاس میسے ہیں، لیکن وہ روپے ہوں گے پاؤنڈز نہیں اس لیے جب تک تم روپوں کو پاؤنڈز میں تبدیل نہیں کروالیتے صرف تب تک تم میرا اے لی ایم استعمال کر سکتے ہو۔“ عمر نے والٹ کھول کر اس میں سے رقم اور اپنا کارڈ نکال کر میز پر رکھتے ہوئے کہا تھا۔ شہوز کو حیرت کا خفیف سا جھٹکا لگا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ عمر اس کو کیش اور اپنا کارڈ تک دے ڈالے گا۔ اس کے خلوص پر بہت پیار آیا۔

”ارے نہیں نہیں۔۔۔ مجھے ضرورت نہیں ہے۔

میرے پاس یوروز ہیں۔ یہ مت کرو تم۔“ وہ اس کا کارڈ اٹھا کر اسے واپس تھمانے لگا۔

”اوہو۔۔۔ اپنے یوروز بھی سنبھال کر رکھو۔ یہ پاؤنڈز ہیں۔۔۔ چپ چاپ رکھ لو اب والٹ میں اور اتنے بھی شوخ مت بنو تمہیں جانتا ہوں تم بہت امیر ہو گئے ہو لیکن ہمیں بھی اپنا فرض ادا کرنے دو۔“

وہ دوبارہ لیپ ٹاپ کی زپ بند کر کے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اب کی بار شہوز کچھ نہیں بولا تھا، حالانکہ وہ پاکستان سے ہی کچھ روپے یورو میں کنورٹ کروا کر لایا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا تھا تاکہ عمر کو دکھاسکے کہ اس کے پاس پیسے ہیں۔“

”اب کدھر جا رہے ہو؟“ عمر نے اسے اٹھتا دیکھ کر سوال کیا تھا۔

”ابھی تو صرف واری صدقے جا رہا ہوں تمہارے انداز پر۔۔۔ ماشاء اللہ بڑے ذمہ دار ہو گئے ہو۔“ شہوز نے چڑایا پھر وہ اپنا والٹ کھولنے لگا تھا۔ عمر نے ناپسندیدگی سے اس کو دیکھا پھر والٹ پکڑ کر اسے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

”چل پھر لالے! نکلتا ہوں۔۔۔ شام کو ملاقات ہوگی پھر بات کریں گے ذمہ داریوں کی۔“ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔ شہوز نے کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر کے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا تھا۔



”نور محمد؟“ شہوز نے نا سمجھی کے عالم میں عمر کا چہرہ دیکھا تھا۔

اسے ایک دم یاد نہیں آیا تھا کہ عمر کس کا ذکر کر رہا ہے۔ لندن آمد کے بعد یہ پہلا ایک اینڈ تھا اور عمر اس کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے کافی پرجوش تھا۔ وہ آفس کے بعد روز ہی می کے گھر آ جاتے تھے۔ آج بھی وہ آفس سے بیٹھ آیا تھا اور اب وہ دونوں کافی کے مک لے کر عید کے کمرے میں آ بیٹھے تھے۔ ایک دور کے رشتہ دار کی فیملی ڈنر کے لیے آرہی تھی اس لیے لائبریری بھی می کی معاونت کے خیال سے ان کے

گھر پر تھی۔ عمر نے یہ موقع مناسب سمجھتے ہوئے شہوز کو ساتھ لیا تھا اور اوپر آگئے تھے۔ عمر تفصیل سے اس سے نور محمد کے متعلق بات کرنا چاہتا تھا۔

”ہاں نور محمد۔ تمہیں یاد ہے۔ شہوز بھائی نے ہمیں ایک بار بتایا تھا تاکہ لائبریری کا بھائی ان کا کلاس فیلو تھا۔ وہ جو بعد میں کسی نفسیاتی بیماری کے چکر میں مینٹل ہاسپٹل میں داخل تھا۔“ وہ بغور اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”اوہو۔۔۔ تمہیں یاد کیوں نہیں آرہا۔“ عمر نے آگے کر پوچھا تھا۔ شہوز نے سر ہلایا۔ اس کی توجہ خشک میوہ جات کی پلیٹ میں زیادہ تھی جو عمر کالی کے ساتھ اٹھا لایا تھا۔

”ہاں ہاں۔۔۔ یاد تو آگیا ہے لیکن مسئلہ کیا ہے اتنی رازداری سے بات کیوں کر رہے ہو؟“ اس نے کھٹے میٹھے روٹنڈ کا جو کے دانے مٹھی میں بھرے تھے۔

”وہ یہاں ہے۔۔۔ یو کے میں۔۔۔ کسی اساتذہ میں نہیں ہے۔“ عمر نے اپنے تئیں کوئی راز آشکار کیا تھا اس پر۔

”اچھا۔۔۔ یہاں ہے؟ لائبریری ملتی ہے اس سے۔ ملنا بھی چاہیے۔۔۔ بھائی ہے اس کا۔“ وہ لاپرواہی سے بولا تھا۔ عمر نے اس کے انداز کو ناپسندیدگی سے دیکھا۔

”بھائی! مانا تو بہت ہینڈ سم ہو گیا ہے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ عقل کو استعمال ہی نہیں کرنا۔ اس کو پیکنگ میں رکھنے کا ارادہ کر لیا ہے کیا؟“ وہ مصنوعی انداز میں چڑ کر اس کے سر پر انگلی سے دستک دیتے ہوئے بولا تھا۔ شہوز ہنسا۔

”بک بک نہیں کر۔ تعریف کرنی ہے تو کھل کر کر۔۔۔“ اس نے کاجو کا ایک دانہ اس کی جانب اچھلا دیا۔

”تمہیں بھی لڑکیوں کی طرح تعریفیں سننے کا زیادہ ہی شوق ہو گیا۔ لیکن فی الحال ذرا اپنی ذات سے باہر نکلو اور سنجیدگی سے میری بات سنو۔ یہ بہت اہم معاملہ ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ لائبریری کا ایک بھائی ہے نور محمد۔ یہ بات تمہیں پتا ہے یا نہیں؟“ عمر کے چہرے پر

پہلی سنجیدگی محسوس کر کے شہروز بھی سنجیدہ ہوا تھا۔
 ”ہاں یہ بات تو ہوتا ہے مجھے۔ اور یہ بھی سمجھ میں
 آگیا کہ وہ یہاں ہے۔ آگے چلو۔“ وہ بتا بھی رہا تھا اور
 پوچھ بھی رہا تھا۔

”نہیں یہاں لندن میں نہیں ہے۔ لوٹن میں
 ہے۔“ عمر نے اپنے گھٹنے کے نیچے رکھا کشن نکال کر
 اپنے انداز نشست کو مزید آرام دہ بنایا تھا۔
 ”میں تمہیں مختصر الفاظ میں ساری بات بتانے کی
 کوشش کرتا ہوں۔ امانہ کا ایک بھائی تھا نور محمد۔
 جس کے بارے میں ہمیں بہروز بھائی نے بتایا تھا کہ وہ
 ذہنی طور پر صحت مند نہیں تھا اور بعد میں کسی لڑکی کے
 ساتھ افیئرنگی بنا پر انکل آفاق نے اسے کافی مار پیٹ کی
 تھی اور وہ گھر سے بھاگ گیا تھا۔ یہ ہیں وہ باتیں جو
 ہمیں بہروز بھائی سے پتا چلی تھیں، لیکن اب امانہ نے
 مجھے اس بارے میں کافی تفصیل سے بتایا ہے۔ اصل
 قصہ یہ نہیں ہے۔“

عمر نے رک کر اس کے چہرے کے تاثرات جانچنے
 کی کوشش کی کہ آیا اسے ابھی بھی اس کی باتوں میں
 دلچسپی محسوس ہو رہی ہے یا نہیں۔ اسے یہ احساس بھی
 تھا کہ شاید شہروز اس مسئلے میں زیادہ دلچسپی نہ لے
 لیکن چونکہ وہ امانہ سے وعدہ کر چکا تھا کہ وہ اس کے
 بھائی کی تلاش میں اس کی مدد کرے گا تو یہ اس کے لیے
 اب کسی مہم سے کم نہیں تھا۔ اس کی دلی خواہش تھی
 کہ شہروز اس سلسلے میں ذاتی دلچسپی لے۔

”اصل قصہ کیا ہے پھر۔“ شہروز نے پوچھا تھا۔

”امانہ کا بھائی کسی لونیشک اسائنمنٹ میں نہیں تھا،
 بلکہ 2000 عریں یو کے آگیا تھا اور یہ بھی ٹھیک
 ہے کہ وہ ذہنی طور پر صحت مند نہیں تھا۔ اس کا علاج
 بھی ہوتا رہا تھا، لیکن اس کی وجہ کوئی لڑکی نہیں تھی یا
 کوئی افیئر وغیرہ کا معاملہ نہیں تھا جیسا کہ ہمیں بہروز
 بھائی نے بتایا تھا۔ دراصل انکل آفاق ابتدا سے ہی
 اسے بیٹے کے لیے بہت سخت گیر باپ تھے اور بڑھائی کو
 لے کر مار پیٹ کرتے رہتے تھے۔ حالانکہ بقول امانہ
 کے اس کا بھائی ایک بہت ہی آؤٹ اسٹینڈنگ

اسٹوڈنٹ تھا، لیکن انکل کے سخت تشدد اور ایٹار مل
 روٹے نے اسے مکمل طور پر پھلنے پھولنے ہی نہیں
 دیا۔ ایک بار اس کا اپنے اکیڈمی فیلوز کے ساتھ جھگڑا
 ہو گیا جسے بلا وجہ یہ رنگ دیا گیا کہ اس کا شاید کسی لڑکی
 سے افیئر تھا۔ باپ کی حیثیت سے جب انکل آفاق کو
 اس جھگڑے اور اس جھگڑے کے محرک کا پتا چلا تو
 انہوں نے عادت کے مطابق اس پر کافی تشدد کیا۔ پہلا
 پینک انٹیک اس کو تب ہی ہوا تھا۔ آسان اور مختصر
 لفظوں میں بیان کروں تو انکل آفاق کا رویہ بیٹے کے
 ساتھ نہایت نامناسب تھا اور اس کی ذہنی مخدوش
 حالت کی وجہ بھی یہ ہی رویہ تھا۔ اس واقعہ کے بعد سے
 حالات مزید بگڑ گئے شاید اس کو پینک انٹیکس بھی ہوتے
 تھے اور وہ انگریز انٹیلی کا مریض بھی تھا۔ اس کا علاج چلتا
 ہی رہتا تھا۔ اسی وجہ سے آئی روینہ نے اپنے بھائی
 کہنے پر اسے ان کے ساتھ یو کے بھجوا دیا تھا۔ وہ
 روچڈیل میں رہتے تھے اور انہیں بھی اپنی آزاد روش
 والی بیٹی کے لیے ایک کھوٹا چاہیے تھا۔ اسی لیے
 انہوں نے اپنی بیٹی کی شادی اس کے ساتھ کر دی، لیکن
 یہ شادی زیادہ دیر نہیں چلی تھی۔ اس لڑکی کا کسی سفید
 فام عیسائی کے ساتھ افیئر تھا جو اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا
 اور تب وہ ریگنٹ تھی۔ وہ لڑکی نور محمد کے ساتھ
 شادی پر خوش نہیں تھی اور صرف زمانے کو دکھانے
 کے لیے اس نے یہ سرسری سارشتہ قائم کیا تھا، لیکن
 کچھ عرصہ بعد مطلب نکلنے کے بعد نور محمد، ماموں،
 ممانی کو کھٹکنے لگا تھا۔ وہ چاہتے تھے تو نور محمد واپس چلا
 جائے۔ سو انہوں نے حالات کو اس کے لیے اس سب پر
 موڑنا شروع کیا، لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نور محمد کی
 ذہنی حالت مزید بگڑ گئی۔ وہ لیول اے سینٹر فرینک ہو گیا
 تھا۔ اس لیے امانہ کے ماموں نے اسے بلیک برن کسی
 بحالی سینٹر بھجوا دیا۔“ عمر نے چیدہ چیدہ سب ہی بتا دیا
 تھا۔

”یہ تو بہت عجیب باتیں بتا رہے ہو تم۔ ایسا لگتا
 ہے جیسے کوئی فلم کی کہانی بنا رہے ہو۔“ شہروز کو اس
 مرحلے پر واقعی کچھ دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ عمر

نے اپنے کافی کے مک پر بنے جھاگ کو دیکھا، پھر اسے ہٹانے کے لیے پھونک ساری تھی۔

”فلمی کہانی ابھی کہاں۔ اصل فلمی کہانی تو ابھی باقی ہے۔“ کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

”امامہ کا بھائی بلیک برن سے کہیں غائب ہو گیا تھا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں وہ وہیں کہیں ہے، لیکن کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ لوٹن چلا گیا تھا۔ تم نے شاید کبھی لوٹن کے بارے میں سنا ہو۔ لوٹن ایسے علاقے کے طور پر شہرت رکھتا ہے جہاں مسلم آبادی زیادہ ہے، لیکن یہاں مسائل بھی زیادہ ہیں۔ یہاں غیر قانونی طور پر مقیم بیچلرز زیادہ ہیں۔ یہاں کے بارے میں اکثر خبریں آتی رہتی ہیں جو زیادہ حوصلہ افزا اور مثبت نہیں ہوتیں۔ اس کے علاوہ اس کے متعلق مزید کوئی خبر نہیں ہے۔ امامہ کے ماموں تو اس کے متعلق بات نہیں کرتے۔ ان لوگوں کے رُمز بھی آپس میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہ سب باتیں بھی کسی تیسرے رشتہ دار کے ذریعہ امامہ لوگوں کو پتا چلی تھیں۔ انکل آفاق ویسے ہی اس معاملے میں دلچسپی نہیں لیتے۔ وہ گویا بیٹے سے دست بردار ہو چکے ہیں، لیکن آنٹی اپنے بیٹے سے ملنا چاہتی ہیں اور ظاہر ہے امامہ کے دل میں بھی بھائی سے ملنے کی خواہش ہے اور مسئلہ یہ ہے کہ اس کے بارے میں مزید کچھ پتا نہیں ہے۔ امامہ کے پاس صرف ایک فون نمبر تھا جو اس شخص کا تھا جو اس کے بھائی کو روچڈیل سے بلیک برن لایا تھا، لیکن وہ نمبر بھی رسپانڈنگ نہیں رہا الب۔“

”عمر! کیا پتا۔ وہ زندہ نہ ہو۔ میرا مطلب اتنے سالوں سے غائب ہے تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ شہوز نے کندھے اچکا کر خدشہ ظاہر کیا تھا۔

”یہ بات میرے ذہن میں بھی آئی تو تھی، لیکن میں اس سچ پر سوچنا نہیں چاہتا۔ ایسے سوچنے کا مطلب ہو گا شکست تسلیم کر لینا جو کہ میں نہیں کرنا چاہتا۔ میں پوری انرجی کے ساتھ یہ سوچ کر اسے تلاش کر رہا ہوں کہ وہ زندہ سلامت اور ٹھیک ٹھاک ہے اور یہ بات تم امامہ کے سامنے بھول کر بھی مت کہنا۔ وہ

اپنے بھائی سے ملنے کے لیے بے تاب ہے۔“ عمر نے کہا تھا۔

”یہ تو فطری سی بات ہے۔ خونی رشتے مقناطیس کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کے حصار سے نکلنا آسان تھوڑی ہوتا ہے۔“ شہوز نے بھی اپنا مک سنبھالا تھا۔

”یہ ہی تو بات ہے۔ آنٹی کے بارے میں سوچنا ہوں تو دل بہت دکھتا ہے۔ سوچ یار! کہیں ادھر ادھر ہوں تو ہماری مائیں کیسے بے چین ہو جاتی ہیں۔ میں اب ممی سے الگ رہتا ہوں، لیکن روز بھاں آتا ہوں۔ ایک دن نہ آؤں تو ممی بے چین ہو کر فون کرتی ہیں کہ کہیں میری طبیعت تو خراب نہیں ہے یا کوئی پریشانی تو نہیں ہے۔“

عمر کے لہجے میں تاسف تھا۔ شہوز نے سر ہلایا۔ اس کی ممی بھی اس کے کراچی جانے کے بعد سے اسی طرح بے چین رہنے لگی تھیں، لیکن وہ ان کا مذاق اڑایا کرتا تھا کہ ممی آپ تو جذباتی ہی ہو جاتی ہیں۔ عمر کے لہجے میں اپنی ممی اور پھر اپنی ساس کے لیے اس قدر محبت اور پریشانی دیکھ کر اسے حیرانی ہوئی تھی۔ وہ جس دن سے آیا تھا عمر کے روتے میں اسے عجیب سی تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ پہلے جیسا غیر ذمہ دار اور لاپرواہ نہیں رہا تھا، بلکہ کافی سمجھ دار لگنے لگا تھا۔ شادی اس کی شخصیت میں ایک مثبت تبدیلی لائی تھی جو واضح محسوس ہوتی تھی۔

”میری بولی خواہش ہے کہ نور محمد کا جلد از جلد کچھ پتا چل جائے، تاکہ آنٹی روینہ کا انتظار ختم ہو۔ ان کے بارے میں سوچ کر میرے دل کو کچھ ہوتا ہے شہوز۔ اولاد کے دکھ پیرا ساٹھ ہوتے ہیں۔ یہ والدین کو اندر ہی اندر ختم کر دیتے ہیں۔ مجھے جس دن سے یہ ساری تفصیل پتا چلی ہے نا آنٹی روینہ کا چہرہ نظموں کے سامنے گھومتا رہتا ہے۔ ان کو دیکھ کر پہلا خیال یہ ہی آتا تھا میرے ذہن میں کہ یہ میری ممی کی طرح مطمئن اور پرسکون کیوں نہیں لگتیں۔ ان کے پورے وجود سے بے چینی کیوں جھلکتی نظر آتی ہے۔ ایک ہی ان کی بیٹی ہے۔ ملی مشکل بھی نہیں ہے۔ تو پھر ایسا کیا

نا۔ ”اس نے ناک سے مکھی اڑانے والے انداز میں کہا تھا، ”پھر شہروز کو خوش دیکھ کر بولا۔

”یہ سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ انسانی فطرت ہے۔ اس میں ٹھہراؤ وقت کے ساتھ ہی آتا ہے۔“

اس نے سرسری سے انداز میں کہا، ”جیسے وہ اپنی بدلتی ہوئی طبیعت سے خود بھی واقف تھا۔

”ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ انسان وقت کے ساتھ سمجھ دار ہوتے ہیں۔ لیکن کچھ انسان پیدا ہی سمجھ دار ہوتے ہیں جیسے کہ ”میں“ شہروز منور۔“ وہ آنکھیں گھماتے ہوئے بولا تھا۔

”ہاں جیسے کہ تم سمجھ دار۔ خوش فہم۔ خود پسند۔ اور۔“ عمر کا انداز بھی اس جیسا ہی تھا۔ شہروز نے اس کی بات کالی۔

”اور۔ خوش لباس۔ خوش مذاق۔ خود دار۔ اور۔“ اب کی بار عمر نے اس کی بات کالی تھی۔

”اور خود بخود بھی۔ آئیوٹنگ۔ یعنی کسی کے پوچھنے کہنے سے پہلے ہی اپنی تعریف میں مسلسل بچنے والا باجا۔“ چھپھورا۔ ”عمر اسے چڑا رہا تھا۔ شہروز نے شرارتی انداز میں اسے گھورا تھا، ”پھر بولا، ”خود بخود نہیں۔ اسے کہتے ہیں خود شناس۔ خود آگاہ۔

شہروز نے اس کی تشریح پر پاس پڑا کشن اسے کھینچ کر مارا تھا۔ وہ گفتگو جو انتہائی سنجیدگی سے شروع ہوئی تھی پالا خر کسی منطقی لائحہ کو طے کیے بنا ختم ہوئی نظر آرہی تھی۔



”تم نے آگے کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“ آنٹی رافعہ نے اس کے آگے چائے کا کپ رکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

اس کا کلینک باقاعدہ شروع ہو چکا تھا۔ ہر کام اس کی توقع سے زیادہ تیزی سے اور بہترین طریقے سے انجام پایا تھا۔ وہ ہفتے میں دو دن جمعہ ہفتہ کے لیے دس بجے سے چھ بجے تک کلینک پر رہی تھی۔ اتوار کوئی الحال

ہے جو ان کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔ اب جا کر اس راز سے پردہ اٹھا ہے۔ تو یقین کرو ان پر ترس آتا ہے۔ اللہ کسی ہل کو ایسی مشکل میں نہ ڈالے۔“

وہ کالی ختم کر چکا تھا۔ شہروز کی کالی ابھی بھی مک میں موجود تھی۔ وہ عمر کا چہرہ تگنے میں مگن تھا۔ عمر کی آنکھوں کے گوشے نم لگتے تھے۔ شہروز اس عمر سے تو واقف ہی نہیں تھا، جس کا دل اتنا حساس تھا کہ کسی اور کے دکھ اس کی آنکھوں کو نم کر دیتے تھے۔ وہ کسی تیسرے انسان کے لیے پریشان ہو سکتا تھا۔ شہروز اس کے رویے پر حیران ہو گیا تھا۔

”تم مجھے ایسے کیوں گھور رہے ہو۔ کیا پہلے کوئی خور و آدی نہیں دیکھا اور اب دیکھ ہی لیا ہے تو کیا دیکھتے ہی چلے جاؤ گے۔“

وہ اس کی نظروں سے خائف ہو کر نیم مزاحیہ انداز میں بولا تھا، ”ناکہ اپنی کیفیت پر قابو پاسکے۔

”میں یہ سوچ رہا تھا کہ تم پہلے والے عمر نہیں رہے؟“ شہروز نے ٹھنڈی کالی کا پہلا گھونٹ بھرا تھا۔ ٹھنڈی ہو جانے کے باعث وہ اسے بہت بد مذا لگی۔ ”کیا بہت بُرا لگ رہا ہوں؟“ عمر نے نیم سنجیدگی سے پوچھا۔

”نہیں۔“ شہروز نے اتنا کہہ کر ایک اور گھونٹ بھرا، ”پھر لہجے میں قطعیت بھر کر بولا۔ ”بہت ذمہ دار لگ رہے ہو۔ اچھے بیٹے۔ اچھے شوہر۔ اچھے بھائی۔“

”میں پہلے بھی ایسا ہی تھا۔ اچھا بھائی، اچھا بیٹا۔ اچھا شوہر۔ یعنی ایک ٹکٹ میں تین تین مزے، فل سکیج۔“ وہ — سنجیدہ نہیں تھا۔

”نہیں، پہلے تمہاری طبیعت میں بچپنا تھا جو اب یک دم غائب ہو گیا ہے۔“ شہروز نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی تھی۔

”طبیعت میں بچپنا نہیں تھا۔ میں خود بچپن میں تھا۔ چھوٹا تھا۔ ضد اور جذباتیت تھی مزاج میں۔ اب خیر سے خود باپ بننے والا ہوں تو ذمہ داری تو آئی تھی

چھٹی ہی طے کی گئی تھی۔ اس نے ایک نرس بھی اپنے پرانے اسٹاف میں سے یہاں کے لیے مزید نخواہوے کر رکھ لی تھی اور ایک عدد ریسپشنسٹ آئی رافہ نے اپنے سلائی والے اسکول کی لڑکیوں میں سے جن کو منتخب کی تھی۔ سب کچھ اس کی خواہش کے مطابق ٹھیک ٹھاک ہو گیا تھا۔ ابھی تک جو دو دن گزرے تھے وہ تو بے حد مصروفیت والے تھے۔

اس کا خیال تھا کہ یہ کوئی بہت ہی پسماندہ علاقہ ہے تو آنے والی عورتیں سادہ کم بڑھی لکھی اور دیہاتی ہوں گی، لیکن ایسا نہیں تھا وہ اتنا پسماندہ علاقہ بھی نہیں تھا جیسا زارا نے سوچ رکھا تھا۔ آنے والی زیادہ تر عورتیں بڑھی لکھی اور کھاتے پیتے گھروں سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ آئی رافہ نے پبلٹی کا ذمہ اپنے سر لے رکھا تھا اور ابتدا میں کنسلٹیشن فیس بہت ہی کم رکھی گئی تھی تو عورتوں کی جانب سے رسالے اچھا مل گیا تھا اور زارا کو یہ مصروفیت اچھی لگ رہی تھی۔ جمعہ کی وجہ سے آئی رافہ کا اپنا اسکول جلدی بند ہو گیا تھا۔ وہ گھر پر ہی تھیں اس لیے انہوں نے زارا کو اپنے ساتھ دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے بلایا تھا، لیکن میو گھر پر موجود نہیں تھا۔ وہ آج کل کافی مصروف رہنے لگا تھا۔ کھانا کھا کر وہ چائے پینے بیٹھی تھیں۔

”شادی کب کر دو گی؟“ وہ اسے خاموش پا کر مزید پوچھ رہی تھیں۔

اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی، لیکن فوراً سمجھ میں نہیں آیا کہ جواب کیا دے۔ گزشتہ ایک سال وہ شادی کے متعلق بہت سنجیدگی سے سوچتی رہی تھی۔ اس مسئلے کے لیے پریشان رہی تھی، لیکن اب اس نے اس مسئلے پر سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ یہ واقعی اس کے اختیار کی بات نہیں تھی۔

”خدا را اب یہ گھسا پٹا جملہ مت بولنا کہ شادی ایک جوا ہے۔ شادی جوا نہیں ہوتی۔ جوا ہوتی تو سنت نہ ہوتی۔ اس لیے سنجیدگی سے جواب دو کہ شادی کے

متعلق کیا سوچا ہے۔“ انہوں نے اپنا کپ تھاما تھا اور اس کے سامنے بیٹھ گئی تھیں۔

”ابھی نہیں۔ چند سال بعد سوچوں گی۔“ اس نے گھونٹ بھرا تھا۔

”ویسے تو یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے زارا۔ لیکن میں چونکہ زندگی بھر استاد رہی ہوں، اس لیے اچھی بات بتانے سے رہ نہیں سکتی۔ شادی مناسب وقت پر ہی اچھی لگتی ہے۔ تم خود ایک ڈاکٹر ہو۔ تم سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ بیس سے پینتیس سال کی عمر بچے پیدا کرنے کے لیے مناسب ترین عمر ہوتی ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے اس عمر میں شادی ہو جانی چاہیے۔“

”اس عمر میں کون کرتا ہے آج کل شادی۔ یہ عمر تو ابھی کھیلنے کودنے کی ہوتی ہے۔“ اس نے ان کی بات کے وزن کو کم کرنے کے لیے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

آئی نے اس کی جانب آنکھ ترچھی کر کے دیکھا۔

”ارے بی بی! آج کل بچیوں کو کھیلنے کودنے بھی کون دیتا ہے۔ پانچ سال کی عمر سے جو مولی مولی کتابیں دے کر بٹھاتے ہیں تو تیس تیس سال تک بس اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دھکے ہی کھاتی رہتی ہیں۔ کمپیوٹرز میں سرکھپا رہی ہیں، مولی مولی اسائنمنٹ میں صحت خراب کر رہی ہیں۔ بسوں، رکشوں میں خرچ ہوئی جا رہی ہیں۔ ایم اے۔ ایم ایس۔ ایم فل۔ پی ایچ ڈی۔ ہمیں تو نام لینے میں ہی سہکن ہو جاتی ہے۔ خون چوسنے والی اس پڑھائی سے زیادہ بڑی ذمہ داری ہے کوئی آج کل۔“ انہوں نے اس انداز میں منہ بنا کر کہا کہ زارا کو ہنسی آگئی۔

”آپ لڑکیوں کی اعلا تعلیم کے خلاف ہیں کیا؟“ اس نے وہی سوال پوچھا جو سب سے پہلے ذہن میں آیا تھا۔

”نہیں۔ بالکل نہیں۔ میں تعلیم کے خلاف نہیں ہوں۔ کوئی بھی تعلیم کے خلاف کیسے ہو سکتا ہے۔“ انہوں نے قطعیت سے کہا تھا، پھر مزید اضافہ کرتے ہوئے بولی تھیں۔

”میں تعلیم کی اس بے مقصدیت کے خلاف ہوں

جو آج کل رائج ہوتی جا رہی ہے۔ تعلیم آج کل ڈگریوں کے پلندے کا نام بن کر رہ گئی ہے۔ علم محدود ہوتا جا رہا ہے۔ بچے بچیاں علم نہیں حاصل کر رہے بلکہ جیسے کسی دوڑ میں گھوڑے بنے دوڑے چلے جا رہے ہیں اور ہاتھ پھر بھی کچھ نہیں آ رہا۔ ہم نے اتنا بے ذائقہ علم پہلے کبھی نہیں چکھا تھا۔ میں تمہیں اپنی مثال دیتی ہوں۔ جب میں نے بی اے کیا تا تو میرا شمار انتہائی پڑھی لکھی لڑکی کے طور پر ہونے لگا تھا۔ یہ 75 کی بات ہے۔ جب بی اے کیا تو میں اپنے سارے آس پاس کے گھروں اور رشتے داروں کی منظور نظر ہو گئی تھی۔ کسی کو خط لکھنا ہوتا تھا کوئی فارم بھرنا ہوتا تھا یا کوئی درخواست لکھنی ہوتی تھی تو سب میرے پاس آتے تھے۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ رافعہ بی بی بہت سیانی لڑکی ہے جو شہر سے پڑھ کر آئی ہے، تم یقین نہیں کرو۔ گی، لیکن اس وقت میں اپنی فیملی کی اس علاقے کی پہلی لڑکی تھی جو ہاسٹل میں رہ کر کالج تک پڑھ کر آئی تھی۔ میں نے اتنی درخواستیں اور خط لکھے ہیں کہ گنتے بیٹھو تو ہزاروں ناسی سیکڑوں تو ضرور ہو جائیں گے اور اب اکیسویں صدی میں یہ حال ہے کہ میرے آس پاس کے ہر گھر میں تین تین چار چار افراد ہیں جو گریجویٹ ہیں۔ میرے پاس ایک وقت میں چودہ لڑکیاں پڑھنے آئی ہیں جو بی اے کر رہی ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی کالج میں درخواست لکھنے کے لیے کہہ دو تا تو تیرہ لڑکیاں پرنسپل کی اسپیلنگ ہی نہیں لکھ پائیں گی اور وہ جو ایک لکھ کے لائے گی وہ بھی پرنسپل کے اسپیلنگ میں ”اے“ کے بجائے ”ای“ لکھ دے گی۔ ”انہوں نے تلخی بھرے لہجے میں کہا تھا“ پھر گفتگو میں اس کا انہماک محسوس کر کے بات جاری رکھتے ہوئے بولیں۔

”یہ ابھی اسی سال کی بات ہے مجھے اپنی پنشن کے سلسلے میں کچھ کام تھے تو لاہور جانا پڑا۔ واپسی میں کچھ بچوں نے کتابیں منگوائی تھیں، وہ خریدنے کے لیے لپٹی چلی گئی۔ بک اسٹور پر ایک لڑکی کتابیں خرید رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ”شہاب نامہ“ تھا۔ میں بہت

خوش ہوئی۔ میری بہت پسندیدہ کتاب ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم نے یہ کتاب ہی کیوں خریدی۔ میرے ذہن میں تھا وہ تعریف کرے گی کتاب کی اور لکھنے والے کی۔ میں بھی چار جملے بول کر خوش ہوں گی۔ کتابیں پڑھنے والوں کو ایک بیماری ہوتی ہے۔ اپنی پسندیدہ کتاب کے بارے میں اپنی من چاہی اولاد کی طرح ہر وقت بات کرنا پسند کرتے ہیں۔ اسی لیے میں اس لڑکی کے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر چل سی گئی تھی۔ وہ محترمہ بولیں۔ ”میں دراصل سی ایس ایس کی تیاری کر رہی ہوں تو مولی مولی مشہور کتابیں خرید رہی ہوں۔ ان میں سے بھی کچھ یاد کر لوں گی۔ کیا پتا پیپر زیا انٹرویو میں ان میں سے بھی کچھ آجائے۔ اب مت پوچھو۔ مجھے کتنا غصہ آیا۔ یہ ہے آج کل تعلیم کا معیار، لیکن یہ تعلیم نہیں ہے۔ یہ تعلیم کی ناقدری ہے۔ ایسی تعلیم کی میں حامی نہیں ہوں۔“ ان کے چہرے سے ناپسندیدگی پھلکنے لگی۔

”تم میری بات سے اتفاق کرو یا نہ کرو، لیکن آج کل تعلیم حاصل کرنے کا شوق اور لگن اتنی نہیں ہے جتنی کہ پہلے ہوا کرتی تھی۔ تعلیم کی لگن اور شوق بہت کم لوگوں کو ہے۔ آج کل یہ شعور حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کی جا رہی ہے۔ میں ایسی تعلیم کے حق میں نہیں ہوں جو صرف ڈگریوں کا انبار جمع کرنے کی خاطر، ملازمت میں پروموشن یا تنخواہ میں انکریمنٹ کی خاطر یا پھر اچھے رشتے کے لالچ میں کی جائے۔ مجھے تھکا دینے والی چیزوں سے شروع سے الجھن رہی ہے۔ ایسی بے مقصد تعلیم جس میں شوق یا لگن کا کوئی عنصر شامل نہیں، تھکن کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ یہ عورتوں کو کمزور کر رہی ہے اور اس کا فائدہ صرف فارماسیوٹیکل کمپنیوں کو ہو رہا ہے۔ ایک ایک بچہ پیدا ہوتے ہی آج کل کی بچیوں کے گھٹنے جواب دے جاتے ہیں۔ کمر کا درد ہر تیسری لڑکی کا مسئلہ ہے۔ طاقت کی دوایاں کھا کھا کر لڑکیوں کے بدن اور فارماسیوٹیکل کمپنیوں کے بینک اکاؤنٹس پھولتے جا رہے ہیں۔

ہم نے ایک بڑا ظلم کیا ہے۔ ہم نے اپنی بچوں کو سکھا دیا ہے کہ تم ڈگریوں کے ڈھیر نہیں لگاؤ گی تو تمہیں اچھا رشتہ نہیں ملے گا۔ اچھی جا ب نہیں ملے گی اچھا رتبہ نہیں ملے گا۔ ”اچھی عورت“ کی ایسی ایسی نایاب تعریفیں رائج کر دی گئی ہیں کہ اب لڑکی بے چاری کو اچھا بننے کے لیے بڑی مشقت کرنی پڑتی ہے۔ پہلے اچھا طالب علم بننے کے لیے جی جان سے محنت کرتی ہے پھر اچھی بیٹی بیوی بننے کے لیے اپنا آپ خرچتی ہے کیونکہ وہ پڑھ لکھ جائے تب بھی گھر اور گھر کی ذمہ داریاں اسے ہی اٹھانی ہوتی ہیں۔ اور وہ اس فکر میں گھٹنے لگتی ہے کہ ہر کام میں سلیقہ اور جدت لاسکے ورنہ فوراً ”طعنہ دے دیا جاتا ہے کہ ایسی تعلیم کا فائدہ جب سبب کی بلیغ اور گاجر کے پھول سلا د میں رکھنے کے لیے نہ بنانے آسکیں۔ اس معاشرے کو عورت کی لاتعداد ورائٹی چاہیے۔ اچھی بیٹی اچھی طالب علم اچھی ڈاکٹر اچھی انجینئر اچھی بلورچر اچھی دھو بن۔ وہ بھی کولہو کے بیل کی طرح سب کرنی جاتی ہے اور جب اچھی ماں بننے کی باری آتی ہے تو وہ اتنا تھک چکی ہوتی ہے کہ دن اگلیوں پر کھتی ہے کہ بچہ تین سال کا ہو تو اسے کنڈر گارٹن میں ڈال کر پھر سے اچھی عورت ہونے کا ثبوت دے سکے لیکن سچ پوچھو تو تب اسے بڑا دکھ ہوتا ہے کہ جن کے لیے اسے اچھا بہت اچھا ہونا چاہیے تھا۔ وہ ان کے لیے دسکی اچھی نہیں ہو پارہی۔ میں جانتی ہوں تم اور بہت سی بچیاں میری بات سے متفق نہیں ہوگی لیکن میں پھر بھی کہتی رہوں گی کہ اس ملک کا المیہ ہے کہ یہاں کی عورت تو طاقت ور ہو گئی ہے لیکن وہ ایک کمزور ماں بن چکی ہے۔ ماں کو کمزور نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ماں کسی بھی ریاست کا انرجائزر ہوتی ہے۔ یہ طاقت ہوتی ہے۔ یہ ہی سب سے بڑی ذمہ داری بھی ہے۔ میں اس لیے لڑکیوں کی مناسب وقت پر شادی کی حامی ہوں۔ انہوں نے اولاد پیدا ہی نہیں کرنی ہوتی۔ اسے پالنا بھی ہوتا ہے۔ اس کی تربیت کرنی ہوتی ہے۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے بچے۔ ماں کے قدموں تلے جنت کا مطلب

یہ تھوڑی ہے کہ بچہ پیدا کر لیا، تکلیف سہ لی تو جنت مل جائے گی۔ بچہ تو ہر ماں پیدا کر لیتی ہے۔ تکلیف تو بندر یا گھوڑی یا بھینس کو بھی ہوتی ہوگی۔ ماں کے قدموں تلے جنت کا مطلب جو مجھے سمجھ میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ بچہ ماں کی گود سے اتر کر پاؤں پاؤں چلنا سیکھتا ہے۔ یہ ماں کے قدم ہیں۔ اس کی پیروی ہے اس کی پیش قدمی ہے جو بچے کو جنت کا راستہ دکھا سکتی ہے جو صرف درد نہ سہ کر نہیں حاصل ہونے والی۔ اصل مشقت تو اس تربیت کی ہے جو ماں کی اولین ذمہ داری ہوتی ہے۔ ”انہوں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”اس لیے تو ماں کا درجہ بہت بلند ہے۔ اس سے بہت احسن کام لینے ہوتے ہیں اللہ کی ذات نے بہر حال میں تمہیں نصیب جس کر کے بے زار نہیں کرنا چاہتی۔ میں تو صرف ایک مشورہ دے رہی تھی۔ تم خود ایک ڈاکٹر ہو۔ ہر اچھی بری چیز بہتر سمجھتی ہو۔ اس لیے اب پڑھ لکھ چکی ہو جو کرنا تھا کر رہی ہو اللہ تمہیں اس میں کامیابی دے لیکن آئندہ کے متعلق بھی سوچو۔“

وہ اس کے ہاتھ سے خلی کپ پکڑتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھی تھیں۔

”آئی آپ بہت ذہین ہیں۔ آپ کی باتیں سن کر مجھے ہمیشہ بہت موٹی دین ملتی ہے۔ میں بہت متاثر ہوتی ہوں۔ اللہ نے آپ کو بہت فہم و فراست دی ہے۔“ اس نے انہیں دل سے سر لہا تھا۔ وہ ایک دم ہنس دیں۔

”ذہین نہیں ہوں، نقل چور ہوں۔ ادھر ادھر سے کتابیں بڑھ کر لوگوں کے سامنے خود کو عقل مند ثابت کرنے کے لیے لیکچر دیتی رہتی ہوں۔“ وہ مسکرائی تھیں۔

”یہ ہی بات جب میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ نقل چور ہیں تو آپ پیرا مان جاتی ہیں۔“ یہ ٹیپو کی آواز تھی جو محسن سے آئی تھی۔ وہ محسن میں لگے وائش بیسن کے پاس کھڑا تھا۔ آواز سے ابھی بھی نیند کے اثرات

چھلک رہے تھے۔

”اٹھ گئے تم۔“ آنٹی رافعہ نے اس کو محبت سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”کیسی ہیں آپ ڈاکٹر زارا۔ سب کام ٹھیک چل رہا ہے نا۔“ وہیں کھڑا ہوا پوچھ رہا تھا۔ زارا کا جواب سننے سے پہلے ہی اس نے منہ دھونا شروع کر دیا تھا۔ زارا نے بھی اپنی چیزیں سمیٹیں۔ وہ نہیں جانتی تھی ٹیپو گھر میں موجود ہے۔ وہ نظر نہیں آیا تھا، سو اس نے یہ ہی سوچا تھا کہ باہر ہو گا۔

”میں زارا سے پوچھ رہی تھی کہ اس کا شادی کا کب تک ارادہ ہے۔ یہ کہہ رہی۔“ وہ نہ جانے کیا کہنے والی تھیں۔ ٹیپو نے ان کی بات کاٹ دی۔

”ناشتا بنائیں امی۔ ابھی کوئی نصیحت سننے کا موڈ نہیں ہو رہا۔ میرے دلغ کے سب سنگٹنز بھوک کی وجہ سے کام نہیں کر رہے۔“ وہ پانی کے چھینٹے مار رہا تھا

منہ پر۔
”تم نیٹ ورک تبدیل کر لو ر خور دا۔ ہاتھ مارے سنگٹنز کام کی باتوں پر ہمیشہ ہی ایسا بھونڈا رسپانس کرتے ہیں۔“

زارا نے کچن کی جانب جاتی ہوئی آنٹی رافعہ کی چڑی ہوئی آواز سنی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ماں بیٹے کے درمیان سینڈویچ بننے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس کا۔ وہ مسکرائی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔



”یہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہوا۔“ بل گرانت نے اس کی پیشانی پر ایک اور بینڈج لگائی تھی۔ سلمان نے بدقت اپنے درد پر قابو پایا۔ نور محمد نے دار اس پر عقب سے کیا تھا، لیکن وہ فرش پر اس رخ سے گرا تھا کہ اس کا چہرہ اور پیشانی فرش سے ٹکرائی تھی۔ اس کمزور نظر آنے والے نور محمد میں نہ جانے اتنی طاقت کیسے آگئی تھی کہ اس کی لگائی گئی ایک ضرب نے ہی اس کے ہاتھوں کے طوطے چڑیاں سب اڑا دیے تھے۔ وہ ہوش و حواس سے بے گانہ ہو گیا تھا اور یہ ہی حال بل گرانت

عرف احمد معروف کا ہوا تھا، لیکن وہ ہوش میں پہلے آیا تھا اور اب سلمان کی مرہم مٹی بھی وہی کر رہا تھا۔ اضطراب بے چینی ان کے ہر عمل سے مترشح تھی۔

”سب کچھ ہی اگر ٹھیک ہونے لگے تو زندگی جلد ہو کر رہ جائے۔ اس لیے ابھی کبھی کچھ ٹھیک نہ ہونا ہی ٹھیک ہوتا ہے۔“ سلمان نے اسے تسلی دینی چاہی تھی۔ اسے بولنے میں تکلیف کا سامنا تھا جو اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا۔ بل گرانت نے آخری بینڈج لگا کر فرسٹ ایڈ باکس بند کر دیا تھا۔

”میں تمہارے لیے کافی لے کر آتا ہوں۔“ وہ کوئی بھی جواب دیے بنا باہر نکل گیا تھا۔ سلمان وہیں بیٹھنے کے بجائے اس کے ہمراہ ہی آگیا تھا۔ نور محمد کے گھر سے اس طرح چلے جانے کے عمل نے اسے بھی حیران کیا تھا۔ وہ بل گرانت کی الماری سے اس کا بیگ ہمراہ لے گیا تھا اور اس نے اس کے لیے الماری پر ایک اسٹیکر نوٹ بھی چسپاں کیا تھا جس پر صرف ایک جملہ تحریر تھا۔

”آپ اچھے انسان نہیں ہیں احمد معروف۔“ اس نوٹ کو دیکھ کر وہ مزید بے چین ہو گیا تھا۔

”آپ کیوں پریشان ہیں؟“ سلمان نے کچن شیلف کے سامنے اسٹول پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا تھا۔ ”آپ پریشان کیوں نہیں ہیں؟“ وہ آکتائے ہوئے انداز میں اس سے پوچھنے لگا۔

”آپ خود ہی تو کہتے ہیں، وہ بہت اچھا اور نیک انسان ہے تو پھر اس کے اس طرح چلے جانے پر پریشان ہونے کا کوئی جواز تو نہیں بنتا۔ وہ کچھ دیر میں واپس آجائے گا۔“ سلمان نے تسلی دینی چاہی۔

”پریشان ہونے کا جواز تو ہے۔ آپ سمجھ ہی نہیں رہے۔ وہ میرا بیگ بھی ہمراہ لے گیا ہے۔ نہ جانے کیا سوچ کر لے گیا ہے اور پھر اس طرح تشدد کرنے کی وجہ۔ میرا ذہن سمجھ نہیں پا رہا کچھ بھی۔ اور آپ کا اس کے ساتھ جو تعلق تھا، وہ میری نسبت زیادہ مضبوط ہونا چاہیے۔ وہ آپ کا کلاس میٹ تھا۔ آپ کا ہم وطن، ہم زبان، ہم مذہب تھا۔ رات کے اس پہر وہ گھر

سے ناراض ہو کر کہیں چلا گیا ہے۔ پریشانی تو جائز ہے، جبکہ آپ جانتے ہیں کہ وہ آپ کی باتوں سے خائف ہو کر گیا ہے۔ اس نے جتا کر کہا تھا۔

”وہ میری باتوں سے نہیں آپ کی باتوں سے خائف ہو کر گیا ہے۔ مجھے لگتا ہے اس نے ہماری باتیں سن لی ہیں۔ اسے آپ کے متعلق سب کچھ پتا چل گیا ہے۔ اس کے لیے یہ ہی دھچکا ناقابل برداشت ثابت ہوا ہو گا کہ آپ مسلمان نہیں ہیں۔ اسی لیے وہ جو بیگ لے گیا ہے اس میں یقیناً آپ کے ناول کا مسودہ ہو گا۔ یعنی اگر کوئی شخص اس ساری صورت حال کا ذمہ دار ہے تو وہ آپ ہیں۔“

مسلمان نے بھی اسی انداز میں جتا کر کہا تھا۔ بل گرانٹ کچھ نہیں بولا۔ وہ کیا سوچ رہا تھا اس کے چہرے سے پتا لگانا مشکل تھا۔ مسلمان چند لمحے اس کی جانب دیکھتا رہا۔

”میں اعتراف کر لیتا ہوں کہ آپ نے سر توڑ محنت کر کے میرے بارے میں جو بھی معلومات اکٹھی کی ہیں۔ وہ سو فیصد غلط نہیں ہیں، لیکن آپ نے نور محمد کو پہچاننے میں سخت غلطی ہے۔ وہ ایسا انسان نہیں ہے جیسا آپ سمجھ رہے ہیں۔“ بل گرانٹ نے دھیمے سے لہجے میں کہا تھا۔

”آپ نور محمد کے بارے میں اتنا کچھ کیسے جانتے ہیں اور آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جو آپ جانتے ہیں وہی سچ ہے۔ میرے پاس بھی جو معلومات ہیں وہ انتہائی مستند ذرائع سے حاصل کی گئی ہیں۔ یہ بات بھی ٹھیک ہے کہ میں نے بذات خود جس شخص سے بھی نور محمد کے متعلق پوچھا ہے اس کے منہ سے ایک بھی برا لفظ سننے کو نہیں ملا۔ میرے سب ہی ذاتی ذرائع بھی ان معلومات سے مماثل نہیں ہیں، لیکن بہر حال ایک برطانوی این جی او کے پاس اگر کسی کے متعلق کوئی مواد ہے تو وہ ایک دم سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔“

مسلمان کے لیے یہ سوال واقعی بہت اہم تھا۔ وہ ہر حال میں اس سوال کا جواب چاہتا تھا۔ اس نے تمام تر باتیں جو اس کے پاس ریکارڈ کی صورت موجود تھیں۔

وہ باتیں جو اس نے ایک بوڑھے پروفیسر آفاق علی کے منہ سے سنی تھیں۔ وہ باتیں جو روچڈیل میں رہنے والے ایک کاری کرنے بتائی تھیں اور وہ باتیں جو وہ خود اس کے متعلق جانتا تھا ایک ایک کر کے اس سے کہہ ڈالی تھیں۔ وہ خاموشی سے اس کے چپ ہو جانے کا انتظار کرتا رہا۔

”مسلمان حیدر! آپ ابھی اس سمندر میں ایک چھوٹی مچھلی کی طرح ہیں۔ مچھلی بھی وہ جو گہرے پانی میں رہ نہیں سکتی۔ میں نے اس سمندر میں زندگی گزارنی ہے۔ میں کنارے پر کھڑے ہو کر بھی گہرائی ملنے جتنا قابل ہو چکا ہوں۔ میں آپ کو یہ سارا نیٹ ورک کھول کر بتا سکتا ہوں، سمجھا سکتا ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں خود ایسے کام کرتا رہا ہوں۔ جھوٹ میں سچ کیسے ملایا جاتا ہے اور سچ کو کیسے جھوٹ ثابت کرتے ہیں یہ مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ میرا نام بل گرانٹ ہے۔ میں نے اپنی زندگی کے پہلے چار ویسٹ سٹیلرز ناول ایسے لکھے ہیں جیسے بچہ کلاس روم میں املا لکھتا ہے۔“ وہ ایسے بات کر رہا تھا جیسے خود کلامی کر رہا ہو۔

”میں آج آپ کے سامنے اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں فنڈز کے نام پر ایک خطیر رقم لے کر ناول لکھتا رہا ہوں۔ میں نے ہمیشہ اپنے قلم کا غلط استعمال کیا ہے۔ میں نے اپنے زیادہ تر ناول ایسے موضوعات پر لکھے جو کچھ مخصوص لوگوں یا قوموں کے فائدے کے لیے تھے۔ میں نے کبھی انسانیت کے متعلق نہیں سوچا، میں شہرت کے نشے میں اس قدر گم رہا کہ مجھے کبھی یہ سوچنے کا خیال ہی نہیں آیا کہ میں کوئی غلط کام کر رہا ہوں، حالانکہ مجھے زندگی میں ایسے بہت سے لوگ ملتے رہے جو مجھے سمجھاتے رہے کہ غلط اور صحیح میں فرق کر کے زندگی گزارنا ہی اصل زندگی ہے۔“

وہ خاموش ہو گیا تھا۔ پشیمانی اس کے ہر انداز سے جھلکنے لگی تھی۔ مسلمان حیدر کو انہی ہر چوٹ کا درد اس کی آنکھوں میں چھپے کرب کے آگے ہیچ محسوس ہوا۔

”بہر حال یہ میری زندگی کے متعلق بات کرنے کا وقت نہیں ہے۔ میں آپ کو اس گورکھ دھندے کو

سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں، جس کا شکار نور محمد ہوا ہے۔ اسے استعمال کیا گیا ہے۔ آپ کو میری باتیں عجیب نہیں لگنی چاہئیں۔ آپ ایک صحافی ہیں۔ آپ اس بات کو سب سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ کہ انہی من پسند خبریں لگوانے کے لیے یارائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے سیاسی قوتیں یا دوسرے عناصر بانی کی طرح پیسہ بہاتے ہیں۔ دنیا بھر میں کسی ایک متنازعہ موضوع پر اتفاق رائے پیدا کرنے کی خاطر یہ انجانی قوتیں ہمیشہ قہقہہ رہتی ہیں۔ نور محمد ان ہی قوتوں کا شکار ہوا ہے۔ نور محمد کے متعلق مجھے سب سے پہلے صوفی سیف اللہ نے بتایا تھا۔ وہ نور محمد کو بہت پسند کرتے ہیں۔ یہ بات بھی انہوں نے مجھے کہی تھی کہ یہ بچہ یعنی نور محمد دین میں اس قدر گم ہے کہ اس کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ دنیا بھی کوئی چیز ہے۔ اس کے متعلق ہر بات مجھے ان سے پتا چلی تھی۔ وہ اسے کافی اچھے طریقے سے جانتے تھے۔ وہی چاہتے تھے کہ میں نور محمد کو سکھاؤں کہ دنیا سے لا تعلقی ممکن نہیں ہے۔ وہ ہی چاہتے تھے کہ نور محمد ایک بار اپنی ماں سے ضرور ملے۔ وہ کہتے تھے کہ مائیں بلکتی ہیں تو اللہ ناراض ہوتا ہے۔ ان ہی کے کہنے پر میں نور محمد سے ملنے یہاں آیا تھا، لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ مسٹر ٹیرن سے بھی مجھے نور محمد کے متعلق کافی باتیں پتا چلی تھیں۔ انہوں نے نور محمد کو ”دہشت گرد“ قرار دے دیا تھا اور وہ مجھ سے دہشت گردی کے موضوع پر ہی ناول لکھوانا چاہ رہے تھے۔ اس ناول میں مجھے ایسا مواد دیا جا رہا تھا جس میں اسلامی روایات کی تذلیل کے علاوہ مقدس شخصیات کے متعلق تضحیک آمیز چیزیں بھی شامل تھیں۔ میں وضاحت کرتا چلوں کہ اس سب کے پیچھے ان ہی قوتوں کا ہاتھ ہے جو ”اسلام فوبیا“ کو مغرب کا سب سے بڑا ناسور قرار دیتے ہیں۔ اس میں حکومتی اہلکار بھی شامل ہیں۔ سوشل ایکٹویسٹ بھی ان کا ساتھ دیتے ہیں اور وہ لوگ بھی ان ہی کے حامی ہیں جو جدی پشتی راشٹ ہیں اور برطانوی امیگریشن پالیسی کے خلاف ہیں، جو نہیں چاہتے کہ برطانوی امیگریشن بھورے

لوگوں کو دی جائے۔ یہ لوگ ”اسلام فوبیا“ کو بہت ہوا دیتے ہیں اور شریعت کو اپنے حقوق کی خلاف ورزی سمجھتے ہیں۔ وہ دین اسلام کو پس ماندہ خیال کرتے ہیں اور مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔ مسٹر ٹیرن ان ہی کے نمائندہ تھے۔ ان کی زبانی مجھے نور محمد کے متعلق بھی پتا چلا تھا۔ ان ہی کی باتوں نے مجھے بھی متحس کر دیا تھا کہ میں دیکھوں تو سہی یہ شخص آخر کون ہے۔ مسٹر ٹیرن کہتے تھے نور محمد ایک جادوگر ہے۔ جو اس سے ملتا ہے۔ اس کا ہو جاتا ہے۔ جب میں پہلی بار اس سے ملا تو حیران رہ گیا۔ جادوگر ایسے ہوتے ہیں کیا۔ میں نے سوچا تھا۔ میں بہت مایوس ہوا تھا، سلمان حیدر! اور مجھے یقین ہے کہ آپ بھی ہوئے ہوں گے۔ لیکن میرا یقین کیجئے، یہ شخص ایک ہیرا ہے جو تراشا نہیں گیا اور یہ بات مجھے اس کے ساتھ رہنے سے سمجھ میں آئی۔ یہ واقعی جادوگر ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس بات کا اسے خود بھی نہیں پتا۔ اس لیے میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ آپ کسی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ نور محمد استعمال کیا جا رہا ہے۔“

وہ چپ ہو گیا تھا۔ سلمان نے اپنے سامنے بیٹھے اس پچاس پچپن برس کے سفید فام کو دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں جھوٹ کہتی نہیں لگتی تھیں۔
(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

تمہاری اپنی لکھی ہو



فرحت اشتیاق

قیمت - 300 روپے

پیرہ سٹاک کی دوا

امتیاز احمد اور سفینہ کے تین بچے ہیں۔ معین، زار اور ایزب۔ صالحہ، امتیاز احمد کی بچپن کی منگیت تھی مگر اس سے شادی نہ ہو سکی تھی۔ صالحہ دراصل ایک شوخ، الہڑی لڑکی تھی۔ وہ زندگی کو بھرپور انداز میں گزارنے کی خواہش مند تھی مگر اس کے خاندان کا روایتی ماحول امتیاز احمد سے اس کی بے تکلفی کی اجازت نہیں دیتا۔ امتیاز احمد بھی شرافت اور اقدار کی پاس داری کرتے ہیں مگر صالحہ ان کی مصلحت پسندی، نرم طبیعت اور احتیاط کو ان کی بزدلی سمجھتی تھی۔ نتیجتاً "صالحہ نے امتیاز احمد سے محبت کے باوجود بدگمان ہو کر اپنی سہیلی شازیہ کے دور کے کرن مراد صدیقی کی طرف مائل ہو کر امتیاز احمد سے شادی سے انکار کر دیا۔ امتیاز احمد نے اس کے انکار پر دلبرداشتہ ہو کر سفینہ سے نکاح کر کے صالحہ کا راستہ صاف کر دیا تھا مگر سفینہ کو لگتا تھا جیسے ابھی بھی صالحہ، امتیاز احمد کے دل میں بہتی ہے۔

شادی کے کچھ ہی عرصے بعد مراد صدیقی اپنی اصلیت دکھا دیتا ہے۔ وہ جواری ہوتا ہے اور صالحہ کو غلط کاموں پر مجبور کرتا ہے۔ صالحہ اپنی بیٹی ابیہا کی وجہ سے مجبور ہو جاتی ہے مگر ایک روز جوئے کے اڈے پر ہنگامے کی وجہ سے مراد کو پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے۔ صالحہ شکر ادا کرتے ہوئے ایک فیکٹری میں جاب کر لیتی ہے۔ اس کی سہیلی زیادہ تنخواہ پر دوسری فیکٹری میں چلی جاتی ہے جو اتفاق سے امتیاز احمد کی ہوتی ہے۔ اس کی سہیلی صالحہ کو امتیاز احمد کا وزٹنگ کارڈ لا کر دیتی ہے۔ جسے وہ اپنے پاس محفوظ کر لیتی ہے۔ ابیہا میٹرک میں ہوتی ہے۔ جب مراد رہا ہو کر آ جاتا ہے اور پرانے دھندے شروع کر دیتا ہے۔ دس لاکھ کے بدلے جب وہ ابیہا کا سودا کرنے لگتا ہے تو صالحہ مجبور ہو کر امتیاز احمد کو فون کرتی ہے۔ وہ فوراً "آجاتے ہیں اور ابیہا سے نکاح کر کے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ان کا بیٹا معین احمد باپ کے اس راز میں شریک ہوتا ہے۔ صالحہ مر جاتی ہے۔ امتیاز احمد، ابیہا کو کالج میں داخلہ دلا کر ہاسٹل میں اس کی رہائش کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ وہاں حنا سے اس کی





دستی ہے جو اس کی روم میٹ بھی ہوتی ہے مگر وہ ایک خراب لڑکی ہوتی ہے۔

معینز احمد اپنے باپ سے ابیہا کے رشتے پر ناخوش ہوتا ہے۔ زار اور سفیر احسن کے نکاح میں امتیاز احمد ابیہا کو بھی مدعو کرتے ہیں مگر معینز اسے بے عزت کر کے گیٹ سے ہی واپس بھیج دیتا ہے۔ زار کی مندر باب ابیہا کی کالج فیلو ہے۔ وہ تفریح کی خاطر لڑکوں سے دوستیاں کر کے ان سے پیسے ہنر کر ہلا گلا کرنے والا مزاج رکھتی ہے اور اپنی سہیلیوں کے مقابلے اپنی خوب صورتی کی وجہ سے زیادہ تر ٹارگیٹ جیت لیا کرتی ہے۔ باب معینز احمد میں بھی دلچسپی لینے لگتی ہے۔ ابیہا کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے مگر وہ اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ وہ معینز احمد کی گاڑی سے ٹکرانی تھی کیونکہ معینز اپنے دوست عون کو آگے کر دیتا ہے۔ ایکسیڈنٹ کے دوران ابیہا کا پرس کہیں گر جاتا ہے۔ وہ نہ تو ہاسٹل کے واجبات ادا کر پاتی ہے۔ نہ ایگزامز کی فیس۔ بہت مجبور ہو کر وہ امتیاز احمد کو فون کرتی ہے مگر وہ دل کا دورہ پڑنے پر اسپتال میں داخل ہوتے ہیں۔ ابیہا کو بحالت مجبوری ہاسٹل اور ایگزامز چھوڑ کر حنا کے گھر جانا پڑتا ہے۔ وہاں حنا کی اصلیت کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔ اس کی ماما جو کہ اصل میں ”میم“ ہوتی ہیں، زور زبردستی کر کے ابیہا کو بھی غلط راستے پر چلانے پر مجبور کرتی ہیں۔ ابیہا بہت سر پٹختی ہے مگر میم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ امتیاز احمد دوران بیماری معینز سے اصرار کرتے ہیں کہ ابیہا کو گھر لے آئے مگر سفینہ بھڑک اٹھتی ہیں۔ امتیاز احمد کا انتقال ہو جاتا ہے۔ مرنے سے قبل وہ ابیہا کے نام پچاس لاکھ گھر میں حصہ اور ماہانہ دس ہزار کر جاتے ہیں۔ اس بات پر سفینہ مزید سخت پڑا ہوتی ہیں۔ معینز ابیہا کے ہاسٹل جاتا ہے۔ کالج میں معلوم کرتا ہے مگر ابیہا کا کچھ پتا نہیں ملتا۔ وہ چونکہ باب کے کالج میں پڑھتی تھی۔ اس لیے معینز باتوں باتوں میں باب سے پوچھتا ہے مگر وہ لاعلمی کا اظہار کرتی ہے۔

عون معینز احمد کا دوست ہے۔ ثانیہ اس کی منکوحہ ہے۔ مگر پہلی مرتبہ بہت عام سے گھر چلو جلسے میں دیکھ کر وہ ناپسندیدگی کا اظہار کر دیتا ہے۔ جبکہ ثانیہ ایک پڑھی لکھی ذہین اور با اعتماد لڑکی ہوتی ہے۔ وہ عون کے اس طرح انکار کرنے پر شدید ناراض ہوتی ہے۔ پھر عون پر ثانیہ کی قابلیت کھلتی ہے تو وہ اس سے محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے مگر اب ثانیہ اس سے شادی سے انکار کر دیتی ہے۔ دونوں کے درمیان خوب تکرار چل رہی ہے۔

میم ابیہا کو سیفی کے حوالے کر دیتی ہیں جو ایک عیاش آدمی ہوتا ہے۔ ابیہا اس کے دفتر میں جاب کرنے پر مجبور کر دی جاتی ہے۔ سیفی اسے ایک پارٹی میں زبردستی لے کر جاتا ہے جہاں معینز اور عون بھی آئے ہوتے ہیں مگر وہ ابیہا کے یکسر مختلف انداز جلسے پر اسے پہچان نہیں پاتے تاہم اس کی گھبراہٹ کو محسوس ضرور کر لیتے ہیں۔ ابیہا پارٹی میں

ایک ادھیڑ عمر آدمی کو بلا وجہ بے تکلف ہونے پر تھپڑ مار دیتی ہے۔ جواباً ”سیفی بھی اسی وقت ابیہا کو ایک زوردار تھپڑ جڑ دیتا ہے۔ عون اور معینز کو اس لڑکی کی تذلیل پر بہت افسوس ہوتا ہے۔ گھر آکر سیفی میم کی اجازت کے بعد ابیہا کو خوب تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ اسپتال پہنچ جاتی ہے۔ جہاں عون اسے دیکھ کر پہچان لیتا ہے کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کا معینز کی گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ عون کی زبانی یہ بات جان کر معینز سخت حیران اور بے چین ہوتا ہے۔ وہ پہلی فرصت میں سیفی سے میٹنگ کرتا ہے۔ مگر اس پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ ثانیہ کی مدد سے وہ ابیہا کو آفس میں موبائل بھجوواتا ہے۔ ابیہا بمشکل موقع ملتے ہی ہاتھ روم میں بند ہو کر اس سے رابطہ کرتی ہے مگر اسی وقت دروازے پر کسی کی دستک ہوتی ہے۔ حنا کے آبلے سے اسے اپنی بات ادھوری چھوٹی پڑتی ہے۔ پھر بہت مشکل سے ابیہا کا رابطہ ثانیہ اور معینز احمد سے ہو جاتا ہے۔ وہ انہیں بتاتی ہے کہ اس کے پاس وقت کم ہے۔ میم اس کا سودا کرنے والی ہیں لہذا اسے جلد از جلد یہاں سے نکال لیا جائے۔ معینز احمد ثانیہ اور عون کے ساتھ مل کر اسے وہاں سے نکالنے کی پلاننگ کرتا ہے اور یہیں اسے اپنا رانا راز کھولنا پڑتا ہے۔

وہ بتا دیتا ہے کہ ابیہا اس کے نکاح میں ہے مگر وہ پہلے اس نکاح پر راضی تھا نہ اب پھر ثانیہ کے آئیڈیا پر عمل کرتے ہوئے وہ اور عون میڈم رعنا کے گھر جاتے ہیں۔ میڈم ابیہا کا سودا معینز احمد سے طے کر دیتی ہے مگر معینز کی ابیہا سے ملاقات نہیں ہو پاتی کیونکہ وہ ڈرائیور کے ساتھ بیوی پار لگنی ہوتی ہے۔ وہاں موقع ملنے پر ابیہا ثانیہ کو فون کر دیتی ہے۔ ثانیہ بیوی پار لگتی جاتی ہے۔ دوسری طرف تاخیر ہونے پر میڈم حنا کو بیوی پار لگتی دیتی ہے مگر ثانیہ ابیہا کو وہاں سے

نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ثانیہ کے گھر سے معیز اسے اپنے گھر انیکسی میں لے جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر سفینہ بیگم
 بری طرح بھڑک اٹھتی ہیں مگر معیز سمیت زارا اور ایزدا نہیں سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ معیز احمد اپنے باپ کی
 وصیت کے مطابق ابیہا کو گھر لے تو آتا ہے مگر اس کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے۔ وہ تنہائی سے گھبرا کر ثانیہ کو فون کرتی
 ہے۔ وہ اس سے ملنے چلی آتی ہے اور حیران رہ جاتی ہے۔ گھر میں کھانے پینے کو کچھ نہیں ہوتا۔ وہ عون کو فون کر کے شرمندہ
 کرتی ہے۔ عون نام نہاد ہو کر کچھ اشیائے خورد و نوش لے آتا ہے۔ معیز احمد بزنس کے بعد اپنا زیادہ تر وقت رباب کے ساتھ
 گزارنے لگتا ہے۔

سفینہ بیگم اب تک یہ ہی سمجھ رہی ہیں کہ ابیہا مرحوم امتیاز احمد کے نکاح میں تھی مگر جب انہیں پتا چلتا ہے کہ وہ معیز
 کی منکوحہ ہے تو ان کے غمے اور نفرت میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ اسے اچھے پیچھے بری طرح تاراج کرتی ہیں اور اسے
 بے عزت کرنے کے لیے اسے نذراں کے ساتھ گھر کے کام کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ابیہا ناچار گھر کے کام کرنے لگتی
 ہے۔ معیز کو برا لگتا ہے مگر وہ اس کی حمایت میں کچھ نہیں بولتا۔ یہ بات ابیہا کو مزید تکلیف میں مبتلا کرتی ہے۔ وہ اس پر
 تشدد بھی کرتی ہیں۔

رانے شکوے شکایتیں دور کرنے کی خاطر عون کے ابا عون اور ثانیہ کو اسلام آباد نازیہ کی شادی میں شرکت کرنے کے
 لیے بھیجتے ہیں۔ جہاں ارم ان دونوں کے درمیان آنے کی کوششیں کرتی ہے اور ثانیہ اپنی بے وقوفی کے باعث عون سے
 شکوے اور ناراضیاں رکھ کر ارم کو موقع دیتی ہے۔ عون صورت حال کو سنبھالنے کی بہت کوشش کرتا ہے مگر ثانیہ اس کے
 ساتھ بھی زیادتی کر جاتی ہے۔ ارم کی بسن سلیم ایک اچھی لڑکی ہے، وہ ثانیہ کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ اگر عون نے
 پہلے شادی سے انکار کر کے اس کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچائی تھی تو اب اپنی عزت نفس اور انا کو چھوڑ کر آپ کو منانے کے
 لیے جتن بھی کر رہا ہے۔ عزت کریں عون کی اور دوسروں کو اپنے درمیان آنے کا موقع نہ دیں۔ ثانیہ کچھ کچھ مان لیتی
 ہے۔ تاہم مندی میں گئی ثانیہ کی بدتمیزی پر عون دل میں اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔

رباب، سفینہ بیگم کے گھر آتی ہے تو ابیہا کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ پھر سفینہ بیگم کی زبانی ساری تفصیل سن کر اس کی
 ہنسیکرتی ہے۔ ابیہا بہت برداشت کرتی ہے مگر دوسرے دن کام کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ سفینہ بیگم کو شدید غصہ
 آتا ہے۔ وہ انیکسی جا کر اس سے لڑتی ہیں۔ اسے تھپڑ مارتی ہیں جس سے وہ گر جاتی ہے۔ اس کا سر بھٹ جاتا ہے اور جب
 وہ اسے حرام خون کی گالی دیتی ہیں تو ابیہا بھٹ پڑتی ہے۔ معیز آکر سفینہ کو لے جاتا ہے اور واپس آکر اس کی بینڈج کرنا
 ہے۔ ابیہا کہتی ہے کہ وہ پڑھنا چاہتی ہے۔ معیز کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ سفینہ بیگم ایک بار پھر معیز سے ابیہا کو طلاق
 دینے کا پوچھتی ہیں تو وہ صاف انکار کر دیتا ہے۔

سترہویں قسط

اسے دیکھتے ہی معیز گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ابیہا کے دل کی دھڑکنیں تو پہلے ہی
 اتھل پھل تھیں مگر جب اس کے قریب پہنچنے پر معیز نے آگے جھک کر فرنٹ سیٹ کا دروازہ ان لاک کیا تو وہ
 ٹھوکر کھاتے کھاتے بچی۔

ست روی سے دروازہ کھول کے وہ فرنٹ سیٹ پہ سٹے ہوئے انداز میں بیٹھ گئی۔ چونکہ اریٹ کھول چکا تھا۔
 معیز نے گاڑی اشارت کر کے آگے بڑھائی تو وہ بے حد پرسکون سی کیفیت میں تھا، لیکن گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے
 اس نے بے اختیار سائیڈ ویو مرر پر نگاہ ڈالی۔ لاؤنج کا داخلی دروازہ بند تھا۔ سفینہ بیگم صدمہ شکر باہر نہیں آئی تھیں۔
 ”راستہ تو معلوم ہے نا کیڈی گا۔؟“

مین روڈ پہ آ کے معیز نے اس سے پوچھا تو۔ دم سادھے بیٹھی ابیہا بری طرح چونک گئی مگر بڑا کر بولی۔

”جی۔ ہاں جی۔ شاید۔“
 معیز نے بے اختیارانہ نگاہ اس پر ڈالی۔ گاڑی کے دروازے کے بالکل ساتھ جڑ کے بیٹھی وہ گھبراہٹ کا شکار تھی۔

”ہاں یا شاید۔؟“
 ”میرا مطلب ہے میں ثانیہ کے ساتھ ایک بار آئی تھی ٹیچر سے ملنے۔“ وہ قدرے سنبھل کر بولی۔
 ”اچھا۔ تو پھر ایڈریس بتا دو۔“
 وہ نارمل سے انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔ ایسہا کا دل غ چکرایا۔
 ”ایڈریس۔۔ تو۔ نہیں پتا۔“ وہ انکی ”معیز نے بے اختیار گاڑی کی رفتار آہستہ کی تھی۔“
 ”کیا مطلب؟ ایڈریس نہیں پتا ہے؟“ وہ از حد حیران ہوا۔
 ”مجھے تو ثانیہ لے کے جانے والی تھیں۔“ اس نے جلدی سے وضاحت پیش کی۔ پھر یاد آنے پہ بولی۔
 ”روڈ مجھے یاد ہے۔ وہاں سے ہم نے گول گے کھائے تھے۔“ معیز بے ساختہ ہلکے سے ہنس دیا۔
 ایسہا ندوس سی بیگ کا اسٹریپ مسل رہی تھی۔
 ”اب اگر مجھے بھی ساتھ لے گئی ہو تو میں گول گے کھلانے تو مجھے ضرور یاد رہتا۔“ وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا۔

”آئم سوری۔“ اس کا لہجہ بھیگا ہوا سا تھا۔
 کیا سوچ رہا ہو گا وہ۔ ساتھ آنے کا اتنا ”شوق“ تھا کہ بنا ایڈریس کے ساتھ چل پڑی۔ اس سوچ کے ساتھ اسے رونا آنے لگا۔
 سگنل پہ گاڑی رکی تو وہ موبائل پہ کسی کو میسج کرنے لگا اور جب تک سگنل گرین ہوا جوابی میسج آچکا تھا۔
 گاڑی دوبارہ سے چلی تب تک ایسہا شرمندہ ہو ہو کر بے حال ہو چکی تھی۔
 ”آپ مجھے واپس چھوڑ دیں۔ میں ثانیہ کے ساتھ ہی آجاؤں گی۔“
 اس نے ہلکے سے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا تو معیز نے تیکھی نظر اس پر ڈالی۔
 ”تمہارے خیال میں سوائے تمہاری ”ثانیہ جی“ کے کسی اور کو راستوں کا پتا ہی نہیں۔“ قدرے خفگی سے کہا۔ ایسہا نے ہڑبڑا کر اسے دیکھا۔ معیز نے گاڑی روک دی تھی۔ وہ خوف زدہ سی ہوئی۔
 کیا اسے غصہ آگیا تھا؟
 اس کی شکل پہ پھیلا ہر اس دیکھ کر معیز کو خود پر تاسف ہوا۔ زندگی میں اس سے بڑا کوئی افسوس نہیں ہونا چاہیے کہ آپ کی وجہ سے کسی کی زندگی مشکل ترین جائے۔

اپنی زندگی تو ہر کوئی آسان بنا لیتا ہے، دوسروں کی زندگیوں کو آسان بنانا کمال ہوتا ہے۔
 ”یہ دیکھو گول گے والا۔ اور وہ تمہاری اکیڈمی۔“ وہ بے حد نرمی سے گول گے کی ریڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اب اسے اکیڈمی کا بورڈ دکھا رہا تھا۔

ایسہا کی جان میں جان آئی۔
 ”تھینک یو۔“ وہ کھل سی گئی۔ پھر گاڑی سے اترتے ہوئے حیران سی پل بھر کو پلٹی۔
 ”آپ کو کیسے پتا چلا۔؟“
 ”ثانیہ سے پوچھا ہے۔“ وہ مسکرایا تو ایسہا کو یورے ماحول میں سنہرا بن سا گھلتا محسوس ہوا۔

معین اس کے ساتھ گیٹ تک آیا۔ وہ اس سے واپسی کا وقت پوچھ رہا تھا۔
ایسا ہانے وقت بتاتے ہوئے ایک ہلکی سی نگاہ اس مہربان سے چہرے پر ڈالی۔
نرم سے تاثرات اور بھرپور توجہ۔

ایسا ہانے پہلی بار ان بھوری آنکھوں کو دھوپ میں کانچ کی طرح چمکتے دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ اسی پل اسے
بھوری آنکھوں سے عشق ہوا تھا۔
”ہیلو۔“ وہ اس کی آنکھوں کے آگے چٹکی بجا رہا تھا۔ ایسا گڑبڑا کر جو اس میں لوٹی اور اس قدر شرمندہ ہوئی کہ
بہ سرعت پلٹ کر گیٹ پار کر گئی۔
اور معین اس کی نگاہ کے بے خود سے ارتکاز کو محسوس کر کے اپنی جگہ جم سا گیا۔



ٹانیہ نے بنا نمبر دیکھے کال اٹینڈ کی تو خیال یہی تھا کہ دوسری طرف ایسا ہی ہوگی۔ آج اس کی اکیڈمی کا پہلا دن
تھا۔

”ہیلو۔“ بے ترتیب سانس پر قابو پاتے ہوئے بولی۔
”میں نے تم سے کہا تھا کہ اپنی مرضی کا فیصلہ کرنا۔ پھر شادی کی تاریخ کیسے طے ہونے دی تم نے؟“
عون کے انداز میں اس قدر سرد مہری اور کڑواہٹ تھی کہ ٹانیہ بے دم سی بستر پر گر گئی۔
”میرے کندھے پہ بندوق رکھ کے چلانا چاہتی ہو تم۔ تو یہ تمہارا خیال ہی رہ جائے گا ٹانیہ بی بی۔“
وہ بے رخی سے بولا تو ٹانیہ جھلبلا اٹھی اس قدر لا تعلقی اور بے اعتنائی۔
”ٹانیہ بی بی۔! وہ جو ہمیشہ اس کے نام کے آگے اپنا نام لگایا کرتا تھا۔ وہ عون عباس کیا ہوا؟
”یہ بڑوں کا فیصلہ ہے ان سے بات کرو۔“ ٹانیہ کی انا انگریزی لے کر بیدار ہوئی تو اس نے بھی بے رخی ہی کو
اپنایا۔

”وہی تو میں بھی پوچھ رہا ہوں۔ تمہارا فیصلہ کہاں گیا؟“
”ایک بات یاد رکھو ٹانیہ۔ میری زندگی میں کوئی ”ٹارگٹ“ لے کر مت آنا۔ بدلے کی خواہش ہے تو صاف
لفظوں میں شادی سے انکار کر کے بدلہ اتار لو۔“
اس قدر تلخی۔ اس قدر غیریت۔

ٹانیہ کو لگا ہی نہیں کہ وہ عون عباس سے بات کر رہی ہے۔ جو اس کے کڑوے لہجے کے گھونٹ بھی امرت سمجھ
کر پیا کرتا تھا۔ نرمی بذلہ منجھی اور شرارت جس کے مزاج کا حصہ تھی۔
ٹانیہ اسے روکنا چاہتی تھی۔ اسے بتانا چاہتی تھی کہ اس کے خیالات ہی نہیں بلکہ جذبات میں بھی تبدیلی

آچکی ہے، مگر عون کے انداز کی تندہی نے اس کی زبان گنگ کر دی۔ محبت کا اظہار تو وہاں کیا جاتا ہے جہاں بے
تکلفی ہو، مان ہو۔ اور جہاں ڈیرا ہی غیریت اور بے اعتنائی کا ہو، وہاں اظہار محبت کیسے؟
ٹانیہ نے سوچ رکھا تھا کہ اب وہ کبھی بھی عون سے بد تمیزی نہیں کرے گی۔ اور جب عون اس کے انداز کا
دھیما پن اور نرمی دیکھے گا تو خود بخود اس کی ذہنی وجہ ذاتی تبدیلی کا احساس کر لے گا۔
مگر یہاں تو کیا ہی پلٹ گئی تھی۔ تازی آبی کی شادی کے دوران شاید وہ حد ہی کر گئی تھی۔ تب ہی تو عون جیسے میٹھے
لب و لہجے والے بندے نے بھی شعلے اگلنا شروع کر دیے تھے۔

اس کی آنکھوں میں ضبط کی سرخی اتر آئی۔ ورنہ تو زور زور سے رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ گہری سانس لے کر اندر کی کثافت کو کم کرنے کے ساتھ ثانیہ نے اپنی ہمت کو بھی مجتمع کیا اور شرے ہوئے انداز میں بولی۔
 ”میں انکار نہیں کروں گی عون عباس۔! کیوں کہ میں اپنے گھر والوں کا دل نہیں دکھا سکتی۔ یہ کام پہلے بھی تم نے کیا تھا اور اب بھی اگر تم ایسا چاہتے ہو تو تم ہی کو کرنا پڑے گا۔“ اور بس۔

اس نے لائن کاٹ دی تھی۔ ساتھ اس کے کب سے رکے آنسو بہہ نکلے اور وہ تکیے میں منہ گھسیڑے روئے چلی گئی اور دوسری طرف عون تلملا کر ہیلو، ہیلو کرتا رہ گیا۔ ثانیہ کے لفظوں نے جلتی پہ تیل کا سا کام کیا تھا۔ وہ خود سب کی نظروں میں اچھی بن گئی تھی۔ اب اگر عون انکار کرتا تو اباجی جوتے مار کے گھر سے نکال باہر کرتے، مگر اس زندگی کا کیا۔؟

عون کے اندر بے چینی حد سے سوا ہو گئی۔ پھولوں، تیلیوں، ہواؤں، بادلوں اور گھٹاؤں سے محبت کرنے والا بندہ اپنی زندگی کو بھی رومانوی انداز میں گزارنے کی سوچ رکھتا تھا۔ ایسے میں ثانیہ اس کی زندگی میں ”خود کش حملہ آور“ کی طرح داخل ہو رہی تھی یا شاید ”سٹار گٹ کٹر“ بن کے اور عون عباس جانے تو جھتے زندگی ختم کرنے کے حق میں نہیں تھا۔

ماں تھپہ بل لیے وہ کتنی ہی دیر سوچتا رہا تھا۔



وہ سیفی کے ساتھ کسی عام ہوٹل میں ہوٹلنگ نہیں کرتی تھی۔ معیذ کے ساتھ تو وہ شہر کے کسی بھی اچھے ریسٹورانٹ میں چلی جاتی تھی، مگر سیفی کے ساتھ وہ ہمیشہ وہاں ہوٹلنگ کرتی جہاں ہائی جینٹری کے لوگ ہوتے اور جہاں ”معیذ احمد“ کے پائے جانے کا امکان کم سے کم ہوتا، ابھی تک وہ اپنی زندگی کی ترجیحات متعین نہیں کر پائی تھی۔ دل تو معیذ احمد کے مغرورانہ انداز پر بہت بری طرح آیا تھا، مگر سیفی کے ٹھاٹ باٹھ نے بھی اس کے دل کو لپچا رکھا تھا اور کچھ کالج کے زمانے کی ایسی پکی عادت ہو چکی تھی کہ اپنے حسن کا ”صدقہ“ وصول کرنا کچھ ایسا برا بھی نہ لگتا تھا۔

ابھی بھی وہ سیفی کے ساتھ لپچ کر کے شاپنگ مال آئی تھی اس نے جس چیز پر نظر ڈالی سیفی کے اشارے پر اس کے لیے پیک کر دی گئی۔

”اب بس۔۔۔ میں تھک گئی ہوں۔“

رباب نے اٹھلا کر بڑے ناز سے کہا تو وہ پے منٹ کے بعد کارڈ اپنے والٹ میں رکھتا شکفتگی سے بولا۔

”لڑکیاں تو شاپنگ سے نہیں تھکتیں سوٹ ہارٹ۔۔۔“

”جو کبھی کبھار کرتی ہیں وہ نہیں تھکتی ہوں گی۔“ وہ ناک چڑھا کر یوں بولی جیسے ارب پتی کی بیٹی ہو۔ سیفی اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے شاپنگ مال سے نکلا تھا۔ اس کی مہنگی ترین گاڑی میں بیٹھتے ہوئے رباب نے گردن یوں راج

ہنس کی طرح اٹھا رکھی تھی، جیسے باقی سب اس سے حقیر ہوں۔

”آج تمہیں اپنی آپا سے بھی ملوانا ہے میں نے۔“ سیفی نے اس کا ہاتھ تھام کر ہونٹوں سے لگاتے ہوئے معنی خیزی سے کہا تو رباب نے ٹھنک کر اسے دیکھا۔

”او نہوں۔ اتنے رف حلیے میں۔“

سیفی نے ایک گہری نگاہ اس کے جدید تراش میں لپٹے وجود پر ڈالی۔ برہنہ سپید بانہوں کی خوب صورتی ہی

نگاہوں کو خیرہ کیے دے رہی تھی تو پھر۔
 ”قیامت لگ رہی ہو جان من۔ کہو تو ابھی حسن کو خراج تحسین پیش کروں۔“
 وہ جذبات سے چور لہجے میں کہتا اس کی طرف جھکا تو رباب اس قدر اچانک پیش قدمی پر پیچھے نہیں ہٹ پائی۔ وہ اس کے رخسار کو چھو چکا تھا۔
 اس کا چہرہ تہمتا اٹھا رباب نے اس کے سینے پہ ہاتھ رکھ کے پیچھے دھکیلا تھا۔
 ”سیفی پلیز۔ جگہ کا تو خیال کرو۔“
 وہ خفگی سے کہتے ہوئے پیچھے ہو کر بیٹھی۔ تو وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ اس کی قربت نے دل و ذہن پر رومان پرور سا احساس طاری کر دیا تھا۔

”ہر جگہ ہی ”سنسری پلیز“ کا اشتہار سنی رہتی ہو سوئی۔“
 ”آج میں بہت تھک گئی ہوں۔“ وہ بالوں میں ہاتھ چلاتی بڑے نخرے دکھا رہی تھی۔
 ”تم چلو تو۔ تمہاری تھکاوٹ دور کرنے کا سامان بھی کر دیں گے۔“
 سیفی نے ذومعنی انداز میں کہا تو رباب نے اسے ہلکا سا گھور کے دیکھا۔
 ”چلو نا سوٹ ہارٹ۔ میں نے آپا سے پراس کیا تھا آج انہیں تم سے ملوانے کا۔“
 سیفی اپنے ارادے میں اٹل دکھائی دے رہا تھا اور پچھلی سیٹ پہ دھرے وزنی شاپنگ بیگزمیں اتنی کشش تو تھی کہ رباب کی عقل مختل کر دیتے۔ سو وہ بھی گہری سانس بھرتے شانے اچکا کر رہ گئی۔
 سیفی کے ہونٹوں پر راطمینان مسکراہٹ پھیل گئی۔
 شکار جال میں پھنسنے کو تھا۔ سیفی نے بہت تحمل سے اس دن کا انتظار کیا تھا اور اب ”پھل“ کھانے کے دن آگئے تھے۔



معیذ نے اسے اکیڈمی چھوڑا تو واپسی کا وقت بھی پوچھ لیا تھا مگر آفس پہنچنے اور یکے بعد دیگرے دو میٹنگز اٹینڈ کرنے کے بعد اس کے ذہن سے بالکل ہی محو ہو گیا کہ اس نے ایسہا کو پک کرنے جانا ہے۔
 ”سر پروڈکشن ڈیپارٹمنٹ کا وزٹ کر لیں۔ مال بالکل ریڈی ہے جانے کے لیے۔“ اس کے پی اے نے یاد دلایا تھا۔

”آہا۔۔۔ یہ رہ گیا تھا۔“ وہ کراہ کے رہ گیا۔ ابھی ہونے والی میٹنگ میں وہ بزنس ڈیلی گیشن کے ساتھ اچھا خاصا سرکھپا کے آیا تھا۔

مگر ہر حال یہ کام انتہائی ضروری تھا۔ سو وہ فوراً ہی پروڈکشن منیجر کے ساتھ چل دیا۔
 ادھر فارغ ہونے کے بعد ایسہا نے وقت دیکھا تو ابھی معیذ کو بے وقت میں بیس منٹ باقی تھے۔ وہ اطمینان سے اکیڈمی میجر کے دیے نوٹس پر نظر ڈالنے لگی۔ اس کے بعد اسٹوڈنٹس نے یکے بعد دیگرے جانا شروع کر دیا تو وہ جیسے حواس میں آئی۔ وقت دیکھا تو دس منٹ اوپر ہو رہے تھے۔ وہ جلدی سے نوٹس سمیٹ کر فائل میں لگاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے خیال میں معیذ باہر آچکا تھا۔ بیگ شانے پہ ڈال کر فائل اٹھاتی اور بھجلیت باہر نکلی۔ گیٹ سے باہر آ کے اس نے ادھر ادھر نظر ڈال کے معیذ کی گاڑی تلاش کرنے کی مقدور بھر کوشش کی مگر وہ ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ وہ دوپٹے کو قدرے نقاب کے انداز میں چہرے پر سیٹ کر کے گیٹ کی سائیڈ پر کھڑی ہو گئی۔
 مگر اگلے دس منٹ گزرنے کے بعد اس کے دل میں بے چینی پیدا ہونے لگی۔ موبائل بھی چار جنگ پہ لگا چھوڑ

آئی تھی۔

اس سے اگلا وقت خوف زدہ کرنے والا تھا۔ کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں دکھنے لگیں۔
(تو کیا وہ اسے پک کرنا بھول گیا تھا۔ یا پھر اس کا یہی پلان تھا۔ ایسا کو دنیا میں گم کر دینے کا؟)
اس نے دھندلاتی نظروں سے سڑک پہ دوڑتے پھرتے ٹریفک کو دیکھا اور گھر کا ایڈریس یاد کرنے کی کوشش کی۔
اس دنیا میں انسان کو اتنا بھی سادہ نہیں ہونا چاہیے، ایک بار خیال آیا کہ دوبارہ کوچنگ سینٹر کے اندر چلی جائے،
مگر پھر خیال آیا کہ ٹیچر نے اگر گھر کا پتا پوچھ لیا یا فون نمبر تو کیا بتائے گی۔ دل مسوس کے وہیں کھڑی معیذ کے آنے
کی دعا میں کرنے لگی۔
مگر آنسوؤں کا نمکین پھندا اس کے حلق میں پھنس گیا تھا۔ اسی وقت کوئی شخص اس کے پاس آ کے کھڑا ہوا۔



عون کو ثانیہ پر جتنا بھی غصہ آتا کم تھا۔ وہ سوچ کر تلملاتا اور تلملاتا کر سوچتا۔
وہ لڑکی جو بپانگ دہل اسے کسی اور لڑکی کے ساتھ۔ انوالومنٹ کے طعنے دیتی رہی ہو اور بھری محفل میں بے
عزت کر کے رکھ دیتی ہو۔ اس کی یہ ”بے ایمانی“ ہضم نہیں ہو رہی تھی۔
دل سے تو وہ بالکل بھی عون کی زندگی میں آنے کو تیار نہیں تھی۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ پھر فیصلے کے
وقت ثانیہ کا کوئی قدم نہ اٹھاتا۔ محض بیوی کی رضا کو نبھانا عون کو جلتے تو بے پر ہٹھا رہا تھا۔
وہ ایک محبت کرنے والی شریک سفر کو زندگی میں لانا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے ثانیہ سے وقت مانگا تھا، لیکن
اس گزرتے وقت میں جتنی عون کی محبت میں شدت آئی اتنی ہی ثانیہ کی بدگمانی بھی بڑھی۔
اور اب تو عون بھی یہی چاہتا تھا کہ ثانیہ اپنی نفرت کو لے کر اس کی زندگی میں نہ آئے۔ وہ ایک ناکام زندگی جینے
کے حق میں نہیں تھا۔ وہ اپنی سی کوشش کر چکا تھا، ثانیہ کو اپنے حق میں کرنے کی۔
اور ثانیہ۔۔۔ وہ اپنا فیصلہ یقیناً ”نازیہ کی مہندی والے دن سنا چکی تھی۔“
اسے جب جب ثانیہ کا وہ انداز یاد آتا اس کے اندر طیش سا بھرنے لگتا۔
فرماں برداری کا ”ایوارڈ“ لینے کی خاطر کیے گئے ثانیہ کے فیصلے کو عون نے قطعیت سے رد کر دیا تھا۔ اسی لیے
دل کی آواز کو دباتے ہوئے اس نے صاف لفظوں میں ثانیہ کو اچھی خاصی شادی تھیں۔
مگر آگے سے ثانیہ کے ہٹ دھرم اور خود کو ”نیک بی بی“ بنائے رکھنے والے انداز نے اسے خاصا پتا کے رکھ
دیا تھا۔ جانے کس کے برے دن آنے والے تھے؟



”سر ایچ ٹائم ہو چکا ہے۔“
وہ واپس ہوئے تو اس کے پی اے نے تیسری بار مودیاناہ اسے یاد دلایا اور اس کا وہی پہلے والا جواب۔
”بھوک نہیں ہے ابھی یا۔۔۔“

اور اپنے آفس میں کرسی پر گرتے ہوئے یونہی اس کے ذہن میں آیا کہ اسے بھوک کیوں نہیں ہے آج۔
صبح کیا کھایا تھا؟
وہی روٹین کا ناشتا۔ وہ سیٹ سے سر نکالے ریلیکس موڈ میں تھا۔
دفعتا ”اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔“

”ڈبل ناشتا۔“ وہ فی الفور سیدھا ہوا۔
 وہ صبح گھر سے ناشتا کرنے کے بعد پراٹھے اور آلیٹ کا بھی ناشتا کر کے آیا تھا۔ ایسہا کے ہاتھ کا ناشتا۔
 ”یا اللہ!“ وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ کلائی الٹ کر وقت دیکھا۔ وہ ایسہا کے بتائے ہوئے وقت سے پون گھنٹہ لیٹ تھا۔
 وہ موبائل اٹھا تا بجلت دروازے تک گیا پھر تیزی سے پلٹا اور ٹیبل پر سے گاڑی کی چابیاں جھپٹ کر اٹھا لیں،
 تیزی سے لفٹ کی جانب پر بھتا وہ اپنے موبائل پر مسسڈ کالز چیک کر رہا تھا۔
 ایسہا کی کوئی کال نہ تھی۔ اس نے ایسہا کا نمبر ملا کر موبائل کان سے لگایا اور لفٹ میں داخل ہو کر گراؤنڈ فلور کا
 بٹن دبا دیا۔ لب بچھے وہ پریشانی کی زد میں تھا۔



کوئی شخص اس کے پاس آ کے کھڑا ہوا تو ایسہا کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ ہاتھ سے تھام دوڑے کا نقاب
 ذرا سا سر کا تو اس نے جھپٹ کر پھر سے دوپٹے کو ٹھیک کیا، مگر حسن کی اتنی سی جھلک ہی مقابل کو مسحور کرنے کے
 لیے کافی تھی۔

”کیا بات ہے۔ کافی دیر سے آپ یہاں کھڑی ہیں محترمہ۔ رکشہ، ٹیکسی چاہیے آپ کو۔ میں لا دوں؟“
 وہ کھوجتی نظروں سے اسے دیکھتا بظاہر بڑی شائستگی سے پوچھ رہا تھا، مگر ان وجود چھیدی لال آنکھوں میں سے
 جھلکتے ہوئے مسفاک تاثر نے ایسہا پر کپکپی سی طاری کر دی۔

”نہیں۔ نہیں۔“ وہ خشک ہوئے حلق کے ساتھ بولی تو منہ سے عجیب سی آواز نکلی۔
 سامنے والے خزانٹ شخص کی گہری نظر نے فوراً ہی اندازہ کر لیا کہ وہ کتنے پانیوں میں ہے۔
 ”میرے شوہر آرہے ہیں۔“

ایسہا نے ذرا ہمت پکڑتے ہوئے بے رخی سے کہا اور دو قدم اس سے دور ہوتے ہوئے سڑک کے دائیں
 طرف سے آتی ٹریفک کو دیکھنے لگی۔

”ارے میری بلیبل۔ جس کے لیے تم یہاں کھڑی ہو۔ وہ اب نہیں آنے کا۔ چلو میرے ساتھ۔“
 وہ پچکارنے والے انداز میں بولا اور پھر جیسے اس کی ہمت بندھانے کو ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ ہلکی سی چیخ کے ساتھ
 خوف زدہ سی پیچھے ہٹی اس کی فائل ہاتھوں سے پھسل کے گری تو نوٹس ادھر ادھر بکھر گئے۔
 ”ارے تم تو ڈر رہی ہو۔“ اس کے ہونٹوں پر مکروہ سی مسکراہٹ تھی۔ ایسہا کے یوں کمزوری دکھانے پر وہ
 مزید شیر ہو گیا تھا۔

خوف اور بے بسی کا شکار ایسہا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس پاپ زندگی رواں دواں تھی، مگر کسی کو بھی
 اس خاموش حادثے کی خبر نہ تھی۔ اور ایسہا کے اندر اتنی بھی ہمت نہ تھی کہ وہ چیخ و پکار کر کے کسی کو متوجہ ہی
 کر سکتی۔

وہ آگے بڑھا تو ایسہا تیزی سے پیچھے ہٹی دیوار کے ساتھ جا لگی اسی وقت کسی نے اس شخص کو شرٹ کے کالر
 سے پکڑ کر پوری قوت سے پیچھے گھسیٹ لیا تھا۔

وہ بوکھلا کر پلٹا تو ساتھ ہی ناک پر پڑنے والے مکے نے درحقیقت اسے دن میں تارے دکھادیے۔

”کھہر تیری تو۔۔۔ سالے۔“
 معیز کا دماغ گھوم گیا تھا۔ سڑک پار کر کے آنے تک وہ سارا معاملہ سمجھ چکا تھا۔ ڈری سہمی ایسہا اور اسے

تک کرنا گندے حلیے والا شخص۔

معین کا ارادہ تو اس کی اچھی طرح ٹھکانی کرنے کا تھا، مگر وہ ایک مکا کھا کر ہی یوں بگٹ بھاگا کہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ بمشکل ضبط سے کام لیتا پلٹا تو خوف کی حدوں کو چھوٹی ایسا ہاروتے ہوئے اس کے ساتھ آگئی۔

لحمہ بھر کو وہ ساکت سا رہ گیا۔ پھر نرمی سے اس کے سر کو تھپکا۔

”اٹس او کے ایسا۔ خود کو سنبھالو۔ دفع ہو گیا ہے وہ۔“ مگر اس کے خوف زدہ وجود کی لرزش نے معین پر واضح کر دیا کہ وہ کس حد تک ہشت زدہ تھی۔

سیفی اور میڈم کے شکنجے میں مقید رہنے والی ایسا کے ذہن میں پرانا خوف جاگ اٹھا تھا۔

”بی بریو ایسا۔ چلو۔ گاڑی میں بیٹھو۔ روڈ پہ کھڑے ہیں ہم۔“

اس کے سر کو نرمی سے سہلاتے ہوئے معین نے اسے احساس دلایا تو وہ بے اختیار پیچھے ہٹ گئی۔

معین نے اس کے نوٹس سمیٹ کر فائل میں لگائے۔ اسے معاشرے کی بے بسی پر بھی افسوس ہوا۔ ارد گرد کے لوگوں کو غیر معمولی واقعات بھی شک میں مبتلا نہیں کرتے تھے۔ اسی لیے تو ہماری قوم حوادث کا شکار ہوتی رہتی ہے۔

وہ اسے لیے سڑک پار کرنے لگا تو ایسا نے اس کے بازو کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ رکھا تھا۔ اس کی کیفیت محسوس کر کے معین کو ندامت ہو رہی تھی۔

اپنی یادداشت کو وہ بار بار کوس چکا تھا۔ سو گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے ایسا سے معذرت کر لی۔

”آئم سوری۔ میری وجہ سے تمہیں پر اہلم ہوئی۔“

وہ سر جھکائے سوں سوں کرتی رہی۔

”مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ تمہیں کو چنگ سے پک کرنا ہے، مگر میٹنگز میں ایسا الجھا کہ۔“ اس نے تب بھیچنے پھر سر جھکائے بیٹھی ایسا کو دیکھا۔

”میں تمہارے نمبر پہ کال کرتا رہا ہوں۔ تم نے میری کال بھی اٹینڈ نہیں کی۔“

ایسا کا دل دھک سے رہ گیا۔ آہستہ سے سر اٹھا کے دیکھا تو وہ اسی کو دیکھ رہا تھا۔

”وہ۔ موبائل نہیں تھا میرے پاس۔ چار چنگ پہ لگایا ہوا تھا تو گھر پہ رہ گیا۔“

مجرمانہ انداز میں کہا تو وہ گہری سانس بھرنا گاڑی اشارت کرنے لگا۔

”موبائل فون کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہے کہ آپ اسے کہیں بھی ساتھ لے جاسکتے ہیں۔ کوئی پر اہلم ہو تو کسی سے بھی رابطہ کر سکتے ہیں۔“

وہ محل سے موبائل کے فوائد پر روشنی ڈال رہا تھا۔ ایسا کو شرمندگی ہونے لگی۔ واقعی اگر اس کے پاس

موبائل ہوتا تو وہ چھٹی ہوتے ہی معین کو کال کر سکتی تھی۔

”آئم سوری۔ غلطی میری ہی ہے۔“ وہ رندھے لہجے میں بولی۔

”ارے۔“ معین اس کی بات پر بے ساختہ حیران ہوا اور پھر ہلکے سے ہنس دیا۔

ایسا نے بے اختیار اسے دیکھا اور پھر پلکوں کی باڑ گرا لی۔ وہ ساتھ ہوتا تو ایک معصوم سا فخر گھیرنے لگتا کہ وہ

”اس کا“ تھا، مگر یہ خیال آتے ہی دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں۔

”میں آئندہ کبھی موبائل گھر نہیں چھوڑوں گی اور چھٹی کے بعد بھی کو چنگ سینٹر کے اندر ہی رہوں گی۔“

ایسا نے سارا الزام ہی اپنے سر لے لیا تھا، معین کی لڑکیوں کی ایک نئی قسم سے واقفیت ہو رہی تھی۔ سو اس کا

حیران ہونا بنتا تھا۔

”اس طرح کے فضول لوگوں سے ڈرنے کے بجائے ان سے سختی سے پیش آنا چاہیے تاکہ ان کی ہمت نہ بڑھے۔“ وہ اسے سمجھانے لگا۔

”میں نے اس سے کہا تھا۔ میرے شوہر مجھے لینے آرہے ہیں۔“ وہ بے اختیار ہی بول اٹھی، مگر پھر ساتھ ہی گھبرا کر معیز کو دیکھا۔ وہ ونڈا سکرین کے پار دیکھ رہا تھا۔ پتا نہیں اس نے سنا نہیں یا سن کے ان سنی کر گیا تھا۔ ایسہا کو تسلی ہوئی۔

”یہ رعب ڈالنے کی کون سی قسم ہے؟“ معیز نے اس قدر اچانک پوچھا کہ ایسہا گڑبڑا کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ سنجیدہ تھا۔

”سوری۔ آپ کو برا لگا ہے تو مگر میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

معیز نے گاڑی روکی۔ گھر آگیا تھا۔ وہ کچھ کہے بنا گاڑی کا ہارن بجانے لگا۔

”اما اگر کچھ کہیں تو خاموشی سے سن لیتا۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔ تم بس اپنی اسٹڈیز پہ دھیان دو۔“ اندر آنے تک وہ اسے سمجھا چکا تھا۔

مگر خیریت ہی رہی۔ سفینہ بیگم پورچ یا لان میں دکھائی نہ دی تھیں۔ ایسہا اپنی چیزیں سنبھالتی نیچے اتری۔

اسی وقت لاؤنج کا داٹھلی دروازہ کھلا اور کوئی باہر نکلا۔ معیز پلٹا اور گہری سانس بھر کے رہ گیا۔

”ہیلو بڈی۔“ وہ بہت خوش دلی سے کتا معیز کی طرف بڑھا اور گرم جوشی سے اس سے لپٹ گیا۔

وہ عمر تھا۔ معیز کا ماموں زاد۔

”تم کب آئے۔ اور یوں اچانک؟“ معیز حیران تھا۔ ایسہا تیزی سے انکیسی کی طرف بڑھ گئی۔

”میری چھوڑو۔ یہ کون تھی؟“ عمر کی نگاہ میں ستائش تھی۔ معیز نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

”کم آن عمر۔ تم تبھی اپنی فطرت نہیں بدل سکتے۔“

”خوب صورتی ہوئی ہی تعریف کے قابل ہے میرے دوست۔“ وہ زبردستی اس کے شانے پہ بازو پھیلانے

عالمانہ و فلسفیانہ انداز میں کتا اندر کی طرف بڑھا تھا۔

معیز اس سے ماموں اور فیملی کے متعلق پوچھنے لگا۔



ثانیہ کا واپس آنے کو جی تو نہیں چاہ رہا تھا، مگر کسی بھی طرح مجبوراً ”جواب کے یہ دو ماہ گزارنے ہی تھے۔ سو اس نے بھی آکر آفس جوائن کر لیا، مگر اس بار اس کے اندر کی خوش مزاج ثانیہ کہیں کھوسی گئی تھی۔ ایک اکٹاہٹ آمیز بے زاری کیفیت مستقل اسے گھیرے ہوئے تھی۔ آج اتوار کی چھٹی تھی تو وہ ایسہا کی طرف آگئی۔

”دو دنوں کا کہہ کے اتنے دن لگا کے آرہی ہیں۔“ ایسہا نے شکوہ کیا، مگر ثانیہ تو حیرت سے لہج کا مینو دیکھ رہی تھی۔

ایسہا نے بریانی کے ساتھ مٹن قورمہ اور چکن و بیجی ٹیبل مکس کباب بنائے تھے۔ ساتھ میں پودینے دی کی چٹنی اور خوش رنگ سلاو۔

بڑے دنوں کے بعد اس کی بھوک چمک اٹھی۔

”تم تو بڑی سکھڑاڑ کی ہو بھئی۔ شوہر کے معدے سے ہو کے دل میں جاو گی۔“

کھانے کے دوران اس کے ہاتھ کے ذائقے کی معترف ہوتے ہوئے ثانیہ نے اسے چھیڑا تو ایسہا کے چہرے پر ہلکی سی لالی بکھر گئی۔
 ”انہوں نے بھی شوق سے کھایا تھا۔“ وہ چیخ سے چاولوں کو پلیٹ میں ادھر ادھر کرتے ہوئے شرمیلے انداز میں بولی تو بے یقینی سے ثانیہ چیخ ہی تو اٹھی۔
 ”کیا۔۔۔ کس نے۔۔۔ معیذ کی بات کر رہی ہو؟“ ایسہا اس کے یوں چلانے پر ڈر سی گئی۔ جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔

”کب کیسے۔ پوری اسٹوری بتاؤ۔“
 وہ بے چین ہو گئی جواباً ”ایسہا نے جھجکتے شرماتے سارا واقعہ کہہ سنایا۔

ثانیہ دم بخود تھی۔
 ”میں نے تو سوچا کوچنگ کے لیے تمہیں وین یا رکشہ لگوا دیا ہو گا۔“
 ایسہا مسکرا دی۔

”آہا۔۔۔“ ثانیہ کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔
 ”میں بھی کہوں اتنی بدلی اور انوکھی سی کیوں لگ رہی ہے میری بیاشنزدی۔“

اس کے ذوق معنی انداز پر ایسہا جھنبھی۔
 ”ایسا ویسا کچھ نہیں۔ بس ان کا انداز کھوڑا بدل گیا ہے۔“
 ”تھوڑا۔۔۔؟“ ثانیہ نے لمبا کھینچتے ہوئے پوچھا تو وہ کھنکھار سی ہنسی ہنس دی۔
 ”شکرا اللہ۔ انہیں اپنے غلط رویے کا احساس ہو گیا۔ میں تمہارے لیے واقعی بہت خوش ہوں ایسہا۔“
 ثانیہ نے محبت بھرے خلوص سے کہا۔ ایسہا کے ہر انداز سے جھلکتی خوشی اور طمانیت کا راز اب اس پر منکشف ہو گیا تھا۔

”آپ بتائیں۔ رخصت ہو کے کب جا رہی ہیں عون بھائی کے گھر۔۔۔؟“
 ایسہا نے مسکراتے ہوئے پوچھا اور برتن اکٹھے کرنے لگی۔

ثانیہ کی مسکراہٹ پھکی پڑنے لگی۔

”ہوں۔۔۔ جلد ہی۔ دو ماہ بعد کی ڈیٹ فکس ہوئی ہے۔“

”ارے واہ۔“ ایسہا برتن وہیں پہنچھوڑا اس کے پاس آ بیٹھی۔

”کتنا مزہ آئے گا ثانیہ۔! میں نے زندگی بھر کبھی کوئی شادی اٹینڈ نہیں کی۔“

وہ چمکتی آنکھوں کے ساتھ خوشی بھرے لہجے میں بولی تو ثانیہ کو احساس ہوا کہ ”دوسروں“ کی شادی میں ہر کوئی خوش ہوتا ہے۔ ثانیہ نے اس کا ہاتھ تھپکا۔

”یو آر ویری لکی ثانیہ۔ اتنے اچھے انسان کی زندگی میں شامل ہونے جا رہی ہیں۔“

وہ جذب سے بولی۔ ثانیہ بمشکل مسکراہٹ برقرار رکھے ہوئے تھے۔

”جب میرا نکاح ہوا تب میں بہت ڈپرہسڈ تھی۔ کوئی احساس ہی نہیں ابھرا دل میں ماسوائے خوف کے۔“

آئندہ زندگی کا خوف۔ معیذ کے متوقع رویے کا خوف۔

ایسہا نے اداسی سے کہتے آخر میں جھرجھری سی لی۔

”مگر اب میں اس وقت کو یاد کرنا نہیں چاہتی۔ اللہ پاک نے اگر مجھ پر آزمائش ڈالی تھی تو اب مجھے خوشی بھی عطا

کردی ہے اور نعمتوں کی ناشکری نہیں کیا کرتے۔“

وہ کھل کے مسکرا رہی تھی۔

اور ثانیہ کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ شادی کی تاریخ طے ہونے کے بعد اس کے دل میں بھی تو عون کے متوقع رویے کا خوف ہی۔ اس نے سوچا اور اس سی ہو گئی۔

اسے بھی تو ایک اچھے انسان کی صورت اللہ تعالیٰ نے نعمت بخشی تھی۔ اور بدلے کی جنگ میں وہ کیسے اس کے پیٹھے جذبوں کو روندتی اور کڑواہٹ کا شکار کرتی رہی تھی۔

”میں آپ کی شادی کی بہت اچھی شاپنگ کروں گی اور عون بھائی کی سالی بھی میں ہی بنوں گی۔ ہے نا ثانیہ۔“
ابھہا پر جوش بھی اور وہ اسے خالی نظروں سے دیکھتی اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔



سیفی کی ”آیا“ سے ہونے والی ملاقات نے رباب کو بہت متاثر کیا تھا۔ ان کا ماڈرن انداز ان کا لباس قیمتی جیولری اور ان کا رکھ رکھاؤ اور واپسی پر انہوں نے زبردستی رباب کو ڈائمنڈ کے ٹاپس اور برسلسٹ گفٹ کیے تھے۔
”اس کی کیا ضرورت ہے آیا۔“ رباب نے ایک نظر خوب صورت تحفے پر ڈالی تو اس کی آنکھوں میں چمک سی اتر آئی۔ مگر یوں پہلی ہی ملاقات میں اتنا قیمتی تحفہ لینا۔۔۔ دل تو چاہ رہا تھا فوراً ”قبول کر لے، مگر اسے معیوب لگ رہا تھا۔“ یہ ہمارے گھر کی روایت ہے رباب۔ ہونے والی بہو گھر سے خالی ہاتھ جائے، ہمیں اچھا نہیں لگے گا۔“
وہ بڑے خوب صورت اور سیرس انداز سے بولیں تو رباب نے بے اختیار مسکرا کر ساری باتیں سنتے سیفی کی طرف دیکھا تو اس نے آنکھ دیا دی۔ وہ بوکھلا کر آپا کی طرف متوجہ ہو گئی۔
واپسی پر وہ سیفی سے الجھی۔

”یہ کیوں کہا تم نے آیا سے۔۔۔ بہو والا چکر۔ شادی وادی کا خیال تو ابھی میرے ذہن میں بھی نہیں ہے۔“
”کم آن جانی۔۔۔ جب موڈ بنے گا تب کر لینا۔ شادی کا کیا ہے۔“
وہ اسے بہلاتے ہوئے بولا۔

اور بعد میں اس کا پ پر اپنی فرینڈز کو سیفی کی آیا کا دیا ہوا تحفہ دکھاتے ہوئے وہ سیفی کے جذبات کا مذاق اڑاتی رہی اور اپنی ہوشیاری پر ان کی داد وصول کر کے رباب کا حوصلہ اور برہا۔
کاش کہ ایک بار بھی اس کے ذہن میں یہ بات آجانی کہ مفت میں اتنے مہنگے تحفے دینے والے وقت آنے پر ان کی بہت بھاری قیمت وصول کیا کرتے ہیں۔



”پھپھو بتا رہی تھیں تم نے انہیں بہت تنگ کیا ہوا ہے۔“
کھانے کے بعد چائے کے دوران بڑی بے تکلفی سے عمر نے سفینہ بیگم کے سامنے ہی موضوع چھیڑ لیا تو وہ شکایتی نظروں سے ماں کو دیکھنے لگا۔ اسے اچھی طرح سمجھ آ گئی تھی کہ عمر کو کیوں کر ”مورٹ“ کیا گیا تھا۔
”بچے اپنی ماؤں ہی کو تنگ کیا کرتے ہیں آلی تھنک۔“ معیز نے اپنا کپ اپنے آگے کھیٹا۔
”تنگ کرنے اور زندگی اجیرن کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے عمر! اس سے کہو۔“ سفینہ بیگم چیخ کر بولیں۔
”بہت خوب۔۔۔ تو اب یہ ہمارے درمیان ”آپرٹر“ کا رول ملے کرے گا۔“
”کم آن معیز۔۔۔ پھپھو نے بتائی ہے مجھے ساری بات ختم کر اس قصے کو یا۔۔۔“
عمر لا ابالی تھا۔ سو اس کے مشورے بھی ایسے ہی تھے چٹکی بجا کے یہ کرنے اور چٹکی بجا کے وہ کروینے والے۔

”وہ میرا مسئلہ ہے۔ تم بیچ میں مت پڑو۔ اس کام کے لیے تو نہیں آئے ہو گے تم؟“ معیز نے طنز کیا۔
 ”اوہ نو۔ میں تو لمبی چھٹیاں گزارنے آیا ہوں پاکستان۔“ وہ اطمینان سے بولا۔ مگر اس کی چمکتی آنکھیں اس کی بات کی نفی کر رہی تھیں۔

معیز کو کوفت کا احساس ہوا۔ عمر کالا ابلی پن اور شرارتیں کسی زمانے میں معیز کو بہت اچھی لگا کرتی تھیں، لیکن اب اگر وہ ماما کے کہنے پر ایسا والے معاملے میں بھی ٹانگ اڑانے کا ارادہ رکھتا تھا تو یہ اچھی بات نہ تھی۔ معیز کب خالی کرتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

”تو ٹھیک ہے، پھر کوشش کرنا کہ اچھی سی ”چھٹیاں“ ہی گزارو۔“ سنجیدگی سے کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا تو سفینہ تلملائیں۔

”دیکھا تم نے۔ اب تو میرا وہم نہیں کہو گے نا تم۔“ اور عمر کیا کہتا وہ تو معیز کو اس لڑکی کے ساتھ گاڑی سے اترتے دیکھ چکا تھا۔

”بھی تو میں یہیں ہوں پھپھو! اچھی طرح دیکھ لوں گا اس کو۔“
 اطمینان سے کہا تو وہ اس کے کہے پر اطمینان لے آئیں۔ اپنے بھتیجے کی صلاحیتوں پر انہیں بہت اعتماد تھا۔ باقی کی ساری رپورٹ اسے ایراز اور زارا سے مل گئی تھی۔

”مجھے تو اس بات کی سمجھ نہیں آرہی کہ جب اللہ نے معیز کے لیے ایک راہ متعین کر دی ہے تو وہ اس سے بھاگ کیوں رہا ہے؟“ یہ عمر کا تجزیہ تھا۔

”ان کی کمٹ منٹ ہے کسی اور سے۔“ زارا نے رباب کا نام لیے بغیر دبے لفظوں کہا تو عمر کے لبوں پر محظوظ کن مسکراہٹ پھیل گئی۔
 ”آئی سی۔“

”لیکن آپ یہ بات انہیں بتائے گا مت عمر بھائی۔“ زارا نے اس کی مسکراہٹ کا رنگ جانچتے ہوئے اسے ساتھ ہی متنبہ کر دیا تھا۔ عمر نے ہاتھ ہلا کر گویا کان سے مکھی اڑائی۔

”ماما تو ایسے ہی پریشان ہو رہی ہیں جبکہ بھائی کہہ چکے ہیں کہ وہ اس معاملے کو جلد ہی ختم کر دیں گے۔“
 ایراز کا رویہ حقیقت پسندانہ تھا۔ اسے معیز کی شادی برقرار رہنے سے کوئی ایشو نہ تھا۔

”ہاں۔ میں نے بھی ماما کو سمجھایا ہے۔ جس قسم کے حالات میں بھائی نے یہ قدم اٹھایا سب ہی جانتے ہیں اور پھر اگر انہوں نے اس شادی کو نبھانا ہوتا تو اسے سیدھا اس گھر میں لاتے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔“ زارا نے کہا۔

”ویسے اگر تم دونوں اس لڑکی کی بات کر رہے ہو جسے میں نے پوری طرح میں دیکھا تھا تو پھر معیز کی بدذوقی پر مجھے کوئی شبہ نہیں کہ وہ اسے چھوڑنا چاہتا ہے۔“ عمر نے گہری سانس بھری۔

”ہاں۔ خوب صورت تو بہت ہے وہ۔“ زارا نے بھی اعتراف کیا تھا۔
 ”چلو۔ دیکھتے ہیں پھر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر موضوع بدلتے ہوئے ایراز سے

کہا۔
 ”اور تم چلو میرے ساتھ ذرا۔ عصر کی نماز کے بعد قبرستان جانا ہے میں نے۔ سب عزیز واقارب کی قبروں پر

فاتحہ خوانی کرنی ہے۔“
 وہ جب بھی پاکستان آتا یہ اس کا معمول تھا۔ سو ایراز سر ہلا کر وضو کرنے اٹھ گیا۔



”آج ریسٹورنٹ مت آنا تم۔“

ابا نے ناشتے کی ٹیبل پر اخبار پڑھنے کے دوران یوں کہا جیسے اخبار ہی کی کوئی سرخی یا آواز بلند پڑھ کے سنائی ہو۔
”یہ کس نے کہا صدر پاکستان نے یا وزیراعظم نے؟“ عون یوں چونکا جیسے ان کی بات سمجھ میں ہی نہ آئی ہو۔
بھابھی کی ہنسی اور امی کی مسکراہٹ بے ساختہ تھی۔ ابا نے اخبار نیچے کر کے اسے گھور اتوڑا مڑوب ہوا۔
”میں ہی۔ معلومات میں اضافے کے لیے پوچھ رہا تھا۔“ اور دل جمعی کے ساتھ فریج ٹوسٹ کے ساتھ نبرد آزما ہو گیا۔

”اپنی ماں سے پوچھ لینا آج کارو گرام۔ ریسٹورنٹ سے چھٹی ہے تمہاری۔ مزید کوئی سوال مت کرنا۔“
انہوں نے گھما پھرا کر اپنے مخصوص انداز میں رعب سے کہا۔ تو عون نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر معصومیت سے بولا۔

”جی ابا جی۔ آپ نے کہہ دیا اور میں فوراً سمجھ گیا۔ لیکن جاننا صرف یہ تھا کہ یہ صرف آج کی چھٹی ہے یا
”پکی“ والی۔“

”اف۔“ بھابی نے چہرہ موڑ کر بمشکل ہنسی چھپائی۔

”یہ دیکھ رہی ہو اس نالائق کو۔ مجال ہے جو سیدھی بات سمجھ جائے۔“

ابا نے ہمیشہ کی طرح امی کو درمیان میں ڈالنا فرض خیال کیا۔ وہ ابا کی پسلیوں پر پہلے ہی جزبز ہو رہی تھیں بول
اٹھیں۔

”سمجھ تو گیا ہے۔ آپ ہی مشکل مشکل باتیں کرتے رہتے ہیں۔ بے چارے۔ سیدھے سے کہہ دیتے کہ

آج ریسٹورنٹ سے چھٹی کر کے ثانیہ کو ساتھ لے جانا شاپنگ کے لیے۔“

”لو جی۔“ عون صاحب کے تو کانوں کے کہیں آس پاس ہی دھماکا ہوا تھا۔

بھابھی نے شوخی سے اسے دیکھا۔ مگر ادھر کہیں ”گلاب“ کھلے ہوتے تو چہرہ چمکتا۔ سنبھلتے ہوئے بولا۔

”وہ کون سا بچی ہے جو خود سے اپنی شاپنگ نہیں کر سکتی۔“

”اب یہ بھی آپ سمجھائیں گی اسے یا پھر میں ہی زحمت کروں؟“ ابا نے طنزاً امی کو مخاطب کیا تو انہوں نے
عون کو گھور کے دیکھا۔

”بیٹا۔ یہ تم دونوں کی شادی کی شاپنگ ہے۔ میرا دل تھا کہ کپڑا اور زیور ثانیہ کی پسند کا ہی آئے۔“

”تو آپ لے جا کے دلوادیں نا۔ میں کون سا شاپنگ ایکسپٹ ہوں۔“

عون نے صاف جواب دیا تھا۔ بھابھی کھنکھاریں۔

”میں ساتھ جانے والی تھی عون، لیکن دونوں ہی بچوں کی طبیعت ذرا ٹھیک نہیں ہے۔ تم ثانی کو لے جا سکتے

ہو۔“

بھابھی نے جس انداز میں لفظوں پر زور دے کر کہا عون بخوبی سمجھا۔

مگر وہ کیا کرتا۔ مجبوری بن آئی تھی۔ وہ دل ہی نہیں رہا تھا۔ جو اس کے ساتھ کو ”خوش خبری“ سمجھ کر کھل اٹھتا۔

پہلے یہ موقع ملا ہوتا تو وہ سر کے بل چل کے ثانی کے ساتھ جاتا۔ مگر اب تو فی الحال دل کے تار بالکل خاموش تھے۔

جسی تبھی ردھم کو چھیڑنے میں ناکام۔

”میں یہ سر کھپائی نہیں کر سکتا بھابھی! آپ کسی اور دن کارو گرام رکھ لیں۔ بچے بھی تب تک ٹھیک ہو جائیں
سر۔“

عون کے صفا چٹہ جواب پر ابا امی اور بھابھی نے جس طرح بے یقینی سے گھور کے اسے دیکھا وہ گڑبڑا سا گیا۔

”میرا مطلب ہے کہ لیڈر کی شاپنگ میں میرا کیا کام؟“ معصوم شکل بنا کر جواز پیش کیا۔
ابالحو بھرا سے گھور کر گویا اس کے ”پوشیدہ عزائم“ کا اندازہ کرتے رہے پھر اخباریہ کر کے رکھتے ہوئے اطمینان سے بولے۔

”شاپنگ وہ کرے گی اپنی پسند کی۔ تم صرف ڈرائیور کے طور پر اس کے ساتھ جاؤ گے۔“
”کوئی۔“ ابالحو عزت کا بھرتا بنانے کے ماہر تھے۔ بھابھی قہقہہ لگا کے نہیں۔
”آپ بڑا اچھا پیسٹ استعمال کرنے لگی ہیں۔ دانت چمکانے کا کوئی موقع جانے نہیں دیتیں۔“
ابا کے اٹھتے ہی ضبط کر کے بیٹھا عون بھابھی سے الجھنے لگا تو وہ اور نہیں۔
”عزت راس نہیں آئی تمہیں۔ اچھا بھلا موقع مل رہا ہے شادی سے پہلے ملاقات کا اور تم ہو کے دے بہانے پہ بہانہ۔“

”کوئی ناراضی تو نہیں کر رکھی ثانی سے۔“ امی کو یوں ہی خیال سا گزرا۔
”کوئی نہیں۔ ناراضی ہوئی تو آپ کی بہورانی کے تیور ہی ظاہر کر دیتے۔ اس نے تو ادب سے سر جھکا کے رخصتی کی ہائی بھری ہے۔“

بھابھی نے مسکرا کر ثانیہ کی تعریف کی تو عون کا دل سلگا۔ کیسے وہ سب کی نظروں میں معتبر بن بیٹھی تھی۔ اب اگر عون اعتراض کرتا تو ساری بات عون پر ہی آنے والی تھی۔ ثانیہ نے تو فرماں برداری سے سر جھکا دیا تھا۔ وہ دانت پیس کے رہ گیا۔

”اچھا۔ لے جاؤں گا شہزادی صاحبہ کو شاپنگ پر۔ بلکہ ابا کہیں تو شہزادی صاحبہ کے وزٹ کے لیے شاپنگ مال بھی خالی کروالوں گا۔ سکیورٹی کے پیش نظر۔“

”ہاں۔ تمہاری اتنی اوقات۔ جتنا کہا ہے اتنا ہی کرو۔ اور ڈرائیونگ دھیان سے کرنا۔“
ابا ریسنورنٹ کے لیے نکل رہے تھے۔ طنزاً ”ہنکارہ بھرتے ہوئے بولے تو وہ تلملا اٹھا۔
مگر اب کی بار ابا کے جانے کا پکا یقین کر لینے کے بعد اگلا جملہ بولا۔
”ایک آیا اور دوسری ابا کی بھانجی۔ فوٹو کاپی ہیں ایک دوسرے کی۔“
”وضاحت کرو۔ وضاحت۔“

بھابھی نے شور مچایا۔ امی کو تو سمجھ ہی نہیں آئی تھی۔ وہ بھابھی کو منہ چڑاتا اٹھ گیا۔
ابھی جا کے ثانی سے دو دو ہاتھ کرنے تھے اسے خیال آیا اچھا خاصا موقع مل رہا تھا۔ ثانیہ سے بات کرنے بلکہ اس کا دماغ درست کرنے کا۔

معیز اور ایسہا کی ٹائمنگ میں فرق کی وجہ سے معیز نے ڈرائیور کو کہہ دیا کہ وہ ایسہا کو اکیڈمی پک اپ لینڈ ڈراپ کر دیا کرے۔ سفینہ بیگم تک یہ بات پہنچی اب انہوں نے جانے کیسے برواشت کر لیا یا شاید وہ سب اپنے بچے پر چھوڑ بیٹھی تھیں جو انہیں ”سب ٹھیک ہو جائے گا“ کا اشارہ دے رہا تھا۔ معیز نے آفس جا کے ایسہا کو کال کی۔
”ڈرائیور سے کہہ دیا ہے میں نے۔ ایڈریس بھی سمجھا دیا ہے۔ باقی تم دیکھ لینا۔“
”جی۔ شکریہ۔“ وہ تشکر بھی۔

اور اب وہ تیار ہو کر بھاگ بھاگ پورچ میں پہنچی۔ رات کے لیے سالن بناتے کافی دیر ہو گئی تھی۔
وہ چلتے چلتے موبائل بیگ میں رکھتی گاڑی تک پہنچی تو فائل گرتے گرتے پہنچی۔ ڈرائیور نے اسے دیکھ کر ہی گاڑی اشارت کی تھی شاید۔
وہ پچھلا دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گئی اور نوٹس کو سمیٹ کر ٹھیک سے پن اپ کر کے فائل میں سیٹ کیا۔

ڈرائیور گاڑی میں روڈ پر لے آیا اور اب وقت ”فوتی“ سے بیک مر میں سے دیکھ بھی رہا تھا۔
وہ فائل سیٹ پر رکھتی سیدھی ہو کر بیٹھی تو نظریا لکل غیر ارادی طور پر بیک مر میں جھانکتی ڈرائیور کی نظروں سے جا ٹکرائی۔

ایسہا نے سٹا کر نظریں کھڑکی سے باہر مرکوز کر دیں۔ اب تو ایسہا کو بھی اکیڈمی کا راستہ یاد ہو گیا تھا۔ سو اس روڈ پر آتے ہی اس نے ڈرائیور کو باقی کا پتا سمجھایا اور اشارے سے بورڈ بھی دکھادیا اکیڈمی کا۔
وہ نیچے اتری تو ڈرائیور بھی دروازہ کھول کے نیچے اتر۔

”واپسی کب ہوگی میڈم؟“ یہ لبو لہجہ۔ ڈینٹ اور شائستہ۔
ایسہا نے بے تحاشا چونک کر دیکھا تو خوش شکل اور خوش لباس سائبندہ اس نے بے یقینی سے پوچھا۔
”آپ ڈرائیور تھے؟“ (میرے کہنے سے باز ہی رہی) ڈرائیور نے ادب سے سر جھکایا۔
”جی میڈم! کتنے بجے پک کرنے آؤں آپ کو؟“

واپسی کا وقت بتا کر وہ اپنی حواس باختگی کو کوسی جلدی سے پلٹ کر گیٹ میں داخل ہو گئی۔
ڈرائیور کے ہونٹوں پر پراسراری مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ ادھر ادھر نگاہ ڈالتا گاڑی میں بیٹھ گیا۔



”اللہ کا واسطہ ہے ثانی۔ اچھی سی شاپنگ کرنا۔ شادی کے بعد میلاد ہی نہیں شادیاں بھی اٹینڈ کرنی ہوتی ہیں۔
کوئی شوخ سے رنگ لینا۔“

خالہ کی ہدایات کا سلسلہ ثانیہ کو ہدایات کم اور طنز زیادہ لگ رہا تھا۔

”میرے خیال میں شاپنگ پہ آپ ہی چلی جائیں۔“ ثانیہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا تو وہ تحمل سے بولی۔ مگر
ادھر بھی اسی کی خالہ تھیں اطمینان سے بولیں۔

”نازیہ کی شادی سے آگے جس طرح تم کپڑوں کے معاملے پہ اچھلی کودی تھیں اسی کے پیش نظر کہہ رہی ہوں
کہ گرمیوں کے لیے لان اور سرویوں کے لیے لینن کاٹن نہ اٹھالانا۔“

گاڑی کے ہارن پر وہ خالہ کو خفگی سے دیکھتی جلدی جلدی بالوں کو پونی میں قید کرنے لگی۔ خوب صورت بال
اب کمر تک آنے لگے تھے اس کے باوجود ثانیہ نے انہیں قینچی نہیں لگائی تھی۔ (مومن کو پسند تھے لمبے بال) ورنہ
اس سے پہلے تو وہ شانوں سے نیچے تک برہماتی اور بس۔ باقی کٹوا دیتی کہ سنبھالے نہیں جاتے۔
اب تو بال ہوں یا بات۔ سب سنبھالنا آ گیا تھا۔ گاڑی کا ہارن اب مسلسل بجنا شروع ہو گیا تھا۔

”نہ بھابھی میں صبر ہے نہ ان کے دیور میں۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے بھاگی۔

وہ گیٹ سے باہر گاڑی لیے کھڑا تھا۔ ثانیہ کو غصہ آیا اسے دیکھ کر بھی ہارن پر سے ہاتھ نہیں اٹھایا تو وہ فرنٹ
سیٹ پر بیٹھتے ہوئے طنز سے بولی۔

”ہارن نیا لگوا یا ہے یا تم پہلی بار بجا رہے ہو۔؟“

”بے فکر رہو۔ تمہارے لیے نہیں۔ کسی اور کے لیے بجا رہا تھا۔“

وہ گاڑی اشارت کرتے ہوئے اطمینان سے سامنے ٹیرس پر جنگلے سے لگتی خوب صورت دوشیزہ کو دیکھتے ہوئے
بولا تو ثانیہ کا دل جل کر رہ گیا۔

یہ تو طے تھا کہ آج کا دن بڑا ”یادگار“ گزرنے والا تھا دونوں ہی کا۔

”بھابھی نہیں آئیں۔ مجھے تو ان کے ساتھ جانا تھا شاپنگ کے لیے۔“ ثانیہ نے ماتھے پر توری رکھتے ہوئے

یوں کہا جیسے عون کے ساتھ جانا پتا نہیں کتنا ناگوار ہو۔ وہ بھی پتا۔ مگر اطمینان سے بولا۔
 ”وہی آ رہی تھیں ابانے زبردستی یہ ”بلا“ میرے سر منڈھ دی۔“
 ثانیہ کا سر گھوما۔ مگر قدرے توقف سے وہ بولا۔
 ”شاپنگ کو کہہ رہا ہوں۔“

اب جس کو بھی کہہ رہا ہو ثانیہ کے دل کو تو لگ ہی چکی تھی۔
 ”شادی کا شوق تو تھا نہیں تمہیں پھر یہ شاپنگ کا شوق کیوں؟“
 عون تو پتا نہیں کیا سوچ کر آیا تھا۔ مگر ثانیہ نے بھی گویا قسم ہی کھالی تھی کہ کم از کم وہ رخصتی سے انکار نہ کرے گی۔ عون کو کرنا ہو تو کرے۔

”یونہی۔ سوچا شادی نہ سہی کم از کم شاپنگ تو اپنی پسند کی ہونی چاہیے۔“
 ”اوہ ہو۔ تو یہ بھی ارمان تھا۔ پسند کی شادی کا۔“ عون نے بات اچلی۔ تو وہ برہستہ بولی۔
 ”ہاں۔ جیسے تمہیں تھا۔“ ان ڈائریکٹ ارم والا طعنہ۔ عون اندر ہی اندر تلملایا۔

”دیکھو ثانی۔ تم نا صرف میری بلکہ اپنی بھی زندگی برباد کرنے پر تلی ہوئی ہو۔ انکار کرویتیں تو ہم دونوں ہی خوش رہتے۔“

ضبط کرتے ہوئے سرد مہری سے کہا تو وہ خاموشی سے پورا بابا ہر دیکھتی رہی جیسے ”ثانی“ کوئی اور ہو۔ (تو وہ اس کے ”بغیر“ خوش رہنا چاہتا تھا)
 ثانیہ نے لب بچھینچے۔

خاموشی بسا اوقات بدگمانیوں کو برہا دیتی ہے۔ بات کرنے سے دل کی بھڑاس بھی نکلتی ہے اور دل میں پلتی بدگمانیاں بھی۔ سو جہاں ضرورت ہو وہاں بات ضرور کرنی چاہیے۔ تاکہ بھڑاس بھی نکلے اور بدگمانی بھی۔
 دونوں ایک ساتھ مگر دونوں کی سوچ الگ الگ محو سفر تھی۔ ثانیہ نے بہت برے دل کے ساتھ شاپنگ کی اور عون بھی ساتھ یونہی چلتا رہا جیسے شاپنگ ہیگنز پکڑنے آیا ہو اور بس۔
 آئندہ زندگی کا نقشہ ان دونوں کے سامنے واضح ہو کر آگیا تھا ثانیہ کے خود سر انداز نے عون کی بدگمانی کو مزید برہایا تھا۔



ڈرائیور گاڑی کو اکیڈمی سے آگے لیتا چلا گیا تو ایسہا جو اسٹاک سے گزرتے نظاروں کو کھڑکی سے دیکھ رہی تھی چیخ اٹھی۔
 ”روکو۔ روکو گاڑی کو۔“

ڈرائیور نے فوراً ”بریک پریاؤں رکھ دیا۔“
 ”کیا ہو امیڈم؟“ وہ مڑ کر اسے دیکھ رہا تھا۔
 ”اکیڈمی پیچھے رہ گئی ہے۔ گاڑی کہاں لیے جا رہی ہے؟“
 ایسہا نے اسے احساس دلایا تو وہ چونک کر ارد گردیوں کو دیکھنے لگا جیسے اسے پتا ہی نہ ہو۔ چار دونوں سے وہ اسے پک
 اینڈ ڈراپ کر رہا تھا۔ اور آج ایسی سنگین غلطی۔
 ”سوری میڈم۔ آج دراصل پریشانی کا شکار تھا۔ ذہن الجھا ہوا تھا اس لیے۔ سوری آگین۔“
 وہ شرمسار سامعانی مانگنے لگا۔ ایسہا کا دل موم ہونے لگا۔

”کوئی بات نہیں۔ گاڑی پیچھے موڑ لو۔“

وہ چپ چاپ گاڑی موڑنے لگا۔ پھر وہ نہیں سکا تو شکوہ کنناں انداز میں بولا۔

”میڈم! آپ نے ایک بار بھی میری پریشانی کے بارے میں نہیں پوچھا۔“

ایسہا کے لیے اس کی بات بلکہ شکوہ انتہائی غیر متوقع تھا۔ پھر بھی وہ خفت کا شکار ہوئی۔

”مجھے کسی کے پر مسئلہ کے متعلق پوچھنا اچھا نہیں لگتا۔“

”غریب آدمی کا تو کچھ بھی پرسنل نہیں ہوتا میڈم۔“ وہ آہ بھر کے بولا تو ایسہا نے اس کی پشت کو گھورا۔ مہنگی

کننگ بہترین برانڈ کے کپڑوں اور جوتوں میں ملبوس۔ وہ گاڑی کے علاوہ کہیں اور ایسہا کو نظر آتا تو وہ اسے ڈرائیور تو قطعی نہ سمجھتی۔

وہ بیک ویو مرر میں سے ایسہا کو اپنا جائزہ لیتے دیکھ چکا تھا۔ بول اٹھا۔

”میرے حلیے پر مت جائیں میڈم۔ معیذ صاحب کا ڈرائیور ہوں۔ ان کے اسٹینڈر کے مطابق رہنا پڑتا ہے

مجھے۔“ اس کے انداز میں بے چارگی تھی۔

”مسئلہ کیا ہے۔ آئی مین کیا پریشانی ہے تمہیں؟“ ایسہا کو تو ہر غریب آدمی قابل ہمدردی ہی لگتا تھا۔ وہ جس

بھوک اور افلاس کو دیکھ آئی تھی وہاں سے ہر ایک کو اٹھالیتا چاہتی تھی۔

آگے سے ڈرائیور نے گھریلو حالات کی تنگی، بسن کی شادی اور الابلا مسائل کا ڈھیر اس کے سامنے یوں لگا دیا

جیسے وہی اس کی مالکن ہو۔

اور مالکن صاحبہ نے بھی اترتے ہوئے کمال فراخ دلی سے پانچ ہزار کا نوٹ ڈرائیور کو مرحمت فرما دیا۔

ڈرائیور کا منہ حیرت کے مارے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

”دیکھیں محترمہ! میں۔“

”کچھ مت کہو۔ فی الحال میرے پاس یہی تھے رکھ لو۔ جب تمہاری بسن کی شادی ہوگی تو مجھے بتانا۔ میں کچھ

کروں گی اس کے لیے۔“

وہ ہمدردی سے کہتی اسے مزید کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔ ڈرائیور نے نوٹ الٹ

پلٹ کر جائزہ لیا لگ تو اصلی ہی رہا تھا۔ وہ متاثر سا گاڑی میں جا بیٹھا اور۔

گاڑی اشارت کرتے ہوئے اس ”مہربان پری“ کے متعلق سوچتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر

گئی۔



رباب کا رزلٹ آؤٹ ہو گیا تھا۔ اور رزلٹ دیکھ کر رباب کا دماغ ہی آؤٹ ہو گیا۔ پوزیشن ہولڈر رہنے والی

اسٹوڈنٹ اسٹینڈس میں اڑتے اڑتے پچی تھی۔ باقی سبیکٹس میں اتنے مار کس تھے مگر اس بار اس کی کوئی پوزیشن

نہیں بنی تھی۔

کلاسز بنک کرنا، کلج آؤرز میں اپنے ”ٹارگٹ“ پورے کرنا۔ ساری خرافات رزلٹ والے دن رنگ لائی

تھیں۔

گھر والوں کی سخت ست سننا پڑیں اور اس نے بھی سب کو منہ توڑ جواب دیے۔

”بہت بڑھتی جا رہی ہو تم رباب۔ ذرا رنگ ڈھنگ بدلو اپنے۔ باپ بھائیوں نے سر پہ چڑھا رکھا ہے تمہیں۔“

ماں نے اس کے لاڈلے پن کو ایک طرف رکھتے ہوئے اچھی طرح جھاڑا تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”فار گاڈ سیک ما۔ مجھے اپنے طور سے اپنی زندگی جینے دیں۔ میری زندگی میں اپنے فل اشاپ اور کوماز لگانے کی کوششیں مت کریں۔“ وہ بدتمیزی سے بولی۔

اسے حیرت ہوئی۔ اسے مختلف چیلنجز دینے والی اور ہر ٹارگٹ کے لیے بک اپ کرنے والی اس کے گروپ کی مینوں لڑکیوں کے بہت اچھے مار کس آئے تھے۔

اب جو بھی ہوا ہو۔ گھر والوں کو جتنے بھی منہ توڑ جواب دیے ہوں مگر اس کا دل بجھ گیا تھا۔

سفیر احسن کا فون آیا۔ اس نے ڈانٹا تو نہیں مگر حیرت زدہ وہ بھی بہت تھا۔ اس نے رباب کو پڑھائی کی طرف دھیان دینے اور آگے ایڈمیشن لینے پر لمبا سا لیکچر دیا تھا۔ سو آج رباب کا موڈ بہت خراب تھا۔ اسے اس وقت کسی اچھے دوست کی بہت سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

اس نے معیذ کو کال کی۔

پہلے دوبار تو اس نے کال اینڈ ہی نہیں کی۔ تیسری بار اینڈ کی بھی تو مختصر سا جواب دیا۔

”سوری۔ اس وقت ارجنٹ اینڈ امپورٹنٹ میٹنگ ہے بعد میں بات کروں گا۔“

وہ لائن ڈراپ کر چکا تھا اور رباب کا چہرہ مارے ہتک کے تنپنے لگا۔

معیذ نے اس کا ایک لفظ بھی سننے کی زحمت نہ کی تھی اسے اپنا آپ کسی فقیرنی سے مشابہہ لگا۔ جو بھیک کے لیے کسی کے پیچھے بار بار لپکتی ہے اور وہ اسے بار بار دھتکارتا ہے۔

اسے خود سے نفرت محسوس ہوئی۔

میں اس قدر گر گئی ہوں۔ میں۔ جس کے ایک اشارے پر لڑکے دم ہلاتے چلے آتے ہیں۔ اور یہ معیذ احمد۔

آئی ہیٹ ایم۔

اسے معیذ احمد اچانک نفرت محسوس ہوئی۔

وہ چاہنے والا ہی کیا جسے میں پکاروں اور وہ سر کے بل حاضر نہ ہو۔ اس کی کنپٹیاں سلگنے لگیں۔ اس نے سینٹی کو کال کی۔

”ڈارلنگ۔ میں تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔“ وہ کھل اٹھا۔ رباب کو ڈھارس ملی۔

”کیا کر رہے ہو۔؟“

”ایک بزنس ڈیلی کیشن کے ساتھ میٹنگ ہے جس اس کے بعد فری ہوں۔“ وہ چمکا۔

”کینسل کر دو سینٹی۔! میرے لیے۔ میں فوری طور پر تم سے ملنا چاہتی ہوں۔“

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی تو دل کہیں اتھاہ گہرائی میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

”آریو اوکے سویٹ ہارٹ۔؟“ وہ پریشان ہوا۔

”تمہاری میٹنگ۔؟“ رباب نے پوچھنا چاہا تو وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

”بھاڑ میں گئی میٹنگ اور فارن ڈیلی کیشن۔ تم بتاؤ کہاں ہو؟ میں آ رہا ہوں ابھی۔“

اس کے انداز میں اس قدر بے مالی تھی کہ رباب جیسے زندہ ہوا تھی۔ امید و ناامیدی کے سمندر میں ڈبکیاں

کھاتا دل نئے خون سے بھر کر توانا ہوا تھا۔

”اور تمہیں تو میں کبھی معاف نہیں کروں گی معیذ احمد۔“ تیار ہوتے ہوئے اس نے کئی بار سوچا تھا۔

وہ کینہ پرور تھی۔ اپنے سو دو زیاں کا حساب رکھتی تھی اور بس۔ اس وقت اسے ذہنی و جذباتی سہارے کی

ضرورت تھی معیذ سے نہ مل سکا تو وہ چٹکی بجاتے دل سے اتر گیا۔ اس نے بے پناہ جذباتیت اور انا پرستی سے کام

لیتے ہوئے آج سے معیذ احمد کو اپنی ”ہٹ لسٹ“ میں رکھ لیا تھا۔

”کون تھی؟“

میم نے فون پر بند ہوتے ہی استفہامیہ انداز میں سیفی کو دیکھا تو وہ معنی خیزی سے مسکرا دیا۔
”بلبل نو خیز تھی۔ رباب احسن۔“

میم کے ہونٹوں پر محفوظ کن مسکراہٹ پھیل گئی۔

”ہوں۔ تو یہ فارن ڈیلی کیشن سے میٹنگ کے بھرم اسے کرائے جارہے تھے۔“

”چڑیا خود جال میں پھنسنے کو تیار ہے میم۔ اوہ سوری آیا۔“

وہ دو معنی انداز میں کہتے ہوئے آخر میں جلدی سے تصحیح کرتے ہوئے بولا تو میم نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ پھر اسے تنبیہ کرتے ہوئے قدرے سنجیدگی سے بولیں۔

”اس بار بی کیس فل سیفی۔ چڑیا اڑنے نہ پائے۔ وہ لڑکی ایسا ہیاد ہے نا، کیسا دھوکا دے گئی تھی۔“

”وہ ناکامی تو میرے دل پہ لکھی ہوئی ہے میم۔ ڈونٹ وری اس بار بہترین ”پیس“ ہے۔ سب ازالہ ہو جائے گا۔“

سیفی نے انہیں تسلی دلائی۔ تو انہوں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلادیا۔



میٹنگ سے فارغ ہو کر اپنے آفس کی طرف آتے ہوئے اس نے کتنی ہی بار رباب کا نمبر ملایا مگر دوسری طرف سے کال اٹینڈ نہیں کی گئی تو وہ تجھجلا سا گیا۔

”شٹ یار۔ ایک تو غصہ اس لڑکی کی ناک پہ دھرا رہتا ہے۔ ذرا جو سمجھ داری اور ٹھنڈے پن سے کام لیتی ہو۔“

وہ جلتا کڑھتا اپنی چیزیں سمیٹتا۔ آفس سے نکل آیا۔ راستے میں رباب کی ناراضی دور کرنے کے خیال سے وہ سرخ گلابوں کا بکے لینے کے لیے رکا۔

سگنل پہ گاڑی رکی تو اس نے ایک بار پھر رباب کو کال ملائی، مگر اب کی بار بھی اس نے کال اٹینڈ نہیں کی تھی۔ سگنل گرین ہوا۔ سب گاڑیاں چل پڑیں۔ دفعتاً ”اپنے دائیں طرف سے آگے نکلنے والی گاڑی میں بیٹھی لڑکی پر نگاہ پڑی تو وہ حیران سا ہوا۔ مگر ششدر تو تب رہ گیا جب اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص کو دیکھا۔ وہ مارے صدمے یا شاید شدید حیرت کے گاڑی چلانا بھول کر روڑ جاتی گاڑی کو دیکھتا اس معنے میں الجھا تھا۔ پیچھے سے گاڑیوں نے متواتر ہارن بجانے شروع کیے تو وہ ہوش میں لوٹا جلدی سے گاڑی اشارت کرنے لگا۔



ایسا بھی فریش ہو کے واش روم سے نکلی ہی تھی جب اس نے ڈور بیل کی آواز سنی۔

اس کے خیال میں ثانیہ تھی، مگر دروازہ کھلتے ہی معینہ کو سامنے پا کر وہ حیران ہو گئی۔

”اب سامنے سے ہٹو گی بھی یا یہیں جم کے کھڑی رہو گی؟“ وہ اسے ”ہستادہ“ دیکھ کر چڑتے ہوئے بولا تو ایسا

خفیف سی ہوتی سائیڈ پر ہو گئی۔

وہ سوئڈ بوئڈ تھا۔ یعنی آفس سے سیدھا ادھر ہی آ رہا تھا۔

ایسا کے دل کو انجان سی مسرت گھیرنے لگی۔ آج کتنے دنوں کے بعد وہ دیکھائی دیا تھا۔ وہ آکر لاؤنج کے وسط میں

کھڑا ہو گیا اور ایسا کو دیکھنے لگا۔ وہ جو اس کے پیچھے ہی آرہی تھی اپنی جگہ ٹھہم گئی۔ (اور دل بھی)

”آج کہاں گئی تھیں تم؟“

وہ پوچھ رہا تھا۔ ایسہا نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”اگیدی گئی تھی۔ ابھی آئی ہوں۔“

”کس کے ساتھ گئی تھیں۔ بلکہ کس کے ساتھ آئی ہو؟“

معیز کے انداز میں محسوس کن سختی تھی۔ ایسہا کا دل لرزا۔

”ڈرائیور کے ساتھ۔“ اٹک کر کہا۔

وہ دو قدم اس کی طرف بڑھا۔ اب وہ اس کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔

”واپسی پر کس کے ساتھ آئی ہو۔؟“

اس نے پھر سے پوچھا تو ایسہا پریشان سی ہو کر بولی۔

”آپ کے ڈرائیور کے ساتھ ہی آئی ہوں۔ آپ پوچھ لیں اس سے۔“

”تم میرے نکاح میں ہو۔ جانتی ہونا تم۔؟“

معیز نے بے اختیار سخت لہجے میں کہتے ہوئے اسے شانوں سے تھام کر جھٹکا سا دیا تو وہ برا فروختہ ہو گئی۔

وحشت زدہ آنکھوں سے اسے دیکھا جو اسے گھورتے ہوئے جیسے سچائی کی تہہ میں اترنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”اور جب تک ہو۔ کوئی بے ایمانی کی تو جان سے مار ڈالوں گا۔“

ایسہا کی تو ابھی سے جان نکلنے لگی۔ جانے کیا ہو گیا تھا جو اسے کوئی بھی ”ٹڑکا“ ڈھونڈنے کی آزادی دینے والے

معیز کو اس قدر بھڑکا گیا تھا۔

”ہوا کیا ہے معیز! میں تو سیدھی گھر آئی ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ لب بھینچے اسے

گھورنے لگا حتیٰ کہ وہ ہاتھوں میں منہ چھپا کے رو دی۔ وہ گہری سانس بھرتا پیچھے ہٹا۔

اس نے کسی کو کال کی۔

”نیکسی میں آؤ ذرا۔“

ایسہا نے سنا وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔ اس نے دوپٹے سے چہرہ رگڑا۔ اور معیز کو دیکھا۔

”آپ مجھے ڈرا رہے ہیں۔ کیا بات ہوئی ہے؟“ رندھے لہجے میں بولی۔

وہ تنے ہوئے تاثرات لیے یونسی اسے دیکھتا رہا جیسے پولیس اپنے مجرم کو دیکھتی ہے۔ دروازے پر دستک ہوئی

تھی۔

”آجاؤ!“ کوئی اندر آیا تو ایسہا بے اختیار معیز کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ وہ کوئی آدمی تھا۔

”میڈم کو پک اینڈ ڈراپ کر رہے ہو تم۔؟“ معیز نے سخت لہجے میں پوچھا تو ایسہا نے کرنٹ کھا کر معیز کا چہرہ

دیکھا۔

”سرجی! میں تو ایک ہفتے کی چھٹی پر تھا۔ میرے ہاں بیٹا ہوا ہے کب سے چھٹی مانگ رہا تھا بیگم صاحبہ نے دے

دی۔“ وہ خوش ہو کر بولا۔

”ہوں۔ جاؤ تم۔“ معیز کی پیشانی پر شکن تھی۔ وہ آدمی چلا گیا۔ ایسہا کا دل اتھاہ گہرائی میں ڈوبنے لگا۔

”یہ ڈرائیور تھا۔“

معیز نے جتانے والے انداز میں کہا تو وہ ششدر رہ گئی۔ اگر یہ ڈرائیور تھا تو ایک ہفتے سے وہ کس کے ساتھ

کرتی رہی تھی؟؟

”اب تم بتاؤ۔ تم کس کے ساتھ آتی جاتی رہی ہو؟“ معیز نے سختی سے پوچھا تو اس کا سر چکرانے لگا۔ وہ

صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔ چند ثانیوں تک وہ اسے گھورتا رہا۔
 ”مجھے نہیں پتا۔ اس دن میں پورچ میں گئی تو کوئی اور ڈرائیور گاڑی میں بیٹھا تھا۔ وہی مجھے پک اینڈ ڈراپ کرتا تھا۔“

ایہا کی رنگت سفید پڑ گئی۔ وہ درحقیقت بہت خوف زدہ ہو چکی تھی۔ اس کی بات سن کر معیز کو فوراً ”ہی سارا معاملہ سمجھ میں آگیا۔“
 ”اس کی تو۔“ وہ لب بھینچتا تیز قدموں سے نکل گیا تھا۔ ایہا متحیر اور پریشان سی دروازے تک آئی۔ وہ تو سارے معاملے کو قطعاً ”سمجھ نہیں پائی تھی۔“

وہ سیدھا بیوی کے سامنے نیم دراز پائن اہل سے شغل کرتے عمر کے سر پر جا پہنچا۔ چند لمحے اسے گھور کے دیکھا تو اس نے ناچار بیوی اسکرین پر سے نظر ہٹائی۔
 ”پائن اہل چاہے۔“ اس نے پائن اہل کا ٹکڑا کانٹے میں پھنسا کر اسے دکھایا۔
 ”یہ کیا کھیل شروع کر رکھا ہے تم نے عمر۔“ معیز نے دانت پیسے۔
 ”کیا۔ کون سا کھیل؟“ عمر نے چونکے بلکہ حیران ہونے کی بھونڈی اداکاری کی۔ تو معیز کو اور غصہ آیا۔
 ”تم ایہا سے دور رہو عمر۔! وہ میری بیوی ہے۔“ بھینچے بھینچے لہجے میں کہا۔ عمر کی قلربی طبیعت سے اس سے زیادہ اور کون واقف تھا۔

عمر نے پرسکون انداز میں اسے دیکھا اور اطمینان سے بولا۔
 ”ہاں۔ وہ بیوی جسے تم کسی بھی وقت چھوڑنے والے ہو۔“ عمر کے انداز میں پتا نہیں کیا تھا جس نے معیز کو بھک سے اڑا دیا۔

وہ کم از کم ایک گھونسا تو اس کے منہ پر دے ہی مارتا اگر خود پر ضبط نہ کرتا۔
 ”میں نے کہا نا عمر۔ اس سے دور ہو۔ جب تک وہ میرے نکاح میں ہے۔“ نگلی اٹھا کر سرسراتے لہجے میں کہا تو عمر نے معصومیت سے پوچھا۔

”پھپھو تو کہہ رہی تھیں جو نبی وہ کسی اور کو پسند کر لے گی شادی کے لیے۔ تم اسے چھوڑ دو گے۔“
 ”مگر وہ“ کوئی اور ”تم ہرگز نہیں ہو عمر۔“ سمجھے تم۔ ”وہ دھاڑ کر کہتا ٹھوکرلوں سے چیزیں اڑاتا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔“

اس کے پاس وقت نہیں تھا غور کرنے کے لیے آخر اسے اتنا غصہ کس بات پر آ رہا ہے؟
 عمر کے ہونٹوں پر محفوظ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ لی وی کا والیم بڑھا کر وہ پھر سے اپنے پائن اہل کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔



وہ چھٹی کے وقت اکیڈمی سے نکلی اور ڈرائیور کو ادھر ادھر تلاشا۔ وقت دیکھا تو ابھی دس پندرہ منٹ باقی تھے۔ اسے کوفت ہوئی۔ آج معیز نے خود حامل طود پر اسے ڈرائیور کے ساتھ بھیجا تھا۔
 اور ایہا نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ کسی نقصان سے بچ گئی تھی۔
 ”ہیلو ایہا مراد۔“ مردانہ لہجہ اس کے پاس گونجا تو کرنٹ کھا کر مڑ کے دیکھتے اس کی جیسے جان ہی نکل گئی تھی۔
 (باقی آئندہ ماہ انشاء اللہ)

چھوٹا جھگڑا



”اے بہنا کے (کیا) پوچھتی ہو؟ وہ بڑے بیٹے منوا کی پیدائش پر چھانسن (والی) کا سارا خرچہ ہمارے باوا نے اٹھایا اور تو اور ہماری ساس نے منہ کھول کر بٹوا کی پیدائش پر ”مبارکی“ بھی مانگ لی۔ بس باوا نے فوراً ہی بیس کلو آٹا، پانچ کلو گھی، دس کلو چینی، چار کلو میدہ اور زچہ بچہ کی مائش کے لیے پانچ کلو سرسوں کا تیل اور ڈھیر سا خشک میوہ خرید کر سسرال بھیجا دیا۔“

رئیس النساء خالہ نے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ وہ حاضرین محفل کے ساتھ خود بھی ماضی کی یادوں سے محظوظ ہونے لگیں۔ رقیہ خاتون نے آنکھیں نہجا کر اپنی بہو اسماء کو دیکھا، جو ٹھوڑی پر ہاتھ دھرے تائی ساس کی بہن کی باتیں دلچسپی سے سن رہی تھی۔ انہوں نے مسکرا کر دل ہی دل میں جھٹائی کی چھوٹی بہن کے انداز بیاں کو سلام پیش کیا۔

رئیس النساء اپنے میاں کے ساتھ انڈیا سے پاکستان رشتے داروں سے ملنے ملانے اور گھومنے پھرنے آئی ہوئی تھیں۔ انیس النساء نے آج چھوٹی بہن کے اعزاز میں دعوت رکھی تھی، بہو کے اصرار پر انہوں نے اوپری منزل پر رہنے والی اپنی جھٹائی، جن سے ان کا ہمیشہ کا کانٹے کا پیر تھا اور چھوٹی بیٹی سیما کو بھی کھانے پر بلا لیا، بڑی بیٹی سیما تو بیاہ کر دوسرے شہر چلی گئی تھی۔ مہینوں بعد میکے آنا ہوتا، جس کا قلق انیس النساء کو اپنے گھر ہونے والی ہر تقریب کے موقع پر ہوتا۔

”واہ۔ واہ۔ ریان دلہن۔ جی خوش کر دیا۔“
علیم خالو نے زریں کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ

رکھا۔ انیس النساء کی نئی نویلی سوزریں کے ہاتھ میں بڑا ڈانقہ تھا، اس کا پکایا ہوا مزیدار پھلی پلاؤ، اچار گوشت اور شاہی کھڑے کھانے کے بعد سب پر ایسی سستی چھائی کہ وہ سب بڑے کمرے میں ہی بیٹھ گئے۔

”ہماری بہو۔ پکائی ہی اتنا اچھا ہے۔“ اقبال احمد نے مسکرا کر کہا۔ وہ بھی اپنے ہم زلف کو کہنی دینے ان کے برابر میں آ بیٹھے۔ ریان نے پیار سے بیوی کو دیکھا، جس کی تعریف کرتے ہوئے عظیم خالو نے پانچ سو کا

نوٹ انعام کے طور پر اسے زبردستی تمھارے۔ میاں بیوی کا رشتہ بھی کتنا عجیب ہے نا، نکاح کے بولوں میں ایسا جادو پایا جاتا ہے کہ دو الگ الگ ماحول کے رہنے والے اس پیارے سے بندھن میں بندھ کر ایک جاں ہو جاتے ہیں ایک کو دکھ پہنچتا ہے تو دوسرا تڑپ اٹھتا ہے، اور دوسرے کی تعریف پر پہلا غر محسوس کرنے لگتا ہے مگر یہ ان کے ساتھ ہی ہوتا ہے جو دل سے اس رشتے کی اہمیت کو مان لیں۔

زریں ماں بننے والی تھی۔ صبح سے دعوت کے انتظام میں مصروف رہنے کی وجہ سے مکان سے اس کی پھول سی من موہنی صورت کھلا گئی تھی، ریان کو بیوی پر ایک دم ترس آ گیا۔ لیڈی ڈاکٹر نے اس کے سامنے ہی زریں کو کمزوری اور لو بلڈ پریشر کی وجہ سے مسلسل کھڑے رہنے سے منع کیا تھا۔ وقفے وقفے سے آرام کی تائید بھی کی تھی، مگر وہ سب کی خوشی کے لیے ایک پاؤں پر کھڑے رہتی۔ ریان نے فکر مندی سے زریں کو دیکھا اور تخت پر سے گاؤں تک اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے مسکرا کر شوہر کو دیکھا اور تکیہ سے کمر نکا کر آسودگی کا سانس لیا۔ بعض اوقات بڑی سے بڑی دولت بھی انسان کو وہ خوشی نہیں دے پاتی، جو کسی کے محبت بھرے جملے یا چھوٹے سے پر خلوص عمل سے حاصل ہو جاتی ہے، ریان کی آنکھوں سے ٹپکتی محبت سے زریں کی روح تک میں سرشاری دوڑ گئی۔

انیس النساء کی توجہ ان دونوں کی طرف ہی تھی۔ انہیں بیٹے بہو کی دلداریاں ذرا جو بھائی ہو سکیہ وہ ہی ماں

تھیں، جو بیٹی کے حاملہ ہونے پر اسے بہانے بہانے سے یکے بلوائتیں تاکہ وہ اس حالت میں زیادہ سے زیادہ آرام کر سکے، مگر ساس بنتے ہی بہو کے لیے ان کے نظریات میں تبدیلی آگئی زریں کی طبیعت کی خرابی انہیں معمول کی بات لگی۔

”ارے کیا ہم نے بچے پیدا نہیں کیے۔“ وہ اپنے ماضی کو یاد کرتے ہوئے اسے ذرا رعایت دینے کو تیار نہ تھیں، ان کی ساس آج کل اپنی بیٹی کی طرف گئی ہوئی تھیں۔

مردوں کو چائے کی طلب نے بے چین کرنا شروع کر دیا، اس سے قبل کہ زریں اٹھتی، اقبال احمد نے فوراً ہی سیمہ کو چائے بنانے کا کہہ دیا، انیس النساء نے شوہر کو نیڑھی آنکھ سے دیکھا، مگر اتنے لوگوں کے بیچ کیا بولتیں ویسے بھی سامنے اکڑو، بہنوئی بیٹھے تھے، وہ جب بھی پاکستان آتے سلی کی دھری پالیسی پر انہیں تنقید سے نوازتے، اس لیے چپ رہنے میں ہی عافیت جاتی۔ سیمہ باپ کی فرمائش پر بڑے ناز خروں کے بعد چائے بنانے کچن کی طرف چل دی، لیکن اب لگ رہا تھا کہ پائے گلا رہی تھی۔ ویسے بھی ویک اینڈ تھا کافی عرصے بعد خالہ سے ملاقات ہوئی، تو سب ان کے گرد ڈیرہ جمائے خوش گہیوں میں مصروف ہو گئے۔ ساتھ ہی ان کی اینٹیا سے لائی ہوئی سوغاتیں، میٹھی ناریل کری، کھانے کا علوہ، چھوڑا اور آم پاپڑ بھی چٹخارے لے کر کھایا جا رہا تھا، جو زریں اور اسماعیل نے ہلپٹوں میں لا کر سب کے بیچ میں رکھ دیے۔

ریس النساء بھی لگے ہاتھوں اپنے شہنشاہ کے قصے سننے میں مشغول ہو گئیں، ان کی ہندی ملی اردو سننے میں بڑا مزہ دے رہی تھی۔ انیس النساء نے موقع محل دیکھ کر بڑی چالاکی سے باتوں کا رخ اپنی منشا کے مطابق موڑ دیا۔ آخر ریان کے یہاں پہلی اولاد کی آمد متوقع تھی، اس نے شادی پر تو لڑکھڑک کر بہت سی رسومات کو فرسودہ قرار دے کر ان کے دل کے ارمان پورے ہی نہیں ہونے دیے، مگر قدرت نے انہیں

اب ایک اور موقع فراہم کیا تھا۔

ریان ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتا تھا۔ اس کی پوسٹنگ دو سال سعودی عرب میں رہی واپس پاکستان آیا تو اس کے اندر بہت بدلاؤ آچکا تھا۔ کئی معاملوں میں وہ مل کو بھی سمجھانے بیٹھ جاتا۔ گھر کا بڑا کملا پوت 'داوی کالاڈلا' اقبال احمد بھی ہر معاملے میں بیٹے کا ساتھ دیتے۔ اس لیے انیس النساء کئی باتوں میں اسے نہ چاہتے ہوئے بھی رعایت دے جاتیں 'ریان جینز کا سخت مخالف تھا' اسی لیے زریں کے گھر والوں کو صرف لڑکی کی ضروریات کا سامان جینز کی صورت میں دینے کا عندیہ دیا۔

جیلہ خاتون نے اس بات پر پوتے کی پیٹھ ٹھونکی۔ انیس النساء نے پھر بھی ساس اور بیٹے کے علم میں لائے بغیر زریں کے والدین سے چکے چکے کئی فرمائشیں کر ڈالیں 'شادی سے ایک دن قبل جب جینز کا ڈھیر سا سامان اترتا تو جیسے سارا گھر جگمگا اٹھا۔ ریان تو بوکھلا اٹھا' اس کے نظریات مٹی کے ڈھیر کی طرح بے جان پڑ گئے۔ وہ مل سے لڑ پڑا۔ اقبال احمد نے الگ بیوی کی تلاش کی۔

ریان شرمندگی کے مارے 'سسرال فون کر کے سارا اسباب واپس بھجوانا چاہتا تھا' مگر شادی بیاہ کے موقع پر جب کہ پورا خاندان جمع تھا جیلہ خاتون نے گھر کے مسئلے کو گھر تک محدود رکھنے کی ٹھانی اور ریان کو سمجھا بچھا کر خاموش کرادیا۔ ویسے بھی اب کچھ ہو نہیں سکتا تھا 'مکن سے تیر نکل چکا تھا۔

انیس النساء نے بھی سکون کا سانس لیا۔ بیٹا کتنا ہی روشن خیال بنتا ہو بھلا وہ اپنے ریت دواج سے کیسے ناتا توڑ لیتیں؟ پھر بات جب اپنے فائدے کی ہو تو 'ایسی فضول رسموں سے چٹے رہنا بھی جائز ہو جاتا ہے' پھر کیا انہوں نے اپنی بیٹیوں کو ترک بھر کر جینز نہیں دیے تھے۔ اب اپنی باری پر وہ کیوں خالی ہاتھ رہ جاتیں؟ رقیہ بھی لاکھ اخلافت رکھنے کے اس معاملے میں جنٹلمانی کی ہمنوا بنی ہوئی تھیں 'یوں کہا جائے تو بہتر ہو گا کہ ان مسئلوں پر "ایک پنے کی دودال ثابت ہوتیں" رقیہ کی

بہو اسماء کے یہاں بھی دو مہینے بعد خیر سے دوبارہ خوش خبری متوقع تھی 'اسی لیے وہ بھی رقیں النساء کی باتیں بڑے عقیدت و احترام سے سن رہی تھیں۔

"اے ہے 'رقیں النساء! ماں نے جو تیرے منور کی پیدائش پر نقدی اور کرتا ٹوپی بھیجی تھی 'اس بارے میں تو بہوؤں کو بتانا۔ تا' میں خود اس وقت بنارس گئی ہوئی تھی 'اس لیے ماں کے ساتھ مل کر میں نے ہی تو تیری "چھٹی" کی تیاری کی تھی۔" انیس النساء نے مسکرا کر بہو کو نظروں ہی نظروں میں تولاد اور بہن کو بڑھاوا دیا۔ ریان نے ماں کی طرف ناگواری سے دیکھا 'مگر ادب مانع آگیا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ آپا۔۔۔ کا بے نہیں بتائیں گے 'وہ سب تو الگ سے دیا گیا تھا۔" رقیں النساء خالہ نے بان کی گلوری گالوں میں دبائی اور سر ہلا کر بہن کی باتوں کی تصدیق کی 'ساتھ ہی کتھے والی انگلی بالوں میں پونچھی۔ زریں نے خالہ کی حرکت دیکھی تو مسکرا کر اسماء کو ٹھوکا دیا۔

"خالہ۔۔۔ یہ کرتا ٹوپی کیا ہوتا ہے؟" اسماء نے اچنبھے سے پوچھا۔ اس کے لیے یہ اصطلاح نئی تھی 'زریں نے بھی حیران نظروں سے خالہ ساس کو دیکھا 'علیم خالو نے بیوی کو گھورا۔ وہ پاس ہی صوفے پر بیٹھے خبریں دیکھ رہے تھے 'انہیں بیوی کی لن ترانیاں کچھ بھا نہیں رہی تھیں 'مگر کیونکہ وہ اس وقت حاضرین محفل کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھیں 'اسی لیے شوہر کے اشاروں کو نظر انداز کیے جوش و خروش میں تیز تیز بولے جا رہی تھیں۔

"ارے بلال مہراؤ (بیوی) کا پوچھتی ہو ہمارے بنارس میں جب کسی کے یہاں بچہ پیدا ہوتا تھا۔ تو اس کے نخیال والوں اور رشتے داروں کی طرف سے اس کے لیے چھٹی بر جو سامان آتا' اسے کرتا ٹوپی کہے ہیں۔" انہوں نے مسکرا کر اسماء کو بتایا۔ مگر اسماء اب جی کنفیوز ہی رہی۔

"اے 'ریمو! یہاں خاندان بھر میں ابھی بھی کرتا ٹوپی کا رواج چل رہا ہے؟ اب "چھٹی" میں کیا کیا

”تو پھر یہ طے پا گیا نا۔ تم یہ کمیٹی میری ای کو دے دو گی؟“

اسما نا کی امید بھری نگاہیں، زریں کے چہرے پر ٹک گئیں، اس نے ناچاہتے ہوئے بھی ہائی بھرلی۔ زریں نے اسماء کے اتنا زور دینے پر ہل تو کر دی، مگر اب وہ سوچ میں پڑ گئی کیوں کہ اس دفعہ کا نمبر تو اس کی بڑی بہن شیریں کا تھا، چلو خیر ان کو منانا چنداں دشوار ثابت نہیں ہو گا۔ اسماء بھابھی کی ای پیسوں کے لیے اتنا پریشان ہیں، دو مہینے سے کیا فرق پڑتا ہے، یہ کمیٹی ان کو دے کر دو مہینے بعد کی بجایا کو دے دوں گی، ایسے منہ بھر

کہ انکار کرنا اچھا نہیں لگ رہا۔ چلو جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ زریں نے دل ہی دل میں نئی ترتیب بنائی اور اسماء کو اطمینان دلاتے ہوئے بولی۔

”آپ بے فکر ہو جائیں بھابھی۔ میں دس تاریخ تک تیس ہزار روپے آپ کو دے دوں گی، آپ اپنی ای کو پہنچا دیجیے گا۔“ ان کی آنکھوں میں امید کے دیے روشن تھے جسے بجھانا، زریں کے بس میں نہیں تھا۔

”اللہ تمہارا بھلا کرے، تم نے میرے سر سے ایک بڑا بوجھ اتار دیا، بہن ایک بات کا اور خیال رکھنا، اس بات کا ذکر کسی اور کے سامنے آنے نہ پائے، تم تو خود سرال نبھا رہی ہو، ایسی نزاکتوں کو مجھ سے بہتر سمجھتی ہونا۔“ اسماء نے زریں کا ہاتھ تھام کر دھیرے سے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا کر یقین دہانی کرائی۔ اسماء ایک دم پر سکون نظر آنے لگی۔ اب وہ زریں کی طبیعت کے بارے میں پوچھنے لگی۔

”ارے۔۔۔ اندھا والی خالہ نظر نہیں آرہیں؟“ اسماء نے پوچھا۔

”جی۔۔۔ وہ اپنے سرسالی رشتے داروں کی طرف رہنے لگی ہوئی ہیں۔ شاید اگلے ہفتے واپسی ہو۔“ زریں نے تکیہ کے غلاف میں ٹانگا لگاتے ہوئے جواب دیا۔ وہ ہر تین دن بعد اپنے بستر کی چادر اور تکیہ کے غلاف بدلتی تھی، اسے میلے بستر سے وحشت ہوئی تھی، اسماء بھی اس کی مدد کروانے لگی۔

”سلان آتا ہے؟“

انیس النساء نے پیار سے بہن کو ایسے پکارا جیسے بچپن میں کھیلتے ہوئے پکارتی تھیں، ویسے بڑھاپے میں بھی دونوں بہنیں کھیل ہی تو کھیل رہی تھیں، کھلونوں سے نہ سسی ہوووں کے جذبات سے ہی سسی۔ انیس النساء جانتی تھیں کہ بہن کو چاہی بھر دی ہے، اب وہ بولتی رہے گی اسی لیے انہوں نے اطمینان سے فکری پاندان اپنی طرف کھینچا اور پان کی گھوری کلمے میں دیا۔ انکلیوں پر کتھا چونکا کر چانتے ہوئے معصوم بن گئیں، وہ ریان کی موجودگی کی وجہ سے ذرا احتیاط سے کام لے رہی تھیں۔

”تو۔۔۔ کے (کون) پرکھوں کی رسموں سے منہ موڑ کر گناہ گار بنے، نہ بھی نا۔ آپ لوگوں کا تو نہیں پتا، مگر وہاں اب بھی سب کچھ ویسے ہی ہے، بچے کی پیدائش کے پانچویں دن چھٹی کی جاتی ہے، اس دن کے لیے نھیال کی طرف سے ٹائی کے لیے بڑے اہتمام سے کرتا ٹوپی کی تیاری ہوتی ہے، جس میں بچے کا گدا، لحاف، ہنسنے کے کپڑے، ”بھنجننا کھلونا“ امل باوا، دادا، دادی کے جوڑے وغیرہ ہوتے ہیں۔ ہاں اگر کوئی نھیال زیادہ پیسے والا ہو تو وہ خاندان میں واہ واہی کے لیے لازمی سونے کا کوئی پھول (ٹاپس) چاندی کا توڑیا بچی کے لیے چھوٹی سی انگوٹھی وغیرہ بھی بھیجتا ہے۔“

انیس النساء نے تفصیلی کرتا ٹوپی کی تشریح کی اور داد کی وصولی کے لیے بڑی بہن کو دیکھا، مگر وہ خاموش رہیں، ان کا مقصد آرام سے پورا ہو گیا تھا، اب انہیں بول کر بیٹا ہو کے سامنے برا بننے کی کیا ضرورت تھی، رقیہ بھی سرشار سی بیٹھی اسماء اور زریں کے چہرے پر ایک رنگ آتا جانا دیکھ رہی تھیں، دونوں ہوووں جو ماں بننے کے مراحل سے گزر رہی تھیں، اب تک وہ باتوں کو بے مقصد سمجھ کر سن رہی تھیں، مگر دھیرے دھیرے ان پر کچھ چیزیں واضح ہونے لگیں، زریں کی تو خیر تھی مگر اسماء حقیقتاً ”پریشان نظر آنے لگی۔“

”یہ اندھا سے آنے والے بھی عجیب باتیں کرتے ہیں۔ شاید ہندوؤں کے ساتھ رہ کر وہاں کے رسم و رواج ان کے ذہنوں پر سوار ہو گئے ہیں۔“ اسماء نے ناگواری سے کہا۔

”ہاں۔ اس دن میں نے بھی سنا۔ خالہ کیسی کیسی بے مقصد کہانیاں سن رہی تھیں، خیر وہ تو اندھا میں رہ رہی ہیں تو ان پر وہاں کے اثرات تو ہوں گے مگر میں تو اپنے ملک میں لوگوں کو دیکھتی ہوں کیسے دوسروں کی تہذیب میں تحریر ڈھلنے کی کوشش جاری رہتی ہیں ویسے بھی اس دن داد نہیں تھیں نا، جب ہی سب کو کھل کر کھیلنے کا موقع مل گیا۔“ زریں نے غلاف میں ٹانگا لگا کر اس کا منہ سیا اور سوئی دھاگہ لپیٹ کر دراز میں رکھتے ہوئے شرارت سے بولی۔

”ارے۔ بہن! یہ باتیں تمہیں بے مقصد لگ رہی تھیں، مگر ہماری ساسوں کی تو جیسے دل کی آواز تھی، وہ دونوں ہی داوی بننے والی ہیں، اب دیکھو ”چھوچھک“ کے نام پر ہمارے گھر والوں سے کیا کچھ کی امید لگائے بیٹھی ہوں گی۔“ اسماء نے افسردگی سے کہا۔

”چھوڑیے بھابھی۔ میں اور ریان تو ان باتوں پر یقین ہی نہیں رکھتے، میرا کوئی ارادہ نہیں کہ ڈیلیوری کے موقع پر اپنے گھر والوں سے کوئی فرمائش کروں، ویسے بھی ریان کہتے ہیں کہ جب یہ اولاد میری ہے تو اس کی ساری ذمہ داریاں بھی میری ہو میں نا۔ اب یہ کیا کہ بچہ میرا ہو اور پیدائش کا خرچہ تنہا والے اٹھائیں۔“ زریں نے دھیرے دھیرے اسماء کو تقاضا سے بتایا، اس کا چہرہ شوہر کے دیئے ہوئے اعتماد کی وجہ سے چمک رہا تھا۔

”ہا۔۔۔ تم خوش قسمت ہو بہن جو تمہیں۔۔۔ ریان جیسا نیک طبیعت لڑکا ملا۔“ اسماء نے ٹھنڈی سانس بھری اور غیر محسوس طور پر آنکھوں کے پھلکے گوشے پونچھ ڈالے، زریں نے اسماء کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ دھرا۔

”اب دیکھو ڈاکٹر نے مجھے اگلے مہینے کی تاریخ دی ہے۔ میری امی کو ابھی سے میری چھوچھک کی فکر لگ

گئی ہے۔“ اسماء نے افسردگی سے بتایا۔

”ہاں۔ مگر آپ کے بڑے بھائی اور چھوٹی بہن کی بھی تو دو مہینے بعد شادی ہے۔“ زریں نے پوچھا۔

”ہاں۔ مگر کیا کریں؟“ اسماء کے سوال میں ہی بہت سے جواب چھپے ہوئے تھے، زریں بھی افسردہ ہو گئی۔

”ارے بیٹھیں نا۔ ایک کپ چائے کافی کر جائیے گا۔“ اسماء ایک دم جانے کے لیے کھڑی ہوئی تو زریں کو خیال آیا۔

”نہیں بھئی۔ میں کوئی مہمان تھوڑی ہوں، اوپر سے ہی تو اتر کر آئی ہوں، پھر کبھی سہی۔ ابھی تو میں اماں جان کو بالک کاٹنے کو دے آئی تھی، آج تمہارے بھائی کی فرمائش پر دال ساگ بنا رہی ہوں، مزید بیٹھی تو کھانے میں دیر ہو جائے گی۔“

زریں نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔ وہ جانتی تھی کہ شوہروں کو دفتر بھیجنے کے بعد خواتین کے پاس کاموں کا ایک انبار جمع ہوتا ہے۔ جو ان کی گھر واپسی سے پہلے نمٹانا ضروری ہوتا ہے۔ گو کہ اس کی شادی کو ابھی سال بھر ہی ہوا تھا، مگر وہ بھی صبح اٹھ کر پھرتی سے امور خانہ داری نمٹاتی تاکہ ریان کی واپسی پر اسے فریش چہرے کے ساتھ مسکراتی ہوئی ملے۔ زریں میلی چادر اور نکیہ کے غلاف سمیٹ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔

”رات کے لیے کیا پکانا ہے؟“ روزانہ کی طرح یہ سوال اس کے سامنے منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ وہ ہر کے لیے تو اس نے رات کے بجے ہوئے دم کے قیمہ میں تازہ ہر ادھنیا اور ہری مرچ ملا کر فرنیج میں رکھ دی تھی، اب اسے کھانے سے قبل بس گراما گرم قیمے بھرے پر اٹھے پکانے تھے، ساتھ میں پودنے کی چٹنی بہت مزہ دے گی۔ اس نے سوچا اور مطمئن ہو گئی۔

انے کمرے سے باہر نکلی تو اسماء بھابھی کو انیس النساء کے سامنے پیشی بھگاتے دیکھ کر اس کی ہنسی نکل گئی، یہ اپنی دیورانی کے بارے میں پوری سن کن لے رہی تھیں اور اسماء بھابھی اس وقت جان چھڑانے کے

موڈ میں تھیں۔

”ماں بننا بھی کوئی آسان کام نہیں عورت اپنا جوبن کھو کر ایک نئے اور خوب صورت رشتے کی خوشی سب کی جھولی میں ڈالتی ہے، کسی کو باپ، آتی ہے تو کسی دادی، ثانی، کوئی ماموں، پچھو کے رشتے پر فائز ہو جاتے ہیں اس پر بھی سسرال والے بہو کا شکر گزار ہونے کے بجائے اسے نو مہینوں تک مختلف فرمائشوں کی آزمائشوں میں ڈالے رکھتے ہیں، کسی کو بیٹا چاہیے ہوتا ہے تو کسی کو میکے سے سدا نش کا خرچ۔“

بھابھی کا بے ڈول جسم دیکھ کر وہ مسکرا دی اسے اپنی

ثانی کی بات یاد آگئی جو وہ اکثر اس کی امی اور خالہ سے باتیں کرتے ہوئے دہراتی تھیں، ”زیریں کو وہ باتیں اب اچھی طرح سے سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ وہ بھی تو اب ایسے ہی خوش کن دور سے گزر رہی تھی، شکر تھا کہ شوہر صرف شریک زندگی نہیں تھا، بلکہ شریک غم بھی تھا۔“

نانی ساس کی جرح سے پیچھا چھڑا کر اسماء اب دھیرے دھیرے میٹرھیاں چڑھ کر اوپر کی طرف جارہی تھی، زیریں کی نظروں نے دور تک اس کا پیچھا کیا۔



”اے دلہن۔ تم دونوں میں ایک گھنٹے سے کیا راز و نیاز جاری تھے؟“ وہ شاید اسماء کی موت میں خاموش بیٹھی تھیں، اس کے اوپر جاتے ہی انہوں نے توپوں کا رخ اپنی بہو کی طرف موڑا اور ناگواری سے بولیں۔

”جی۔ کوئی خاص بات تو نہیں تھی بس وہ مجھ سے کل۔ ڈاکٹر کے وزٹ کے حوالے سے پوچھ رہی تھی۔“ زیریں نے نہ چاہتے ہوئے بھی تھوڑی سی غلط بیانی کی۔ زیریں کا یہ پہلا تجربہ تھا اس لیے وہ ذرا اسی بات پر گھبرا اٹھتی تھی، اسماء کے یہاں دوسرے بچے کی ولادت متوقع تھی، تو وہ اس معاملے میں سینئر ہونے کی وجہ سے زیریں کی دل جوئی بھی کر دیتی۔

”ہو نہ ہو۔ تم لوگوں نے ماں بننے کو جیسے ہوا بتا رکھا ہے، جب دیکھو ڈاکٹر کے پاس دوڑیں لگائی جارہی ہیں“

ڈاکٹر بھی ایسے نا تجربہ کار کہ نیسٹ کروا کروا کے بندے کا تیل نکال دیتے ہیں۔ ایک ہمارا وقت تھا کہ ٹائم پر دایہ کو گھر پر بلایا اور ہو گئی فراغت، کہاں کے نیسٹ اور کہاں کے اسپتالوں کے چکر، میں خوب جانتی ہوں کہ یہ تو بس سارے مردوں کو بے وقوف بنانے کے چکر ہیں کہ وہ دفتر سے تھکے ہارے آکر لگ جائیں بیویوں کی غلامی میں۔“ انیس النساء شروع ہو چکی تھیں ان کو خاموش کرانا ناممکن تھا۔

زیریں کا دل چاہا کہ ان سے پوچھے ”مرد کیوں نہ اپنی بیویوں کے خیرے اٹھائیں، آخر عورت اتنی تکالیف

سہہ کر رہی تو انہیں باپ جیسے رتبے پر فائز کرتی ہے تو پھر کیا ان کی کوئی ذمہ داری نہیں؟“ مگر اسے پتا تھا کہ ایک بحث لا حاصل چھڑ جائے گی۔ اسی لیے کان پیٹے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

یہ دونوں خاندان ورثے میں ملے ہوئے اس گھر میں اوپری، کچلی منزلوں پر رہائش پذیر تھے، بلال کی دادی ابھی حیات تھیں وہ بہت سلیبھی ہوئی خاتون تھیں، جب تک ان کا چھوٹا بیٹا انوار زندہ رہا۔ وہ ایک مہینہ اور ایک مہینہ نیچے رہتیں، مگر اب وہ صرف اقبال احمد کے گھر ہی رہائش پذیر تھیں، رقیہ خاتون کی ساس سے کبھی نہیں بنی۔ وہ بے چاری اگر ہو کو اس کی غلط روش پر ٹوکتیں تو رقیہ خاتون بھی ان کو چار باتیں سناتیں۔ انوار کی زندگی میں تو ایسا ممکن نہ تھا، مگر اب رقیہ کو کس کا ڈر، بلال کو انہوں نے شروع سے دبا کر رکھا۔ وہ حق بات کہتے ہوئے بھی ڈرتا۔ جمیلہ خاتون مرحوم بیٹے کا زمانہ یاد کرتیں اور روٹی ہوئی نیچے اتر جاتیں، اقبال احمد کو دنیا میں ساری باتیں برواشت تھیں، سوائے ماں کی بے عزتی کے۔

”اماں۔ کی ایک روٹی مجھ پر بھاری نہیں۔ اب وہ تاحیات میرے پاس رہیں گی۔“ بیوی کے ناک منہ چڑھانے کے باوجود اقبال احمد نے صحن کے پتھوں بیچ کھڑے ہو کر اعلان کر دیا۔ پاٹ وار مروانہ آواز اوپر تک جارہی تھی، رقیہ خاتون چور سی بن گئیں، جمیلہ خاتون بیٹے کی سعادت مندی پر سفید دوپٹے سے آنسو

پوچھتی رہ گئیں، جو خوشی کے مارے ان کی آنکھوں سے جھلک پڑے۔



”کیا بات ہے سو؟ دو منٹ کا کہہ کر گئیں اور گھنٹہ لگا آئی ہو۔ سب خیریت تو رہی۔“ اسماء ہانپتی کانپتی اوپر پہنچی تو رقیہ خاتون کے سامنے لائن حاضر ہونا پڑا۔ اس نے فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور قریب رکھی کرسی پر بیٹھ کر پانی پینے لگی۔ وہ جھٹانی کا احوال جاننے کو بے تاب تھیں، اس وقت سو کا پانی پینا بھی ان پر بھاری پڑ رہا تھا۔

”کچھ نہیں کل زریں گانا کالوجسٹ کے پاس گئی تھی۔ بس اس کی خیر خیریت لینے بیٹھ گئی تھی۔“ اسماء نے مختصر بات کر کے جان چھڑانی چاہی، مگر وہ جھاڑ کے کانٹوں کی طرح الجھ پڑیں۔

”آئے۔ ہائے۔ ابھی تو اس کو دو سرامینہ لگا ہے اسپتالوں کے چکر لگنا شروع ہو گئے، یہ ہی تو خرابی ہے آج کل کی لڑکیوں میں ذرا برداشت نہیں، چھینک بھی آجائے تو ڈاکٹر کی طرف ضرور جائیں گی۔“ گول گول شیشوں والی عینک میں سے رقیہ کی آنکھیں اٹلی پڑ رہی تھیں، مزاج کی کڑختی ان کے چہرے سے عیاں ہوئی تھی۔ اسماء کوفت میں مبتلا ہو گئی۔

”ہو نہ۔ وہ جب سے ریگنٹ ہوئی ہے۔ اس کا بی پی مسلسل لو رہنے لگا ہے اس لیے ڈاکٹر نے ہر پندرہ دن بعد چیک اپ کا کہا ہے اس کے علاوہ کچھ ٹیسٹ بھی کروانے تھے۔“ اسماء نے جلدی جلدی پیاز کاٹتے ہوئے بات بنائی۔ اسے بچوں کے آنے سے قبل ہانڈی پکانی تھی، ویسے ہی دیر ہو گئی تھی، اوپر سے ساسو ماں کی گفتیش۔ وہ پہلے ہی پریشان تھی اس لیے اس وقت اچھی بات بھی بری لگ رہی تھی، ویسے بھی وہ زریں کو پسند کرتی تھی، جس نے اسے شادی کے بعد سے سکی جھٹانیوں جیسا مین دیا تھا حالانکہ وہ ریان کے تایا زاد بھائی بلال کی بیوی تھی۔

”یہ ہی تو سمجھنے کی بات ہے، ڈاکٹر پیسہ بنانے کے

لیے اٹھے سیدھے ٹیسٹ کرواتے رہتے ہیں، بھلا بتاؤ کوئی بات ہے، ہم نے اولادیں پیدا نہیں کی ہیں کیا؟ جو کچھ ہم سہہ چکے ہیں، آج کل کی لڑکیوں پر پڑے تو روتی ہوئے میکے بھاگ جائیں، مگر مجال ہے جو ہم نے منہ سے بھاپ بھی نکالی ہو، اوپر سے اس خاندان کے سیدھے لڑکے بیویوں کے پیچھے اتنے پاؤ لے بنے رہتے ہیں۔ بس نہیں چلا کہ بیوی کو ہتھیلی کا چھالا بنا ڈالیں، شرم و حیا سب ختم ہو گئی ہے، ارے بلال کے ابا تو کبھی سب کے سامنے ہمارے برابر میں نہیں بیٹھتے تھے۔“

انہوں نے ماتھے پر ہاتھ مار کر اپنے ماضی کی یادوں کو دہرایا، دو سروں پر رکھ کر سو کو بھی لتاڑا، ایسی باتوں میں تو ان کو ملکہ حاصل تھا۔ اسماء بری طرح تپ گئی دل چاہا کہ بوجھ لے، ”اپنے شوہروں کی زیادتیوں کے بدلے آپ لوگ اپنے بچوں سے کیوں لینا چاہتے ہیں؟“

”اماں۔ ڈاکٹر کچھ بہتر سمجھتے ہوں گے۔ تب ہی تو ٹیسٹ لکھ کر دیتے ہیں، اگر مریض ان کی غشا کے حساب سے علاج نہ کروائے تو کہاں جائے؟ کتنے ڈاکٹروں کو بدلے؟۔ سب کا ایک ساحل ہے، ہر کوئی علاج شروع کرنے سے قبل ٹیسٹ کروانے کو بھیج دیتا ہے، اب غلط ہو یا صحیح مریض تو مجبور ہوتا ہے، ڈاکٹروں کی مانتی ہی پڑتی ہے۔“

اسماء نے چھری ایک طرف رکھی اور رسان سے ساس کو سمجھانے بیٹھ گئی، شادی کے پانچ سالوں بعد بھی وہ ساس کی باتوں سے زچ ہو جانے کے باوجود منہ نہ بگاڑتی بلکہ نرمی سے سمجھانے بیٹھ جاتی، ورنہ رقیہ جیسی تیز خاتون کے ساتھ گزارا کرنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ گھر کے خوش گوار ماحول کے پیچھے اسماء کی قوت برداشت کا بہت عمل دخل تھا۔

”اچھا چھوٹو۔ یہ بتاؤ، وہ ریان کی دلہن کچھ بتا رہی تھی کہ بچے کی پیدائش پر اس کے میکے والے کیسی ”چھوچھک“ بھیجیں گے۔ اس دن تو بھابھی بہن کے ساتھ بہت بڑھ چڑھ کر بول رہی تھیں۔“ رقیہ فوراً ہی مطلب کی بات کی طرف آ گئیں۔

”بھی کہاں۔؟ ابھی تو اس کے بچے کی ولادت میں

بہت وقت پڑا ہے۔ پھر ریان شروع سے ایسی رسموں کے خلاف ہے۔ اور ویسے بھی میں اس سے ایسی فضول باتیں نہیں کرتی۔“

اسماء کا منہ اتر گیا، اس نے سانس کو جتایا اور تیزی سے آکو کھرچنا شروع کر دیے اور کسی پر نہ سہی بے زبان سبزی پر تو اپنا غصہ نکل ہی سکتی تھی، اس کے دونوں چھوٹے دیور ساگ نہیں کھاتے تھے، اس لیے ان کے لیے آکو کی بھیجا پکانی تھی۔

”یہ کیا بات ہوئی۔ ریان میاں کے تو ڈھنگ ہی نرالے ہیں، اب اس دنیا میں رہنا ہے تو اپنی ڈیڑھ

اینٹ کی مسجد الگ تھوڑی بنائیں گے، جو دستور ہے اسی پر چلیں گے۔ بھائی میں تو ابھی سے کہے دیتی ہوں تم اپنی اماں کو پہلے ہی بتا دینا کہ اس دفعہ چھٹی میں تمہارے گھر سے آنے والا سالن اتنا شان دار ہونا چاہیے کہ بڑی بھابھی منہ دیکھتی رہ جائیں۔“ وہ اسماء کے کانڈھے پر ہاتھ رکھ کر دھیرے دھیرے اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگیں۔

”اماں۔ اب میں آپ سے کیا کہوں؟۔ عون کی پیدائش کے وقت کی بات اور تھی امی نے نہ صرف اسپتال کا خرچا اٹھایا تھا بلکہ بچے کے علاوہ سب کے کپڑے لٹے بھی بنائے تھے، مگر اب چھوٹی بہن سلمیٰ اور بڑے بھائی کی شادی سر پر کھڑی ہے، وہ پہلے ہی اتنے اخراجات میں گھری ہوئی ہیں اب میں ان پر بوجھ ڈالتی ہوئی اچھی لگوں گی۔“ اسماء نے بے بسی سے سانس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ارے تو کوئی احسان کیا، اپنی بیٹی کے لیے کیا۔ سارا زمانہ ہی کرتا ہے۔“ وہ ایک دم بکڑ گئیں۔

”اماں! گھر میں دو شادیاں ہیں، مجھے نہیں لگتا کہ اس دفعہ امی میرے لیے کوئی خاص تیاری کر پائیں گی۔“

اسماء نے بے چارگی سے سانس کی طرف دیکھا، مگر انہیں بہو کی آنکھوں کی نمی کہاں نظر آتی، جبکہ خود ان کی آنکھوں پر جگ ہنسائی کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اسماء کو لگا تھا کہ وہ سانس کو سمجھالے گی مگر ان کے بدلے

ہوئے تو ردیکھ کر اسے اور اک ہوا کہ وہ کچھ نہیں کپائے گی، بلال بھی تو شروع سے ماں کے دباؤ میں رہے ہیں ان کے اندر ریان جیسی اخلاقی جرات بھی نہیں تھی کہ منہ پر غلط کو غلط کہہ سکیں، اسی کا خمیازہ اسماء سسرال میں بھگتی آئی تھی۔

”اے بہو۔ میں کیا بولوں، کوئی زور زبردستی تو ہے نہیں۔ یہ تو دل کی خوشی ہے۔ پہلے بھی انہوں نے میری بیٹی زارا کو صرف جوڑا بھیجا تھا، حالانکہ ہمارے یہاں دامادوں کی بہت عزت کی جاتی ہے، مگر تمہاری امی نے احسن میاں کے لیے کچھ نہ بھیجا، ہم نے ہی

اپنے پاس سے جوڑا خرید کر رکھوایا تھا، اب تمہاری مرضی ہے۔ ویسے بھی وہ بہو س اور ہی ہوتی ہیں جو میکے میں سسرال والوں کی عزت گرواتی ہیں۔ میری بیٹی زارا کو کھو اپنے بڑے بیٹے کے عقیقہ پر اس نے کیسے مجھ سے لڑکر اپنے پورے سسرال کے جوڑے بنوائے۔“ بہو کی بات سن کر ان کے منہ میں جیسے کڑواہٹ کھل گئی۔

اسماء کے سر میں درد شروع ہو گیا۔ اب وہ ان سے مزید کیا بحث کرتی کہ آپ کی تو ایک ہی بیٹی ہے، جبکہ ہم پانچ بہنیں اور ایک کمانے والا بھائی ہے، امی کو سب کی طرف دیکھنا پڑتا ہے، کسی بہن کی عیدی ہے تو کسی کے سسرال میں تقریب یا پھر کسی بہن کے گھر بچے کی پیدائش۔ اب اس منگائی کے دور میں وہ جتنا ہاتھ پیر کھینچ کر کر سکتی ہیں وہی ان کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر زارا نے زور زبردستی سے سب کچھ کروایا تو یہ کوئی اچھی بات نہیں، اسماء کو وہ دن یاد تھے، زارا کے بیٹے کا عقیقہ تھا۔ اسماء نے بڑی مشکل سے زارا اور اس کے میاں کا جوڑا، بچے کے چھ جوڑے، جھولا، پرام چیر اور کھلونے خریدے تھے، اس پر بھی زارا کا منہ بنا ہوا تھا، وہ ننھیال سے سونے کی کسی چیز کی امید لگائے بیٹھی تھی، پھر اس کے سانس سر، نند، نندی کی جوڑوں کی بھی کمی تھی۔ مزید کی گنجائش نہیں تھی بلال نے ماں کو اپنی مجبوری بتادی کہ وہ منخواہ دار انسان کہاں سے مزید کچھ کپائے گا؟ یہ سب بھی اسماء کی کفایت شعاری

کے سبب ہو پایا تھا۔ آخر اس کی ساس نے اپنے کانوں کے ٹاپس بچ کر زار کی فرمائشیں پوری کیں۔



”ارے۔ آپ! وہ سامنے دیکھیں۔ اسماء بھابی لگ رہی ہیں، میں نے کل ان کی کمیٹی کے پیسے دیے تھے، لگتا ہے بہن کی شادی کے لیے شاپنگ کرنے آئی ہوں گی، چلو نا۔ دیکھتے ہیں کیا کیا خریدا؟“

زیریں نے بڑی سی چادر میں لپٹی ہوئی اسماء کی طرف اشارہ کیا جو اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ ایک دکان کی

طرف تیز تیز قدموں سے بڑھ رہی تھی۔ زیریں اور اس کی بڑی بہن شیریں بھی شاپنگ کے ارادے سے اس مال میں آئی ہوئی تھیں کہ زیریں کو اسماء نظر آگئی وہ بہن کا ہاتھ تھام کر تیزی سے اسماء کے پیچھے بھاگی۔

”یہ کیا بھابی کہاں جا رہی ہیں؟“ اسماء کو نومولود بچوں کے سامان کی شاپ میں گھسنا دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ پیچھے پیچھے وہ بھی دکان میں داخل ہو گئی، جہاں بچوں کا خوب صورت اور منگنا سامان موجود تھا۔ اسماء ایک خوب صورت گلابی رنگ کے نیٹ لگے گدے کی قیمت کم کروانے پر تکی ہوئی تھی اور سیلز مین اسے سمجھا رہا تھا کہ یہاں ”رائس فکسل“ ہوتی ہے۔

”بھابی۔ آپ تو کہہ رہی تھیں کہ بہن کے جینز کے کپڑے خریدنے جا رہی ہیں۔“ صبح میکے جاتے ہوئے اسماء جب گھڑی بھر کو زیریں کے کمرے میں آئی تو اس نے یہ ہی بتایا تھا ”اسماء نے آواز پر مڑ کر دیکھا تو زیریں کو سامنے کھڑا پایا اس کی کیفیت ایسی ہو گئی کہ کانٹو تو جسم میں لہو نہیں۔“

”وہ۔۔۔ زیریں۔ اصل میں بات یہ ہے کہ۔۔۔“ آنسوؤں سے گلا ایسا رندھا کہ بولا ہی نہیں گیا۔ شیریں اور زیریں اسماء اور اس کی بہن کو لے کر مال میں موجود کولڈ شاپ میں آگئے۔ ٹھنڈا بنانا شیک پینے کے بعد ان سب کے حواس درست ہوئے تو اسماء نے بولنا شروع کیا۔

”بلال۔ مجھے جو جیب خرچ دیتے تھے اس سے

میں نے تمہارے پاس یہ کمیٹی ڈالی، سوچا تھا کہ بہن کو شادی پر جو دوں کی سودوں کی الگ سے یہ پیسے بھی اماں کے ہاتھ پر رکھ دوں گی کہ وہ کچھ خرید لیں گی، اسی لیے تم سے غلط بیانی بھی کی۔ مگر بلال کی امی کا ”چھوچھک“ کا مطالبہ سن سن کر میرے کان پک گئے۔ ان حالات میں اپنی امی کو کیا پریشان کرتی، اسی لیے بلال سے مشورہ کیا کہ کمیٹی سے خود ہی چھوچھک کا سامان لے آؤں، وہ میرے گھر کے حالات سے بھی واقف ہیں، خود اپنی امی کی فرمائشوں پر آکتائے ہوئے تھے مگر وہاں سے زبان درازی کر کے ان کا دل دکھانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ بولے کہ یہ تمہارے پیسے ہیں جیسے چاہے خرچ کرو، میں اسی لیے شمع کو لے کر بازار چلی آئی تھی کہ بچے کی خریداری مکمل کر لوں، پھر امی کی طرف سے یہ سب دے دوں گی۔“ اسماء کی نگاہیں شرمندگی سے دیو رانی کے آگے اٹھ نہیں پارہی تھیں، وہ کچھ نہ کرتے ہوئے بھی مجرم سی بن گئی۔

”بھابی! یہ پیسے آپ نے اپنی بہن کو تحفہ دینے کے لیے رکھے تھے نا اسی کو دیتے تھے گا۔“ زیریں نے افسردگی سے اسماء کو دیکھا اور بولی۔

”وہ ”چھوچھک“ کا کیا ہو گا؟“ اسماء خود بھی دل سے یہ ہی چاہتی تھی مگر ابھی ایک تلواریں اس کے سر پر لٹک رہی تھی اسی لیے پوچھنے لگی۔

”ارے۔ اس کی فکر نہ کریں۔ اس بار بچہ اپنی دادی اماں کے پیسے ہی خرچ کرائے گا۔“ زیریں نے کچھ منٹے ہوئے کہا، اسماء نے کیفیوز نظروں سے زیریں کو دیکھا، وہ کچھ سمجھی نہیں مگر زیریں نے اسے نوٹس کا بورڈ لگا دیا اور خوش باش سی مجمع سے باتیں بگھارنے میں مشغول ہو گئی۔



”اے بچو! کارت ہو بیس آجاؤ۔“ رئیسہ خالہ نے اسماء اور زیریں کو آواز دے کر پاس بلا لیا۔ وہ سب ٹیرس پر کرسی ڈالے خوش گہوڑوں میں مصروف تھے۔ سیماء خالہ کے پاس ہی زمین پر بیٹھے کارپٹ پر بیٹھی اپنے

بچے کا دھرا (دلانی) سلوار ہی تھی۔ خالہ رنگ برنگے ٹکڑوں کی ٹاپ تول میں مصروف تھیں، پاس ہی بلال، ریان اور دوسرے گھروالے خوش گہیوں میں مصروف تھے۔ جمیلہ خاتون بھی تخت پر بیٹھی بچوں کو ہنستا مسکراتا دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔ آج تو رقیہ بھی بن بلائے نیچے اتر آئی تھیں۔

”بھائی۔ سنا۔ خالہ کیا پوچھ رہی ہیں؟“ سیمانے جوش میں ریان کو پکارا۔

”جی۔ خالہ! کیا بات ہے؟“ وہ خوش گوار موڈ میں خالہ کی طرف متوجہ ہوا، انیس النساء بھی دال چھتی ہوئی وہیں آ بیٹھیں۔

”ارے۔ کالہ بٹوا (بیٹا)۔ بہن کا نیک تیار کرت ہو؟“ وہ مسکرا کر بولیں۔

”بہن کو کچھ چاہیے تو ایسے ہی مانگ لے یہ نیک ویک کیا ہوتا ہے؟“ ریان کے کانوں میں آج کل ماں کی طرف سے مسلسل ایسی ہی باتیں پڑ رہی تھیں، اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

”اے بھیا! وہ سب الگ، مگر اب تو اس کا حق ہو دے ہے نا، پھوپھو بننے پر اس کے لیے سونے کا کوئی بالی پتا بنوانا چاہیے۔“ خالہ نے مسکرا کر کہا، سیمانے خوشی سے پھولے تھیں سارہی تھی۔

”ہائے، ہائے صرف اس کے لیے کیوں؟ کیا شیما بہن نہیں ہے؟ دونوں بہنوں میں فرق کرے گا۔“ رئیس النساء نے جلدی سے مداخلت کی۔ ریان کچھ بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔

”ارے۔ منو کی پیدائش پر تو ہماری مندریں جمع ہو گئیں، اور جو بٹلو ہیا (پیشل کا برتن) بجانا شروع کیا تو مت پوچھو، اس وقت تو ایک بھینس ہی بندھی تھی انگنا میں، ہم نے فوراً کھول کر رسی ان کے ہاتھ میں تھما دی، جب جا کے شور تھا، بھیا۔ بہنوں کو ایسے نیک دیا جاتا ہے۔“ خالہ نے بتایا۔

”ہاں، ہاں یہ بھی بتائیے نا کہ اس کے بعد کتنے دنوں تک ہم بچو کے لیے رشتے داروں کے یہاں سے دودھ مانگ مانگ کر لاتے رہے۔ ارے سب پھالتو بات

ہے، ان کو تو بس اپنی واہ واہی کی پڑی تھی، بے سوچے اتنی مہنگی بھینس کھول کر دے دی۔ بھیا۔ ہم منع کرتے رہ گئے۔ انسان اتنا ہی کرے جتنی اس کی اوقات ہو۔“ علیم خالو نے چڑ کر بیوی کو گھورا۔

”اے لومیاں تو کیا ہوا؟ پوری برادری میں کتنا چڑھا بھی تو ہوا کہ علیم صاب کتنے دیا لو ہیں۔“ خالہ نے ان کی بات کو خاطر میں لائے بغیر دلار سے کہا۔

”تو صحیح بات ہے نا ایسے موقع زندگی میں بار بار تھوڑی آتے ہیں، یہ ہی تو وقت ہوتا ہے، جب انسان کی ناک اپنے خاندان میں اونچی ہو جاتی ہے،“ انیس

النساء نے مسکرا کر بیٹے کو حتمایا، ریان کا منہ لال ہو گیا۔

”ہا، ہا۔ بھابھی! حق بات کرتی ہو۔“ رقیہ نے بھی ٹھنڈی سانس بھر کر جٹھالی کا ساتھ دیا، بلال نے فوراً پہلو بدلا۔

”بڑی دلہن نے ایسی کون سی حق بات کی ہے؟ جو تم اتنی ٹھنڈی سانسیں بھر رہی ہو۔ میں تو ان خرافات کے سخت خلاف ہوں۔ یہ ہی دیکھ لو کہ بچے یا بچی کی پیدائش خاندانوں کے لیے خوشی کی گھڑی ہوتی ہے، مگر ہمارے یہاں تو اس خوش گوار موقع پر دوسروں کے اوپر بے جا بوجھ لاد دیا جاتا ہے۔ بچے کی پیدائش پر ہمارے مذہب میں جو امر بھی لازم ہیں۔ اس میں تو مولود کی بہتری کا فرما ہوتی ہے، جیسے حقیقہ، کانوں میں اذان دینا یا تو مولود کا بال منڈوانا۔ مگر یہاں تو نت نئی رسموں کو اپنالیا گیا ہے، جیسے چھٹی پھلہ یا سوا مہینہ کی تقریب وغیرہ۔ بچے کی پیدائش پر ننھیال والوں پر بے جا خرچے کا بوجھ بار لادنا کہاں کا انصاف ہے، بھئی؟“ ریان کی دادی جمیلہ خاتون نے دونوں بہنوں کو ایک ساتھ لتاڑ کے رکھ دیا۔ اسماء اور زریں کے سوا ساری خواتین کے منہ بن گئے۔

”یہ اماں۔۔۔ بھی نا۔ ایسے ہی رنگ میں بھنگ ڈالتی ہیں۔“ انیس النساء نے بہن کے کان میں سرگوشی کی۔

”دادو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ایسی لغو رسومات میں دکھاوے کا جو عنصر ہوتا ہے۔ اس سے اسلامی اقدار کی پامالی ہوتی ہے، بلکہ صاحب حیثیت

ایسے موقعوں پر جو دھوم دھڑ کے انتظام کرتے ہیں، اس سے دوسروں کو بھی تقلید کا موقع ملتا ہے جس سے معاشرے میں بڑھتی ہوئی رسہ کشی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور غریب طبقہ بے جا تکلفات اور تکالیف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بلال کے اندر ملنے والا لاوا آخر باہر نکل آیا۔ رقیہ منہ پھاڑے بیٹے کو تک رہی تھیں جو آج بڑھ چڑھ کر بول رہا تھا۔

”ارے بیٹا۔ یہاں تو ہم لوگوں نے زندگی کے ہر معاملے کو فرسودہ رسومات کے جال میں پھنسا دیا ہے، خود بھی الجھ گئے ہیں۔ شادی بیاہ کو ہی لے لو اسلام میں

اس فرض کی ادائیگی کتنی سادہ اور آسان طرز پر ہے مگر یہاں تو پہلے ہی ہندوؤں کے ساتھ ایک عرصہ گزارنے نے کچھ کم قہر ڈھایا تھا کہ اب ان کے گھر گھر میں چلنے والے انڈین ڈرامے اور فلمیں اپنی ثقافت کا یوں پرچار کرتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ ان کی تقلید میں ان سے بھی آگے بڑھ گیا وہ کیا کہتے ہیں ”شاہ سے بڑھ کر شاہ کے وفادار“ مسلمان گھرانوں میں ایسی ایسی رسموں کی ادائیگی تقاخر سے کی جاتی ہیں جن کی ہم سے دور کی بھی نسبت نہیں۔ منگنی، مابجھا، مہندی، رت جگا، جینر پنچائی، بارات، سلائی — چوتھی چالے وغیرہ جن کی وجہ سے نہ صرف بہت وقت برباد ہوتا ہے بلکہ اس میں فریقین کے پیسوں کا زیاں بھی ہوتا ہے اور اس کا سب سے منفی پہلو یہ ہے کہ ہمارے بچوں کے ذہنوں میں یہ باتیں ایسی رچ بس گئی ہیں کہ ایک شادی کی تقریب میں شریک بنی اپنی ماں سے پوچھتی ہے کہ ”مما۔ پھیرے کب ہوں گے“ بھلا جتاؤ اس سے زیادہ مذہب سے دوری کی دوسری مثال کیا ہوگی؟“ وہ ایسے جوش میں بولیں کہ سب کے منہ پر تالے پڑ گئے، انیس النساء اور رقیہ پہلو بدلتی یہ کہیں مگر ساس کے سامنے ان کی چل نہیں پار ہی تھی۔ ریس النساء الگ سر جھکائے تو ہراسینے میں لگ گئیں۔

”آپ لوگ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ہم کا بتائے کہ وہاں انڈیا میں تو مسلمانوں کا اس سے بھی جیادہ برا حال ہے، ہندوؤں کے ساتھ وہ رہ کر ان کے جیسے ہو گئے ہیں وہاں مسلم گھرانوں میں بھی دولہا بکتا ہے۔“

علیم خالو نے بھی میدان سنبھالا۔
”کیا مطلب خالو؟“ ریان نے حیران ہو کر پوچھا۔
سب ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”ارے بھیا کا پوچھت ہو۔؟ وہاں جو لڑکا سرکاری نوکر ہو تو لگن (منگنی) پر پچاس ہزار یا اس سے بھی جیادہ پیسہ مانگے ہے اور چھوٹا موٹا کام کرنے والا بھی کم از کم لڑکی کے ابا سے چندہ ہزار مانگے ہے، وہج میں پھور و ہیل (کار) یا کم از کم اسکوٹر تو لازمی بننا پڑتا ہے۔“ علیم خالو نے دکھ سے حقیقت بیان کی۔

”ارے بیٹا۔ ہمارے مذہب میں تو بہت آسانیاں ہیں، مگر مشکلات، ہم خود اپنے لیے پیدا کر لی ہیں، اب نئی نسل سے امیدیں وابستہ ہیں۔ مجھے ریان سے تو پوری امید ہے اور وہ میری امیدوں پر کھرا بھی اترتا ہے۔ مگر بلال! میں تم سے بھی یہی توقع رکھتی ہوں کہ باپ بنے جا رہے ہو تو بچے کی ذمہ داری بھی اٹھانا سیکھو۔“ جلیلہ خاتون نے دونوں — ولی عہدوں کو پیار سے مخاطب کیا تو بلال نے سر ہلا کر تائید کی۔

”رقیہ۔ تمہارے ہاتھوں میں تو بہت سلتہ ہے۔ سلائی کڑھائی کے فن سے آگاہ ہو، کچھ کلم میں بھی کر لیتی ہوں، کیوں نا۔ اس بار میں اپنے پڑپوتے کے لیے اپنے ہاتھوں سے کپڑے سیوں؟ اس پر کشیدہ کاری تم کر لیتا، اپنی مشین نکل کر جھاڑ پونچھ لینا۔ میں کل سے اوپر بیٹھ کر تمہارے ساتھ مل کر بلال کے بچے کے کپڑے سیوں گی۔“

انہوں نے بہو کو مخاطب کیا تو رقیہ نے باطل درخواست سر ہلا دیا، ویسے بھی اب ان کے پاس بولنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔

بلال نے دادی کو پیار سے دیکھا، زریں نے اسماء کا ہاتھ نرمی سے دبایا۔ اس نے ہی دادی ساس کو فون کر کے اسماء کی مجبور یوں اور رقیہ کے فرمائشی پروگرام سے آگاہی فراہم کی تھی اور جلدی گھر لوٹنے کا کہا تھا۔ اسماء نے مسکرا کر پہلے دادو ساس اور پھر شوہر کو دیکھا۔ دل میں جیسے قطار در قطار امید کی شمعیں روشن ہونے لگیں۔

لیکچر پالیسی

صوفی! ”وہ کہے بنا نہیں رہ سکا تھا۔ حالانکہ صوفی کے سابقہ ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے وہ جانتا تھا کہ وہ ایک اور چکر لگوا کے رہے گی اور حسب عادت صوفی نے اس کی ہدایت کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیا تھا۔



نہ جانے کیا بات تھی کہ جب بھی وہ کوئی چیز خرید کر

لائی تو دلدلی ہو جاتی تھی۔ خریدتے ہوئے ایک دل کہتا کہ لے لے۔ چیز بہت اچھی ہے۔ دوسرا خیال آتا نہیں رہنے دو۔ پھر جب وہ لے آتی تو اندر ہی اندر پریشان ہوتی کہ کیا اٹھا لائی ہوں۔ پھر سوچتی بدل لیتی ہوں۔ پھر ڈرتی کہ امی ڈانسیں گی۔ پھر خوف زدہ ہوتی کہ سب مذاق اڑائیں گے۔ پھر کوئی اچانک ہی بازار جانے لگتا تو وہ بھی چپکے سے ساتھ ہو لیتی اور بدل کے کوئی اور چیز لے آتی۔ اب تو سب ہی اس کی اس عادت سے واقف ہو گئے تھے۔

اگر کبھی اس کے خیال کی رو بھٹکتی تو وہ لرز جاتی کہ اگر اس کی قسمت میں بھی کوئی ایسا ہی جھول ہوا جیسا اس کی لائی چیزوں میں ہوتا ہے تو۔۔۔ اس تو کے بعد دل خوف میں جکڑا جاتا اور وہ سوچ کو لگام ڈالتے ہوئے دھیان بٹاتی۔

”اچھا گمان رکھنا چاہیے۔“ وہ یہ سوچ کر خود کو تسلی دیتی۔

اور پھر اس کی شادی ہو گئی۔ اسے جو شو ہر ملا تھا وہ کہیں کھویا کھویا رہتا تھا۔ وہ سوچتی مجھے ایک بٹا ہوا شخص ملا ہے ”آدھا ادھورا“ ایک ہی اذیت کم نہیں

”سب سے پہلے تو یہ رسید ادھر دو مجھے ذرا۔ میں اس کے دو ٹوٹے کر کے ادھر ہی پھینک دوں۔“ اسجد نے صوفی کے ہاتھ میں موجود بل کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔ صوفی نے جلدی سے بل پیچھے کر لیا تھا۔

”جی نہیں۔ میں سنبھال کے رکھوں گی یہ سلب۔“ کہتے کے ساتھ ہی اس نے رسید اپنے پاؤں میں ڈال لی۔ وہ لوگ کپڑے کی ایک برانڈ کے اسٹور میں کاؤنٹر پر کھڑے تھے۔ صوفی نے سوٹ والا بیگ کاؤنٹر سے اٹھایا۔ اسجد نے شرارت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”کل تم نے پھر آجانا ہے سوٹ ایکسچینج کرنے۔ ایک تو یہ بہت مسئلہ ہے۔“ بات کرتے ہوئے وہ منبر سے مخاطب ہو گیا تھا۔

”آپ لوگ ایکسچینج پالیسی ختم کیوں نہیں کر دیتے۔“ اس نے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے منبر سے جیسے درخواست کی تھی۔

منبر اپنی پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ ”سر! کمپنی پالیسی ہے“ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

”کیوں ختم کر دیں۔ کیش ری فنڈ ابل تو ہے نہیں اب ایکسچینج تو ہمارا حق بنتا ہے نا جو پیسے ہتھیا لیے ہیں وہ تو واپس ملتے نہیں چیز تو ہماری پسند کی ہونا چاہیے نا“

صوفی نے پوری دل جمعی سے اپنا نقطہ نظر بیان کیا تھا۔ وہ لوگ اب اسٹور سے باہر نکل رہے تھے۔ لیکن

اسجد کا اعتراض وہی تھا۔

”لیکن اب تم چینج ہرگز نہیں کرواؤ گی یہ سوٹ

تھی کہ وہ فرقان کی پہلی پسند نہیں ہے۔ ساتھ اس کی بے اعتنائی کو بھی جھیلنا ایک مشکل ترین کام تھا۔ اس نے اپنے بھائیوں کو اپنے سارے گزرتوں کو دکھا تھا۔ اپنی بیویوں سے ان کا التفات اور چاہت دیکھنے لائق تھی۔ حالانکہ وہ سب شکلا "کوئی رانیاں نہیں تھیں" لیکن ان سب کی زندگیوں میں راجے آگئے تھے۔ وہ بھی کچھ ایسا ہی چاہتی تھی لیکن فرقان اس کو وہ محبت توجہ اور اپنائیت نہ دے پاتا تھا جس کی وہ توقع کے ہوئے تھی۔ اس نے ایک محبت کرنے والے ہم سفر کی چاہ کی تھی جو پوری نہ ہو پائی تھی۔ اس کے پاس اور کوئی راہ نہ تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اطاعت و فرماں برداری کی راہ اپنائے گی۔ فرقان کی ہاں میں ہاں ملا کر وہ ابھی شادی کے چھ ماہ ہی گزار پائی۔ کسی مشکل لمحے میں صوفی کو ایچ پیج پالیسی یاد آجاتی۔ ایک لمبا راستہ زندگی کا آگے پڑا تھا۔ کیسے گزرے گا۔ یہی سوچیں اسے ادھ موا کر دیتیں۔



آج وہ اسجد کے ساتھ میکے آئی تھی۔ یہاں آکر اس نے سب کے سوالوں سے بچنے کے لیے بہت سے کام جمع کیے ہوئے تھے۔

”امی! مجھے فلاں ڈش بنانا نہیں آتی۔ فلاں کھانا میں نے کبھی نہیں بنایا۔ آپ بتائی جائیں میں بناتی ہوں۔“

وہ اونچا اونچا بولنے لگی تھی اب۔ وہ کاموں میں کھپ کر رویوں کو بھولنا چاہتی تھی۔

اسجد اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھتا تھا کہ وہ چمک کہاں غائب ہو گئی ہے جو ہر صبح اس کے جاگنے پر اس کی آنکھوں میں لشکارے مارتی تھی۔ اسجد اداس ہو جاتا۔ اس کی بہن بھتیجی مسکراتے ہوئے زندگی گزارنے کی خواہش مند تھی، لیکن اداس رہنے لگی تھی۔ وہ دونوں بچپن سے ہی اچھے دوست تھے۔

”کہاں کھوئی رہتی ہو تم؟“ اسجد نے اپنے ازلی محبت بھرا انداز میں اسے مخاطب کیا تھا۔ لیکن درپردہ ایک درد تھا۔ بہن کی اداسی کا درد۔

”میں تو یہیں ہوں۔ تمہیں فرصت نہیں بہن کے پاس بیٹھنے کی۔“ صوفی بھی چارج ہو کر بولی تھی۔

”بڑی باتیں آگئی ہیں تمہیں۔ مانا مجھ سے ایک سال سینئر ہو۔ شادی بھی ہو گئی ہے لیکن عقل مجھ سے کم ہی رہے گی تمہاری یاد رکھو۔“

یہ صرف ایک بات نہیں تھی تسلی بھی تھی کہ ”پریشان مت ہو“

نہ جانے کیسے تھی لیکن تھی۔ صوفی مسکرا رہی تھی، لیکن اس کی آنکھیں نم ہو گئیں کہ دل کا حال عیاں ہو گیا۔ اسجد کے چہرے کے تاثرات اس کے لیے تسلی اور دعا بن گئے تھے۔

”چیزوں کو رشتوں کو تھوڑا وقت ضرور دینا چاہیے۔ تم نے ایکچینج پالیسی کو بہت استعمال کیا ہے نا تو سوچو۔ سب سے بہترین ایکچینج پالیسی قدرت کی ہوتی ہے۔

ہم انسان تو محض چیزوں کو بدل سکتے ہیں۔ لیکن یہ

قدرت ہے کہ وہ انسان کو ہی بدل دیتی ہے۔ باہر سے انسان وہ ہی رہتا ہے۔ لیکن اندر سے یکسر بدل جاتا ہے۔ قدرت انسان کو اندر سے بدلتی ہے اور اندر تک بدل دیتی ہے۔ تم اپنے یقین کو مضبوط رکھو بس۔“

صوفیہ نے حیرت سے اس کی بات سنی تھی اور اس کی گہرائی میں ڈوب گئی تھی۔ سوچتی تو وہ بھی۔ غور بھی کرتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی کسی کی تسلی کٹھن سفر کے لیے ہمیں از سر نو تازہ دم کر دیتی ہے۔ وہ نئے سرے سے پُر امید ہو گئی تھی۔

اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا۔ ”بنا بنایا نیا فرقان ہے یہ تو۔“ سب اسے دیکھتے جاتے اور کہتے جاتے تھے۔ اپنے بیٹے کو پہلی بار پیار کرتے ہوئے فرقان نے یوں محسوس کیا تھا کہ وہ نئے سرے سے پیدا ہوا ہے۔ ماضی کے تمام غم خوشیاں پیچھے رہ گئی تھیں۔

صوفیہ حیران تھی کہ یہ کیسا بدلاؤ آیا ہے۔ وہ ست رنگا بدلاؤ جو اس نے کبھی چاہا تھا، وہ ہی چاہنے والا بہترین دوست سا، اپنا اپنا سا، ایسا ہم سفر جس کے اس نے کبھی سنے دیکھے تھے اجنبیت کی روکھے پن کی ساری دیواریں گر گئی تھیں۔ سب کے سامنے وہ بلال کے صدقے واری جاتا اور جیسے ہی دادی پھوپھی بلال کو لے کر کہیں آگے پیچھے ہوتیں وہ صوفیہ کی کلائی پکڑ لیتا۔ ساری باتیں۔ سارے رنگ۔ سارے خواب۔ ساری خوشیاں اس سے بانٹنے لگتا۔ صوفیہ کے اندر کہیں گونج اٹھتی کہ اسجد نے صحیح کہا تھا۔

”سب سے بہترین ایکچینج پالیسی قدرت کی ہوتی ہے۔“

چیزیں بدلنے کے لیے کمپنیوں کی ہزاروں شرائط ہوتی ہوں گی لیکن قدرت اپنی ایکچینج پالیسی پر صرف یہی شرط رکھتی ہے۔ صبر، انتظار، خاموشی، رضا، مشکوہ، شکایت نہیں۔ واویلا نہیں اور مایوسی تو ہرگز

☆

نہیں!



اک طرف طلب تیری، اک طرف زمانہ ہے
پوچھتا ہے دل مجھ سے کس طرف کو جانا ہے

میرے گھر وہ آئے گا، آج گھر سجانا ہے
اس طرف کی چیزوں کو اس طرف لگانا ہے

یقین کر لو

محبتوں کی کہانیوں پر
مجھے تو بالکل یقین نہیں ہے

کہ اس طرح کی محبتوں کا
وجود تم کو

کہیں فسانوں میں ہی ملے گا
مگر مری جاں!

یقین نہ رکھتے ہوئے بھی تم سے
میں عشق ایسا ہی کر رہا ہوں
یقین کر لو!

عطا تراب

نقش ہائے رنگیں کا اک نگار خانہ ہے
زندگی حقیقت ہے، زندگی فسانہ ہے

پائیں گے خوشی بھی ہم، رنج و غم بھی پھیلے گے
اس جہاں میں جب تک اپنا آب و دانہ ہے

دشمنوں کے طعنے ہیں دوستوں کی تنقیدیں
تیر سینکڑوں ہیں اور ایک دل نشاۂ ہے

آتشیں ہے لہجہ بھی، گفتگو بھی بارودی
سوچے شفیق، اس سے کس طرح نبھانا ہے

شفیق احمد شفیق

محبت لائے اب سوغات کوئی
بدل دے صورتِ حالات کوئی

یہ کیسا اختیارِ زندگی ہے
دن اپنلے نہ اپنی رات کوئی

غبارِ آلود صبحِ شہرِ جاں ہے
سفر میں قافلہ مہتا رات کوئی

میں جو کچھ ہوں تری ہی ذات سے ہوں
میسری اپنی نہیں ہے ذات کوئی

میں بارِ غم اٹھا سکتی ہوں تنہا
میرے ثلنے پہ رکھ دے ہات کوئی

میں ادجھل ہو گئی ماں کی نظر سے
گلی میں آئی جب بارِ رات کوئی

زمینِ دل بڑی زرخیز تھی نور
برس جاتی اگر برسات کوئی

شہناز نور

تسکینِ دلِ محروم نہ ہوئی، وہ سٹی کرم فرما بھی گئے
اس سٹی کرم کو کیلہ کیے، بہسلا بھی گئے، ترپا بھی گئے

آشفگیِ وحشت کی قسم، حیرت کی قسم، حسرت کی قسم
اب آپ کہیں کچھ یا نہ کہیں، ہم رازِ تبسم پا بھی گئے

رودادِ غمِ اُلفت ان سے ہم کیا کہتے، کیوں کر کہتے
ایک حرف نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھوں میں آنسو ابھی گئے

اربابِ جنوں پر فرقت میں اب کیلہ کیے، کیا کیا گزری
آٹے تھے سوادِ اُلفت میں کچھ کھو بھی گئے، کچھ پا بھی گئے

یہ رنگِ بہارِ عالم ہے، کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی
مخل تو تری سونی نہ ہوئی کچھ اٹھ بھی گئے، کچھ آ بھی گئے

اس مخلِ کیفِ مستی میں، اس انجمنِ عرفانی میں
سب جامِ بکف بیٹھے ہی رہے، ہم پی بھی گئے، چھلکا بھی گئے

اسرار الحق مجاز

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”اگر تم اتنی غلطیاں کرو کہ تمہاری غلطیاں آسمان تک پہنچ جائیں پھر توبہ کرو تو (پھر بھی) اللہ تمہاری توبہ قبول فرمائے گا۔“
فوائد و مسائل:-

۱۔ یہ ضروری ہے کہ انسان گناہ کے بعد جلد از جلد توبہ کرے، تاہم اگر نفس اور شیطان کے بہکاوے اور دل کی غفلت کی وجہ سے جلد توبہ نہ کی جاسکے تو جب بھی احساس ہو، توبہ کر لینی چاہیے۔ یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ اتنے زیادہ گناہ ہو گئے ہیں۔ وہ معاف نہیں ہوں گے۔ البتہ توبہ وہ ہے جو دل سے ہو، صرف زبان سے نہ ہو۔

شریک گناہ

جھوٹی دنیا میں دوٹ مانگنے والا سچا آدمی ناکام ہو جاتا ہے گا اور بُرے آدمی کو دوٹ دینے والا بھی بُرائی میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔
(واصف علی واصف)

اقوال دانش

پچاس سال کے بعد سارے شہر کی آبادی ساری کی ساری بدل جاتی ہے۔

بات چیت

جارج برنارڈ شاویں بیوی کے ساتھ ایک ڈانس پارٹی میں شرکت کے لیے روانہ ہوئے لیکن واپس آئے تو

اس قدر ناراض کہ ایک دوسرے سے بات چیت کرنے کے روادار نہیں تھے۔

برنارڈ شاویں سے گاڑی کو گیاراج میں لے گئے۔ نیچے اترے، اسے لاگ کیا اور باہر آئے۔ گیاراج کا دروازہ مقفل کیا اور سونے کو لیے چلے گئے۔ نصف شب کو ان کی آنکھ کھلی تو بیڈ روم میں

بیوی کو غائب پایا۔ وہ سمجھے کہ بیوی انہیں چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ وہ گیاراج میں یہ دیکھنے کے لیے گئے کہ کہیں مسران کی قیمتی گاڑی تو نہیں لے گئیں۔ برنارڈ شاویں نے گیاراج کی لاٹ جلائی تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ گاڑی لاگڈ تھی اور اندران کی بیوی گھڑی بنی پڑی تھی۔

سٹر شاویں نے جلدی سے گاڑی کو کھولا اور ترمی سے بولے۔

”تم نے چلا کر مجھے بتادیا ہوتا کہ میں تمہیں بند کیے جا رہا ہوں۔“

”کیسے بتائی؟“ ان کی بیوی نے کہا۔ ”ہماری آپس میں بات چیت جو بند تھی۔“
نمرہ، اقرأ۔ کراچی

دلچسپ وجہ

امریکی ایڈمرل رابرٹ برسکو جنوبی یورپ میں اتحادی فوجوں کے کمانڈر انچیف کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تو ان کے ایک دوست نے ان سے دریافت کیا۔

”ایڈمرل! تم یہ بتاؤ تم نے بحریہ میں بھرتی ہونے کا فیصلہ کیوں کیا تھا؟“

ایڈمرل نے جواب دیا۔ ”جب میں چھوٹا بچہ تھا تو

میرے والد مجھے ایک جنگی جہاز دکھانے لے گئے۔ وہاں میں نے ملاخوں کو جہاز کے عرشے پر ننگے پاؤں چلتے دیکھے۔ میں نے اس وقت اپنے دل میں فیصلہ کیا کہ میں بحریہ میں بھرتی ہوں گا۔ اصل میں بات یہ تھی کہ میرے والد نے اسی روز مجھے جوتے جوتے لے کر دیے تھے، وہ میرے پاؤں کو کاٹ رہے تھے۔ اور میرا دل ننگے پاؤں چلنے کو چل رہا تھا۔“

یہ ریڈیو پاکستان ہے،

ایک بار ریڈیو پاکستان راولپنڈی کے ڈیوٹی اور انجینئرنگ اسٹاف کو لانے والی گاڑی خراب ہو گئی اور صبح کا پروگرام چلانے کے لیے نہ آ سکے۔ ڈیوٹی پر موجود چیرا سنی نے جب یہ دیکھا کہ ڈیوٹی آفیسر ہے اور نہ

انجینئرنگ اسٹاف تو اس نے کنٹرول روم کے کل پرزے اسٹارٹ کر دیے۔ اسٹوڈیو میں جا کر مائیکروفون کے سامنے بیٹھا اور بولنے لگا۔

”السلام علیکم اصبح کھرے جارہے ہیں۔ نہ ڈیوٹی اسٹاف آ رہے نہ انجینئرنگ۔ میں عبدالحکیم چیرا سنی بول رہا ہوں مجھے پتا ہے کہ آپ اس وقت تلاوت کلام پاک سنتے ہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے بین دبا دیا اور گھروں میں ریڈیو سیٹ تلاوت کلام پاک سے منقطع ہو گئے۔

گمان،

سکندر اعظم اپنے آپ کو انسان نہیں سمجھتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ کسی قسم کا دیوتا ہے۔ جنگ میں اسے پہلی مرتبہ زخم لگا تو اسے تعجب ہوا کہ مہولی آدمیوں کی طرح اس کے زخم سے خون کیوں بہہ رہا ہے۔

بے نیازی،

نئے نئے دولت مند ہونے والے میاں بیوی لودپ کی سیر کو چلے گئے۔ واپسی پر ان کے دوست احباب بے چینی سے ان کے سفر کا حال سننے کے منتظر تھے۔ ان کے اعزاز میں دی گئی ایک دعوت میں ایک خاتون نے نو دولت مند کی بیگم سے پوچھا۔

”آپ نے روم کو ابھی اپنے دورے میں شامل رکھا تھا یا نہیں؟“
”مجھے تو معلوم نہیں۔“ بیگم نے بے نیازی سے کذمے اچکا کر کہا: ”لگتے ہیں میرے شوہر خرید کر لے گئے تھے؟“
شہانہ عذلیب۔ گوہر انوالہ

چلنے کے متعلق رائے،

۱۔ چلنے کی باقاعدہ اپنی ایک تاریخ ہے۔
(بین الاقوامی ٹیکنیشن)

۲۔ چلنے جادوئی مصنوعات میں سے ایک ہے اور شاید دنیا کا آنکھوں عجوبہ بھی۔
(عظیم مفکر)

۳۔ کیا چلنے کے ایک کپ سے بہتر بھی کوئی چیز ہے۔
(ونسٹن چرچل)

۴۔ چلنے کا کپ ہی زندگی ہے۔
(گریت گرائنڈ مایبول)

۵۔ اگر چلنے کا ایک کپ نہ ملے تو اس سے بڑی اور کوئی تکلیف نہیں۔
(ہرنارڈیال)

۶۔ جہاں چلنے ہے وہاں امیدیں ہیں۔
(سر آر تھرو پینرو)

۷۔ جس ملک میں چلنے ناپید ہو وہاں زندہ رہنا مشکل ہے۔۔۔
(ٹوائل کوارد)

۸۔ ہم جاہلانہ انداز سے زندگی بسر کر سکتے ہیں لیکن چلنے کے ایک شاندار کپ کے بغیر نہیں۔
(ملاچی میک گورمک)

۹۔ اگر آپ سرد مزاج ہیں تو چلنے آپ میں جوش پیدا کر دے گی، اگر آپ نسبتاً گرم ہیں تو یہ آپ کو ٹھنڈا کر دے گی۔ اگر آپ پریشان ہیں تو آپ کے چہرے پر سکلاہٹ بھر دے گی۔
(گلیڈ اسٹون۔ بٹلاری وزیراعظم)

سیدہ نسبت ذہرا۔ کھروڈ پکا

ترجیع،
شطن رخ کے ایک کھلاڑی نے دوسرے سے پوچھا۔
”کل بھی کیلئے آؤ گے ناں...؟“

دوسرا کھلاڑی سر کھاتے ہوئے لولا۔
 ”کل تو میری شادی ہے۔ لیکن خیر کوئی بات نہیں۔
 میں شادی ملتوی کر دے گا۔“
 نوال افضل کھن۔ لاہور

خوف اور خواہش،

خوف دراصل خواہش سے جنم لینے والی کیفیت
 ہے۔ جو لوگ دنیا کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ خوفزدہ رہتے
 ہیں۔
 (بالقدر سیہ)
 (مرد ابریشم سے اقتباس)
 حذرا ناصر۔ کراچی

خود پسند،

مشہور ناول نگار وکٹر ہیوگو نے الیگزینڈر سے
 باتوں باتوں میں کہا۔
 ”اگر ہم دونوں مل کر ایک ناول لکھیں، تو وہ دنیا
 کا عظیم ترین ناول ہوگا۔“
 الیگزینڈر نے جواب دیا۔ ”واہ گھوڑے اُرد
 گدھے کا کیا میل؟“
 وکٹر ہیوگو نے جواب دیا۔ ”بھئی تم ناول مت
 لکھو لیکن براہ کرم مجھے گھوڑے کا خطاب نہ دو۔“
 حرافریشی۔ بلال کالونی ملتان

فتح،

وہ تمام فتوحات میں سب سے بڑی فتح اپنے آپ
 پر فتح پانا ہے۔
 (افلاطون)
 وہ میں آیا، میں نے دیکھا اور میں نے فتح کیا۔
 (سینسبر)
 وہ گھبروٹ میں تیزی ہمیشہ فتح کی نشانی ثابت نہیں
 ہوتی اور نہ ہی ہمیشہ طاقت ور ہی نے میدانِ جنگ
 میں جوہر دکھائے ہیں۔
 (الیکسیس)
 وہ ہماری حکومت سب سے پہلے ہمارے اپنے دل
 پر ہونی چاہیے، بری خواہشات کو مغلوب کرنا ہی
 عظیم فتح ہے۔
 (پلوٹارچ)
 وہ فتح ان لوگوں کے قدمِ خوشی سے جو یقین رکھتے ہیں
 کہ وہ فتح حاصل کر سکتے ہیں۔
 (درجل)
 وہ فتح غرگوش کے پیروں، مرد کے دماغ اور موت
 کی زبان میں ہوتی ہے۔
 (مقولہ)
 اقصیٰ، حذرا۔ کراچی

قائد اعظم اور اسلام،

قائد اعظم نے ۱۹۴۷ء میں کراچی بار ایسوسی ایشن کے
 جلسہ عید میلاد النبی سے خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ
 انہوں نے پیرسٹی کی اعلا تعلیم کے لیے لکٹرنان کا انتخاب
 اس لیے کیا کہ اس ادارے کے عظیم قانون دانوں کے
 اساتذہ گرامی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بھی
 موجود تھا۔
 اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قائد اعظم کے دل میں
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کس قدر محبت تھی۔
 انہوں نے ایک بارسی لڑکی رتی ڈنشا سے پسند
 کی شادی کی تھی جو سردنشا کی بیٹی تھی لیکن شادی سے
 پہلے رتی نے اسلام قبول کیا۔ اپنا نام مریم رکھا اور پھر
 اگلے روز محمد علی جناح نے ان سے شادی کی۔ اگر وہ
 ماؤنٹ مسلمان ہوتے تو رتی کو مسلمان کہے بنا ہی جلدی
 کر لیتے لیکن انہوں نے رتی کے دائرہ اسلام میں
 داخل ہونے کی شرط رکھی۔ جب رتی نے یہ شرط مان
 لی تو وہ اسے بمبئی کی جامع مسجد کے امام و خطیب
 مولانا نذیر احمد صدیقی کے پاس لے گئے جنہوں نے
 رتی کو شرفِ باا سلام کیا۔
 مولانا نذیر احمد صدیقی شاہ احمد نورانی کے
 تلامذہ تھے۔
 منجہ اکرم۔ گاڈل گولیکی



سیدہ نسبت ذہرا کی ڈاڑھی سے

میری ڈاڑھی میں تحریرِ رانا مدثر ضیاء کی یہ غزل
آپ سب قارئین بہنوں کے لیے۔
ہر اک زخم کو اس نے ہدف بنایا تھا
ستم ظریف! مرادِ اذدار کتنا تھا

یہ تیرے شہر میں جواک فقیر پھرتا ہے
انا پرست، کبھی باوقار کتنا تھا

پھر اس کے بعد جو چاہے سزا سنا دینا
یہ سوچ لینا، مجھے اختیار کتنا تھا

یہ اور بات تم میری دسترس میں نہ تھے
عجبوں کا شجر پر بہار کتنا تھا

مجھے تو اس نہ آئے ملاپ کے موسم
ملکتِ دل کا سماں سازگار کتنا تھا

یہ پتی دھوپ ازل سے مرا مقدر تھی
شجرِ وفا کا مگر سایہ دار کتنا تھا

تمام عمر مجھے جو رُلا کے ہنستا تھا
وہ میرے بعد مگر اشکبار کتنا تھا

میں ہار کر بھی بہت مطمئن سالگیا ہوں
وہ جیت کر بھی ضیا سو گوار کتنا تھا

گڑیا شاہ کی ڈاڑھی سے

ایک بہت ہی پیاری سی غزل قاری بہنوں
کی نذر۔ اس غزل کی تعریف میرے بس سے باہر ہے
آپ خود محسوس کریں۔ شاعرہ ہیں فاخرہ بتول۔

جو دل لگانے کا سوچتے ہو
لو بہانے کا سوچتے ہو

بتاؤ جا کر کھلا سکونگے
یہ جو تم جانے کا سوچتے ہو

کسی کے دل میں مکاں بنا کر
اسے گراتے کا سوچتے ہو

عجبوں کا ہوراج ہر سو
یہ کس زمانے کا سوچتے ہو

نہیں ہے احسان گر محبت
تو کیوں جتانے کا سوچتے ہو

سوال چاہت، جواب دہشت
ستم کمانے کا سوچتے ہو

ابھی تو آئے ہو بعدِ مدت
ابھی سے جانے کا سوچتے ہو

جو دل کی قسمت میں بھرا جڑنا
تو کیوں بسلنے کا سوچتے ہو

ہمارے چہرے کو چاند کہہ کر
ہمیں بنانے کا سوچتے ہو

صبا جمیل

حکے ڈاڑی سے

میری ڈاڑی میں تحریر یہ "امید" سے بھرپور نظم
"مالوس لوگوں کے لیے۔"

کہیں سے سورج نکل پڑے گا،

یہ رات اپنے سیاہ پنوں کو جس قدر بھی دلا کرے
میں تیرگی کا غبار بن کر نہیں جیوں گا

مجھے بتا ہے کہ ایک جگنو کے جاگنے سے
یہ تیرگی کی دبیز چادر نہیں ہٹے گی
مجھے خبر ہے کہ میری بے زور نگروں سے
فضیل دہشت نہیں ہٹے گی

میں جانتا ہوں کہ مرا شعلہ چمک کے رزق غبار ہوگا
تو بے خبر یہ دیار ہوگا
میں روشنی کی تکیہ بن کر کسی ستارے کی مثل بھر
جاؤں گا

بستیوں کو خیر نہ ہوگی
میں جانتا ہوں کہ میری کم تاب روشنی سے سحر نہ ہوگی
مگر میں بھر بھی سیاہ شب کا غبار بن کر نہیں جیوں گا
کرن ہو سکتی نجف لیکن کرن ہے پھر بھی
وہ ترجمان ہے کہ روشنی کا وجود زندہ ہے
اور جب تک

یہ روشنی کا وجود زندہ ہے
رات اپنے سیاہ پنوں کو جس قدر بھی دلا کرے
کہیں سے سورج نکل پڑے گا

سونیا حسین

حکے ڈاڑی سے

میری ڈاڑی میں تحریر بر محسن نقوی کی یہ خوبصورت

غزل جو کہ مجھے بہت پسند ہے۔ آپ بھی پڑھیے۔

دشتِ وفا میں پیاس کا عالم عجیب تھا
دیکھا تو ایک درد کا دریا قریب تھا

گزرے جدھر جدھر سے تمنا کے قافلے
ہر ہر قدم پہ ایک نشانِ صلیب تھا

کچھ ایسی مہربان تو نہ تھی ہم پہ زندگی
کیوں ہر کوئی جہاں میں ہمارا رقیب تھا

اپنا پتا تو اس نے دیا تھا مجھے محسن
میں خود ہی کھو گیا تو یہ میرا نصیب تھا

فرح حسین

حکے ڈاڑی سے

میری ڈاڑی میں تحریر سلیم کوثر کی یہ غزل باذوق
قارئین کے نام۔

جانے کیا بات ہوئی ہے جو غما بیٹھا ہے
عجب میں اک شخص بغاوت پہ تلا بیٹھا ہے

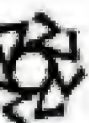
وہ پرندہ جسے پرواز سے فرصت ہی نہ تھی
آج تنہا ہے تو دیوار پر آ بیٹھا ہے

بولتا ہے تو مجھے اذنِ خوشی دے کر
کون ہے جو پسِ راغبار چھپا بیٹھا ہے

تم بھی منجملہ اربابِ جفا نکلے ہو
تم تو کہتے تھے کہ ہر دل میں غدا بیٹھا ہے

تھک گیا دشتِ طلب میں تو سوالی ہی کر
میرا سایہ میری دبلیں پر آ بیٹھا ہے

تو کتابوں میں کسے ڈھونڈتا رہا ہے سلیم
یہ تو کیا دوگ مرے یار لگا بیٹھا ہے





ارم کمال فیصل آباد
درخت کاٹ کے سایہ فروخت کرتے ہیں
اور اس کے بعد کڑی دھوپ سے گزرتے ہیں
ہمیں خدا اپنے مسائل پہ غور کرنا ہے
کہ روزِ روز صبح نہیں اُترتے ہیں
نمرہ، اقرار کراچی
تم نے تو کہہ دیا کہ محبت نہیں ملی
مجھ کو تو یہ بھی کہنے کی فرصت نہیں ملی
پھر اختلاف رائے کی صورت نکل پڑی
اپنی یہاں کسی سے بھی عادت نہیں ملی
عاش خان نندہ محمد خان
مجھے بچوں کے بدلنے سے ہمیشہ خوف آتا ہے
کہ بچے جب بدلتے ہیں کوئی اپنا نہیں رہتا
نور محمد خان بنوں
محبب من ہے تیری اداس آنکھوں میں
سکوتِ صبحِ ازل کا خیال آتا ہے
ملیحہ صدیقی کراچی
غیرِ تجرِ عشقِ سن، نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو۔ تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی
نذراشاں انصاری کراچی
کتنی دلکش ہے اس کی خاموشی
ساری باتیں فضول ہوں مجھے
حیرانوشین منڈی بہاؤ الدین
لینا ہے اس کی یاد سے مجھ کو بھی کچھ نہ کچھ
جیسے سنارِ داکھ یونہی چھانتا نہیں
دل کے معاملے میں بھلا کوئی کیا کرے
یہ تو بڑے بڑوں کو بھی گردانتا نہیں

میسو شوکت لاہور
تم اپنے کسی طردِ عبارت نہیں کرتے
ہم اہل وفا اتنی صداقت نہیں کرتے
ہم لوگ خطا وارِ محبت سہی لیکن
ہم لوگ وفاؤں کی تجارت نہیں کرتے
رضوانہ شکیلہ لاہور
محبت منفرد ہوتی ہے سب وسیلے کے کیلوں سے
جو مارا پھر نہیں کھیلا، جو جیتا اس نے تو بہ کی
حارث قریشی بلال کالونی ملتان
بڑے بھٹکتے پہ جانِ عمن یہ طنز کیسا ہے اس جہاں میں
ہوئے ہیں بے سمت و بے کنار، کبھی سمندر بھی ستارا
نور حسیا نواب شاہ
دورانِ راہ گزر کو دیکھا کریں گے ہم
آئے گی تیری یاد تو رو یا کریں گے ہم
وہ دن جو تیرے ساتھ گزارے تھے پار میں
کتنے حسین خواب تھے سوچا کریں گے ہم
طلعت اقبال لطیف آباد تیرہ
جب منی میں مل جلے گا میری ہستی کا وجود
یاد تازہ ہوگی میری ان تحریروں سے
عاشہ جمیل لیک سٹی لاہور
لو نہی بے سبب نہ پھرا کرو، کوئی شام گھر بھی رہا کرو
وہ غزل کی دہائی کتاب ہے، اسے چکے چکے رُحاکرو
کوئی ہاتھ بھی نہ ملے گا، جو گلے ملو گے تاکہ سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے قلا فاصلے سے ملا کرو



خبریں اور سیک

واصفہ بیل

کی صلاحیتوں کو بڑھاتا ہے۔ اس کے استعمال سے دماغ کے اس حصے میں بھی سکڑاؤ پیدا نہیں ہوتا جو عمر کے ساتھ ساتھ گھٹتا ہے اور جویا دیوں کو محفوظ رکھنے کا کام انجام دیتا ہے، محققین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جو لوگ مچھلی کے تیل کے کیپسول لیتے ہیں ان میں الزائمر اور فتور دماغ کے مرض کے بڑھنے کی رفتار بہت سست ہوتی ہے۔

قصور

اداکارہ میرا کے سب کے ساتھ اختلافات رہتے ہیں۔ کبھی سائنسی اداکاراؤں کے ساتھ، کبھی کیپٹن نوید اور ان کے والد کے ساتھ، لیکن اب ان کا اختلاف اپنے والد سے بھی ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں میرا تو چپ ہیں، لیکن ان کے والد کا کہنا ہے کہ ”میرا کے ساتھ کافی عرصے سے اختلافات ہیں، لیکن وہ میری بیٹی ہے اس لیے اس سے کیا شکوہ کروں۔ انہوں نے مزید کہا کہ میرا یہ سمجھتی ہے کہ میں میرا کی چھوٹی بہن رباب کو شوہر میں آنے سے روک رہا ہوں (کیا واقعی؟) جبکہ میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے، رباب خود ہی شوہر میں نہیں آنا چاہتی۔ (حیرت ہے) لیکن میرا چاہتی ہے کہ رباب شوہر کی دنیا میں آجائے (سوچنے کی بات ہے کہ رباب کے آنے سے میرا کو اتنی دلچسپی کیوں ہے؟ کیا واقعی رباب میرا کی بہن ہے یا نہ؟)

انکشاف

یعنی خالد کا جب سے نکاح ہوا ہے۔ وہ بہت خوش نظر آرہی ہیں۔ لگتا یہ ہے کہ انہیں خوشگوار ازدواجی زندگی راس آگئی ہے۔ جب ہی تو وہ ایک طرف تو مارننگ شو میں نظر آرہی ہیں اور دوسری جانب وہ



مچھلی کے فوائد

روزنامہ خلیج ٹائمز میں شائع شدہ رپورٹ کے مطابق ”کلینیکل نیوریشن“ کی تازہ تحقیق میں انکشاف کیا گیا ہے کہ ہفتے میں دو بار مچھلی کا استعمال خواتین میں سماعت کی کمی کے خطرے کو دور کرتا ہے۔ تحقیق کی سربراہ اور ویمین اسپتال بو سٹن کی ڈاکٹر شیرون کہتی ہیں کہ خواتین میں سماعت کی کمی عام ہو رہی ہے بڑھتی ہوئی عمر میں یہ ایک عام بات ہے، کچھ ایسی غذاؤں کی فطری قوت کا پتا چلا ہے جو سماعت کی کمی کو جلد واقع ہونے سے روکتی اور سماعت کی کمزوری کو دور کرتی ہیں۔ ان میں مچھلی سرفہرست ہے۔ اسی طرح مچھلی کا تیل دماغی طاقت بڑھاتا ہے دل کو صحت مند رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ مچھلی کا تیل الزائمر سے محفوظ رکھتا ہے۔ مچھلی کا تیل یعنی ”کوڈلیور“ آئل کا استعمال یادداشت اور سوچنے سمجھنے

اگر کوئی بھارتی پروڈیو سر لائیک کر دے تو ٹھیک
ورنہ۔؟

سائبان

یہ خبر تو آپ تک پہنچ ہی چکی ہوگی کہ خیر سے مدیحہ
شاہ بھی شادی شدہ ہو گئیں۔ گزشتہ دنوں مدیحہ اپنے
شوہر جاوید اقبال کے ساتھ لاہور آئیں تو انہوں نے
اپنے قریبی دوستوں اور میڈیا کے لوگوں کو ایک دعوت
دلیہ دی۔ اس موقع پر مدیحہ دلہن کے روپ میں تھیں،
اور دولہا بلیک ٹوپس میں ملبوس تھے۔ مدیحہ شاہ اس
موقع پر بہت خوش تھیں۔ اس موقع پر انہوں نے
کہا کہ ”میں اپنی شادی شدہ زندگی کو بھرپور انجوائے
کر رہی ہوں پیار کرنے والا جیون ساتھی ملا ہے۔ شوہر
ایک سائبان ہوتا ہے میں اپنی زندگی خوشگوار گزارنا
چاہتی ہوں مجھ پر کوئی بوجھ نہیں (کیسا بوجھ۔؟)“ اپنے
شوہر کے متعلق مدیحہ نے کہا کہ ”یہ صرف میرے نام
کوڑ ہیں۔ (آہم!!) فلموں میں کام کے حوالے سے
انہوں نے کہا کہ ”جاوید کی طرف سے مجھ پر کوئی
پابندی نہیں ہے۔ جب جاوید کینڈا میں ہوں گے تو



پاکستانی فلموں میں کام کرنے کا فیصلہ بھی کر چکی
ہیں۔ (بھلا بتائیے انڈسٹری میں پہلے کی تھی جو۔؟)
یعنی کا کہنا ہے کہ وہ بہت جلد اس فلمی پروجیکٹ کے
حوالے سے انکشاف کریں گی۔ (اچھا جی! قلم میں
انکشاف بھی ہوتے ہیں۔؟) جس میں وہ جلوہ گر ہو رہی
ہیں۔ (دیکھیں گے۔)

کوشش

اروا حسین نے فلم نامعلوم افراد کی کامیابی کے بعد
بولی ووڈ میں اداکاری کے خواب دیکھنا شروع کر دیے
ہیں، جب ہی تو انہوں نے انسٹاگرام پر ایک ویڈیو شائع
کی ہے جس میں وہ کنگنا رناوٹ کی فلم کو مین کی
ہیروئن کا کردار کر رہی ہیں۔ اس میں اروا نے کنگنا کی
آواز پر ایسی شان دار اداکاری کی ہے کہ لگ ہی نہیں
رہا کہ یہ دو الگ الگ فنکار ہیں۔ بلکہ اروا کی اداکاری پر
کنگنا کی آواز زیادہ سوٹ کر رہی ہے۔ لگتا ہے کہ ہم
سفر کی ماہرہ حسین کے شاہ رخ کے ساتھ فلم سائن
کرنے کے بعد ہر اداکاریہ چاہ رہی ہے کہ کاش اس کا
ڈراما بھی بھارتی ٹی وی کی زینت بن جائے (اور کوئی
بھارتی پروڈیو سرا سے دیکھ لے۔) اب اروا کا یہ ویڈیو



کھومتے ہوئے لکتا ہے جیسے یہ کسی مسلمان ملک کا شہر ہو۔
(عبداللہ طارق سہیل)



میں ان کے ساتھ وہاں ہوں گی اور جب وہ پاکستان میں ہوں گے تو میں پاکستان میں۔ (یعنی جہاں تم۔ وہاں ہم)

ادھر ادھر سے

☆ سوویت یونین کے خاتمے اور مسلم اکثریتی چھ ریاستوں (قازقستان، ازبکستان، تاجکستان، کرغزستان، ترکمانستان اور آذربائیجان) کی علیحدگی کے باوجود روس میں مسلمانوں کی خاصی آبادی ہے۔ جس میں پچھلے برسوں کے دوران تناسبی اضافہ بھی ہوا۔ روس کا ہر چھٹا آدمی مسلمان ہے اور کئی مسلمان جمہوریتیں ہیں۔ سب سے اہم جمہوریہ تاتارستان ہے جو ماسکو سے نوے کلومیٹر دور ہے۔ قفقاز (کوہ قاف) میں چھ سات منہی منی ریاستیں مسلمان اکثریتی ہیں اور ان ہی میں چیچنیا بھی شامل ہے۔ دارالحکومت ماسکو میں بیس لاکھ مسلمان مقامی شہری ہیں اور اتنے ہی یعنی بیس لاکھ مسلمان تارکین وطن ہیں۔ ایک مغربی جریدے نے لکھا تھا۔ ماسکو میں

(روزنامہ جسارت)

☆ ہم امریکیوں کے دلوں میں موجود اپنے خوف کو اپنے لیے استعمال کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے اور وہ ہیں کہ اپنے خوف ہی کے باعث ہماری گردنوں پر سوار ہیں۔ جانے کب ہمیں ہوش آئے گا اور ہم کب اس جنگ کے لیے تیار ہوں گے جس کے خوف سے ہی وہ مرے جاتے ہیں۔ (مریم گیلانی)

☆ صوبہ خیبر پختون خواہ کے وزیر اطلاعات نے کہا ہے کہ بلا اجازت کسی تنظیم کو متاثرین کی مدد کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ کیا حیران کن بیان ہے دنیا کی تاریخ میں ایسا بیان کسی نے نہیں دیا ہوگا۔ (ایکسپریس نیوز عبداللہ طارق سہیل)



میکے استاد

آسیہ زلاتی

واقعات یاد آئے۔ بس جی دماغ کے روزن کھل گئے۔ روشنی اندر آئی۔ چھوٹے بھائی کو مرکزی کردار بنایا۔ اور لکھنا شروع کر دیا۔

اب قلم رکنا تھا۔ خیر۔ آخر ایک خاص مقام پر وہ قصہ ختم کر کے۔ نئے صاف کاغذ پر لکھ کر ایڈیٹر ”تراشے“ کے نام کے لفافے میں ڈال کر میز پر رکھ دیا۔ پھر دیکھا کہ ہمارا لفافہ کھول رہے ہیں۔ بڑی شرم آئی۔ ہائے اللہ۔ ناہنجتہ تحریر۔ بھکانہ خیالات کیا سوجھتے ہوں گے۔ کئی دن ہم نے سامنا نہ کیا۔ پھر سنا کہ پرچا تکمیل کے آخری مراحل میں ہے۔ دل دھک دھک کرنے لگا۔ پھر سب جمع ہوئے۔ اور پرچہ پڑھ کر سنانے کے لیے ہماری بڑی بہن کے سپرد کیا گیا۔ آخری۔ ہماری کہانی کی باری آگئی۔ اس سے پہلے اتنے قیمتی لگ چکے تھے کہ۔ اب مزید ہنسنے کی طاقت نہ تھی۔

ارے۔ مگر۔ تعارفی تمہید میں کیا تھا؟

”پڑھنے والے اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ اس شوخی تحریر کی خالق کتنی ادیبہ اپنے ادبی مستقبل میں کیا ہوگی؟“ الفاظ تھے کہ موتی چور کے لڈو۔ سیدھے حلق میں اتر گئے۔ خوشی کے مارے آنسو آگئے۔ (نورا) خود کو ادیبہ مان لیا

اور یہ تحریری رپورٹ۔ تعریفی سند بن کر آج تک ذہن میں روشنی بکھیرتی رہتی ہے۔ اور یہ بھی پہلی کاوش۔ تعریف کرنے والے تھے۔ علی سفیان آفاقی۔

انہوں نے بھی ادب کے بحرِ خار میں نیا نیا قدم رکھا تھا۔ کچھ عرصہ ”تراشے“ چلا۔ پھر وہ پڑھنے پڑھانے میں مصروف ہو گئے۔ وقت گزرا تو اخبار سے منسلک ہو گئے۔ اس کے بعد مزید وقت گزر گیا۔ تجربے کی بھٹی کندن سے سونا بناتی گئی۔ فلموں کی کہانیاں لکھتے لکھتے فلم بنانے لگے۔ پھر تو پتا نہیں کیا کیا بن گئے۔ ہمارے بہنوئی بھی بن گئے۔ مگر ہم نے تو اول دن سے انہیں اپنا استاد مانا۔ استاد ہی سمجھل۔ خود کو شاگرد۔ انہوں نے ہی ہمارے ذہن کو جگایا، شوق کو اکسایا تھا۔ اور باقاعدہ ادیبہ کا خطاب دیا۔ تو اس خطاب کی لالچ برکھنے کی پوری کوشش بھی کی۔

ہمارا تو بچپن گڑیوں سے کھیلتے گزر رہا تھا۔ ہمارے ابا کو بچوں کے ہر کھیل سے دلچسپی تھی۔ گڑیوں کا حال بھی پوچھا کرتے تھے۔ ابا ایک ادیب، شاعر، نقاد، مصنف سب کچھ تھے۔ ہمیں ادب سے پڑھنے کی حد تک دلچسپی تھی۔ پورا خاندان ہی ادیب تھا۔ یہاں تک کہ پھپھو میں بھی اپنے دور میں تہذیب الاخلاق میں لکھا کرتی تھیں۔

میرٹھ (انڈیا) سے بھجلی پھپھو صاحبہ لاہور آئیں۔ ان کے ساتھ ان کے (اور ابا کے بھی) بھانجے ساتھ آئے۔ ہم سے چند سال ہی بڑے ہوں گے۔ مگر ان کے ہاتھ میں ہر وقت قلم اور کاپی ہوتی تھی۔

پھپھو نے بتایا۔ ”سوئی میاں بھوپال سے اپنے گھر بیٹھ کر ہاتھ سے لکھ کر اخبار نکالا کرتے تھے۔ چغل خور نام تھا۔ خاندان بھر کی اوٹ پٹانگ خبریں اس میں ہوتی تھیں۔“

”ہاتھ سے لکھ کر اخبار؟ خاندان کی خبریں؟ واہ۔“ سب کو دلچسپی ہوئی۔ خبروں کا نمونہ سن کر اور بھی ہنسی آئی۔ سوئی میاں دراصل میرٹھ میں اپنی خالہ کے گھر پر پڑھنے آئے تھے۔ جی نہیں۔ گھر پر نہیں۔ کلج میں پڑھتے تھے۔ اور پڑوسیوں کو اپنی نت نئی شرارتوں سے حیران کرتے تھے۔

لاہور آکر انہوں نے ترقی مکمال کا مظاہرہ کرتے ہوئے رسالہ نکالنے کا اعلان کیا۔ ہاتھ سے لکھ کر۔ خاندان والوں سے فرمائش ہوئی کہ اپنی اپنی نگارشات فوری عطا کی جائیں۔ تحریریں شوخ ہونی چاہئیں۔ پرچہ مزاحیہ ہو گا۔ ہم تو حیرت سے دم بخود ہو گئے۔ جب انہوں نے ہم سے بھی تقاضا کیا۔ یعنی کہ اس ادبی فنی سفر میں ہمیں بھی اہمیت دی گئی۔ اب سوچ بچار کا در کھلا۔ کئی دن دماغ میں کھلبلی سی رہی۔ کیا لکھیں۔ اور کیسے۔ بچوں کا رسالہ تو تھا نہیں کہ کہانی لکھ دیں۔ لکھنا آتا ہی نہیں تھا۔ ہاں پڑھنے میں بہت مہارت تھی۔

خیر۔ اب ہم نے جو غور کیا تو چھوٹے بھائی پر نظر پڑی۔ وہ بہت دلچسپ باتیں کرتا تھا اور اس کی حرکتیں بھی بہت عجیب ہوتی تھیں۔ اسے دیکھ کر بہت ہنسی آئی۔ کئی

ایک دن اپنی آفاقی (چھوٹی بہن) آئیں۔ کہنے لگیں۔
”آیا۔ کوئی افسانہ لکھا ہوا ہو۔ تو دے دیں۔ ہمارے گھر
محمد فاضل صاحب آئے بیٹھے ہیں۔ انہیں قلم کے لیے
استوری چاہیے۔“

محمد فاضل صاحب کافی مشہور ڈائریکٹر پروڈیو سر نہ جانے
کیا کیا تھے۔ ہمارے پاس ایک افسانہ رف حالت میں بڑا
تھا۔ دے دیا۔ پتا چلا۔ کہ انہیں استوری بہت پسند آتی
ہے۔ قلم بھی بن گئی۔ ”عاشی۔“

سنسہ ہونے سے پہلے ہم نے اسٹوڈیو جا کر دیکھا۔ اپنی اور
سونی بھائی کے ساتھ۔ اس سے پہلے بھی کئی فلمیں اسٹوڈیو
میں ریلیز سے پہلے دیکھی تھیں لیکن کہانی کے نام کے آگے
اپنا نام اسکرین پر جگہ گاؤ دیکھ کر جو خوشی ہوئی۔ بس۔ قلم
کے سب کردار موجود تھے۔ سب سے ملنا ہوا۔ بابر شریف
ہیروئن تھیں۔ وہ بھی بطور خاص ملیں۔ کہانی کی تعریف
کی۔ بابر نے اس میں اپنا کردار بہت اچھی طرح نبھایا تھا۔
سونی بھائی (گھر میں۔ باہر کے لوگ آفاقی کہتے تھے) بے حد
بزلہ منج حاضر جواب۔ خوش مزاج انسان تھے۔ گھر میں
جتنی دیر رہتے۔ سب کو مزاحیہ شعر سنا کر یا سنا کر ہنساتے
رہتے۔ (ڈانٹ ڈپٹ کا شعبہ الگ تھا۔)

ایک بار ان کے بڑے بھائی سلطان بھائی نے ایک نظم
لکھی۔

مزا آجائے گا واللہ۔

یہاں جب آؤ گی بیگم۔

وہ اس زمانے کے مزاحیہ رسالے چاند میں چھپی۔
ہماری بہن نے فوراً ”جواب میں۔“

مزا آجائے گا واللہ۔

یہاں جب آؤ گی بھابھی

لکھ ڈالی جس میں سلطان بھائی کے محبت کے جھولے
اور خوابوں کے جزیرے میں گھومتے رہنے کی نفی کی تھی اور
بتایا تھا کہ میاں کے موزے اور بچوں کے پوتڑے بھی
دھونے ہوں گے علاوہ کھانا پکانے اور میاں کی خفگی کے۔ وہ
بھی چاند میں چھپ گئی۔ پھر سونی بھائی میدان میں آ گئے۔
پوری مثنوی لکھ ڈالی۔ جس میں بیگم کو ساس نندوں کے
ظلم و ستم سے ڈرایا بلکہ خوف زدہ کیا تھا۔ وہ مثنوی بھی چاند
میں ہی چھپی۔ ان دنوں چاند کی مقبولیت کا گرافیک نخت
آسمان پر جا پہنچا۔ ابابھی اس میں مزاحیہ مضامین بھیجتے تھے۔
ہم نے بھی گھریلو ڈائری کے نام سے اس میں دلچسپ

واقعات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ گھر میں مشاعرے اور ادبی
محفلیں ہوتیں۔

ابا اس کے روح رواں تھے وہ مشرقی پاکستان چلے گئے۔
تو ادبی محفلیں بھی ختم ہو گئیں۔ سونی بھائی کا سفر جاری رہا۔
بے شمار فلموں کی کہانیاں۔ کسی بھی مکالمے، منظر نامہ وغیرہ
کئی فلمیں خود بھی بنائیں۔

اس سے پہلے یہ ہوا کہ ”تراشے“ بند ہونے کے بعد
سلطان بھائی نے بھی ایک نیم سنجیدہ رسالہ نکالا۔ وہ بھی بند
ہو گیا تو ہماری آپا بیگم (بڑی بہن) نے ایک اور رسالہ شروع
کیا۔ ان کی شادی سلطان بھائی سے ہو گئی۔ تو وہ رسالہ
بند۔ پھر ہم نے خلوص بڑے طمطراق سے نکالا۔ بلکہ بمبئی
کے پتے پر کرشن چندر راجندر سنگھ بیدی کو بھی خطوط لکھے
کہ افسانے بھیجیں۔ ان دنوں نے افسانے تو نہیں۔
جوابات ضرور دیے۔ شاباشی اور حوصلہ افزائی کے ساتھ۔

پھر ہماری شادی ہو گئی۔ رسالہ بند ہوا۔ عرصہ بعد ہمارے
بیٹے اور اپنی آفاقی کی بیٹی نادیا آفاقی سلطان بھائی آپا بیگم
کے بیٹوں ذی شان اور عفان نے مل کر مزاحیہ
”سنگ“ نکالا۔ کافی دن چلا۔ گویا ادب اور رسالوں کا
شوق علی سفیان آفاقی کا ڈالا ہوا تھا۔ جو ہر نسل میں خود بخود
برہم رہا تھا۔ سونی بھائی بے حد پرجوش، مخلص۔ بلکہ ان
تھک محنت کی بدولت زبردست کاوش کی وجہ سے ادب کی
دنیا میں نام پیدا کر چکے تھے۔ نوائے وقت کے فیملی میگزین
کے بانی بھی وہی تھے۔ وفات کے ایک ہفتہ پہلے صاحب
فراش ہو گئے۔ لیکن لیٹے لیٹے بھی کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے
تھے۔ اسپتال پہنچ کر بھی اصرار کرتے رہے کہ مجھے آفس
جانا ہے۔ کام کرنا ہے۔ شوق کی انتہا۔

انٹھائیس کتابوں کے مصنف تھے۔ بے شمار فلموں کے
خالق۔ انہیں دیکھ کر لگتا تھا کہ یہ شخص صرف لکھنے کے
لیے دنیا میں آیا ہے۔

کہتے ہیں انسان چلا جاتا ہے۔ یاد رہ جاتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ انسان جا کر بھی نہیں جاتا۔ وہ ذہن کے

پروے میں مجسم موجود رہتا ہے۔ مثال بن کر۔

پورے ملک کے اخبارات۔ تمام ٹی وی چینل اس کے

گواہ ہیں۔ ہر اخبار میں ہم عصروں کے مضامین۔ ٹی وی

کے ہر چینل پر ان کے بارے میں پروگرام چل رہے ہیں۔

مثال در مثال۔ گواہ در گواہ۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔

آمین۔

آپ کا اورپی خانہ

فرح رضوی

کے کوفتوں کی ترکیب بتا رہی ہوں جو کہ محنت طلب تو ہے لیکن قیمتی کوفتوں سے کسی طرح کم نہیں آزمائش شرط ہے۔

دال کوفتہ

اجزا :

| | |
|-----------|--------------------|
| ایک پاؤ | چنے کی دال |
| دو چمچے | ادرک، لہسن پیسٹ |
| تھوڑا سا | ہری مرچ، ہر ادھنیا |
| حسب ذائقہ | نمک، لال مرچ |
| تین عدد | پیاز |
| آدھا پاؤ | دہی |
| ایک چمچ | سیا گرم مسالا |
| حسب ضرورت | گھی |
| ایک چمچ | ہلدی، پیادھنیا |

چنے کی دال کو ابال کر سل پر باریک پیس لیں۔ پھر اس میں آدھا ادرک، لہسن پیسٹ، ہری مرچ، گرم مسالا اور نمک، مرچ ملا کر خوب مکس کریں اور پھر کوفتے بنالیں۔ اب ایک دیگی میں پانی ابلنے کے لیے رکھ دیں اور اس پر چھلنی اس طرح ایڈجسٹ کریں کہ پانی چھلنی تک نہ پہنچے اور اس چھلنی پر کوفتے رکھ کر ڈھکن بند کر دیں اور پانچ سے دس منٹ تک پانی ابلنے دیں۔ اب ایک دوسرے چولہے پر دیگی میں گھی گرم کریں اور پیاز ڈال کر گلابی کر لیں۔ پھر اس میں ادرک، لہسن پیسٹ ڈال کر بھونیں۔

جب خوشبو آنے لگے تو اس میں تمام مسالا جات ڈال دیں، سوائے گرم مسالے کے اور خوب بھونیں، کوفتے چھلنی سے نکال کر مسالے میں ڈالیں اور اچھی طرح سے بھونیں۔ ان کوفتوں میں چھج ہلاتے ہوئے ڈریں نہیں کیونکہ یہ ٹوٹیں گے نہیں، جب کوفتے بھن جائیں تو دہی ڈال دیں۔ دہی کا پانی خشک ہو جائے تو حسب پسند شورپا بنا کر گرم مسالا، ہری مرچ، ہر ادھنیا ڈال کر دم پر رکھ دیں گرم نان یا روٹی کے ساتھ سرو کریں۔

(8) اگر شیشے کی کسی بوتل کو صاف کرنا ہو تو پیسی ہوئی سروسوں کا ایک چھج بوتل میں ڈال کر بوتل کو ٹھنڈے پانی سے بھر دیں تھوڑی دیر بعد دھو لیں صاف ہو جائے گی۔

اب اپنا تعارف کروا دوں میرا نام مسز فرح رضوی ہے اور میرا تعلق لاہور سے ہے۔

(1) بھئی ہم تو کھانا پکاتے ہوئے صرف ایک چیز کا خیال رکھتے ہیں اور وہ ہے جیب۔ ظاہر ہے بھئی جتنے جیب میں پیسے ہوں گے اسی کے حساب سے ہی تو ہنڈیا پکائیں گے۔ ویسے بھی میرا بیٹا کہتا ہے جو سبزی سب سے سستی ہوتی ہے، مہما وہ پکاتی ہیں۔ اس لیے مہما سے پوچھنے کے بجائے سبزی والے سے پوچھنا چاہیے کہ آج سب سے سستا کیا ہے۔

(2) کچن بھی گھر کے حساب سے ہے، جیسے کہ ہم لوئر مل کلاس لوگوں کے ہوتے ہیں۔ یعنی کمرے کی ہی ایک سائینڈ پر چولہا اور برتنوں والا اسٹینڈ رکھ کر اسی اسٹینڈ کے ایک خانے میں مسالہ جات والے ڈبے رکھے جاتے ہیں۔ چونکہ وہی کمرہ سٹنگ روم، بیڈ روم وغیرہ ہے، اس لیے پکاتے ہی ساتھ ساتھ سب کچھ سیٹنا سلیٹے سے زیادہ مجبوری ہے۔

(3) صبح کا ناشتہ ہمارے ہاں عموماً "ایک ہی طرح کا ہوتا ہے۔ یعنی پراٹھا اور رات کا سالن اور چائے۔ اس کے علاوہ سردیوں میں کبھی مولی کے پرائٹھے بن جاتے ہیں اب ان کی ترکیب کیا بتاؤں وہ تو سب کو ہی بتانے آتے ہیں۔

(4) باہر کھانا فیشن تو ہے۔ لیکن وہی حساب یہاں بھی ہے کہ فالتو پیسے جن کے پاس ہوں وہ ایسے اللہ تللوں پر ضائع کرتے ہیں، ہم جیسے جو گھر میں ٹاپ تول کر پکائیں وہ ہونٹلنگ کیا جائیں۔

(5) ظاہر ہے بھئی موسم کو تو مد نظر رکھنا ہی ہے، کیونکہ بات تو پھر جیب کی آجاتی ہے، موسمی سبزیاں سستی ہوتی ہیں اور بے موسمی مہنگی۔

(6) اچھا پکانے کے لیے محنت اور خلوص نیت کے ساتھ تھوڑا سا پیاز بھی شامل کریں تو لذت دو بالا ہو جاتی ہے۔ چاہے وہ آلو یا دال ہی کیوں نہ ہو۔

(7) مہمان عموماً "بتا کر ہی آتے ہیں جو بتا کر نہ آئیں ان کی تواضع آپ بازار سے کولڈ ڈرنک، چائے، بسکٹ، نمکو اور چمیس وغیرہ سے کریں، یہ سب کھا کر ان کی تسلی تو ہو جائے گی۔ اتنی دیر میں گوشت کا کوئی بھی سالن بن جاتا ہے، روٹی، چاولوں کے ساتھ۔ لیکن یہاں میں آپ کو دال



مَرنے دار پلٹھے بنائیں

خالد جیلانی

سیح کباب پرائٹھا

ضروری اشیا :
گوشت
فائن آٹا
کھانے کا سوڈا
کچری پاؤڈر
پیاز
ادرک لہسن پیسٹ
نمک، تیل
ترکیب :
گوشت کے کیوبز کاٹ کر اس میں کھانے کا سوڈا، کچری پاؤڈر، گرم مسالا، پسلی سیاہ مرچ، لال مرچ، نمک، پیاز، ہرا دھنیا، لہسن اور ک پیسٹ ڈال کر تھوڑی دیر رکھ دیں۔ اس کے بعد چور مشین میں ڈال کر قیمہ بنالیں۔ انگلیٹھی میں کوئلے دھکا میں۔ قیمے کو سیخوں میں پرو کر کونلوں پر سینک لیں۔ سینکتے ہوئے کباب پر تیل لگائی جائیں۔

آلو اور دال کے پرائٹھے

ضروری اشیا :
مونگ کی دال
آلو
آٹا
پسلی سیاہ مرچ
نمک، تیل
ترکیب :
آنے میں نمک ڈال کر گوندھ لیں۔ آلو ابال کر چھیل کر میس کر لیں۔ دال کو ابال کر آلو، ہرا دھنیا، ہری مرچ، لیموں کا رس، سیاہ مرچ اور نمک کے ساتھ اچھی طرح مکس کریں، چھوٹے چھوٹے پیڑے بنائیں۔ ایک پیڑے کے اوپر آلو اور دال کا آمیزہ رکھیں۔ دوسرے پیڑے کو اس کے اوپر رکھیں پھر کنارے دبا کر روٹی کی طرح تیل لیں۔ توے پر تیل یا گھی ڈال کر پرائٹھے کی طرح سینک لیں۔ چٹنی اور راستہ کے ساتھ پیش کریں۔

ایک کھانے کا چمچ
دو عدد
دو کھانے کے چمچے
دو کھانے کے چمچے
دو کھانے کے چمچے
حسب ذائقہ و ضرورت

آنے میں نمک اور صی ملا کر نیم گرم پانی سے گوندھ کر
تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیں۔ گوندھے ہوئے آنے کے
پیڑے بنا کر پہلے تھوڑا سا بیکلیں۔ اس پر سیخ کباب باریک
کتری ہوئی، ہری پیاز، ہر ادھیا اور ہری مرچیں رکھ کر
دوسرا پیڑا تیل کر اس پر رکھیں اور کنارے موڑ کر گول پراٹھا
تیل لیں۔ کانٹے سے پراٹھے پر شیرمال کی طرح سوراخ
کر کے پراٹھے کو پہلے سے گرم توے پر دونوں طرف سے
گولڈن ہونے تک فرائی کریں۔ مزے دار سیخ کباب پراٹھا
تیار ہے، سلاد اور رائتے کے ساتھ پیش کریں۔

پنیر پراٹھا

ضروری اشیا :-

گندم کا آٹا

میدہ

نمک

گھی، تیل

پنیر

ہری مرچ

زیرہ

پیاز

گھی

تین کپ

آدھا کپ

ایک چائے کا چمچ

دو کھانے کے چمچے

ایک کپ

چار عدد

ایک چائے کا چمچ

دو عدد

تلنے کے لیے

ترکیب :-

آنے اور میدے میں نمک ملا کر چھان لیں، پھر اس
میں گھی ملا کر پانی کے ساتھ گوندھ لیں۔ اس کے بعد
ڈھانپ کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پنیر کو چورا کر کے

اس میں ہر ادھیا، ہری مرچیں، باریک کٹی ہوئی پیاز، لال
مرچ، نمک اور بھنا ہوا زیرہ کوٹ کر ملائیں اور تمام اجزاء کو
اچھی طرح مکس کر لیں۔ اب آنے کے چھوٹے چھوٹے
پیڑے بنائیں اور تیل لیں۔ پھر اس میں پنیر بھر کر دوبارہ پیڑا
بنائیں اور بیکلیں۔ درمیانی آنچ پر توے کے اوپر فرائی کریں۔
اور سنہری ہونے پر اتار لیں۔ خستہ و مزے دار پنیر پراٹھا تیار
ہے، اچار، چٹنی یا کبچہ کے ساتھ نوش کریں۔

بند گوبھی کا پراٹھا

ضروری اشیا :-

بند گوبھی

آٹا

ایک عدد

چار کپ

ترکیب :-

بند گوبھی اور ہری مرچیں باریک باریک کاٹ لیں۔
آنے میں پکھلا ہوا گھی، تیل مکس کریں۔ اس کے بعد اس
میں بند گوبھی، ہری مرچیں، ہر ادھیا، اور ک پیسٹ، نمائو
پیوری اور نمک ملا دیں۔ اب تھوڑا تھوڑا پانی شامل کر کے
گوندھیں۔ اس کے بعد چھ سے آٹھ پیڑے بنائیں۔ پھر
انہیں تیل کر توے پر ڈالیں اور گھی، تیل کی مدد سے تلنے
جائیں۔ دونوں جانب سے سنہری ہونے پر اتار لیں، دہی کی
چٹنی اور اچار کے ساتھ پیش کریں۔

قیمے کے پراٹھے

ضروری اشیا :-

میدہ

قیمہ

پیاز

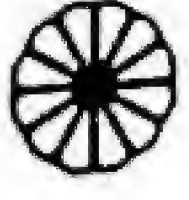
ہر امسالا

مکھن

نمک، تیل

ترکیب :-

میدے میں نمک، مکھن اور گرم پانی ملا کر ہموار آٹا
گوندھ لیں اور رکھ دیں۔ قیمہ بھون کر اس میں پیاز،
لسن، اور ک، ہری مرچیں اور دھیا کتر کر ڈالیں۔ ہر
پیڑے میں قیمہ پیسٹ کر پراٹھے بنالیں۔ گرم توے پر احتیاط
سے گھی کے ساتھ تلیں۔ مزے دار پراٹھے تیار ہیں۔



عزت گھمسان کی لڑائی

نامعلوم گوجرانوالہ

میری شادی کو دو سال کا عرصہ ہوا ہے۔ میں نے ایم۔ اے کیا ہے شادی سے پہلے جاب کرتی تھی۔ ہماری فیملی پڑھی لکھی ہے۔ لیکن سسرال میں صرف میرے میاں پڑھے ہیں۔ میاں باہر ہوتے ہیں۔ شادی کے ایک ماہ بعد ہی وہ باہر چلے گئے۔ اب میرا ایک بیٹا ہے۔ امی، ابو نے یہ رشتہ اس لیے کیا تھا کہ لڑکا پڑھا لکھا ہے اور کمائی بھی ٹھیک ہے۔ بیٹی کو خوش رکھے گا۔ لیکن کیا ہوا کہ شادی کے بعد سے میری شادی شدہ نند بھی میرے گھر آگئی ہے۔ اس کا بیٹا بھی ہے میں اپنے سسر اور ساس کے ساتھ رہتی ہوں۔ سب بہن بھائیوں اور ان کے بچوں کے بارے میں میرے میاں کی بات مانی جاتی ہے اور ان سب کو جب بھی ضرورت ہو، خرچہ پانی میرے میاں دیتے ہیں۔ بڑے بھائی اور ایک بہن تو مستقل میرے میاں کی ذمہ داری ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ میرے سسرال والے بمعہ میرے میاں مجھے خرچہ نہیں دیتے۔ اگر دیتے ہیں تو گن گن کر۔ کہتے ہیں کھانے پینے کی کمی نہیں۔ گھر بھی ہے۔ کپڑے بھی تو پھر مسئلہ کیا ہے۔ اگر کچھ پیسے دیتے بھی ہیں تو ان کا بھی حساب دینا ہوتا ہے۔ جن سے مجھے پریشانی ہو جاتی ہے۔ میاں ویسے تو اپنا دل کرے تو پیار سے بات کرتے ہیں۔ لیکن جب میں کچھ بات کروں تو ان کا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔ دو سال میں سسرال والے جو کر سکتے تھے وہ کیا۔ مجھے اور میرے گھر والوں کو برا بھلا کہا۔ طعنے دیے۔ بات بات پر نکتہ چینی کی۔ خاوند نے شک کیا۔ جب وہ باتیں سوچتی ہوں تو دماغ پھر جاتا ہے۔ میرے خاوند اب آنے والے ہیں، لیکن وہ تمام باتیں یاد کروں تو کسی سے بھی بات کرنے کو دل نہیں کرتا۔ اب سسرال والے بھی ٹھیک ہو رہے ہیں۔ لیکن خرچ کا مسئلہ ویسا ہی ہے۔ میری رہنمائی کریں؟ سمجھ نہیں آتی میاں کو بھی مجھ سے محبت ہے کہ نہیں؟ جب میاں کو غصہ آتا ہے تو وہ مجھے اتنی باتیں سناتے ہیں کہ کیا بتاؤں۔ میرا دل ہے کہ مجھے جاب مل جائے۔ جس کے لیے میں اور میرے والدین کوشش کر رہے ہیں۔ سسرال کا ماحول بھی کافی مختلف ہے۔ میاں سب کا خیال رکھتے ہیں میرا کیوں نہیں؟ وہ چاہتے ہیں میں سب برداشت کروں گو نگلی بن کر۔

ج۔ اچھی بہن! ایک مرد سے بہت سے رشتے اور بہت سی ذمہ داریاں منسلک ہوتی ہیں۔ شادی ہونے کے بعد مرد کی اولین ذمہ داری بیوی ہوتی ہے لیکن باقی رشتوں سے بھی تعلق ختم نہیں ہو جاتا۔ مڈل کلاس گھرانوں میں اگر خاندان کے کسی فرد پر اللہ تعالیٰ کا کرم ہو جاتا ہے اور وہ کسی بڑے عہدے پر فائز ہو جاتا ہے یا بڑا کاروبار کرنے لگتا ہے تو گھر کے دیگر افراد کو اس سے توقعات ہوتی ہیں کہ وہ ان کی مدد کرے گا۔ آپ کے شوہر کے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے۔ آپ کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے بہن بھائی معاشی لحاظ سے کمزور ہیں۔ اس لیے وہ ان کی مدد کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ آپ کے شوہر کو آپ کا خیال نہیں ہے یا وہ آپ سے محبت نہیں کرتے لیکن وہ اپنی ذمہ داریوں سے بھی منہ نہیں موڑ سکتے اسی لیے جب آپ ان لوگوں کے متعلق کچھ بات کرتی ہیں تو ان کا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔

ابھی شادی کو صرف دو سال کا عرصہ گزرا ہے اتنی جلد شوہر میں تبدیلی کی توقع نہ رکھیں۔ تھوڑا انتظار کر لیں۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ویسے بھی آپ نے لکھا ہے۔ سسرال والے ٹھیک ہو رہے ہیں۔ آپ حاب

کرنا چاہتی ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں، اس سے ایک تو آپ کچھ دیر کے لیے اس ماحول سے نکل سلیں کی، دوسرے خرچ کا مسئلہ حل ہو جائے گا ویسے بھی آپ کے میاں صاحب باہر ہوتے ہیں۔ اس لیے آپ پر ان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے لیکن اس کے لیے آپ کو اپنے شوہر سے کی اجازت لینا ہوگی، ان کی اجازت، مگر بغیر کوئی قدم اٹھانا مناسب نہیں۔

آپ کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ سمجھ دار اور متحمل مزاج ہیں، نرمی اور محبت سے اپنے شوہر کو اپنے اور اپنے بیٹے کے حقوق کا احساس دلائیں گی تو یقیناً ”ان پر اثر ہوگا۔ شوہر کے بارے میں آپ سوچتی ہیں کہ ان کو آپ سے محبت ہے یا نہیں؟ اپنے بارے میں بھی سوچیں کہ آپ کو شوہر سے محبت ہے یا نہیں۔ جن سے محبت کی جاتی ان سے منسلک چیزوں کو بھی انسان خوشی سے قبول کرتا ہے۔

عائشہ پسرور

میں کہاں سے شروع کروں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ میں اٹھارہ سال سے بیمار ہوں بہت علاج کرواتی ہوں۔ آرام نہیں آتا۔ کچھ عرصہ پہلے مجھے خواب میں قرآن کریم کی سورہ توبہ کی آیت جس میں اللہ تعالیٰ نے تین صحابہ پر فرمایا ہے کہ زمین اتنی وسیع ہو کر ان پر تنگ ہو گئی کہ وہ اپنی جان سے تنگ آ گئے۔ مجھے خواب میں اس آیت کے بارے میں اشارہ ہوا تو میں سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ میں تو اس آیت کی عملی تفسیر ہوں۔ میں اٹھارہ سال سے بیمار ہوں۔ مجھے کسی دوائی سے آرام نہیں آتا۔ خدا کی قسم رل گئی ہوں۔ مجھے لگتا ہے اللہ مجھ سے ناراض ہے۔ عدنان بھائی وہ مجھے معاف کیوں نہیں کرتا۔ میں نماز اور قرآن بھی پڑھتی ہوں۔ اپنے سب گناہوں کی اللہ سے معافی مانگتی ہوں، مجھے لگتا ہے کہ وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ ہر اس انسان سے جس کی اللہ دعا قبول کرتا ہے یا جو خدا کے زیادہ قریب ہے میری درخواست ہے کہ وہ میرے لیے دعا کرے کہ اللہ مجھے معاف کر دے۔ مجھ پر رحم کر دے۔ میں نفسیاتی مریض بن گئی ہوں۔ خدا کے لیے میرا خط ضرور شائع کریں کہ شاید میرے لیے کوئی دعا کر دے۔ اللہ مجھے معاف کر دے۔

پیارے بہن! آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ اللہ تعالیٰ آپ سے ناراض ہے۔ تکلیفیں، بیماریاں، پریشانیاں سب انسانوں پر آتی ہیں لیکن اللہ کے نیک بندوں پر زیادہ ہی آزمائشیں آتی ہیں۔ آپ نے حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ نہیں پڑھا۔ وہ پیغمبر تھے۔ ان کی صحت، مال و دولت، اولاد، بیویاں سب اللہ تعالیٰ نے ان سے لے لیں۔ سترہ سال تک بیمار رہے اور بیماری بھی کیسی اذیت ناک کہ زخموں میں کیڑے پڑ گئے پھر ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوئی اور اللہ نے ان کو وہ سب کچھ لوٹا دیا جو ان سے لے لیا تھا۔

آپ نے اپنے خواب میں سورہ توبہ کی آیت کا ذکر کیا ہے یہ ان تین صحابہ کے بارے میں ہے اللہ تعالیٰ نے جن کی توبہ قبول کر لی تھی اور انہیں معاف فرمادیا تھا۔ اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا اور معاف کرنے والا ہے۔ ویسے بھی خواب کی تعبیر کوئی عالم ہی بتا سکتا ہے۔ آپ مایوس نہ ہوں۔ دعا کرتی رہیں۔ اللہ تعالیٰ فضل کرے گا، آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ستر ماؤں سے زیادہ مہربان ہے۔

قارئین بھی بہن عائشہ کے لیے دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ ان کی پریشانیاں دور کرے اور انہیں صحت و تندرستی عطا فرمائے۔



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

س: پیاری باجی! میں بالکل بھی خوب صورت نہیں ہوں، سب بہن بھائی گورے چٹے سرخ سفید ہیں ان کے نقش بھی اچھے ہیں دونوں بہنوں کی آنکھیں بھی بڑی ہیں اور بال بھی لمبے گھنے ہیں میں ان کے ساتھ بیٹھوں تو الگ ہی نظر آتی ہوں مجھے کوئی ترکیب بتائیں کہ میں بھی خوب صورت ہو جاؤں۔

ج:۔ آج کی دنیا میں خوب صورتی کا تصور کافی حد تک بدل چکا ہے۔ اب یہ کہا جاتا ہے کہ ہر صحت مند عورت خوب صورت ہے۔

آپ درج ذیل مشوروں پر عمل کریں۔ آپ کی صحت بہتر ہوگی اور آپ خوب صورت نظر آئیں گی۔
(1) پریشان رہنا چھوڑ دیں۔ اچھی باتیں سوچیں۔ اچھی امیدیں رکھیں۔ پریشانیوں اور ٹینشن سے جلد خشک، بے رونق، آنکھوں کے گرد حلقے اور چہرے پر جھریاں پڑ جاتی ہیں بال کرنے لگتے ہیں۔

(2) پوری نیندیں روزانہ 6 سے آٹھ گھنٹے گہری نیند لینا ضروری ہے۔ نیند کے دوران چہرے کے پٹھے پھیلتے ہیں جس سے ہماری جلد پر خوشگوار اثرات ہوتے ہیں۔

(3) ایسی خوراک لیں جس میں تمام غذائیت موجود ہو جسم کے لیے پروٹین بہت ضروری ہیں۔ پروٹین سے بھری غذا میں یہ ہیں۔ والیس، لوبیا، مونگ پھلی، خشک میوے اور چھلکوں والے اناج۔

تازہ ہری سبزیاں اور پھل بھی بہت مفید ہیں۔ سبزیوں اور پھلوں میں موجود ریشے ہمارے نظام ہضم کو بہتر کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ اس سے جلد بہتر ہوتی ہے اور جو گھنے ریشم جیسے بالوں کے لیے بہت اہم ہے۔ وٹامن اے حاصل کرنے کے لیے دودھ، مکھن، پنیر کا استعمال بھی اپنی روزمرہ کی زندگی میں برہادیں۔



رضوانہ خان۔ گاؤں میلو سیلو

س: میرے چہرے پر بال ہیں جہاں میں رہتی ہوں وہاں بیوٹی پارلر کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ تھریڈنگ کا طریقہ بھی مجھے نہیں آتا۔ کوئی ایسی ترکیب بتائیں جو میں آسانی سے کر سکوں اور بال بھی صاف ہو جائیں۔
ج: ایک خوبانی لے کر اس کو اچھی طرح پس کر گاڑھا سا پیسٹ بنالیں پھر اس میں ہم وزن شہد ملا لیں اس آمیزہ کو چہرے پر لگا کر اس وقت تک چھوڑ دیں جب تک وہ بالکل خشک نہ ہو جائے۔ خشک ہو کر یہ جھلی کی طرح ہو جائے گا پھر اس جھلی کو رگڑے بغیر کھینچ کر اتار لیں۔ اس طرح بال بھی کھینچ کر جھلی کے ساتھ اتر جائیں گے اور جلد بھی تروتازہ اور دلکش ہو جائے گی۔

